خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ـــــ محمود ریاض

مدیرہ ـــــ سادرہ خاتون

مدیر ـــــ آذر ریاض

نائب مدیرہ ـــــ رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات ـــــ عدنان

اشتہارات ـــــ خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کردیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کردیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

آپ سے کیا پردہ

بیگم محمودی کی گاجریں

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

ناول

انٹرویو

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

نظمیں غزلیں

رنگارنگ پھول

پکوان

میری بیاض سے

بیوٹی بکس

نفسیات

مئی 2017
جلد 45 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

زندگی اور وقت کبھی نہیں ٹھہرتے۔ زندگی کا کارواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ دکھ ہو یا سکھ، خوشی ہو یا غم سب بیت جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے یادوں کا ایک جہاں آباد کر لیا جاتا ہے۔ یادوں کی اپنی ایک دنیا ہے جو تلخ بھی ہے اور شیریں بھی۔ اس میں اپنوں کی رفاقت کا احساس بھی ہے اور ان کی جدائی کا غم بھی۔ اپنوں کی ابدی جدائی کے زخم اگر مندمل بھی ہو جائیں تو ان کی کسک باقی رہ جاتی ہے۔

محمود ریاض صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے سولہ سال بیت گئے لیکن آج بھی ان کی یادوں کے نقوش تازہ ہیں۔ کبھی ان کی جدائی کا احساس دل میں کسک بن کر ابھرتا ہے تو ان کے ساتھ گزارے پل یاد آ کر زندگی کو روشن سمت اور اُجالا دیتے ہیں۔

ریاض صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے۔ وہ دکھ بھی دیکھے جو انسان کو توڑ کر رکھ دیں۔ کامیابی اور کامرانی کی منزلیں بھی دیکھیں لیکن نہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر ان کا مزاج بدلا، نہ دکھ کی انتہائی کیفیت میں انہوں نے اپنے فرائض سے روگردانی کی۔ انہوں نے زندگی کے سارے فرائض پوری ذمہ داری سے نبھائے۔ اس انداز سے کہ ان کے انتہائی قریبی لوگ بھی نہ جان سکے کہ ان کے ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے کتنے غم چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت کتنی روشن، کتنی اجلی تھی، ان کی سوچ کتنی مثبت تھی، اس کا اندازہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے شائع ہونے والے پرچوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کی سوچ اور وسیع نگاہ کے ترجمان ہیں۔

ان کی یادیں اور باتیں آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو ابدی زندگی میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

رمضان المبارک سروے،

رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی ہماری زندگی کے معمولات یکسر بدل جاتے ہیں۔ سوتے جاگنے سے لے کر کھانے پینے اور پکانے کے اوقات میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔

ہماری قارئین جو ملک کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں اور مختلف ثقافت سے ان کا تعلق ہے۔ رمضان المبارک میں ان کے معمولات کیا ہوتے ہیں، جون کے شمارے میں اس حوالے سے قارئین سے سروے شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1. رمضان المبارک میں آپ کے معمولات زندگی میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ گھر کے دیگر کاموں کے ساتھ آپ عبادت کا وقت کیسے نکالتی ہیں؟ رمضان المبارک میں آپ کیا خصوصی عبادت کرتی ہیں؟
2. سحری اور افطاری میں آپ کیا خصوصی پکوان بناتی ہیں؟ کوئی ایسی ڈش جو آپ کے خاندان میں بنتی ہو؟
3. کیا آپ رمضان میں مہمانوں کو افطار پر مدعو کرتی ہیں؟

ان سوالوں کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 مئی تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا ناول "حالم"، ● آسیہ ریاض کا ناول "دشتِ جنوں"،
- سائرہ رضا، مصباح نوشین اور نادیہ احمد کے مکمل ناول، ● سمیرا حمید کا ناولٹ "بنتِ جمیلہ"،
- عطیہ خالد، ہاجرہ ریحان، قرۃ العین سکندر، قدسیہ رانا، آمنہ اسیہ مظہر چوہدری کے افسانے،
- مشہور اینکر شہزاد اقبال سے ملاقات، ● باتیں کزنز ہاشمی سے،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہم اسے آپ کے لیے پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، خط لکھ کر بتائیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

حکمران کی اطاعت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جس نے (حکمران کے جائز کاموں میں) اطاعت سے ہاتھ اٹھالیا تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے روز اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں فوت ہوا کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے۔ "جس شخص کو اس حال میں موت آئی کہ وہ جماعت کو چھوڑے ہوئے تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

فوائد و مسائل : 1۔ اس حدیث میں بھی مسلمان حکمران کی اطاعت کو لازم اور اس کی بیعت و اطاعت سے گریز و انحراف کو کفر و ضلال سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اسے جاہلیت کی موت اس لیے فرمایا کہ اسلام سے قبل ایک امیر کی اطاعت کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ اس میں وہ اپنی عار اور ذلت محسوس کرتے تھے۔ اسلام نے اس طوائف الملوکی کا خاتمہ کر کے انہیں نظم و ضبط کا پابند بنایا اور اطاعت امیر کی تاکید کی۔ تاہم اس میں جس امیر کی بیعت اور اطاعت کو ضروری اور اس سے خروج و بغاوت کو جاہلیت قرار دیا گیا ہے اس سے صاحب امر و اختیار امیر، یعنی حکمران اور بادشاہ وقت مراد ہے۔ مسلمانوں کی محدود جماعتوں کے بے اختیار امیر مراد نہیں ہیں کیونکہ ان کی اطاعت سے ملکی استحکام وابستہ ہے نہ ان کی عدم اطاعت سے نظم مملکت میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی بیعت و اطاعت سے انکار یا انحراف اتنا بڑا جرم نہیں کہ اسے کفر و ضلال قرار دیا جاسکے، جب کہ حدیث میں اسے کفر و ضلال ہی کہا گیا ہے، جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امیر سے مراد مسلمانوں کا با اختیار حاکم ہے نہ کہ تنظیمی معاملات کے امیر' اور جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے نہ کہ مسلمانوں کا کوئی ایک

گروہ یا دھڑا۔

2۔ اپنے اپنے گروہ کے امیر یا صدر کی اطاعت بھی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی گروہ میں نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا ہو، اس نظم جماعت سے خروج کفر نہیں، جیسا کہ جماعت المسلمین اور اس کے امیر سے خروج کفر ہے۔ نیز بعض لوگ کسی نہ کسی پیرو مرشد کی بیعت کرنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔

ضروری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تجھ پر سننا اور ماننا ضروری ہے، اپنی تنگی کی حالت میں بھی اور خوش حالی میں بھی، اپنی خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور حکمرانوں کے تجھ پر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ حکمرانوں کی اطاعت چونکہ ملت کے مجموعی مفاد کے لیے ضروری ہے، اس لیے تاکید کی گئی کہ تم اپنے ذاتی مفادات اور حالات و جذبات مت دیکھو بلکہ ان سے بالا ہو کر سوسائٹی کے مفادات کے پیش نظر ہر صورت میں حکمرانوں کی اطاعت کرو۔ سوائے نافرمانی کے کاموں کے کہ ان میں اطاعت کرنا جائز نہیں۔

2۔ اس حدیث میں معاشرتی استحکام کا خیال رکھنے کی ترغیب دلائی گئی ہے اور خود غرضی، جو امن و امان اور استحکام کو ختم کر دیتی ہے، سے باز رہنے کا حکم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، پس ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔

ہم میں سے بعض اپنے خیمے درست کر رہے تھے، بعض تیر اندازی وغیرہ میں مقابلہ کر رہے تھے اور بعض اپنے مویشیوں میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے آواز لگائی کہ نماز تیار ہے۔

ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا، اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی امت کی رہنمائی ایسے کاموں کی طرف کرے جنہیں وہ ان کے لیے بہتر جانتا اور انہیں ان کاموں سے ڈرائے جنہیں وہ ان کے لیے برا جانتا۔ اور تمہاری یہ امت جو ہے اس کی عافیت اس کے ابتدائی حصے میں رکھ دی گئی ہے اور اس کے آخری حصے میں آزمائش اور ایسے معاملات پیش آئیں گے جنہیں تم برا سمجھو گے اور ایسے فتنے ظہور پذیر ہوں گے کہ ایک، دوسرے کو ہلکا کر دے گا (یعنی ایک سے بڑھ کر ایک فتنہ رونما ہو گا اور بعد میں آنے والے فتنے کے مقابلے میں پہلا فتنہ بالکل ہلکا لگے گا۔) ایک فتنہ سامنے آئے گا تو مومن کہے گا: یہی میری ہلاکت کا باعث ہو گا۔ پھر وہ دور ہو جائے گا اور کوئی اور فتنہ ظہور پذیر ہو گا تو مومن کہے گا یہی وہ فتنہ ہے، جو سب سے بڑا ہے۔

پس جس شخص کو یہ پسند ہو کہ وہ جہنم کی آگ سے دور ہو اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو اسے موت اس حالت میں آنی چاہیے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اپنے ساتھ کیے جانے کو پسند کرے۔ اور جو شخص کسی امام کی بیعت کرے اور اسے اپنا ہاتھ اور اپنے دل کا پھل دے دے (یعنی دل میں اس کی بیعت کے پورا کرنے کا عزم رکھے) تو اسے چاہیے کہ مقدور بھر اس کی اطاعت کرے، پھر اگر دوسرا کوئی اسے اپنا تابع بنانے کے لیے اس سے جھگڑا کرے تو دوسرے کی گردن مار دو (اسے قتل کر دو)۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں ابتدائی حصے سے مراد صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا عہد ہے جسے دوسری حدیث میں خیر القرون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ عہد، مابعد کے تمام عہدوں سے زیادہ خیر و عافیت اور برکت و سعادت کا عہد ہے۔

اس کے بعد یکے بعد دیگرے فتنوں کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوں گے۔ اس پیش گوئی کی صداقت آج ہر شخص پر روز روشن کی طرح واضح ہے۔

2۔ فتنوں کے ظہور کی خبر سے مقصد' امت کو متنبہ کرنا ہے تاکہ وہ ان سے اپنا دامن بچا کر رکھے' اسی لیے اس سے بچنے کا طریقہ بھی بتلا دیا اور وہ ہے ایمان باللہ اور ایمان کے عقیدے پر مضبوطی سے قائم رہنا اور لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ اور حسن اخلاق کا اہتمام کرنا۔

3۔ اس میں اقتدار پسندوں کی کثرت کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے اور اس کا حل یہ بتلایا ہے کہ پہلے حاکم کی اطاعت کرو اور اس کے ساتھ مل کر دوسرے مدعی خلافت کی گردن اڑا دو کیونکہ اس طرح ہی ملت اسلامیہ کی وحدت قائم رہ سکتی ہے اور وہ انتشار و تفریق سے بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔

بُرے حاکم

حضرت ابو ہنیدہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

"اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم' اس کی بابت ارشاد فرمائیے کہ اگر ہم پر ایسے (بُرے) حاکم مسلط ہو جائیں کہ وہ ہم سے تو اپنا حق مانگیں لیکن ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے۔"

آپ نے اس سے اعراض فرمالیا۔

انہوں نے پھر آپ سے یہی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم ان کی بات سنو اور مانو' ان کے ذمے وہ بوجھ ہے جو انہیں اٹھوایا گیا (یعنی عدل و انصاف) اور تمہارے ذمے وہ بوجھ ہے جو تمہیں اٹھوایا گیا (یعنی اطاعت)۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ مطلب یہ ہے کہ حاکم اور رعایا دونوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔ جو بھی اس میں کوتاہی کرے گا اس کا بوجھ اس پر ہوگا اور اس کا خمیازہ اسے قیامت کے روز بھگتنا ہوگا۔ لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اگر حاکم اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو رعایا بھی سمع و طاعت سے انکار کردے۔ اس لیے کہ کوتاہی کا علاج کوتاہی سے ممکن نہیں۔ اس طرح مزید فساد ہوگا۔

2۔ بنابریں ملک کے مفاد عامہ کے لیے حکمرانوں کے ظلم کو برداشت کرنا' ان کے خلاف خروج و بغاوت کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ تاہم قانون جس حد تک تنقید کرنے اور اصلاح کی آواز بلند کرنے کی اجازت دے' اس حد تک ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا' خروج و بغاوت سے مختلف چیز ہے اور اس کا اہتمام کرنا اپنی اپنی طاقت کے مطابق ضروری ہے۔

خود غرض حکمرانی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے بعد خود غرض حکمرانی ہوگی (یعنی سارے مفادات خود ہی سمیٹ لینے کی ہوس۔ یا دوسرے معنی میں اپنوں کو ترجیح دینا) اور دیگر امور جنہیں تم بُرا سمجھو گے۔"

صحابہ کرام نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس شخص کی بابت کیا حکم فرماتے ہیں جو ہم میں سے یہ زمانہ پائے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنا وہ حق ادا کرنا جو تمہارے ذمے ہے اور جو تمہارے حقوق (حکمرانوں کے ذمے) ہیں' ان کا سوال تم اللہ سے کرنا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :
اس میں جہاں ایک طرف عوام کو حکمرانوں کے ظلم وستم، ان کی اقرباپروری یا خود ہی تمام قومی وسائل کو اپنے لیے مختص کر لینے کو صبر کے ساتھ برداشت کر لینے کی تلقین ہے، وہاں دوسری طرف بالواسطہ حکمرانوں کو بھی تنبیہہ ہے کہ وہ مذکورہ طور طریقے اختیار کرنے سے بچیں ورنہ وہ عنداللہ مجرم ہوں گے۔

حاکم کی اطاعت فرض ہے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے حاکم کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے حاکم کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :
امیر یا حاکم سے مراد اپنے وقت کا مسلم حکمران، کسی صوبے کا گورنر، وزیراعلیٰ اور کسی علاقے کا افسر مجاز ہے۔ ان کی اطاعت، جب تک اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو، ضروری ہے اور ان کی نافرمانی سخت گناہ۔ کیونکہ نظم ملت بہت ہی ضروری ہے اور وہ اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔

صبر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو اپنے حاکم کا کوئی کام ناپسندیدہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے، اس لیے کہ وہ بالشت برابر بھی حاکم کی اطاعت سے نکلا تو اس کی موت، جاہلیت کی موت ہوگی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں بھی حکمرانوں کی اطاعت میں سرکشی کرنے سے روکا گیا ہے۔

بادشاہ کی بے توقیری

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
"جس نے بادشاہ کی بے توقیری کی، اللہ بھی اسے ذلیل کرے گا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :
1۔ بادشاہ کی بے توقیری اور اہانت سے مراد، ان کی حکم عدولی اور عدم اطاعت ہے۔ اس سے حکمرانوں کا وقار اور ان کی تمکنت و جلال متاثر ہوتا ہے جبکہ امن واستحکام کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کا رعب و دبدبہ قائم رہے تاکہ جرائم پیشہ اور قانون شکن عناصر کو اپنی مذموم کارروائیوں کی جسارت نہ ہو۔ بہرحال ملکی مفاد اور مصلحت عامہ کی وجہ سے مسلمانوں کو یہی تاکید کی گئی ہے کہ جب تک حکمرانوں سے کفر صریح کا ارتکاب نہ ہو اور جب تک وہ نماز اور دیگر شعائر دین کو قائم رکھیں، اس وقت تک ان کی اطاعت کرو، چاہے وہ عدل و انصاف کے قیام اور عوام کے دیگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے ہی ہوں۔

2۔ اسلام میں حزب اختلاف کا رول بھی مختلف ہے۔ جس کا کام ہی ہر وقت حکومت پر تنقید اور اس کے خلاف لوگوں کو خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا ہے تاکہ وہ حکومت ناکام اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جائے اور پھر وہ خود اس کی جگہ اقتدار پر فائز ہو جائے۔ اسلام میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا یہ تصور نہیں ہے۔ سب ایک ہی امت ہیں اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں جن کے مفادات اور مقاصد بھی ایک ہیں اور حکمرانوں کی کوتاہیوں کے باوجود عوام کو ان کے خلاف خروج و بغاوت پر آمادہ کرنا جرم ہے۔

3۔ ان کی کوتاہیوں کو برداشت کرنے کی تاکید میں

بھی یہی حکمت ہے تاکہ ایک حکمران کو حکومت کرنے کا زیادہ سے زیادہ وقت ملے کہ اسی میں عوام کا بھی مفاد ہے اور ملک کا استحکام بھی۔

عہدہ و منصب کا سوال کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"یہ آخرت کا گھر ہم ان ہی لوگوں کے لیے کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔" (القصص۔83)

فائدہ :

طلب امارت کا مطلب ہے کہ اس کا طالب دنیا میں بڑائی کو پسند کرتا ہے اور بڑائی پسندوں کا رویہ ہی زمین میں فساد کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ عہدہ و منصب کی خواہش اور اس کے لیے سعی و کوشش کا انجام بالعموم برا ہی ہوتا ہے۔ حسن انجام اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی مناصب سے کنارہ کش رہے۔

منصب کا سوال کرنا

حضرت ابو سعید عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عبدالرحمن بن سمرہ! تو خود حکومت کے کسی منصب کا سوال نہ کرنا' اس لیے کہ یہ منصب اگر تجھے بغیر سوال کیے مل گیا تو اس پر (اللہ کی طرف سے) تیری مدد ہو گی اور اگر یہ تجھے سوال کرنے سے ملے گا تو یہ تیرے سپرد کر دیا جائے گا (اللہ کی مدد شامل حال نہیں ہو گی۔) اور جب تو کسی بات پر قسم کھالے' پھر تو کسی اور میں اس سے زیادہ بہتری دیکھے تو وہ کام اختیار کر جس میں بہتری ہو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ امارت سے مراد خلافت (حکومت) یا اس کا کوئی بھی منصب ہے۔ اس کی آرزو اور اس کے لیے کوشش کرنا ناپسندیدہ ہے' اس لیے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا نہایت مشکل امر ہے۔ البتہ جسے بغیر مانگے یہ منصب مل جائے' وہ اسے قبول کر لے کیونکہ بن مانگے یہ اسی کو ملے گا جس میں اس کی خاص استعداد و صلاحیت ہو گی۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی مدد ہو گی اور اسے خیر و سداد کی توفیق ارزانی ہو گی جبکہ خود خواہش کر کے حاصل کرنے والا اللہ کی طرف سے خیر اور سداد کی توفیق سے محروم رہے گا۔

2۔ کسی کام کی بابت قسم کھائی ہے' جب کہ اس میں کسی دوسرے کام کے مقابلے میں خیر اور نفع زیادہ ہے تو ایسے موقع پر قسم توڑ کے اس کا کفارہ ادا کر دیا جائے اور جس میں بہتری ہے اس کام کو کر لیا جائے۔

3۔ کفارہ قسم ایک گردن آزاد کرنا' یا دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا یا انہیں لباس مہیا کرنا ہے۔ جو ان کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

ندامت کا باعث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم یقیناً" حکومت اور امارت کی حرص کرو گے (لیکن یاد رکھو!) یہ قیامت والے دن ندامت (کا باعث) ہو گی۔" (بخاری)

فائدہ :

1۔ اس میں بھی امارت کی عظیم ذمہ داریوں کے حوالے سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو بغیر اہلیت کے اس کی خواہش کریں گے اور پھر اس میں کوتاہیوں کی وجہ سے عنداللہ مجرم قرار پائیں گے۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ انسان حکومتی ذمہ داریوں سے دور ہی رہے۔ اور اگر اہلیت کی بنیاد پر اسے یہ منصب ملے تو وہ اس کے تقاضے بھی پوری دیانتداری سے ادا کرے تاکہ روز قیامت کی ندامت سے وہ محفوظ رہے۔

☆

انشا جی کی ایک پنجابی نظم

تینوں دسیا تے توں ہسنا اے
اسیں کہندے کہندے مر جانا

اسیں تینوں کجھ نئیں دسنا اے
توں ہسدے ہسدے مر جانا

بس اگ اپنی وچ جلنا اے
اسیں اُجڑے اُجڑے رہ جانا

اور آپے پکھا جھلنا اے
توں وسدے وسدے مر جانا

اسیں پکے آں تو خام کُڑے
ہاں سوچ لیا انجام کُڑے

کجھ ہویا نئیں کی ہونا سی
اک گھر وچ دیوا بلدا ای

اک دن دا ہسنا رونا سی
کی دیکھ سندیسے گھلدا ای

اوہ سارے چھلاں ایویں سی
کیوں پورب پچھم جانی ایں

اوہ ساریاں گلاں ایویں سی
کیوں من اپنا بھٹکانی ایں

پر چرچا کرنا تمام کُڑے
گھر آ جا پے گئی شام کُڑے

بیادِ محمود ریاض
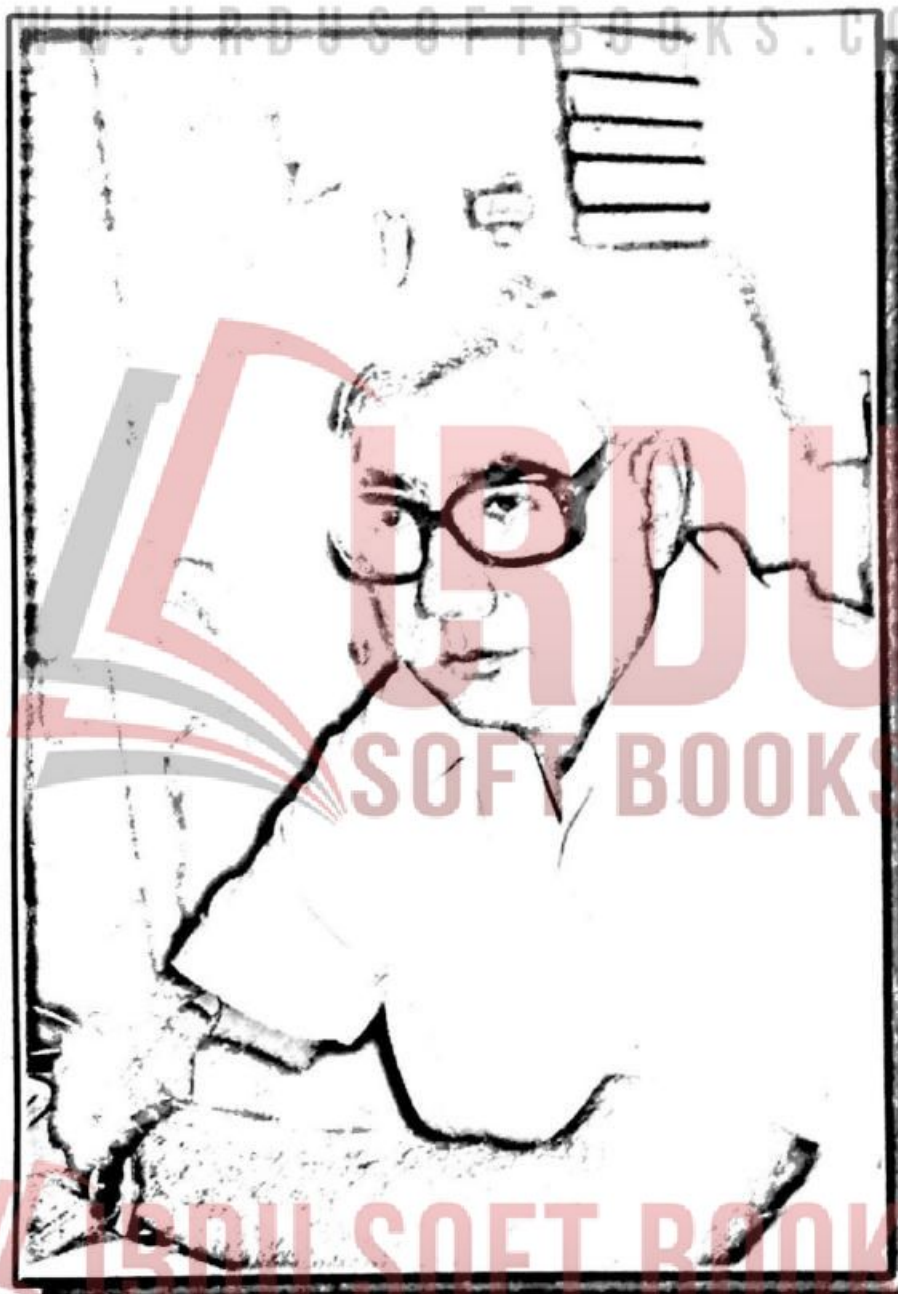
سمندر سی تھی گہرائی اس کی سوچوں میں
وہ اپنی ذات میں اک کائنات جیسا تھا

میرے مہرباں میرے قدرداں

آسیہ رزاقی

عجیب اتفاق ہے کہ میری ریاض صاحب سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہے نا حیرت کی بات۔ اس کے باوجود میں ان کی خوبیوں کی معترف ہوں۔ ان کی بہت سی عادات سے واقف۔ صرف ٹیلی فون کے سبب۔ گو کہ میں کئی بار کراچی گئی۔ وہ بھی لاہور اور اسلام آباد آئے میری موجودگی میں مگر بالمشافہ ملاقات نہ ہوئی۔

اس گریز کی وجہ ان کی طبیعت میں لحاظ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں پردہ کرتی تھی۔ اصل میں ان سے تعارف بھی نہایت دلچسپ مرحلے پر ہوا۔ میری بھانجیاں کراچی سے آئیں تو پوچھنے لگیں۔

"آپ نے خواتین ڈائجسٹ میں کب سے لکھنا شروع کیا؟؟"

میں خواتین ڈائجسٹ کی مقبولیت سے واقف تھی۔ کہہ دیا۔ [illegible]

"[illegible] نہیں جنتی۔"

ان کا اصرار۔ میرا شدومد سے انکار۔ انہوں نے اپنے سامان سے خواتین ڈائجسٹ کا نیا شمارہ نکالا جو انہوں نے اسٹیشن سے لیا تھا۔ حیرت اس میں میرا ناولٹ موجود تھا۔ غالباً" کسی پرانے پرچے سے لیا گیا تھا۔

کراچی کے کئی رسائل میں میں نے افسانے بھیجے۔ چاندنی' پازیب' آنگن اور آنگن شاید فاطمہ ثریا بجیا کا ڈائجسٹ تھا۔ لیکن خواتین میں بھیجنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ پھر میں نے کئی دن سوچ بچار کے بعد ریاض صاحب کو خط لکھا۔ شکوہ کیا کہ

"بھائی صاحب! آپ نے مجھے مطلع کیے بغیر میرا ناولٹ خواتین ڈائجسٹ میں شامل کیا۔ اور مجھے بتایا بھی نہیں' یہ سراسر زیادتی ہے۔"

چند دن بعد ان کا خط ملا۔ جس میں [illegible] معذرت کی [illegible] اور لکھا تھا کہ "یہ تو آپ کی [illegible]

لیے ایک کوشش تھی۔" انہوں نے لکھنے کی دعوت دی تھی۔

اسی خط کے کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی تحریر میں ایک عبارت تھی۔

"بہن صاحبہ! آپ کے بھائی کو ابھی پڑھنے لکھنے کا سلیقہ نہیں ہے کوشش کر رہا ہوں کہ لکھنا آجائے تو آپ کے خط کا جواب دوں۔"

(نہ جانے کس بچے سے لکھوایا تھا۔) کیسا شکوہ اور کہاں کا غصہ۔ اتنی ہنسی آئی کہ حد نہیں۔

"بھلا اتنی مشہور' قابل' ادبی شخصیت جو اتنے مقبول ادارے کو اپنی لیاقت کے سبب چلا رہا ہے۔ اس قدر مشہور ڈائجسٹ کی ادارت کو رہا ہے۔ وہ اب لکھنا سیکھ رہا ہے۔ ہے نا مزے دار بات۔

لطف آگیا۔ اس کے بعد تو ٹیلی فون کے ذریعے آدھی ملاقات کے موقع کئی بار ملے۔ ان کو بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ ان کے چند ستائشی الفاظ میرے لیے سند کا درجہ بن جاتے۔ حوصلہ اور ہمت بڑھ جاتی تب ہی تو خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے والیاں اس کے لیے وقف ہو جاتیں۔

ریاض صاحب کی فطرت میں لحاظ' مروّت اور شفقت کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان کی گفتگو سے ہر جذبے کا اظہار ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی خوش اخلاقی سے سب کے دل جیت لیتے تھے۔ مجھے میں اپنائیت اور شگفتگی کے علاوہ بزرگانہ شفقت کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا جیسے کوئی بڑا بھائی چھوٹی بہن سے محو گفتگو ہے۔

ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

"ہم اپنے ڈائجسٹ کو اعلا نمونہ بنا کر پیش کرنا

درستی کے لیے۔ لیکن آپ کے کسی بھی ناولٹ کا ایک نقطہ بھی ہٹانا نہیں پڑتا۔"

اوہ۔ کس قدر خوشی اور فخر ہوا۔ اتنی بڑی مشہور ادبی شخصیت جب اس طرح کی رائے دے۔ تو بندہ پھول کر غبارہ کیوں نہ بن جائے۔ دل رکھنے اور حوصلہ بڑھانے میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔

ان کی وفات کی خبر ایک سانحہ عظیم سے کم نہ تھی۔ خصوصاً "ہم لکھنے والوں کے لیے جو ان کی ہمت افزائی کے ہمیشہ منتظر رہے۔ ایک مہربان' باذوق' بامروّت ہستی سے دنیا خالی ہو گئی۔ ادبی دنیا میں خصوصاً" رسائل کی دنیا میں کبھی پر نہ ہونے والا خلا چھوڑ کر اور اب ... لگتا ہے کہ شاید یہ خلا کبھی پر نہ ہو سکے۔

چاہتے ہیں ... لیے ... کوئی افسانہ یا ناولٹ ہو ... [illegible] زمانے میں ... خصوصیات ... کی ہیں کیسے چھان بین کر شائع کرتے ... کبھی کبھی تو خاصی مشہور ... [illegible] ... اللہ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

اپنی ذات میں انجمن

عروسہ شہوار

گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا... لیکن یہ صرف تصور کی طاقت ہے جو گردش ایام کو پیچھے کی جانب دوڑنے پر مجبور کر سکتی ہے اور ہم اپنے بیتے ہوئے دنوں پر اک نظر ڈالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ویسے بھی یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔

ان کے سنہری دور کی ''یادیں اور باتیں'' ایک ''سرمایہ'' ہیں۔ جناب محمود ریاض کی یہ خوبی تھی کہ وہ زندگی کے بہت سے رنگ بیک وقت اپنی ذات میں سموئے رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف مواقع پر اپنا کردار عمدگی سے نبھایا اور مختلف ذمہ داریاں بخوبی انجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ دم آخری تک ان کی محنت میں فرق آیا اور نہ ہی جذبے کی شدت ماند پڑی۔

ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے مطالعے کی عادت کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ بے شمار خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش تھی' شائستہ گفتگو' مزاج میں شگفتگی' باتوں کے دوران برمحل اشعار ان کی گفتگو کو دلچسپ بنا دیتے تھے۔ دل چاہتا کہ وہ بولتے رہیں اور سامنے والا سنتا رہے۔ بلاشبہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اپنی ذات میں انجمن کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے پرچوں میں تہذیب' اخلاق اور شائستگی کا جو معیار قائم کیا اور اسے قائم بھی رکھا' ان کے جانے کے بعد بھی ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پرچوں کا معیار اسی طرح قائم ہے۔ ان کی روشن کی ہوئی شمعیں آج بھی تیرگی کا دامن چاک کر رہی ہیں۔

وہ جوہری کی نظر رکھتے تھے۔ ہیرے تلاشتے تھے۔ کتنے ہی مصنفین اس ادارے کے ذریعے سامنے آئے اور آج آسمان ادب پر جگمگا رہے ہیں۔ انہیں زمانے کے بدلتے تقاضوں کا بخوبی ادراک تھا' لیکن وہ اپنی تہذیب اور اقدار سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے بدلتے وقت کا ساتھ دیا' لیکن اپنی معاشرتی اقدار کو بھی ملحوظ رکھا۔

یہ توازن قائم رکھنا آسان کام نہیں۔ کائنات میں کسی شے کو دوام نہیں' دنیا میں آنے والوں کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ 10 مئی 2001ء کو وہ ستارہ بجھ گیا جو آپ اپنی مثال تھا۔ مگر ہمارے دل کے ایوان میں چاند بن کر چمکتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

جتنے نیوز چینل اتنے ہی نیوز اینکر، ہر ایک گھنٹے کے بعد آپ کو ٹاک شو میں اینکرز پروگرام کرتے ہوئے نظر آتے ہوں گے۔ مگر کامیاب وہی ہیں جو اپنی انفرادیت کے ساتھ غیر جانب دار ہو کر پروگرام کرتے ہیں۔

اینکرز میں سے ایک شہزاد اقبال بھی ہیں جو سماء ٹی وی چینل سے رات دس بجے سے گیارہ بجے تک پروگرام کرتے ہیں.... بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ظاہر ہے پروگرام کرنا اور وہ بھی اتنا عمدہ کہ ریموٹ ہاتھ میں ہی رہ جائے، انگلیاں کام کرنا چھوڑ دیں تو خود سوچیے کہ ایک پروگرام کی تیاری میں انہیں کتنا وقت لگ جاتا ہوگا۔ اعلا مقام پانے کے لیے کامیابی کی پہلی کنجی محنت اور سخت محنت ہے۔

"کیسے ہیں شہزاد صاحب؟"

"الحمدللہ.... ٹھیک۔"

نڈر و بے باک اینکر

شہزاد اقبال سے ملاقات

شاہین رشید

"کچھ اپنے بارے میں، اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے؟"

"ہم بنیادی طور پر میمن ہیں۔ میں اور میری فیملی، ہم کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا بچپن مسقط (عمان) میں گزرا اور کلاس 5th تک میں نے وہاں سے تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب بی سی سی آئی بینک میں جاب کرتے تھے اور ارلی نائنٹیز میں ہم پاکستان واپس آ گئے اور بقیہ تعلیم میں نے پاکستان سے حاصل کی.... اولیول اور اے لیول میں نے کراچی سے کیا۔ ایم بی اے میری تعلیم ہے۔ ایم بی اے میں نے "آئی بی ایم" سے کیا اور مارکیٹنگ اینڈ فنانس میں کیا۔ اس کے علاوہ سی ایف اے کا لیول ون کیا۔

ہم چار بہن، بھائی ہیں۔ میرا نمبر دوسرا ہے، مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے اور دو بہنیں ہیں اور دونوں شادی شدہ ہیں۔ میری بھی شادی ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ میرے دو بچے ہیں۔ بیٹی چھ سال کی ہے اور بیٹا ایک سال کا ہے اور میری تاریخ پیدائش 1981ء ہے۔ میں نے اعلا تعلیم حاصل کی ہے، لیکن آپ کو بتاؤں کہ میں اچھا طالب علم تھا، مگر بہت اچھا نہیں، یعنی فرسٹ، سیکنڈ، تھرڈ نہیں آتا تھا۔ والدین کو کبھی کہنا نہیں پڑتا تھا کہ "پڑھ لو۔" میں خود ہی اپنی فکر سے پڑھتا تھا کہ مجھے اچھا رزلٹ لانا ہے۔ بہت زیادہ سوشل نہیں تھا، کم گو تھا اور کسی کے ساتھ بہت جلدی فری نہیں ہوتا تھا.... اور بچپن میں تو کبھی سوچا بھی نہیں

بقیہ صفحہ نمبر 275

نمرہ احمد
حالم

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

گدلے پانیوں کا سنگم!

اس نے خواب میں دیکھا کہ
وہ گدلی سی جگہ ہے۔۔۔
دو دریاؤں کا سنگم۔۔۔
بارش تڑاتڑ برس رہی ہے۔۔۔
کیچڑ میں کھلے آسمان تلے دو افراد کھڑے ہیں۔۔۔
ایک سنہرے بالوں والی لڑکی ہے۔۔۔
بارش نے اس کو بھگو دیا ہے۔۔۔
اس کے بال گیلے ہو کر گالوں سے چپک گئے ہیں
اور وہ گردن اٹھائے اوپر دیکھ رہی ہے۔۔۔
آسمانوں کو۔۔۔ آسمانوں کے پار جہانوں کو۔۔۔
سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔۔۔
کیچڑ میں اس کے پیر لت پت ہیں۔۔۔
وہ دراز قد اور کسرتی بازوؤں والا ہے۔۔۔
اس کے گیلے بال ماتھے پہ بکھرے ہیں۔۔۔
وہ اپنے گریبان پہ ہاتھ ڈالتا ہے۔۔۔

اور ٹائی نوچ کے اتارتا ہے....
پھر وہ آہستہ نہیں موڑتا ہے... پیچھے... اور پیچھے...
لڑکی ابھی تک اوپر دیکھ رہی ہے...
آدمی جھکتا ہے... کیچڑ سے مٹھی بھرتا ہے...
سیدھا کھڑا ہوتا ہے....
مٹھی لڑکی کی طرف بڑھاتا ہے...
"میرے ساتھ رہو... ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔"
وہ بارش اور طوفان میں بلند آواز سے کہتا ہے....
وہ چونک کے اسے دیکھتی ہے... پھر اوپر نگاہ اٹھاتی ہے...
دور آسمان پہ ایک پرندہ اڑتا ہوا آرہا ہے...
اپنے پر پھیلائے اس آدمی کے سر کے اوپر فضا میں آرکتا ہے...
چکر کاٹتا ہے... کاٹتا ہے... کاٹتا ہے...
لڑکی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتی ہے... الفاظ اس کے لبوں سے نہیں نکل پاتے... مگر وہ ہونٹ ہلا کر کہتی... بے آواز... وہ دیکھو....
آدمی مٹھی بڑھائے ہنوز کھڑا رہتا ہے۔ اس کی مٹھی میں کیچڑ ہے... اور کیچڑ میں دمکتی ایک سونے کی چابی ہے...
"میرے ساتھ رہو... میرے ساتھ رہو..." وہ ہنوز کہہ رہا ہے۔
پرندہ ان کے سر پہ چکر کاٹ رہا ہے... سنہرے اور سرخ رنگ کا پرندہ... عقاب جیسا... نیلے ہیروں جیسی آنکھوں والا پرندہ...
ایک جھٹکے سے حالم کی آنکھ کھلی۔

☆ ☆ ☆

"کوالالمپور" جزیروں کے ملک ملائیشیا کا سب سے مشہور شہر ہے۔ مختلف تہذیبوں اور ادیان کا مرکز... یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سمندر اور اونچے پہاڑ... سبزہ اور کھلے باغات... وہ جنت کے تصور جیسا خوب صورت شہر تھا اور اس صبح وہ معمول کے مطابق آوازوں 'شور اور بے فکر قہقہوں سے گونج رہا تھا... لوگ اپنے روزمرہ کے کام نپٹا رہے تھے... سڑکوں پہ... دفتروں میں... گھروں میں...
کے ایل (کوالالمپور کو عرف عام میں کے ایل کہا جاتا تھا) کے مصروف کاروباری مراکز کے علاقے میں ایک اونچی عمارت بے نیازی سے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بارہویں فلور پہ آؤ تو آفس کیبن بنے تھے اور ورکرز مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ٹائپنگ کی آوازیں 'فون کی گھنٹیاں... یوں دکھائی دیتا تھا کہ اس آفس میں ہر روز کی طرح کام جاری و ساری تھے۔
ایسے میں ایک نوجوان ہاتھ میں فائل پکڑے تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔ چینی نقوش کی صورت کا حامل وہ درمیانے قد کا تھا اور چہرے پہ دبا دبا جوش تھا۔ ایک آفس کے دروازے کے سامنے وہ رکا' خوشی کو قابو کرتے ہوئے مسکراہٹ دبائی اور دھڑلے سے دروازہ کھولا۔
اندر آفس ٹیبل کے پیچھے ایک تھکا ماندہ سا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ ٹائی ڈھیلی کیے بگڑے تاثرات لیے اس نے آنکھیں اٹھا کے اکتاہٹ سے اندر داخل ہوتے نوجوان کو دیکھا۔

"مولیا! میں اس وقت کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ میں ساری رات سو نہیں پایا۔ ابھی مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"
"انور صاحب...! اچھی خبر ہے۔" مولیا دمکتے چہرے کے ساتھ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھا تو انور صاحب نے ہاتھ جھلایا۔
"تمہیں لگتا ہے اس وقت مجھے کوئی خبر خوش کر سکتی ہے؟ میری لاپروائی سے باس کا لیپ ٹاپ چوری ہو گیا ہے اور تمہیں اپنے کاموں کی پڑی ہے...؟" وہ ناراض چینی آنکھیں مولیا پہ جمائے زور سے بولے۔ "ابھی تک تو باس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان کا لیپ ٹاپ جس میں ہمارے بزنس کی خفیہ دستاویزات ہیں اور جو انہوں نے مجھے وائرس سے پاک کرنے کے لیے دیا تھا، میں گم کر چکا ہوں۔ جاؤ خدا کے لیے..."
"سر! تحمل سے میری بات سنیں۔ مولیا نے لیپ ٹاپ کو ٹریس کر لیا ہے۔" وہ چہک کر بولا۔ (ملائیشیا کے لوگ عموماً "میں نے یہ کر لیا ہے" کی جگہ اپنا نام لے کر کہتے ہیں کہ "مولیا نے یہ کر لیا ہے۔")
انور صاحب کا جھکا اترا چہرہ تیزی سے سیدھا ہوا۔ آنکھیں پھیلیں۔ بہت سے رنگ چند لمحوں میں بدلے۔
"کیا مطلب؟ کیسے؟" وہ تیزی سے آگے ہوئے۔
"حالم!" مولیا نے جوش اور فخر سے وہ فائل سامنے رکھی۔ انور صاحب نے چونک کے اسے دیکھا، پھر سیاہ فائل کو۔
"تم نے حالم کو ہائر کیا؟" ان کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ دلچسپ سرگوشی میں۔ آنکھوں میں چمک ابھری۔
"جی۔ مولیا نے رات کو ہی اسے کال کر دی تھی اور صبح تک اس نے سارا کھوج لگا لیا ہے۔"
"اتنی جلدی؟" ان کو خوش گوار سی بے یقینی ہوئی۔
"وہ حالم ہے سر۔ حالم یعنی خواب دیکھنے والا، مگر خواب وہ ہمارے پورے کرتا ہے۔ ہم جیسے لوگ پولیس کے پاس جا نہیں سکتے کیونکہ پولیس لیپ ٹاپ کو evidence (ثبوت) میں شامل کر کے اسے دیکھے گی ضرور اور ہمارے کارپوریٹ سیکرٹس کمپرومائز ہو جائیں گے اور باس کو بھی علم ہو جائے گا۔ اس لیے ہمارے پاس حالم جیسے چالاک تفتیش کار (Scam Investigator) سے اچھا کوئی آپشن نہیں تھا۔"
"تم نے بہت اچھا کیا۔ حیرت ہے مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ کتنے کام کروا چکے ہیں ہم پچھلے چند ماہ میں اس سے۔" وہ تکان سے پہلی دفعہ مسکرائے۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا۔ "کیسا ہے وہ اب؟ ویسا ہی نخریلا، مغرور اور موڈی؟"
"ہے تو وہ ویسا ہی۔ کتنی منتیں کرنی پڑتی ہیں اس کی، پھر کام کرنے کی ہامی بھرتا ہے وہ، لیکن ایک دفعہ ذمہ داری اٹھا لے تو کام کر کے دم لیتا ہے۔ ایسے ہی تو وہ کے ایل کی بلیک مارکیٹ کا سب سے ذہین اور شاطر انویسٹی گیٹر نہیں ہے سر۔ اس کی ذہانت...."
"اچھا اچھا۔ اب کام کی طرف آؤ۔" انہوں نے بے زاری سے ٹوکا تو مولیا کی زبان کو قفل لگا، پھر خجل سا مسکرا کے بولا۔
"اچھا یہ دیکھیں۔ اس نے لیپ ٹاپ کو ٹریس کر لیا ہے۔ اس وقت ہمارا لیپ ٹاپ اس ایڈریس پہ موجود ہے۔" مولیا نے فائل کھول کے اس پہ ایک جگہ نشاندہی کی۔
انور صاحب آگے کو جھکے، عینک ناک پہ جمائی اور غور سے پڑھا۔ "یہ تو کسی کے گھر کا پتا لگ رہا ہے، مگر یہ کون... ایک منٹ۔" انہوں نے چونک کر آنکھیں اٹھائیں۔ رنگ فق ہوا تھا۔
"یہ تو تنکو کامل محمد کا گھر ہے۔" انہوں نے چونک کے سر اٹھایا تو منہ آدھا کھل چکا تھا اور پیشانی پہ پسینہ

پھوٹنے لگا تھا۔ "تنگو کامل نے ہمارا لیپ ٹاپ چرایا؟ او خدا... مجھے اٹھا لے... مجھے اٹھا لے۔"

"صبر کریں، سر۔"

"صبر؟ میں باس کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" وہ چیخے تھے۔ "میری کار سے ان کا لیپ ٹاپ چوری ہوتا ہے اور چوری کرنے والا کون ہے؟ ہمارا سب سے بڑا حریف۔ یا اللہ! وہ اب تک کیا کچھ کر چکا ہوگا ہمارے ڈاکومنٹس کے ساتھ۔"

انہوں نے پیشانی پہ ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مولیا نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کے ان کے سامنے کیا۔ انور صاحب نے جھٹ گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گئے۔ پھر گہری سانس لے کر خود کو نارمل کرنے لگے۔

"ابھی تک تو میں نے سر کو یہ کہہ رکھا ہے کہ لیپ ٹاپ ٹھیک کروا رہا ہوں۔ چند گھنٹے سے زیادہ میں ان کو ٹال نہیں سکتا۔ اب بتاؤ۔" وہ خود پہ قابو پاتے ہوئے فکرمندی سے پوچھنے لگے۔ "وہ کتنی جلدی تنگو کامل کے گھر سے لیپ ٹاپ نکال کر لا سکتا ہے؟"

"کون؟"

"میرا دادا جو قبر میں بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہے 'یو ایڈیٹ۔'" انہوں نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ پانی کا گلاس تو کانپا ہی، مولیا خود بھی اچھل ہی پڑا۔

"مم... میں... وہ... حالم کا پوچھ رہے ہیں آپ؟ مگر سر، وہ انویسٹی گیٹر ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکے گا اور..." مگر انور صاحب کے تاثرات اور لال انگارہ آنکھیں دیکھ کر وہ گڑبڑا کے اٹھا۔ "میں... میں کچھ کرتا ہوں۔ اس کی منت کرتا ہوں۔"

انور صاحب نے خاموشی سے انگلی سے اسے قریب بلایا۔ وہ ڈرتے ڈرتے ان کی طرف جھکا۔

"اگر..." وہ اتنا زور سے گرجے کہ مولیا بے اختیار پیچھے ہٹا۔ "مجھے آج رات تک لیپ ٹاپ نہ ملا تو تمہاری نوکری گئی۔ جتنا پیسا خرچ کرنا پڑے، کرو... میں ساری رقم ادا کروں گا، لیکن مجھے وہ واپس چاہیے..."

"راجر باس۔" اس نے اثبات میں زور زور سے گردن ہلائی۔ جلدی جلدی فائل سمیٹی اور باہر کو بھاگا۔

اپنے آفس میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور کرسی پہ آ کے نڈھال سا گرا، مگر وقت مزید ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک نظر اپنی بیوی بچوں کی تصاویر کو دیکھا جو میز پہ رکھے فریمز میں لگی تھیں اور پھر فون پہ نمبر ملانے لگا۔

"کالنگ حالم۔" جلد ہی اس نے فون اٹھا لیا۔

"میں سوچ ہی رہا تھا کہ ابھی تک میری صبح خوش گوار کیوں گزر رہی ہے۔ کوئی نحوست کیوں نہیں گھل رہی اس میں؟ فون کرنے کا شکریہ مولیا۔ اب بتاؤ کیا کام ہے؟"

خوش گوار سی مردانہ آواز کانوں سے ٹکرائی تو مولیا کی صبح میں سارے زمانے کی نحوست گھل گئی۔ چہرے کے زاویے بگڑے، مگر وہ ضبط کر کے مسکرایا۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔ کام بتاؤ۔" وہ اب کے رکھائی سے بولا تھا۔ "مگر یاد رکھنا، اگلے چار دن میں مصروف ہوں۔ جمعرات کے بعد کر سکوں گا۔ اب بتاؤ، پھر سے کیا کھو دیا ہے تم نے؟"

"وہی لیپ ٹاپ..." وہ بے چارگی سے بولا۔ "وہ کیسے نکلواؤں؟"

"کیا مطلب؟ ابھی تک نکلوایا نہیں ہے وہ؟ کمال آدمی ہو یار تم۔ دو گھنٹے پہلے رپورٹ دی تھی تمہیں۔ اپنے چار پانچ سیکیورٹی کے بندے لے کر جاتے، ان کے گھر میں گھستے اور نکال کر یہ جا وہ جا۔"

”حالم۔۔۔ حالم۔۔۔ خدا کے لیے سمجھو۔“ مولیا اپنے بال نوچنا چاہتا تھا۔ ”ہم کارپوریٹ سیکٹر کے لوگ ہیں۔ غنڈے بدمعاش نہیں ہیں۔ جتنے اچھے ہمارے سیکورٹی آفیسرز ہیں اس سے کہیں اچھے لوگ تنکو کامل کے پاس ہوں گے۔ وہ تنکو کامل ہے۔ ایک امیر اور طاقت ور آدمی۔ نہ ہوتا تب بھی ہم یہ نہیں کرسکتے کیوں کہ لیپ ٹاپ انور صاحب کی لاپروائی سے کھویا ہے۔ ہم باس کو بتائے بغیر اس کو واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کل صبح سے پہلے۔“

”دیکھو! اگر تو تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ میں تنکو کامل کے گھر جا کر تمہارا لیپ ٹاپ چراؤں گا تو میں یہ نہیں کرنے لگا‘ سوری۔ حالم چور نہیں ہے۔ صرف انویسٹی گیٹو ہے۔“ وہ بے رخی سے بولا تھا۔

”پھر میں کیا کروں؟ میری نوکری چلی جائے گی یار۔“ مولیا نے بے چارگی سے فوٹو فریمز کو دیکھا۔ آفس بلائنڈز سے چھن کر آتی دھوپ میں وہ مزید چمکنے لگی تھیں۔ تیز دھوپ۔۔۔ بے سائبان۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔

”اچھا پھر کسی چور کو ہائر کرو‘ وہ رات کو چرا لائے گا۔“ حالم نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

”میں کاروباری آدمی ہوں۔ کہاں جانتا ہوں ان چور ڈاکوؤں کو؟ تم کچھ کرو پلیز۔ میں منہ مانگی رقم ادا کروں گا۔“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”پہلے سے دگنی رقم دوگے؟“ مولیا جھٹکے سے سیدھا ہوا۔ چہرہ کھل اٹھا۔

”ہاں بالکل۔“

”دگنی میں تین گنا لوں گا۔“

مولیا نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا پھر ضبط کرتے ہوئے دوبارہ کان سے لگایا۔ ”جو مانگو گے‘ دوں گا۔“

”پھر ایک کام کرو۔“ حالم کا لہجہ اب کے نرم پڑا جیسے اسے مولیا پہ ترس آگیا ہو۔ ”مجھے دو ڈھائی گھنٹے دو۔ میں تنکو کامل کے تمام ملازموں کی پروفائلز تمہیں دے دیتا ہوں۔ ان کی صلاحیتیں اور ان کی کمزوریاں۔ تم جس ملازم کو بہتر سمجھو اس کے پاس جا کر اس کو ڈرا دھمکا کے یا پیسے کا لالچ دے کر اس کو خرید لو۔ گھر کا بھیدی آسانی سے لیپ ٹاپ نکال کر لادے گا۔“ مولیا کا منہ کھل گیا۔

”یہ سب میں کروں گا؟ مطلب۔۔۔ کیا تم خود ان ملازموں سے بات نہیں کرسکتے؟“

”یو نو واٹ مولیا۔۔۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری مدد کی جائے۔ اب فون نہ کرنا۔“

کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ مولیا کا سر گھومنے لگا۔ اس نے دیوانہ وار دوبارہ نمبر ملایا۔

”پلیز۔۔۔ پلیز حالم۔۔۔ فون اٹھالو۔“ وہ بہ آواز بلند دعا کر رہا تھا۔

(اگر باس کو معلوم ہو گیا۔۔۔ گھن کے ساتھ وہ بھی پس جائے گا۔ بلکہ وہ تو سڑک پہ آجائے گا۔) مگر حالم فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

میز پہ رکھے فوٹو فریمز اب دھوپ کی حدت سے چمکنے لگے تھے۔ جیسے اس کے بیوی بچے سائے سے نکل کر ننگے سر سورج تلے آکھڑے ہوئے ہوں۔ اس کا تو گھر بھی کمپنی کا دیا ہوا تھا۔ اس نے غصے اور بے بسی سے پیغام ٹائپ کیا۔

”حالم۔۔۔ فون اٹھاؤ ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔“

”آفس کے دروازے کا لاک کھول کے خودکشی کرنا‘ ورنہ لاش سے بدبو آنے میں چند دن لگ جاتے ہیں۔“

”میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ میں اس کے ملازموں سے خود بات کرلوں گا۔ صرف مجھے ان کی پروفائلنگ دو۔“ اس نے جلدی جلدی پیغام لکھا۔

"پہلے مجھ سے معذرت کرو۔" "فوراً" جواب آیا۔
"کیسے؟"
"ایک کاغذ پہ لکھو۔ حالم کے ایل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے اور میں آئندہ اس سے اختلاف نہیں کروں گا۔ تمہارے یہ لکھنے تک میں پروفائلز تیار کرلوں گا۔" مولیا نے "فوراً" سے نوٹ پیڈ پہ قلم گھسیٹا۔
"میں نے یہ لکھ بھی لیا۔"
"اس کو پانچ سو پچپن دفعہ لکھو۔" وہ غرا کے بولا اور فون کٹ گیا۔ مولیا نے گہری سانس لی' آستین سے پیشانی پونچھی اور جلدی جلدی قلم کاغذ پہ گھسیٹنے لگا۔
"پتا نہیں اس شخص کی کون سی انا کو تسکین ملتی ہے ایسے کاموں سے۔" وہ غصے سے بڑبڑا بھی رہا تھا۔
کمرے میں دھوپ پھیلتی جارہی تھی مگر اس نے اے سی کو تیز نہیں کیا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا۔ بس سر جھکائے' لکھتا گیا۔ لکھتا گیا۔ جانے کتنی دفعہ لکھا گیا تھا کہ اس نے سر میز پہ رکھ دیا اور خالی نظروں سے قلم اور پنسلز سے بھرے مگ کو دیکھنے لگا۔ اس کا سر درد کررہا تھا جیسے دماغ پھٹنے کو ہو۔ انور صاحب کے ساتھ اس کی نوکری اور گھر دونوں جا ئیں گے۔۔۔
فون کی گھنٹی چنگھاڑی تو مولیا اچھل پڑا۔ تیزی سے فون اٹھایا۔ حالم کی ای میل آئی تھی۔ اس کے جسم کا ہر عضو آنکھ بن گیا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ چند پرنٹڈ کاغذ اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ کھلا لیپ ٹاپ ترچھا کرکے یوں رکھا ہوا تھا کہ سورج کی کرنوں کا راستہ رک گیا تھا اور فوٹو فریمز چھایا تلے تھیں۔ ان کو جیسے سائبان مل گیا تھا۔
"تنکو کامل کا ڈرائیور!" اس نے ایک کاغذ اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور آنکھیں چھوٹی کرکے تفصیل پڑھی۔ "اونہوں۔ جو اتنے سال سے تنکو کامل کی ملازمت کررہا ہو' بھلے وہ جوئے کا عادی بھی ہو' وہ نہیں بک سکتا۔" اس نے کاغذ واپس ڈالا اور دوسرا پرنٹ آؤٹ اٹھایا۔
"بٹلر۔" بند مٹھی ہونٹوں پہ رکھ کے چند لمحے تفصیلات پڑھیں۔ بٹلر کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا گیا تھا جیسے۔
"یہ تو بالکل بھی نہیں۔ اس کا کرمنل بیک گراؤنڈ اس کی کمزوری نہیں' اس کی طاقت ہے۔ کیا سوچ کے حالم نے اس ہٹے کٹے آدمی کی پروفائل بنا کے دی ہے؟ یہ تو مجھے پھونک مار کے اڑا دے گا۔"
جھرجھری لے کر کاغذ رکھ دیا۔ اب پرسنل اسسٹنٹ کی باری تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی مولیا کو رونا آگیا۔
"یہ تو مجھ سے عمر میں بھی بڑا ہے اور قابلیت میں کہیں آگے ہے۔ امریکا کا پڑھا ہوا محنتی اور قابل نوجوان۔ اس کے سامنے میں بات بھی نہیں کرپاؤں گا۔" اس کاغذ کو تو اس نے چھوا بھی نہیں۔ پھر اگلے کو دیکھا تو نگاہ ٹھہر گئی۔ دھیرے سے کاغذ اٹھا کے آنکھوں کے سامنے لایا۔
وہ ان تمام پروفائلز میں پہلی نسوانی پروفائل تھی۔
"تالیہ مراد۔" وہ نام پڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ صفحے کے کونے میں اس کی تصویر بنی تھی۔
(تصویر آج کی لی ہوئی تھی جیسے کسی گھر کی چھت سے گلی میں چلتی لڑکی کی تصویر اتاری گئی ہو۔ وہ لمبا سا مقامی طرز کا فراک پہنے ہوئی تھی' کہنی پہ ٹوکری ٹنگی تھی جس میں پھول تھے اور وہ سر جھکائے کندھے کے پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ ماتھے پہ سفید خوب صورت سا ہیٹ پہن رکھا تھا' جس سے سیاہ بال نکل کر کندھے پہ گر رہے تھے۔ جھکے سر اور ہیٹ کے باعث چہرہ واضح نہ تھا' مگر رنگت گوری' نکھری ہوئی لگتی تھی۔) مولیا کی نظریں ٹائپ شدہ الفاظ پہ جار کیں' جو حالم نے اس کی پروفائلنگ کرتے ہوئے لکھی تھیں۔

"تالیہ مراد۔ اس کا تعلق کشمیر سے ہے۔ تین ماہ سے تنکو کامل کی ملازمہ ہے... زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے' مگر انگریزی اور ملے زبان ٹھیک سے بول لیتی ہے۔ بہت باتونی لڑکی ہے۔ قدرے بے وقوف اور جلد باز۔ آدھا دن تنکو کامل کی ملازمت کرتی ہے اور شام میں ایک ریسٹورنٹ میں ویٹرس کے طور پہ کام کرتی ہے۔ کشمیر میں اس کا لمبا چوڑا خاندان ہے' جس کی کفالت یہی کرتی ہے۔ جو کماتی ہے وہیں بھیج دیتی ہے۔ خود عام کپڑوں اور جوتوں میں خوش باش گھوم رہی ہوتی ہے۔ تالیہ کو سوپ بنانے' احمقوں کی طرح بہت بولنے اور ہر چھپکلی' کاکروچ کو دیکھ کر چیخیں مار مار کے روتے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے ہے' جن کے پاس اچھی شکل اور دراز قد کے علاوہ کوئی خصوصیت اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ نہ ذہانت' نہ تعلیم۔ اس کے باوجود تنکو کامل ہو یا سوپ پارلر والے' سب تالیہ سے محبت کرتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ ایک کم ذہن' کم علم اور سادہ سی لڑکی پہ سب اتنا اعتماد کیوں کرتے ہیں؟ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایمان دار' سچ بولنے اور خیال رکھنے والی لڑکی ہے۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہے۔ ان ہی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی میں کبھی ترقی نہیں کر سکی اور غربت میں جکڑی ہوئی ہے۔" وہ ایک بے رحمانہ تجزیہ تھا۔

مولیا کی پیشانی پہ افسوس کی لکیریں ابھریں۔ "حالم کتنا بے مروت اور سفاک ہے یا شاید مادہ پرست۔" ابھی وہ کوئی اور تبصرہ کرتا' لیکن صفحے کا آخری پیراگراف پڑھ کے ٹھٹک گیا۔

"تالیہ یہاں ال لیگل ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں آنے والے غیر قانونی پاکستانیوں میں سے ہے اور یہی اس کی وہ کمزوری ہے' جس کی بنا پہ اس کو ڈرایا دھمکایا جاسکتا ہے۔"

"اوہ تب ہی تنکو کامل نے اسے ملازمت دی۔ ال لیگل لڑکی یعنی کم تنخواہ اور مراعات۔ کنجوس تو وہ ہمیشہ سے تھا... غیر قانونی تارک وطن..." مولیا نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ رنگت میں پھر سے سرخیاں گھل گئی تھیں اور فوٹو فریمز چھاؤں میں' محفوظ دکھائی دیتے تھے۔

"مجھے اس لڑکی کو ڈھونڈنا ہے۔" کار کی چابی اٹھاتے ہوئے اس نے تمام کاغذ سمیٹ کر فائل میں رکھے' ایک نظر لڑکی کے چہرے پہ ڈالی اور فائل لیے اٹھا۔

"مجھے ان چند گھنٹوں میں اس لڑکی کے ذریعے باس کا لیپ ٹاپ واپس حاصل کرنا ہے۔" وہ ایک عزم سے باہر کو بھاگا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوپ پارلر میں دوپہر اپنی ساری حدت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یخنی کی خوشبو اور اشتہا انگیز دھوئیں سارے میں پھیلے تھے۔ کچن میں ایک ساتھ بہت سی چیزیں پک رہی تھیں۔

اندر جھانکو تو دو ویٹر ٹرے میں برتن لگا رہے تھے۔ ایک ویٹرس ایک ہیلٹر پہ جھکی کھڑی اس میں رکھے ملغوبے کو سجا رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی ایپرن اور ٹوپی پہنے کھڑا سوپ کے دیگچے میں چمچہ ہلا رہا تھا۔ صرف وہ فارغ بیٹھی نظر آتی تھی۔

خالی کاؤنٹر پہ جو کرسی کے انداز میں بیٹھی تھی' اس نے ایپرن پہن رکھا تھا اور بال ٹوپی میں مقید تھے۔ یہ واضح نہ تھا کہ وہ کتنے لمبے تھے' مگر چہرہ بیضوی اور سرخ سفید سا تھا۔ سیبوں جیسے گال جن پہ مسکرانے سے ڈمپل پڑتا تھا اور بڑی بڑی سبز آنکھیں۔ وہ ایشیائی نقوش والی پیاری سی لڑکی تھی اور اس وقت آنکھیں گھما کے سب کو دیکھتی مسکراتے ہوئے گنگناتے جا رہی تھی۔

رفعتا“، سری ویٹرس نے سر اٹھا کے اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔

”کتنا کام پڑا ہے‘ اگر تم تھوڑا سا کر لوگی تو وزن نہیں کم ہو جائے گا تمہارا۔“

تالیہ گانا روک کے ہلکا سا ہنسی‘ پھر آنکھیں سیدھی ویٹرس پہ جمائے بولی۔ ”میرے گانے سے سوپ میں ذائقہ آتا ہے۔ آپ لوگوں نے وہ مووی دیکھی ہے کنگ فو پانڈا؟ نہیں دیکھی نا؟ میں نے بھی نہیں دیکھی‘ لیکن سنا ہے اس میں ایک موٹا سا پانڈا تھا جو ـــــ“

”تم نے اپنی تنخواہ کا کیا کیا تالیہ؟“ بوڑھے شیفس نے ایک دم اس کی طرف گھوم کے تختی سے سوال پوچھا تو تالیہ کی زبان رکی‘ لیکن مسکراہٹ برقرار رہی۔

”جب معلوم ہے کہ تنخواہ پاکستان بھیجتی ہوں تو پوچھتے کیوں ہو‘ پیارے اور موٹے سے بوڑھے؟“ وہ کہہ کے خود ہی ہنس دی تو باقی سب بھی ہنس پڑے۔ سوائے شیف کے جو خفگی سے اسے گھور رہے تھے۔

”لٹا دیا نا ہر دفعہ کی طرح اپنے خاندان پہ سب کچھ؟ اپنے لیے کیوں کچھ نہیں رکھتیں؟“ وہ زچ ہوئے۔

”ارے ارے... میرے کون سے اتنے خرچے ـــ ہیں اور پھر اتنے سارے پیسوں کا میں نے کیا کرنا ہے۔ اونہوں۔ کھاؤ نہیں‘ ایک۔“

اس نے بات کرتے کرتے کفگیر اٹھایا اور ویٹر کے ہاتھ پہ مارا جو نوکری سے گاجر لاپروائی سے اٹھا رہا تھا۔ ہاتھ پہ لگی تو اس نے بدمزگی سے تالیہ کو دیکھا جس نے نفی میں دائیں بائیں گردن ہلائی۔ ”اونہوں۔ یہ مالک کی امانت ہے۔ ہم اسے نہیں کھا سکتے۔“

”بس بس تالیہ! تم اپنی سچائی اور ایمان داری کو لے کر ہمیشہ ویٹرس ہی رہنا۔“ وہ برہمی سے ٹرے اٹھاتا باہر نکل گیا۔ تالیہ پھر سے ہنس دی اور کندھے اچکا دیے۔ پھر گردن موڑی تو ہیڈ شیف اسی طرح اسے ناراضی سے گھور رہے تھے۔ تالیہ نے مسکراہٹ دبالی۔

”تمہارے خاندان نے کیا تمہیں پیسہ کمانے والی مشین سمجھ رکھا ہے؟ تمہارا باپ اور بھائی خود کام کیوں نہیں کرتے؟ چلو ماں باپ تو ٹھیک ہے‘ بھائی بھابھی اور ان کے بچوں کا خرچا بھی تم کیوں اٹھاؤ؟ کیا ان کو احساس نہیں ہوتا کہ تم ایک انسان ہو اور دو دو نوکریاں کر کے گزارا کرتی ہو؟“ غصے اور بے بسی کی حدت سے ان کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ تالیہ اداس ہوئی۔ ”ابو بیمار رہتے ہیں‘ بھائی کی نوکری سے گزارا نہیں ہوتا۔ بھابھی کے بچے ہیں وہ کام نہیں کر سکتیں... اور وہ سب کوشش تو کرتے ہیں نا۔ پھر ان کا کیا قصور؟ اگر میں ذرا پڑھ لکھ جاتی تو کوئی نوکری کر لیتی اچھی سی‘ لیکن خیر...“ وہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ”میرے کون سے خرچے ہیں یہاں۔ نہ پڑھائی وغیرہ کرنی ہوتی ہے‘ نہ بیمار پڑتی ہوں۔ اوپر سے ہوں بھی ال لیگل۔“

کھٹاک سے ڈوئی بوڑھے شیف نے اس کے کندھے پہ دے ماری۔ وہ بلبلا اٹھی۔ ”کیا ہے؟“ روٹھے پن سے چیخی تھی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے‘ اس بات کا اعلان نہ کیا کرو۔ پولیس نے پکڑ لیا نا تو بری پھنسو گی۔“

”ہاں تو آپ کے سامنے ہی کہہ رہی ہوں کون سا کسی اور کو بتا رہی ہوں۔“ وہ کندھا سہلاتے ہوئے خفگی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ ”اب ال لیگل ہوں تو اس میں میرا کیا قصور؟ ٹریول ایجنسی نے دھوکا دیا تھا۔ مجھے تو یہاں آکر علم ہوا۔ میرے تو پیپرز بھی انہوں نے رکھ لیے۔ خیر وہ تو انہوں نے دوسرے نام سے بنوائے تھے۔ غلطی میری اتنی ہے کہ میں نے اسی وقت عقل سے کیوں نہیں کام لیا‘ مگر مجھے نوکری چاہیے تھی نا!“

کندھا سہلاتا اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اداسی سے پلکیں جھک گئیں۔ "اب اگر تنخواہ بھیج دیتی ہوں پاکستان تو کیا برا کرتی ہوں۔ ایک بھائی ہی تو ہے کمانے والا۔ اب فوج کی نوکری میں کہاں گزارا ہوتا ہے پانچ لوگوں کا؟" اس نے سر جھٹک کر پانی کی بوتل نکالی اور بیٹھے بیٹھے منہ سے لگائی۔

معمر شیف نے پلٹ کے اسے دیکھا۔ "نرسنگ چھوڑ دی اس نے؟"

تالیہ نے پانی کا گھونٹ بوتل اوپر لے جا کر بھرا، پھر بوتل لبوں سے ہٹائی اور ڈھکن بند کرتے ہوئے ان کو دیکھ کر بولی۔

"کہاں؟ فوج میں میل نرس ہے نادہ۔ آپ کو تو میرے گھر والے اتنے برے لگتے ہیں کہ ان کی اچھی باتیں بھی بھلا دیتے ہیں آپ!" آخر میں نروٹھے پن سے بولی۔ شیف چند لمحے تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

"تمہارے کوئی خواب نہیں ہیں تالیہ؟" اس سوال پہ تالیہ جو گوتم بدھا کے انداز میں چوکڑی مارے کاؤنٹر پہ بیٹھی تھی، تھوڑی تلے انگلی رکھے اوپر دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ "میرے خواب؟"

"ہاں تالیہ۔۔۔ تمہارا سب سے بڑا خواب کیا ہے؟" ایک ویٹر واپس آگیا تھا اور گفتگو میں پرجوش شامل ہوا تھا۔

ویٹرز، شیف، سب رک کر اسے دیکھنے لگے، جو انگلی سے گال پہ دستک دیتی اوپر دیکھتی سوچ رہی تھی۔

پھر اس کی آنکھیں چمکیں، اس نے ان سب کو دیکھا اور چٹکی بجائی۔ "ہے نا۔"

"کیا؟" سب کام روکے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ تالیہ نے دانت سے نچلا لب دبائے بڑی بڑی سبز آنکھیں مسکرا کے جھپکیں۔ "میرا سب سے بڑا خواب یہ ہے کہ میں ایک سوپ کارٹ دھکیلتے ہوئے شہر کی مصروف ترین سڑک پہ سوپ بیچ سکوں۔ میرا اپنا ذاتی سوپ کارٹ ہو اور لوگ میری بہترین ریسپی والے سوپ کے دیوانے ہوں!"

کچن میں لمحے بھر کو سناٹا چھا گیا۔ شیف کا چہرہ سب سے زیادہ اترا تھا۔ ویٹرس تو جل بھن گئی۔

"ایک سوپ کی ریڑھی؟ بس تالیہ؟ بس؟" ایک نے پیر پٹخا۔

تالیہ ذرے ذرا خفیف ہوئی۔ "کچھ غلط کہا میں نے؟"

"لڑکی! تم نوجوان ہو، شکل کی بھی اچھی ہو، خود مختار ہو اور تمہارے خواب اتنے محدود ہیں؟ سوپ کی ریڑھی۔۔۔ اف تالیہ۔۔۔ اف۔۔۔" ویٹرس نے ٹرے اٹھائی اور پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

"ارے ارے۔۔۔ تمہیں معلوم بھی ہے ایک کارٹ کتنا مہنگا ملتا ہے، بات تو سنو۔" وہ پیچھے سے پکارنے لگی۔

"تالیہ! کیا تم دوسروں کی طرح اونچے اونچے خواب نہیں دیکھتیں؟" شیف نے دیگچہ ڈھکا اور اس کے سامنے آکر حوصلہ افزا انداز میں پوچھنے لگے۔ "کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تمہارا اونچا سا محل ہو جس میں تم ملکہ کی طرح رہو، تمہارے پاس دولت کا ڈھیر ہو، شہزادوں سا شوہر ہو، تمہیں کوئی کام نہ کرنا پڑے تو کر چاکر ہوں، تم جس شے کو ہاتھ لگاؤ وہ سونا بن جائے۔۔۔ تالیہ مراد کیا تم ایسے خواب نہیں دیکھتیں؟"

تالیہ نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دائیں بائیں نفی میں گردن ہلائی۔ "نہیں تو۔"

بوڑھے شیف کی ساری خوش اخلاقی ہوا ہو گئی۔ ماتھے کو چھوا، اسے غصے سے کوسا اور کام کی طرف پلٹ گئے۔

تالیہ کندھے اچکا کر پھر سے ہنس دی۔

"میں تو ایک عام سی لڑکی ہوں۔ نہ میری تعلیم ہے، نہ کوئی اعلا خاندان۔ مجھے خوابوں میں دلچسپی ہے نہ مردوں میں۔ بس تنگو کامل کے گھر سے ریسٹورنٹ اور ریسٹورنٹ سے ان کا گھر۔۔۔ میری زندگی جب ان ہی دونوں چکروں

میں کٹ جاتی ہے تو کیا کرنا ہے میں نے لمبے لمبے خواب دیکھ کر۔ اپنے لیے کماتی ہوں کھاتی ہوں اور گھر والوں کو کھلاتی ہوں۔ میں تو بہت خوش ہوں ایسے۔ میری زندگی میں کوئی مسئلہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

وہ بے فکری سے ہنس کر کہہ رہی تھی۔

شیفٹ مزید اسے کچھ سخت سست سناتے کہ ایک ویٹر تیزی سے اندر آیا۔

"تالیہ۔ تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"مجھ سے؟" تالیہ نے انگلی سینے پہ رکھ کے آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔

"ہاں۔ سوٹ وغیرہ پہن رکھا ہے۔ پوچھ رہا تھا تم تنگو کامل کی ملازمہ ہو نا؟"

"اوہ۔" تالیہ کی سبز آنکھیں چمکیں۔ "میں سمجھ گئی۔" وہ جلدی سے نیچے اتری جوتے پیروں میں گھسیٹے (ویٹرس نے ناک سکیڑ کے اس کی اس حرکت اور خالی سلیب کو دیکھا۔ صفائی تمیز آداب سب خاک میں مل جاتے تھے اس کی وجہ سے۔) اور باہر کو لپکی۔ کیپ سر سے اتار دی تھی سیاہ بال جو کندھوں تک آتے تھے اس وقت پونی میں بند تھے۔ وہ ہاتھوں سے سامنے کے بال درست کرتی آگے چلتی آئی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

کونے کی میز پر مولیا بے چین سا بیٹھا تھا۔ چینی نقوش کا حامل وہ درمیانے قد کا نوجوان تھا اور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پریشان لگتا تھا۔ دفعتاً" نظر اٹھائی تو دیکھا سامنے سے ایک ویٹرس چلتی آرہی ہے۔ حالم کی دی گئی تصویر میں اس کی شکل واضح نہ تھی مگر وہ پہچان گیا۔ البتہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ چہرے کو بھی سنجیدہ بنا لیا۔ وہ سامنے آگئی تو اس نے کرختی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھو! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھی۔ کہنیاں میز پہ رکھیں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرایا اور دلچسپی سے اس کو دیکھا۔ "بولیے۔"

مولیا قدرے رعب سے کھنکھارا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوا۔ "تم تنگو کامل کی ملازمہ ہو نا؟"

"یعنی کہ میرا اندازہ درست تھا۔" وہ ہلکا سا ہنس دی۔ "آپ تنگو احمد کامل (تنگو کامل کے بیٹے کا نام) کی سالگرہ کی تقریب میں تھے شاید اور میرا سوپ پیا تھا آپ نے اور اب آپ یقیناً" چاہتے ہوں گے کہ میں آپ کے لیے کام کروں مگر میں....."

"تم ملائیشیا میں ال لیگل ہو ہے نا؟" وہ سختی سے بولا تو وہ ٹھہر گئی۔ مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ سبز آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"آپ کو کیسے۔۔۔"

"دیکھو' میں لمبی بات نہیں کرنے آیا' لیکن اگر ابھی میں جا کر پولیس کو اطلاع کر دوں کہ تم یہاں ال لیگل ہو تو یہ سوپ پارلر کا مالک تو چھوڑو' تنگو کامل بھی مشکل میں پھنس جائے گا۔"

تالیہ کے ہونٹ کھل گئے۔ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ پھر آنکھوں میں افسوس ابھرا۔

"آپ ایسا کیوں کریں گے؟ میرے ساتھ ٹریول ایجنسی نے دھوکا کیا تھا اور پھر میں نے اپلائی کر رکھا ہے قانونی۔۔۔"

"تم جانتی ہو' میں تمہیں ابھی کے ابھی جیل میں ڈلوا سکتا ہوں۔" وہ آگے کو جھکا اور اس کو گھورتے ہوئے غرایا۔ وہ ہلکا سا چونکی۔

"آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

مولیا نے گہری سانس لی اور فائل کھولی۔ پہلے صفحے پہ تالیہ کی پروفائل (رپورٹ) رکھی تھی۔ تالیہ نے سر جھکا کے دیکھا تو آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔ بے یقینی سے پلکیں اٹھائیں۔ "میرے بارے میں آپ کو اتنا کچھ۔۔۔؟" اب کے وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی۔ چوکنی سی۔۔۔ قدرے پیچھے بھی ہوئی۔ "کون ہیں آپ؟"

مولیا نے اگلا صفحہ پلٹا اور ایک تصویر نکال کے اس کے سامنے رکھی۔ "یہ تمہارے گھر والوں کی تصویر ہے نا' کشمیر میں رہتے ہیں وہ۔ جانتی ہو میں ان کے بارے میں کیسے جانتا ہوں؟ کیونکہ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

اس کی طرف جھکے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا چبا چبا کے کہہ رہا تھا۔ تالیہ کی رنگت زرد پڑنے لگی۔۔۔ وہ مزید پیچھے ہوئی پھر گردن گھما کے دیکھا۔ ارد گرد لوگ کھانے پینے اور باتوں میں مصروف تھے۔ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ خوف زدہ لڑکی نے پھر سے مولیا کو دیکھا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارے اوپر قرضہ بھی ہے۔ بھائی کی شادی کے لیے لیا تھا نا؟ وہ کیسے اتارو گی؟ کبھی سوچا؟"

"آپ کو مجھ سے کیا چاہیے۔" وہ بہت بے چین نظر آ رہی تھی۔

"دیکھو تالیہ۔۔۔" مولیا نے آواز دھیمی کی۔ لہجہ نرم کیا۔ لمحے کے لیے بھی وہ لڑکی کے چہرے پر سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ "اگر تم چاہو تو میں تمہارا قرضہ بھی اتار سکتا ہوں' مزید رقم بھی دے سکتا ہوں اور تمہاری فیملی کو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ بات نہیں مانو گی تو تمہارے ماں باپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور تم ال لیگل ہونے اور جیل چلے جانے کے باعث ان کی مدد بھی نہیں کر پاؤ گی۔ اب بتاؤ' میری مدد کرو گی؟"

"کیسی مدد؟" وہ الجھی۔۔۔ رنگت قدرے بحال ہوئی۔

"تمہارے مالک تنگو کامل نے میرا لیپ ٹاپ چرایا ہے اور مجھے وہ واپس چاہیے۔۔۔ یہ اس کی تصویر ہے۔" اس نے کھلی فائل سے ایک اور کاغذ نکال کر سامنے رکھا تو نیچے رکھے ایک کاغذ کا کونا باہر کو سرک آیا۔ تالیہ نے گردن ٹیڑھی کر کے پڑھا۔ نچلے کاغذ کو جس پہ ایک ہی فقرہ کسی نے بار بار پین سے لکھا ہوا تھا۔

"حالم کے اپل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے اور میں آنند ہے۔۔۔" مولیا نے ایک دم ہڑبڑا کے کاغذ اندر ڈالا۔ تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔ "آپ نے کسی حالم نامی اسکام انویسٹی گیٹر کو ہائر کیا ہے میری چھان بین کے لیے؟" آواز میں ہلکا سا غصہ در آیا۔

"میری بات دھیان سے سنو۔" اس نے دوسرا کاغذ سامنے کر کے فائل بند کر دی۔ (سوال نظر انداز کر گیا۔)

"یہ اس لیپ ٹاپ کی تصویر ہے اور یہ تنگو کامل کے گھر میں موجود ہے۔ میرا لیپ ٹاپ چرایا ہے انہوں نے۔ تم مجھے یہ واپس لا کر دو گی اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم جانتی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔"

"آپ چاہتے ہیں، میں چوری کروں؟" وہ الجھن سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ جو انہوں نے چوری کیا میرا اس کو واپس چوری کرو۔ میں تمہیں ایک خطیر رقم دوں گا اور نیشنلٹی لینے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔"

"میں اپنے مالک کے گھر چوری کروں؟ اپنے مالک کے گھر؟" اس نے انگلی سینے پہ رکھ کے افسوس سے پوچھا۔

مولیا نے بے صبری سے جھٹ سر ہلایا۔ "ہاں۔"

تالیہ نے تاسف بھری سانس کھینچی اور سر جھٹکا۔ "پھر آپ ایسا کریں، پولیس کو بتادیں جو بھی بتانا ہے کیونکہ تالیہ ایسی نہیں ہے۔ مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہئیں۔ میں اپنے مالک کو دھوکا نہیں دوں گی۔" وہ سادگی سے کہہ کر کھڑی ہو گئی۔ مولیا بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

"سب یہی کہتے ہیں کہ ہمیں پیسے نہیں چاہئیں اس سے پہلے کہ انہیں چند صفر بڑھا کے رقم دی جائے۔ یہ میرا نمبر رکھ لو۔ تمہارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ ذہن بدلے تو مجھے کال کرنا، لیکن اگر پولیس یا تنکو کامل کے پاس جانے کی کوشش کی تو یاد رکھنا۔" اس نے اپنا موبائل لہرا کے دکھایا۔ "میں نے تمہاری گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔ جس میں تم نے ال لہ کل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر مجھے میرا لیپ ٹاپ نہ ملا تو میں اس گفتگو کو کیسے استعمال کر سکتا ہوں، تمہاری سوچ ہے۔ ایک گھنٹہ۔"

ایک کاغذ کی چٹ اس کی طرف بڑھائی۔ جب وہ نہیں ہلی تو مولیا نے اسے زبردستی اس کے ایپرن کی جیب میں ڈال دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ وہ باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد وہ کچن سے تیز تیز اپنی چیزیں سمیٹتی دکھائی دے رہی تھی۔ ارد گرد کھڑے شیف اور ویٹرز بار بار پوچھ رہے تھے۔ "تالیہ کیا ہوا ہے... کیوں جا رہی ہو؟" مگر وہ بار بار آنسو رگڑتی سر نفی میں ہلائے جا رہی تھی۔ ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مولیا نے دروازہ زور سے بند کیا اور چند لمحے کھڑکی سے باہر سڑک پہ بہتا رش دیکھتا رہا۔ بے فکر سیاح گھوم رہے تھے۔ کھانوں کی خوشبو۔ بازار کا رش۔ وہ مضطرب سا سب کو بے دھیانی سے دیکھتا رہا، پھر فون نکال کے کال ملائی۔

"بولو!" حالم کی کھردری، خشک آواز سنائی دی۔

"میں نے ان تمام ملازموں میں سے تالیہ کو چنا۔ تالیہ مراد کو۔"

"گڈ۔ میں ذرا مصروف ہوں تو..."

"وہ اچھی لڑکی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ اسے اتنا ہراساں کیا۔ وہ سچی اور ایمان دار ہے۔ وہ کبھی چوری نہیں کرے گی۔ اس نے انکار کر دیا ہے حالم!" وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"رقم بڑھا دو۔" وہاں بے نیازی تھی۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا؟ وہ ایک ایمان دار اور سچی لڑکی ہے۔ سادہ اور معصوم!"

"یہ سب اندر سے ایک سی ہوتی ہیں۔ یہاں کوئی سچا یا ایمان دار نہیں ہے مولیا۔ پیسے بڑھا دو، وہ فوراً" مان جائے گی۔" حالم کو جیسے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ مولیا کے لبوں پہ زخمی مسکراہٹ ابھری۔

"یہ تمہارا تجربہ بول رہا ہے کیا؟ کسی لڑکی نے دھوکا دیا ہے تمہیں کیوں لگتا ہے۔"

جواب میں چند لمحے خاموشی چھا گئی۔ گہری خاموشی۔ پھر حالم کا زوردار قہقہہ گونجا۔ مولیا نے گڑبڑا کے فون کان سے ذرا دور کیا۔

"ارے مولیا۔ تمہارا مینٹل کیلبر میرے پاؤں سے بھی نیچے ہے۔ میرے بارے میں اندازے نہ لگاؤ، اپنا

لیپ ٹاپ ڈھونڈو۔"
پھر سے ہنسنے کی آواز آئی اور اس نے فون بند کردیا۔ مولیا بدمزگی سے کچھ بڑبڑایا تھا۔

☆ ☆ ☆

تنگو کامل کا گھر تین منزلہ تھا۔ خوب صورت اور پرتعیش۔ تالیہ نے دروازہ کھولا تو سنہری وال پیپر سے سجی لابی دکھائی دی۔ جس سے سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ ایک طرف لاؤنج میں کھلتا دروازہ تھا۔ سامنے ایک باوردی ملازم کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کے حیرت سے قریب آیا۔

"تالیہ۔۔۔ تمہارے ڈیوٹی آورز تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئے پھر۔۔۔؟"

"سر گھر پہ ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ ابھی۔"

وہ بے چینی سے بولتی آگے آئی تھی۔ ملے طرز کی سیدھی لمبی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے' وہ ریستوران سے مختلف لباس میں تھی۔ بال ہمیشہ بینڈ لگا کے کھول رکھے تھے جو سیاہ تھے اور کندھوں تک آتے تھے۔ سبز آنکھوں میں پریشانی تھی۔

"تالیہ' سر اسٹڈی میں ہیں۔ تمہیں اگر تنخواہ وغیرہ چاہیے تو میم سے بات کرو' مگر وہ بھی کل صبح۔۔۔"

"پلیز مجھے ابھی سر سے ملنا ہے۔ صرف پانچ منٹ کے لیے۔" وہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھی اور سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ملازم آوازیں دیتا رہ گیا اور وہ یہ جا وہ جا' اوپر بھاگ گئی۔

اوپر بھی اسی طرح کی لابی بنی تھی۔ سامنے کھلا سا لاؤنج تھا۔ ایک طرف اسٹڈی کا بند دروازہ۔ تالیہ نے جلدی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور دھکیلا۔

اسٹڈی روم میں میز کے پیچھے کرسی پہ ایک ادھیڑ عمر چینی نقوش والے صاحب بیٹھے سامنے کھڑے نوجوان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ آہٹ پہ دونوں نے مڑ کے دیکھا۔ تالیہ نے خفت اور پریشانی سے سر دروازے سے نکال کے ان کو دیکھا۔

"سر! میں آجاؤں؟"

وہ نوجوان جو تنگو کامل کا پرسنل سیکریٹری تھا' منہ بنا کے منع کرنے والا تھا' مگر تنگو کامل نے تکلفاً" مسکرا کے اسے اشارہ کیا۔

"آجاؤ تالیہ۔" سیکریٹری چپ ہوگیا۔ تالیہ جھجکتی' نظریں جھکائے اندر داخل ہوئی۔ ان کے عین سامنے آکر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔

"سر! مجھے بات کرنا تھی۔" وہ مسلسل انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"ہاں بولو' مگر ذرا جلدی۔" انہوں نے کہنے کے ساتھ گھڑی دیکھی۔

"سر۔ میرے ریسٹورنٹ۔۔۔ ایک آدمی آیا آج۔ اس نے مجھے کہا کہ میں آپ کے گھر چوری کروں۔" وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بتاتی گئی۔ تنگو کامل چونک کے آگے ہوئے۔ سیکریٹری کا بھی منہ کھل گیا۔ جب تک اس نے بات مکمل کی' وہ دونوں ہر شے بھول چکے تھے۔

"اس نے بتایا وہ کون تھا؟"

"کس کے لیے کام کرتا تھا؟"

"نام کیا تھا؟" تابڑتوڑ سوالات کی تیز بوچھاڑ سے لڑکی قدرے ہراساں نظر آنے لگی۔ پھر بظاہر ہمت کرکے گردن اکڑائی۔ "نام نہیں بتایا اس نے سر' لیکن اتنا ضرور کہا کہ اس کا لیپ ٹاپ آپ کی اسٹڈی میں ہے' لیکن مجھے

معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ کسی کا لیپ ٹاپ چوری نہیں کر سکتے۔ ہے نا؟" تائیدی نظروں سے اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ سیکریٹری نے فوراً" مالک کو دیکھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ ہم کیوں چرائیں گے؟ بلکہ ہو سکتا ہے وہ تمہارے ہاتھوں میرا کمپیوٹر چوری کروانا چاہتا ہو۔"

تنگو کامل تالیہ کو دیکھ کر پورے وثوق سے بولے تو اس نے تسلی بھری سانس خارج کی۔

"نہیں سر! اس نے مجھے لیپ ٹاپ کی تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ وہ آپ کے جیسا نہیں تھا۔ سفید سا تھا۔ اس نے بولا یہیں ہے وہ۔" تالیہ نے ایک طائرانہ نگاہ اطراف پہ ڈالی۔

"تم نے بہت اچھا کیا تالیہ! جو مجھے آگاہ کر دیا۔" وہ توصیفی انداز میں اسے دیکھ کے بولے تھے۔ وہ مسکرا دی۔ سیکریٹری تیزی سے بک شیلف کی طرف گیا اور باری باری دراز کھولنے لگا' کتابیں ادھر ادھر پلٹائیں۔

"ہو سکتا ہے' کسی نے ہمارے اوپر لیپ ٹاپ پلانٹ کیا ہو' ہمیں اسے فوراً" ڈھونڈنا ہو گا۔"

"تنگو کامل سوچتے ہوئے بولے تھے۔ سیکریٹری نے سر ہلا دیا۔ وہ جلدی جلدی چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ دفعتاً" انہیں تالیہ کا خیال آیا۔

"تم پیسے لے سکتی تھیں' مگر تم نے مجھے کیوں بتایا؟" اس نے پلکیں اٹھائیں۔

"سر! اگر انسان میں وفاداری' سچائی اور ایمان ہی نہ ہو تو وہ کیسا انسان ہوا؟ باقی ساری خوبیاں اور ڈگریاں سب کے پاس ہوتی ہیں۔ مگر سچائی سیکھی نہیں جاتی۔ یہ تو انسان کی گھٹی میں ہوتی ہے۔"

دراز کھولتے' بند کرتے سیکریٹری نے پلٹ کے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور اونچا سا بولا۔ "سر! یہ اس کا فرض تھا کہ آپ کو رپورٹ کرتی۔ اگر محترمہ چوری کرتیں تو ظاہر ہے' ہمیں پتا چل جاتا' اور اس آدمی کی بھی گارنٹی نہیں تھی کہ پیسے دے گا یا نہیں۔" آواز میں جلن تھی۔ تالیہ کا چہرہ بجھ گیا' البتہ تنگو کامل نے ایک ناپسندیدہ نظر سیکریٹری پہ ڈالی۔

"اگر جھوٹ بولنا دس کریڈٹ ہے تو سچ بولنے کا کریڈٹ دینے کی بھی عادت ڈالنی چاہیے' منگ۔"

"سر!" وہ ایک دم بولی تو وہ' جو اسے جھڑک رہے تھے' تالیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ "کیا؟" نرمی سے پوچھا۔

"مجھے یاد آیا' اس کے پاس ایک کاغذ پہ کسی فراڈ انویسٹی گیٹر کا نام لکھا تھا۔" تالیہ نے آنکھیں بند کر کے یاد کیا۔ "حالم۔۔۔ یہی نام تھا اس کا۔" اس نے اب کے جوش سے تنگو کامل کو دیکھا۔ "اس نے میری معلومات اسی انویسٹی گیٹر سے لی تھیں۔"

"حالم؟ ہوں۔" انہوں نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ سیکریٹری منگ ہاتھ جھاڑتے ہوئے واپس آیا۔ "نہیں ملا سر۔ کچھ بھی نہیں ہے یہاں۔"

"تو اس حالم نے کیوں کہا اس آدمی کو کہ اس کا لیپ ٹاپ یہیں ہے؟ اسی نے بتایا ہو گا۔ یقیناً"۔" وہ متفکر نظر آ رہے تھے۔

"میں نے حالم کا نام پہلی دفعہ سنا ہے' لیکن میں اس کی تحقیق ضرور کروں گا۔" منگ پورے عزم سے کہہ رہا تھا۔

ایک دم تنگو کامل نیچے جھکے اور کچھ کھولنے لگے۔ آواز سے یوں لگتا تھا کہ جیسے اسٹڈی ٹیبل کے نچلے خانے میں رکھا کوئی سیف کھول رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سیف سے چیزیں نکال نکال کر اوپر رکھنی شروع کیں۔ گن۔۔۔ کاغذات۔۔۔ جیولری کے بند ڈبے۔

سیکریٹری نے تالیہ کو فوراً" رعب سے کہا۔ "تم اب جاؤ۔"

یہ سوچ کیا۔ جب مڑنے لگی تو تینگو کامل نے چند مزید چیزیں میز پر رکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "تم رکو تالیہ۔" وہ اپنا سیف خالی کر رہے تھے۔ وہ دونوں سیف کو تو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ان چیزوں کو دیکھ سکتے تھے جو وہ میز پہ ڈھیر کر رہے تھے۔ زیورات کے ڈبے۔ فائلز۔ چند چیک بکس۔ اور ایک شیشے کا ڈبہ۔ جو گھڑی کے باکس کے جیسا تھا اور اس میں ایک سنہری سکہ چمک رہا تھا۔ پھر انہوں نے وہ چیزیں واپس ڈالنی شروع کیں۔ سیف بند کرنے کی آواز آئی۔ وہ سیدھے ہونے لگے 'پھر جیسے کوئی خیال آیا اور اسٹڈی ٹیبل کا اوپری دراز کھولا۔ اندر سامنے ایک سفید لیپ ٹاپ رکھا تھا۔

تالیہ کا منہ کھل گیا۔ "یہ یہاں۔۔۔ واقعی۔۔۔؟"

"یہ ہم نے نہیں چوری کیا۔ یقین رکھو۔" انہوں نے گہری سانس لے کر اسے تسلی کروائی۔ اور لیپ ٹاپ سیکریٹری کی طرف بڑھایا۔

"یہ کسی نے ہمیں پھنسانے کے لیے یہاں رکھا ہے۔ دیکھو اوپر ان کی کمپنی کا لوگو بھی بنا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ کس کا ہے۔" تینگو کامل اور سیکریٹری نے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔

"سر۔ ہمیں پولیس کو کال کرنی چاہیے۔ میں مسز کامل سے کہتی ہوں۔" وہ جذباتی سی ہو کر دروازے کی طرف لپکی۔

"رکو رکو۔ کیا کر رہی ہو۔ تالیہ۔ اوہو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو وہ الجھن سے واپس مڑی۔

"پولیس کو نہ بلائیں؟"

"نہیں، پہلے ہمیں دیکھنا ہو گا کہ اس میں ہے کیا۔"

"لیکن سر! جب یہ ہماری چیز ہی نہیں ہے تو ہم کیوں دیکھیں اسے؟"

"بھئی 'اصل مالک کا معلوم کرنے کے لیے دیکھنا تو ہو گا نا۔" انہوں نے جلدی سے اسے تسلی کروائی پھر سیکریٹری کو اشارہ کیا تو وہ لیپ ٹاپ لے کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ تالیہ گومگو سی کیفیت میں کھڑی رہی۔

"تم نیچے جاؤ اور میرے لیے اچھا سا سوپ بنا کر لاؤ' پھر میں بتاتا ہوں کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔" تالیہ نے بجھے چہرے کے ساتھ سر ہلا دیا اور باہر نکل گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سوپ کی ٹرے لیے اسٹڈی میں داخل ہوئی تو وہ دونوں تیار سے بیٹھے تھے۔ لیپ ٹاپ شاپنگ بیگ میں ڈال رکھا تھا۔ تالیہ نے ادب سے سوپ ان کے سامنے سجایا۔

"تم نے کہا اس نے تمہیں اپنا نمبر دیا تھا' ہے نا؟"

"جی سر۔ میرے ایپرن میں رکھا ہے۔"

"تم اس کو کال کر کے سوپ پارلر بلاؤ اور یہ اس کو دے دو۔ ہم نے چیک کر لیا ہے' یہ اسی کا ہو گا۔ کسی سازش کے تحت کسی نے اسے ہم پہ پلانٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پولیس ہماری بات مانے گی نہیں۔ اس لیے چپ چاپ اسے واپس کر دو۔"

تالیہ نے غیر مطمئن سی ہو کر ان دونوں کو دیکھا۔ "مگر سر۔۔۔ یہ یہاں آیا کیسے۔۔۔؟ اور میں کس طرح؟۔۔۔ وہ تو سمجھے گا۔ میں نے چوری کی ہے۔"

"تو سمجھنے دو نا۔ اور وہ جو پیسے دے وہ رکھ لینا۔ تمہارے کام آئیں گے۔"

"میں پیسے نہیں رکھوں گی۔" وہ بدک گئی۔

"رکھ لینا تالیہ! ورنہ وہ سمجھے گا کہ تمہیں ہم نے بھیجا ہے۔ اس کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس میں انوالوڈ ہیں۔ ٹھیک ہے؟" سیکریٹری اب خوشامدی انداز میں سمجھا رہا تھا۔ تالیہ کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

"میں اس کو چور لگوں گی' سر۔ تالیہ چور نہیں ہے۔"

''ہم جانتے ہیں یہ بات تالیہ۔ اور ہم تمہیں اس کام کی اجازت دے رہے ہیں۔ اس لیے دل سے کسی بھی گلٹ کو نکال کر یہ اسے واپس کر دو۔ یہ تمہارے مالک کا حکم ہے۔ ٹھیک ہے؟''

تالیہ نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور سر اثبات میں ہلایا۔

''اور یہ تمہارا انعام ہے۔'' انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھائی۔ جسے سیکریٹری منگ نے ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ تالیہ نے جیسے بے دلی سے وہ نوٹ اٹھائے تھے۔

جب وہ لیپ ٹاپ لے کر باہر نکلی تو پیچھے سے تنکو کاظ نے سیکریٹری کو سنجیدگی سے مخاطب کر کے کہا۔ ''اس بے وقوف پہ نظر رکھنا۔ کہیں اس کو سچ نہ بتا دے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن اگر آپ مجھے وقت دیتے تو میں اس لیپ ٹاپ کو Keylog بھی کروا دیتا۔ یہ ہمارے حریف کا لیپ ٹاپ ہے۔ وہ جو بھی کام اس پہ کرتا ہم اس کو دیکھ سکتے اور...''

''فائلز کا پی کر لیں ہم نے' یہی بہت ہے۔ اور ہاں پتا لگاؤ یہ یہاں آیا کیسے؟'' ان دونوں کی آوازیں مدھم سرگوشیوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

''مگر سر! انعام کے طور پر تالیہ کو اتنی خطیر رقم دینا غلط نہیں ہو گا؟'' وہ ذرا جذباتی ہو کے بولا۔

''زیادہ بک بک نہ کرو۔ جو چیزیں اس کے توسط سے ملی ہیں ہمیں' ان کی قیمت لاکھوں کروڑوں میں ہے۔'' وہ اسے ڈپٹ رہے تھے۔

اور تالیہ سر جھکائے' لیپ ٹاپ سینے سے لگائے سیڑھیاں اتر رہی تھی ایسے کہ۔ اسے بار بار گالوں پہ آئی نمی کو رگڑنا پڑ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سوپ پارلر میں معمول کا رش تھا۔ مغرب اتر چکی تھی' باہر برآمدے میں لگی کرسیوں پہ بھی مہمان بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ سارے بازار میں رونق میلہ سا لگا تھا۔ ایسے میں سڑک کنارے ایک میز پہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی' اور گود میں شاپنگ بیگ میں رکھا لیپ ٹاپ پڑا تھا۔ دفعتاً'' دوڑتے قدموں کی آواز آئی' پھر سامنے والی کرسی کھینچ کے کوئی بیٹھا۔ تالیہ نے گلابی متورم آنکھیں اٹھائیں۔ وہ خوشی سے تمتماتے چہرے والا مولیا تھا۔

''مجھے پتا تھا... مجھے پتا تھا تم اچھی لڑکی ہو' میرا کام کر دو گی۔ لیپ ٹاپ لائی ہو؟'' اس کی آنکھوں میں ڈر' خوف اور فتح کے ملے جلے تاثرات تھے۔ تالیہ نے اثبات میں سر اوپر نیچے ہلایا۔

''او کے... مگر ہاں... پہلے تمہارے پیسے۔'' اس نے جلدی سے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا۔ ''گن لو۔''

تالیہ نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی' پھر لفافہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور لیپ ٹاپ میز پہ۔ مولیا نے بے قراری سے لیپ ٹاپ اٹھایا اور کھول کے دیکھا۔ سکون سا اس کے چہرے پہ پھیلنے لگا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک۔ تھینک یو تالیہ۔''

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ دور کھڑی کار میں سے ان پہ نظر رکھتے سیکریٹری منگ نے بھی تشفی بھرا ایک میسج اپنے باس کو لکھا۔

''بے فکر رہیں۔ تالیہ نے اسے کچھ نہیں بتایا۔''

''سوری تالیہ... میں نے تمہیں اتنا پریشان کیا۔'' پریشانی کی دھند چھٹی تو مولیا نے افسوس سے کہنا چاہا۔ مگر تالیہ مراد نے ہاتھ جھلا کے اسے جانے کا اشارہ کیا' اور خود بیگ میں رقم ڈالتی' چہرے پہ ناگواری' بے بسی اور غصہ

لیے سوپ پارلر کی طرف بڑھ گئی۔
"خیر۔" مولیا نے لیپ ٹاپ اٹھاتے ہوئے پیچھے سے بلند آواز سے کہا۔ "میرے دوست نے ٹھیک کہا تھا، رقم بڑھا دو تو تم سب ایک سی ہوتی ہو۔ یہاں کوئی سچا اور ایمان دار نہیں ہے۔"
وہ آگے بڑھتے بڑھتے رکی اور پلٹ کے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا، لیکن لب سختی سے بند رکھے اور پھر مڑ گئی۔

رات پھیل رہی تھی۔ مولیا کا دن کامیابی لے آیا تھا۔ سیکریٹری منگ نے کار آگے بڑھا دی اور مولیا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ان دونوں کو اور ان کے باس کو مطلوبہ چیز مل گئی تھی اور وہ سب مطمئن تھے۔

ایسے میں تالیہ مراد سوپ پارلر میں آئی، اپنا استعفیٰ لکھ کر کاؤنٹر پر جمع کرایا، اور اسی خاموشی سے وہاں سے نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کو روک کے وجہ پوچھ لے۔
بیگ میں دو مختلف نوٹوں کی گڈیاں اٹھائے وہ بس اسٹاپ تک آگئی۔ قریباً" آدھے گھنٹے بعد بس اس کو کے ایل کے مختلف مقامات، سڑکوں اور گلیوں سے گزارتی ایک شاہانہ طرز کے علاقے میں لے آئی۔ وہ اسٹاپ سے اتری، اور بیگ سنبھالتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ایک کالونی میں آگے بڑھتی گئی۔
چند منٹ کی واک کے بعد وہ وہ ایک گیٹ کے سامنے رکی۔ گیٹ کھلا تھا۔ تالیہ نے اندر قدم رکھا۔ سامنے رات کی تاریکی میں لیمپ پوسٹس سے جگمگاتا لان دکھائی دے رہا تھا۔ خوب صورت نفیس، تراشیدہ سا لان اور اس کے اختتام پہ اونچا سا کھڑا بنگلہ۔ وہ بیگ کندھے پہ ڈالے آگے چلتی آئی، چلتی آئی...... یہاں تک کہ برآمدے کی سیڑھیاں عبور کر کے اونچے داخلی دروازے تک جا رکی۔ پھر بیل بجائی اور بند مٹھی سے دھپ دھپ دستک دی۔
بھاری قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ تالیہ نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے بھاری بھرکم جثے والی سیاہ رنگت کی عورت کھڑی تھی۔ عمر کافی زیادہ تھی۔
پچاس پچپن کے لگ بھگ۔ بال موٹی موٹی گھنگریالی لٹوں کی صورت کندھوں تک آتے تھے، اور اس نے کھلے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چوکھٹ پہ بازو جمائے اس نے خشمگیں نگاہوں سے سامنے کھڑے ویٹرس کے یونیفارم والی لڑکی کو دیکھا اور استفہامیہ ابرو اٹھائی۔ "ہوں؟"
تالیہ نے نظریں جھکا دیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
"آج تالیہ نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اپنا وقار، اپنا ایمان، اپنی سچائی، اپنی عزت... میں نے ہر شے کو بیچ ڈالا۔ میں نے..... تالیہ مراد نے اپنے ضمیر کا سودا کر لیا۔"
سیاہ موٹی عورت نے سر سے پیر تک اسے دیکھا اور بنا کوئی اثر لیے سنجیدگی سے بولی۔ "کتنے میں؟"
تالیہ کی پلکیں ہنوز جھکی تھیں۔ اس سوال پہ چند لمحے وہ نہیں ہلی، پھر ایک دم پلکیں اٹھائیں تو ان میں آنسو غائب تھے اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
"سات لاکھ میں۔" وہ چہکی اور دونوں ایک دم ہنس پڑیں۔
"اب سامنے کھڑی رہو گی یا مجھے میرے گھر میں داخل بھی ہونے دو گی؟" وہ ایک دم مصنوعی خفگی سے بولی تو فربہ عورت مسکرا کے سامنے سے ہٹی اور ہاتھ پھیلا کے اشارہ کیا۔

"ویلکم ہوم، تالیہ۔ یا شاید مجھے کہنا چاہیے..... ویلکم ہوم، حالم!" تالیہ نے مسکرا کے بیگ اس کے بازوؤں میں تقریباً" پھینکا اور مالکیت بھری شان سے اندر داخل ہو گئی۔

اندر خوب صورت سا لاؤنج تھا جس کے آگے اوپن کچن تھا۔ وہ پھولوں، پینٹنگز اور اونچے وال مورالز سے سجا ایک اعلا درجے کا گھر لگتا تھا۔

"کیسا رہا Scam (فراڈ؟) بےبی گرل؟" سیاہ فام عورت بیگ اٹھائے اس کے پیچھے آئی تو وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑی ایڑیوں پہ چاروں طرف گھومتی، مسکرا مسکرا کے اپنا گھر دیکھ رہی تھی۔ اس سوال پہ مڑ کے اسے دیکھا اور کھلکھلا کے ہنس دی۔

"پرفیکٹ۔ تین تین دفعہ پے منٹ وصول کی ہے۔ ایک دفعہ اس بے وقوف مولیا سے حالم بن کے۔ ایک دفعہ تالیہ بن کے۔ اور ایک دفعہ اپنے کھڑوس باس سے ایمان داری کے انعام کے طور پہ۔ لیکن میں بتا رہی ہوں، آج کے بعد میں نے اس مولیا کے ساتھ کام نہیں کرنا۔" وہ حتمی لہجے میں کہتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ آنکھوں میں جیسے کچھ یاد آنے پہ غصہ در آیا۔

عورت نے کمر پہ ہاتھ رکھ لیے اور آنکھوں میں حیرت لیے اسے دیکھا۔

"مولیا تو اتنا اچھا کلائنٹ ہے۔ اس کو تین دفعہ لوٹ چکے ہیں ہم۔ بے چارہ سب کی طرح تمہیں یعنی حالم کو انویسٹی گیٹر سمجھتا ہے۔ حالانکہ ہم کے ایل کے سب سے بڑے Scam Artists Scam (چور، فراڈ) ہیں۔"

"اور اسی لیے ہم ایسا کلائنٹ افورڈ نہیں کر سکتے جو میرا نام کاغذ پہ لکھ لکھ کے ہر جگہ گھومتا رہے۔ اف۔"

اس نے جھرجھری لے کر فریج کھولا اور ایک سیب نکالا پھر اس میں دانت گاڑتے ہوئے واپس مڑی۔ اب وہ سوپ پارلر والی سادہ لڑکی سے بہت مختلف نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں شاطرانہ سی چمک تھی، کندھے اعتماد سے سیدھے تھے اور پیشانی پہ نخرے کے بل پڑے تھے۔

"مذاق میں اس گدھے کو کہہ دیا میں نے کہ کاغذ پہ لکھے 'حالم کے ایل کا بہترین اسکام انویسٹی گیٹر ہے۔' وہ تو سچ مچ لکھ کر کاغذ ساتھ لیے گھوم رہا تھا۔ اس کو آج ہی کلائنٹ لسٹ سے خارج کرو۔"

"اوہ اچھا!" فریہ عورت نے گہری سانس لی۔ وہ ابھی تک کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ "مجھے لگا اسے ہماری اصلیت معلوم ہو گئی ہے۔"

"کیسے ہو سکتی ہے یار؟" وہ ہتھیلیوں کے بل کاؤنٹر ٹاپ پہ چڑھی اور پیر لٹکا کے بیٹھ گئی، پھر سیب میں دانت گاڑتے ہوئے بے نیازی سے مسکرا کے بولی۔ "ہم ڈارک انٹرنیٹ سے آپریٹ کرتے ہیں۔ ہماری لوکیشن کوئی نہیں جانتا۔ اور پھر سب سمجھتے ہیں کہ حالم ایک آدمی ہے کیونکہ میں ان کرپٹڈ فون سے کال کرتی ہوں، ہمیشہ 'مردانہ آواز میں۔ سب یہی جانتے ہیں کہ میں ایک اسکیم انویسٹی گیٹر ہوں اور ہمارا ہر کلائنٹ آگے یہی بتاتا ہے کہ میں ساتھ میں مغرور اور بدتمیز بھی ہوں۔" وہ سیب کھاتے ہوئے ہنس دی۔ "مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ نہ میں کوئی انویسٹی گیٹر ہوں نہ ہی کوئی مرد۔ میں اور تم..... ہم تو چور ہیں، چور۔ پہلے مسئلہ پیدا کرتے ہیں، پھر اسے حل کر کے پیسے لیتے ہیں۔ جیسے پہلے مولیا کے باس کا لیپ ٹاپ چرا کے تنکو کامل کے گھر رکھا، پھر تینوں جگہوں سے پیسے کمائے، ہاں لیکن اس طرح مولیا کسی مخالف کی تو کرائی کے سامنے حالم کے نام کا کاغذ رکھ دے، ہرگز نہیں۔ اس لیے آج سے مولیا کلائنٹ لسٹ سے آؤٹ ہو گیا۔"

فریہ عورت نے افسوس سے گہری سانس کھینچی۔ "ویسے تو میرا ذاتی خیال ہے کہ مولیا جیسے ناکارہ آدمی کو ہر اس درخت سے معافی مانگنی چاہیے جو اس کے لیے دن رات آکسیجن پیدا کر رہا ہے، لیکن اس کو کلائنٹ لسٹ سے خارج کر کے مجھے افسوس ہو گا۔ ایک کلائنٹ کم ہو گیا۔"

"اونہوں۔ ڈونٹ وری!" تالیہ نے ہاتھ جھلا کے بے فکری سے کہا۔ "میں نے تنکو کامل کے سامنے حالم کا نام لے لیا ہے۔ مستقبل میں ہم ان کے لیے ایسا مسئلہ کری ایٹ کریں گے جس کو حل کرنے کے لیے وہ لازماً حالم کے پاس آئیں گے۔ پتا ہے بہترین اسکام (فراڈ) کیا ہوتا ہے؟ جس میں ان مالدار لوگوں کو لگے کہ سب کچھ

انہوں نے خود اپنی مرضی سے کیا ہے' سارا آئیڈیا ان ہی کا تو تھا۔ جیسے آج تالیہ بیچاری کی تو مرضی ہی نہیں تھی، مگر دونوں اطراف نے اسے مجبور کر دیا اتنے سارے پیسے کمانے پہ۔"

وہ یاد کر کے پھر سے ہنسی اور سیب کو دوسری سمت سے دانت سے کاٹنے لگی۔ کاؤنٹر پہ وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھی بے فکر اور خوش باش نظر آتی تھی۔

"مسز پہ پارلر چھوڑ آئی ہو نا؟" موٹی عورت نے بیگ اٹھا کے میز پہ رکھا اور پھر سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ وہاں، کچھ چرایا جو نہیں تھا۔ اب تو اداکاری کر کے تنگ آ گئی ہوں۔ آج تو اپنے فرضی بھائی کو فوجی بنا دیا میں نے حالانکہ جو کہانی میں نے تالیہ کی لکھی تھی اس میں وہ نرس تھا۔ لیکن پتا ہے کیا۔۔۔" وہ چھت کو دیکھتے ہوئے اداسی سے مسکرائی۔

"اس کردار کا نام ان تین ماہ کے لیے میں نے تالیہ مراد ہی رکھ لیا تھا۔ اپنا اصل نام۔ اچھا لگتا تھا اپنے نام کے ساتھ ایماندار' سچی کے القابات سننا۔ مگر ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں ایک کرمنل' جھوٹی' چور اور دھوکے باز ہوں۔" اس نے نگاہیں نیچے کیں اور اپنی دوست کی موٹی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے خفگی سے بھنویں بھینچیں۔

"تم ناخوش ہو اس حال میں کیا تالیہ؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بے فکری سے ہنس دی اور شانے اچکائے۔ "ابھی تو ہم نے بہت سی چوریاں اور فراڈ ایک ساتھ کرنے ہیں۔ ابھی تو ہمیں بہت بہت امیر ہونا ہے۔ میں نے کسی جزیرے پہ ایک محل خریدنا ہے۔۔۔ جہاں میں ساری عمر عیش سے رہوں۔ ہماری ہر "جاب" ہمیں منزل سے قریب کرتی ہے۔ ہمارے خوابوں کی منزل سے۔ اور آج کی رات سیلیبریشن کی رات ہے۔ تم کھانا بناؤ میں فریش ہو کے آتی ہوں۔" سیب کا درمیانی حصہ بچا کے اس نے ٹوکری کی طرف اچھالا اور کاؤنٹر سے نیچے زمین پہ اتری۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا۔

"سی فوڈ کیوں نہیں بنا لیتیں تم آج؟ آخر اتنے دن تم نے میرے گھر کا خیال رکھا ہے' آج کیلوریز کی پرواہ کیے بغیر میں خوب کھانا چاہتی ہوں۔" وہ واقعتاً" خوش لگتی تھی۔

"اوہ تالیہ!" موٹی عورت نے افسوس سے اسے دیکھا اور دھپ سے صوفے پہ گر گئی۔ "کیا تم نے کبھی ان جانوروں' ان مچھلیوں اور ان جھینگوں کی تکلیف کا احساس کیا ہے جن کو تم جیسے انسان ان کے خاندانوں سے چھین کر' انہیں ذبح کر کے اپنے فریج میں چھپا لیتے ہو؟ کیا تم نے کبھی ان کے لاشوں کی کرب بھری پکار سنی ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کو جلد از جلد فنا کیا جائے؟"

"نہیں لیکن تم شاید پچھلے اتنے دن میرے گھر میں یہی کرتی رہی ہو' ہے نا؟"

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی' چہرے پہ غصہ در آیا۔ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی اور فریزر کا دروازہ کھولا۔ صاف ستھرا تقریباً" خالی فریزر۔۔۔

"اف!" وہ غصے اور درد سے چلاتی واپس مڑی۔ "تم میرا سارا راشن کھا گئیں؟"

موٹی عورت چہرے پہ سادگی سجائے ٹانگوں کی قینچی بنائے صوفے پہ بیٹھی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "گو کہ تمہاری یہ ناشکری میری طبیعت پہ گراں گزر رہی ہے لیکن میں تمہیں اس کے لیے معاف کر دوں گی۔ میں اس مرغی کی طرح ہوں جو ہمیشہ تمہارا خیال رکھے گی اور تمہیں تمام جانوروں کی بددعاؤں سے بچانے کے لیے اپنے پروں میں چھپا کے رکھے گی۔"

تالیہ نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ "اتنی کالی برائلر مرغی پہلی دفعہ دیکھی ہے میں نے۔ ہونہہ!" اور پیر پٹختی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"ناشکری لڑکی۔" وہ اس کے پیچھے تاسف بھری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

رات چند ساعتیں مزید آگے سرکی۔ تاریکی بڑھی۔ داغ دار چاند کے آگے سے سارے بادل چھٹ گئے اور وہ حالم کے گھر کی کھڑکیوں سے صاف نظر آنے لگا۔ اپنے سارے عیوب کالک اور چمک کے ساتھ۔ عیاں اور واضح۔

لونگ روم میں اب اشتہا انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ اوپن کچن جو سلور اور سیاہ رنگ میں آراستہ کیا گیا تھا' اس وقت کسی ریستوران کی طرح سجا نظر آتا تھا۔ مدھم زرد بتیاں جلی تھیں۔ میز پہ موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ فربہ عورت اپنے کھلے جھولے نما لباس کو سنبھالتی' کچن کے وسط میں رکھی مستطیل میز پہ برتن لگا رہی تھی۔ جس پہ مختلف رنگوں اور شکلوں کے پکوان چن دیے گئے تھے۔ اس کا نام لیا نہ تھا مگر تالیہ اس کو "داتن" (Datin) کہتی تھی۔ (ملائشیا میں اپنی دادی کو تعظیماً "داتن" کہہ کے مخاطب کرتے ہیں۔)

دفعتاً "سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی تو اس نے چمچ کانٹے سجاتے گردن اٹھا کے دیکھا۔

تالیہ سیڑھیاں اترتی چلی آ رہی تھی۔ کندھوں تک آتے سیاہ سیدھے بال گیلے تھے اور چہرہ دھلا دھلایا' نکھرا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سبز لینسز اتار کے پھینک دیے تھے تب ہی وہ سیاہ نظر آ رہی تھیں۔ وہ شب خوابی کے لباس کے طور پر پہنے جانے والی رف سی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی مگر ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کے' گردن اٹھائے' کندھے سیدھے رکھے' نیچے اترنے کا انداز شاہانہ تھا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر تالیہ مراد رکی۔ آنکھیں بند کیں اور چھوٹی سی ناک سے سانس اندر کھینچی۔ پھر آنکھیں کھول کے مسکرا دی۔

"میرا فیورٹ سی فوڈ اور سوشی!! ہے نا؟"

"ہاں۔ یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" داتن نے کسی شیف کی طرح سینے پہ ہاتھ رکھے' گردن جھکا کے کہا۔

تالیہ کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔ "واقعی؟"

"ظاہر ہے' نہیں۔ تمہارے پسندیدہ ریستوران سے آرڈر کیا ہے۔" داتن نے بھنویں اچکا کے شان بے نیازی سے کہا اور کرسی پہ بیٹھ گئی۔

تالیہ ہنس دی۔ "تم بھی نا۔" سر جھٹکتے ہوئے اس نے دوسری کرسی کھینچی۔ اب وہ دونوں مدھم روشنیوں میں... موم بتیوں سے سجی میز پہ آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

"اب تنگو کامل کے Scam (چکر) سے Exit (نکلنے کا) کا وقت آ گیا ہے تالیہ۔ آخری اسٹیپ کب لینا ہے؟" داتن نے کھانا نکالتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہر اچھے اسکام کا سب سے اچھا اصول یاد ہے' داتن؟ ہر اسٹیپ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ سامنے والے کو اپنا آئیڈیا معلوم ہو۔" وہ چاول پلیٹ میں نکالتے ہوئے سمجھ داری سے کہہ رہی تھی۔ گیلے بال چہرے کے دونوں اطراف سیدھے گر رہے تھے اور پانی کے چند قطرے گالوں پہ پڑے تھے۔ نظریں کھانے پہ جھکی تھیں۔

"اسٹیپ ون۔ مجھے لیپ ٹاپ کو تلاش کروانے کے بہانے تنگو کامل سے اپنی موجودگی میں لا کر کھلوانا تھا تاکہ میں اس کا کامبینیشن دیکھ سکوں۔ یو نو' وہ UL کلاس 360 کا سیف ہے' اور اس کو کھولنے میں بہت وقت لگنا تھا لیکن خوش قسمتی سے اس نے میرے سامنے لا کر کھولا اور میں نے اس کا کامبینیشن معلوم کر لیا۔"

"اس نے تمہیں کوڈ دیکھنے دیا؟"

سوال پہ تالیہ نے چمکتی نگاہیں اٹھائیں اور مسکرائی۔

"نہیں میں اس کے سامنے کھڑی تھی' وہاں سے لاکر نہیں نظر آتا تھا لیکن اس کے پیچھے بک ریک کے گلاس ڈور میں عکس دے رہا تھا۔" وہ کہہ کے خود ہی ہنس دی۔ پھر یاد آیا۔ "تنگو کامل کی تمام جیولری کی میں نے تصاویر

تمہیں دی تھیں، تم نے ان کی نقل تیار کرلی؟"
"کیسے نہ کرتی؟ ایک تصویر ایک ہزار الفاظ پہ بھاری ہوتی ہے' اور وہ زیورات تصاویر میں ہی مجھ سے درخواست کررہے تھے کہ میں ان کو اپنی ملکیت میں لے لوں۔" داتن چاولوں کا چمچ بھر بھر کے کھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"اچھا میں بتانا بھول گئی۔ اس میں جو تیارا (تاج) تھا' اس کو ہم نے نہیں چرانا۔ وہ مسز کامل کی والدہ کی نشانی ہے' اور اس کے کھو جانے پہ ان کا دل دکھے گا۔"
"مگر تالیہ! وہ اچھا خاصا مہنگا ہو گا یار۔"
" Honour Among Thieves Datin !"
اس نے اسٹکس کی مدد سے مچھلی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے یاددہانی کروائی۔ داتن نے افسوس سے کندھے اچکا دیے۔
"اگلا اسٹیپ۔" وہ واپس پلان تک آئی۔ "اتوار کی رات تنکو کامل کے گھر کوئی خاص مہمان آرہے ہیں۔ میں تقریب سے پہلے سیکورٹی کیمرے ناکارہ کردوں گی اور موقعے کا فائدہ اٹھا کے تمام نقلی جیولری کو ان کے سیف میں ڈال دوں گی اور اصل نکال لوں گی۔ پھر اسی وقت میں کسی مہمان کے ساتھ بدتمیزی کروں گی یا کوئی احمقانہ حرکت جس کے سبب مجھے نوکری سے جواب دے دیا جائے گا۔ یوں ایسا لگے گا کہ انہوں نے اپنی مرضی سے مجھے نکالا تھا۔ اور چند ماہ تو لگیں گے ان کو اندازہ کرنے میں کہ جو جیولری وہ پہن رہی ہیں وہ نقلی ہے' تب تک میرا نام و نشان بھی وہ لوگ بھلا چکے ہوں گے۔
"میری forgeries (جعل سازیاں) اتنی جلدی نہیں پکڑی جاتیں تالیہ۔ یاد ہے وہ انٹرنیشنل ایکسپورٹرز جس کی گھڑی چرائی تھی ہم نے؟ اس نے پورے سال بعد جاکر تھانے میں درخواست دی تھی' وہ بھی سنار کے خلاف کہ اس نے مجھے گھڑی ہی نقلی بنا کے دی ہے۔"
اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔ دفعتاً" داتن کی مسکراہٹ مدھم ہوئی اور اس نے محویت سے اسے دیکھا جو ہنستے ہوئے کھانے پہ پھر سے چہرہ جھکا گئی تھی۔
"تم خود سے محبت کرتی ہو تالیہ؟"
تالیہ نے روشن آنکھیں اٹھائیں اور مسکرا کے داتن کو دیکھا۔ "سب سے زیادہ۔"
"مگر تم اپنی عزت نہیں کرتیں۔"
تالیہ کی مسکان مدھم ہوئی۔ آنکھوں میں سایہ سا لہرایا۔
"میں ایک Scam (وہ لوگ جو بڑی مہارت اور ہوشیاری سے دھوکا دیتے ہیں) آرٹسٹ ہوں داتن۔ اسکام آرٹسٹ۔ یہ ساری دولت میں نے لوگوں کو دھوکا دے کر۔۔۔ ان کو لوٹ کر کمائی ہے۔ میں اپنے آپ کو جانتی ہوں۔"
"تم بھی کسی کو ہرٹ نہیں کرتیں۔ تم لوگوں کا دل نہیں دکھاتیں۔ کسی کو جسمانی ایذا نہیں پہنچاتیں۔ ہم صرف میوزیمز اور امیر و کبیر دولت مندوں کو لوٹتے ہیں۔۔۔ اور پھر ہم وہ ساری دولت غریبوں کو دے دیتے ہیں۔"
"ہیں؟ کون سے غریب؟" تالیہ حیران ہوئی۔
"لو۔ ہم دونوں سے زیادہ غریب کون ہوگا سارے شہر میں۔ ہم خود پہ خرچ کریں تو مطلب یہی ہوا ناکہ غریبوں پہ خرچ کی دولت۔"
تالیہ زور سے ہنس دی۔ "تم داتن! کبھی نہیں بدلو گی۔ مگر میں تمہاری طرح اپنے کام کو جسٹی فائی (صحیح ثابت)

نہیں کرتی، لیکن مجھے یہ کام بہت پسند ہے۔ اور میں اس زندگی سے بہت خوش ہوں۔" کہہ کر اس نے گلاس اٹھایا تو داتن نے مسکرا کے اپنا گلاس اس سے ٹکرایا۔

"گڈ گرل!" پھر اس کا شفاف چہرہ دیکھتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

"سات سال گزر گئے تالیہ۔ سات سال پہلے ہم پہلی دفعہ ملے تھے یاد ہے؟" اس پر وہ اداسی سے مسکرائی۔

"ہاں۔ اس سے پہلے میں کتنی مختلف زندگی گزار رہی تھی۔ لاہور میں اپنے پیرنٹس۔۔۔ اپنے فوسٹر پیرنٹس (گود لینے والے والدین) کے ساتھ۔" وہ موم بتیوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ میز پہ چنے کھانوں سے اڑتی بھاپ اور موم بتیوں کے شعلوں میں بہت سی یادیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔

"تمہیں اپنے اصلی ماں باپ یاد نہیں؟"

"نہیں۔ میری پہلی میموری گیارہ سال کی عمر کی ہے۔۔۔ آج سے سترہ سال پہلے۔ جب میں گیارہ سال کی تھی۔۔۔ میں کسی راہداری میں چل رہی تھی۔" اس نے آنکھیں بند کیں۔ "چرچ کے ڈیسک۔ میں ان کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ میرا منہ میلا تھا۔ لباس پھٹا پرانا تھا۔ سینٹ پال چرچ۔۔۔ ملاکہ۔۔۔" (یہ شہر کوالالمپور سے ذرا فاصلے پہ واقع ہے۔) اس نے آنکھیں کھولیں۔ "وہیں پہ میں پہلی دفعہ اسٹیٹ اتھارٹیز کو ملی تھی۔ انہوں نے مجھے یتیم خانے میں ڈال دیا اور وہاں سے ایک کشمیری جوڑا مجھے ایڈاپٹ کر کے لے گیا۔ سب کہتے ہیں کہ میرے بارے میں کبھی کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ کون ہوں، کہاں سے آئی ہوں، کوئی ریکارڈ نہیں، کوئی نام نہیں۔"

"تمہارا نام کس نے رکھا تھا؟"

"یتیم خانے کی منتظم کہتی ہیں کہ میں نے ان کو اپنا نام تالیہ بتایا تھا۔ تالیہ بنت مراد۔ میرا لباس دیہاتی تھا اور گندا میلا۔ بس یہ ایک نشان تھا میری گردن پہ۔" اس نے انگلیوں سے گدی کے نیچے چھوا۔ "گول سا نشان جیسے کسی نے آگ سے داغا ہو۔ جیسے کوئی ٹیٹو ہو۔ کوئی مہر ہو۔ شاید کوئی حادثہ ہوا تھا میرے ساتھ جو میں ہر شے بھول چکی تھی۔" وہ عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔

"تمہیں کوئی لینے بھی نہیں آیا؟"

"اونہوں۔" اس نے چاول کھاتے ہوئے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "اس علاقے میں دور دور تک کسی کا بچہ نہیں کھویا تھا۔ کسی نے مجھے اپنانے کا دعواہی نہیں کیا۔"

"لیکن تمہارے فوسٹر پیرنٹس تو بہت برے نکلے۔" داتن ناپسندیدگی سے بولی تھی۔ تالیہ کے لبوں پہ اداس مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہاں انہوں نے مجھے ایڈاپٹ تو کر لیا کیونکہ یہاں جاب تھی ان کی اور ان کو ایک نوکرانی چاہیے تھی، لیکن یہاں پھر بھی وہ بہتر تھے۔ پاکستان جا کر انہوں نے مجھے واقعتاً "ملازمہ" بنا لیا۔ اگر بچپن سے مجھے پیسوں اور کھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی چوریاں اور بڑے بڑے جھوٹ نہ بولنے پڑتے تو میں شاید ایسی کبھی نہ ہوتی۔"

"چلو کم از کم یہاں آ کر ان کی نوکری سے تو جان چھوٹی تمہاری۔"

"وہ بھی اس لیے کہ میں ان کی بیٹیوں کے رشتے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے میرج بیورو سے جو پہلا رشتہ ملا، مجھے نپٹا دیا۔ مگر میں بھی خوش تھی داتن! کیونکہ رشتہ ملائیشیا کا تھا۔ یو نو۔۔۔ جان چھوٹ جاتی اس فیملی سے۔ خوش شکل لڑکا تھا۔۔۔ اتنا امیر۔۔۔ اسکائپ پہ نکاح ہوا۔۔۔ میں کتنی بے وقوف تھی نا۔" وہ پھر سے ہنسی۔۔۔ "مجھے لگتا تھا یہاں آ کر میں خوش ہو جاؤں گی کیونکہ یہ میرا ملک ہے۔ ٹھیک ہے، مجھے اپنا آپ لاہوری لگتا رہا ہے ہمیشہ مگر میری اصل قوم تو مالے تھی نا۔ اور ان ہی خوابوں کے ساتھ میں یہاں آئی تھی۔ لیکن ایئرپورٹ پہ۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں تکلیف سی لہرائی۔ کانٹا پلیٹ میں گر دایا۔ واتن خاموشی اور اداسی سے بہت دفعہ کی سنی ہوئی کہانی سننے لگی۔

"ائیرپورٹ پہ اترتے ہوئے پہلی دفعہ میں نے پہلا وژن دیکھا تھا۔ جاگتی آنکھوں سے پہلا خواب۔ جیسے ایک دم آنکھوں کے سامنے منظر بدل جائے اور ایک منظر سا چلنے لگے۔ مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھولتا۔۔۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک بھاری تھیلا کندھے پہ اٹھائے کانٹوں پہ چلتی جا رہی ہوں، جس میں سے سونے کی اشرفیاں چھلک رہی ہیں۔ بس لمحے بھر کا منظر تھا اور غائب۔ وہ مجھے ریسیو کرنے آنے والا تھا۔ میرا کاغذی شوہر اور میں ایئرپورٹ کے وسط میں ہکا بکا کھڑی تھی۔ اور تم واتن۔۔۔ تم تب ایئرپورٹ پہ ملازمہ تھیں۔ ایسی ہی موٹی اور کالی سی تھیں۔ مگر دکھی سی۔ میں گرنے لگی۔ تم نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے باتھ روم تک لے گئیں۔ پانی پلایا۔ یاد ہے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے تمہیں وہیں روک لیا۔ اور اپنا بیگ دیکھا۔ وہ بری میں آیا تھا اور اسکائپ سے میاں صاحب کا حکم جاری ہوا تھا کہ یہی بیگ ضرور ساتھ لاؤں۔ بس ایک بیگ۔۔۔ میں نے وہیں اسے کھولا تھا۔۔۔ تمہارے سامنے۔۔۔ اور یاد ہے اس میں کیا تھا؟" وہ زخمی سا مسکرائی۔

"نوٹوں کے بنڈل!"

"میں کتنی بے وقوف تھی۔ منی لانڈرنگ کی کوریر گرل کے طور پہ استعمال ہو رہی تھی اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ کب میرا بیگ لاہور ایئرپورٹ پہ تبدیل ہوا کوئی ہوش ہی نہیں تھا مجھے۔ اگر تم اس وقت میری مدد نہ کرتیں اور اس بیگ کے ساتھ ایئرپورٹ سے نکلنے میں میری مدد نہ کرتیں تو میں پتا نہیں کہاں ہوتی۔"

"میرا کیا کام تالیہ! میں تو خود اولاد کے ہاتھوں اولڈ ہوم کی طرف دھکیلی جانے والی عورت تھی۔ بڑی دکھی رہتی تھی میں ان دنوں۔ ہائے۔" اسے اپنے دکھ یاد آ گئے۔ "لیکن یہ تمہاری آنکھیں تھیں جن پہ میں نے بھروسا کیا۔ ان کی چمک مجھے سچی لگی اور مجھے محسوس ہوا کہ تم بے قصور ہو۔ ویسے کتنی زیادہ رقم تھی نا اس بیگ میں' یاد ہے تالیہ! کاش رکھ لیتے۔"

"کیسے رکھ لیتے' موٹی خاتون؟" وہ غصہ ہوئی۔ "اسی رقم کو حربہ بنا کر تو ہم نے میرے اس شوہر کو ڈھونڈا اور اس سے طلاق کے پیپرز لیے تھے۔ مگر خیر۔۔۔" اس نے آخری نوالہ لیتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اس فراڈ آدمی نے مجھے ایک سبق تو سکھا دیا تھا کہ پیسے کمانے کے لیے کسی کو دھوکا کیسے دیا جاتا ہے۔ اور دیکھو' آج چھوٹی بڑی چوریاں کر کے ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ انٹرنیٹ اسکام سے شروع کیا گیا سفر آج ہمیں کتنا بڑا اسکام آرٹسٹ بنا چکا ہے۔"

(اسکام آرٹسٹ بنیادی طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کے لالچ کو ان کے خلاف استعمال کر کے ان سے مال لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ اور عموماً ایسے کاموں کے کرنے کا لالچ دیتے ہیں جو قانونی نہیں ہوتے یعنی دھوکا کھانے کے بعد لوٹا گیا شخص پولیس کے پاس نہیں جا سکتا۔ جیسے کسی بندے کو قتل کرنے کے لیے پیسے ایڈوانس میں بٹورنا اور پھر غائب ہو جانا۔)

"تمہیں ملائیشیا آنے سے پہلے کبھی اس طرح کے وژن یا سچے خواب نہیں نظر آئے تھے تالیہ؟"

"نہیں۔ پہلی دفعہ ایئرپورٹ پہ ہی نظر آیا تھا اور پھر کبھی وہ سلسلہ تھما ہی نہیں۔"

"اگر تمہارے خواب اور وژن ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہم اتنا کچھ نہیں کما سکتے تھے تالیہ۔ تم ایک Clairvoyant (جن کو مستقبل نظر آتا ہے) ہو۔ ایک Seer (کشف رکھنے والی) ہو تمہیں وقت سے پہلے بارش نظر آ جاتی ہے' کسی کی موت دکھائی دینے لگتی ہے۔۔۔ کوئی حادثہ۔۔۔ کوئی آفت۔۔۔ مگر ان سارے چھوٹے چھوٹے وژن اور خواب ایک طرف۔۔۔ اگر تم ان سات سالوں میں وہ دس بڑے خواب نہ دیکھتیں تو ہم اتنے امیر نہ

ہوتے۔"

"گیارہ!" تالیہ نے نیپکین سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے تصحیح کی۔ "تنکو کامل کو اپنا لیپ ٹاپ اور زیورات لاکر سے نکالتے دیکھا تھا۔ میں نے خواب میں۔۔۔ تین ماہ پہلے۔ جس کے بعد ہم نے اس پہ کام کرنا شروع کیا تھا' اور میں نے اس کے گھر ملازمت حاصل کی۔۔۔ اس کو ملا کے گیارہ خواب ہوئے جو میں نے دولت مندوں کی تجوریوں اور میوزیمز کی قیمتی پینٹنگز اور آرٹ ورک کے بارے میں دیکھے تھے۔ جیسے قسمت مجھے خود بتا دیتی ہے کہ تالیہ! فلاں کے لاکر میں یہ سب رکھا ہے' اسے چرا لو۔ اور دس دفعہ ان کی مدد سے ہم نے کتنی دولت کمائی۔ اب دیکھو گیارہویں دفعہ کامیاب ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ لیکن داتن۔۔۔" اس نے گہری آہ بھر کے چھت پر لگی بتیوں کو دیکھ کے کہا۔ "میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔"

"کیا؟"

"میں اگلی دفعہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی لمبا ہاتھ۔ ایک آخری جاب' جس سے کروڑوں کما لیں ہم اور پھر میں اس کام کو چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ پچھلے تین ماہ میں نے ایک سچی مگر بے وقوف لڑکی کا کردار کیا۔۔۔ اپنے اصل نام کے ساتھ۔۔۔ مگر ان سب لوگوں سے اتنے اچھے الفاظ سن کر میرا دل چاہنے لگا ہے کہ میں یہ کام چھوڑ دوں۔ ایک آخری فراڈ۔ ایک آخری چوری' کے بعد۔۔۔" وہ چھت پہ لٹکتے فانوس کو دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولی تھی۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں امید تھی' خوشی تھی۔ سادگی تھی۔

"تالیہ!" داتن سنجیدگی سے آگے کو جھکی۔ "پلان کیا گیا گناہ کبھی آخری گناہ نہیں بن سکتا۔ جس جرم سے پہلے تم سوچ لو کہ اسے آخری دفعہ کرنے جا رہی ہو' وہ جرائم کی زنجیر کی محض اگلی کڑی ہوتا ہے۔ اگلی چوری' اگلا گناہ۔ اس کے بعد مزید ایک اور ہوگا۔ پھر مزید ایک اور۔ جو لوگ چھوڑتے ہیں نا گناہ' وہ پچھلے گناہ کو آخری گردان کے چھوڑتے ہیں۔ لیکن میرے اور تمہارے جیسے لوگ۔۔۔ تالیہ! ہم چور ہیں اور ساری عمر یہی رہیں گے۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ انسان نہیں بدلا کرتے۔"

تالیہ نے نگاہیں داتن کی طرف موڑیں تو ان کی جوت بجھ گئی تھی۔ "ہم جب چاہیں یہ کام چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اچھے ہو سکتے ہیں۔"

"ہم پہلے ہی بہت اچھے ہیں تالیہ! مگر ہم اس کام کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ہماری زندگیوں میں جھوٹ اور دھوکے بازی اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم چاہیں بھی تو نہیں بدل سکتے۔ ہم نے ہمیشہ اسی طرح رہنا ہے۔"

"اوکے! پھر میں اسی طرح خوش ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ پھر نیپکن سے ہونٹ تھپتھپائے۔ "اب میں سونے جا رہی ہوں۔ صبح کام پہ بھی جانا ہے۔ ویسے نوکرانی بننا بہت ہی روکھا پھیکا کام ہے۔"

وہ قدرے نروٹھے پن سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

داتن نے مسکرا کے اسے شب بخیر کہا۔ تالیہ جانے ہی لگی تھی کہ ٹھہری۔ آنکھوں میں شرارت سی چمکی۔ لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔

"میں نے کل رات ایک خواب دیکھا!"

داتن نے اطمینان سے اسے دیکھا۔ "کالونی میں کون مرنے والا ہے؟ کس کا کتا بھاگنے والا ہے؟ کون اپنی بیوی کو دھوکا دینے والا ہے؟"

"نہیں۔" وہ نچلا لب دبا کے ذرا سا ہنسی۔ "میں نے خود کو دیکھا۔ میں دو دریاؤں کے درمیان کیچڑ میں کھڑی ہوں اور میرے سامنے ایک آدمی کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اسے میری ضرورت ہے' اور مجھے اس کی۔۔۔ اور یہ کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔" داتن جو دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آخر میں مایوس سی نظر آئی۔ "اس میں اتنا

خاص تو کچھ نہیں تھا۔"
"کیونکہ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ آدمی کون تھا۔"
"کون تھا؟" وہ چونکی۔ تالیہ نے اب انگلی دانتوں میں دبالی تھی اور کچھ یاد کر کے وہ پھر سے ہنسی تھی۔
"وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔۔۔ اف۔۔۔ اف۔" اس کے چہرے پہ رنگ بکھرے تھے۔ داتن نے اچنبھے سے بھنویں بھینچیں۔
"مگر وہ تھا کون؟"
"اونہوں۔ اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تم مجھ پہ ہنسو گی۔ ایسا آدمی میرے خواب میں۔۔۔ اف۔"
"او ہو کچھ تو بتاؤ۔ تم جانتی ہو اسے؟" پھر وہ چونکی۔ "شاید تم اسے پسند بھی کرتی ہو!"
"جانتی ہوں؟ پسند کرتی ہوں؟" وہ جیسے محظوظ ہوئی۔ "پیاری داتن۔۔۔ اس کو سارا ملائیشیا جانتا ہے۔۔۔ اور پسند؟ اونہوں۔ اس سے سارا ملائیشیا عشق کرتا ہے، عشق۔ گڈ نائٹ۔" اور وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ داتن اسے پکارتی رہ گئی مگر اب وہ ہاتھ ہلاتی، سر نفی میں ہلاتی زینے چڑھتی جا رہی تھی۔
"کون ہو سکتا ہے؟" وہ اپنے موٹے موٹے ہاتھوں پہ چہرہ گرائے مشکوک نظروں سے اسے جاتا دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼
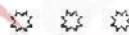
دو دریاؤں کے سنگم پہ وہ دونوں اسی طرح کھڑے تھے۔ بارش تڑا تڑ برس رہی تھی۔ وہ دونوں بھیگے ہوئے تھے۔ پاؤں کیچڑ میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ اوپر دیکھ رہی تھی۔ جہاں سرخ پروں اور سنہری ٹانگوں والا پرندہ اس آدمی کے سر کے عین اوپر فضا میں چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلے ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔
"میرے ساتھ رہو۔" آواز پہ تالیہ نے نظریں پھیریں۔ وہ بھیگی ہوئی تھی۔ سنہری بال موٹی گیلی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔
"میرے ساتھ رہو۔" وہ اب ٹائی نوچ کے اتار رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی شرٹ کا کف کھولا۔ اور آستین پیچھے موڑی۔ نظریں تالیہ پہ جمی تھیں۔ اسی طرح اس نے دوسری آستین موڑی۔ پھر زمین پہ جھکا اور مٹھی میں کیچڑ اٹھائی اور سیدھا ہوا۔ مٹھی اس کی طرف بڑھائی۔
تالیہ نے دیکھا۔ اس کی ہتھیلی میں کیچڑ کے اوپر ایک سنہری چابی دمک رہی تھی۔
"میرے ساتھ رہو۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔
ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔
بیڈ روم میں اندھیرا تھا۔ تالیہ نے چند لمحے پلکیں جھپکا کے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اسی طرح لیٹے لیٹے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ سے سو گئی۔
چند گھنٹے بیتے اور صبح پوری طرح پھیل گئی۔ لاؤنج خاموش پڑا تھا۔ اوپن کچن کی میز پہ ناشتا شیشے کے برتنوں میں ڈھکا ہوا رکھا تھا۔
وہ زینے اترتی نیچے آئی تو ملازمہ کے یونیفارم میں ملبوس تھی۔ آنکھیں سبز تھیں۔ اور چہرے پہ بلا کی مسکینیت طاری تھی۔ لاؤنج میں رک کے اس نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔ "داتن؟"
"نیچے ہوں۔" آواز پر وہ گہری سانس لیتی ایک دروازے کی طرف آئی۔ دیوار میں نصب چوکھٹے پہ اپنا انگوٹھا رکھا۔ خودکار آلے نے اس کی تشخیص کی اور دروازہ کھل گیا۔ آگے سیڑھیاں تھیں جو مزید نیچے جاتی تھیں۔ وہ زینے اترنے لگی۔

نیچے کھلا سا کمرہ تھا۔ دیواروں پہ مختلف پینٹنگز اور آرٹ ورک سجایا گیا تھا۔ چند ڈبے بند رکھے تھے۔ وسط میں بڑی میز تھی جس پہ چند مشینیں رکھی تھیں اور داتن حفاظتی گلاسز لگائے، گلوز پہنے، ایک گن نما آلے سے ایک نیکلس پہ کام کررہی تھی۔
تالیہ اس کے قریب آرکی اور تنقیدی نظروں سے سارے زیورات کو دیکھا۔ پھر ایک انگوٹھی کو اٹھا کے اوپر روشنی میں کر کے دیکھنے لگی۔
"پرفیکٹ۔" اس نے انگوٹھی واپس ڈال دی۔
"بس یہی زیورات ہیں مسز کامل کے پاس؟" داتن نے ایک نظر ان تھوڑے سے زیورات کو دیکھ کے کہا۔
"ہاں... لاکر میں کل چودہ پیسز ہیں۔ تاج کی نقل نہیں تیار کرنی۔ میں باقی تیرہ پیس اٹھاؤں گی۔" وہ کہہ کے جانے لگی۔
داتن جو زیور پہ جھکی تھی، چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "چودہ کیسے؟ تم نے صرف تیرہ کی تصاویر بھیجی تھیں۔ تاج نکال دو تو کل بارہ بچ گئے۔"
تالیہ رکی۔ واپس گھومی۔ زیورات سامنے پڑے جگمگا رہے تھے۔ پھر سے ان کو گنا۔ ذرا سا الجھی۔ "نیکلس، کڑے، بندے، انگوٹھیاں۔ یہ ہوئے بارہ پیس۔ مگر مسز کامل کے تمام زیورات جو لاکر میں تھے میں نے ان کی گنتی کی تھی تو وہ چودہ پیس تھے۔"
"تم نے پہلی دفعہ لاکر اندر سے کب دیکھا تھا؟"
"ایک ماہ پہلے جب میں نے مسز کامل کی انگوٹھی چھپا دی تھی اور ان کو میرے سامنے لاکر کھولنا پڑا تھا، تب میں نے سارا لاکر دیکھا تھا۔ کوڈ اس لیے نہیں دیکھ سکی تھی کہ مجھے انہوں نے لاکر کھولنے کے بعد بلایا تھا۔" وہ الجھ کے انگلیوں پہ گننے لگی۔ "کل بھی جب تنکو کامل نے میز پہ زیورات کے ڈبے رکھے تو میں نے گنے تھے، دو، پانچ... تیرہ..." وہ بڑبڑاتے ہوئے گننے لگی۔ مگر گنتی پوری نہیں ہو رہی تھی۔
"ہو سکتا ہے تم بھول رہی ہو۔ ٹوٹل تیرہ ہی ہوں۔"
"تالیہ کچھ نہیں بھولتی۔" وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ایک دراز کھولی۔ چند کاغذ الٹائے۔ ایک فولڈر نکالا۔
"جب مسز کامل نے میرے سامنے لاکر سے زیور نکالا تھا تو میں نے اپنے بلاؤز بٹن کے کیمرے سے اس کی ہائی کوالٹی تصاویر لی تھیں۔" وہ فولڈر کھولتے ہوئے صفحے تیز تیز پلٹ رہی تھی۔
"اور تم نے مجھے تیرہ تصاویر دی تھیں تالیہ۔ وہ میرے گھر پڑی ہیں۔"
"میرے پاس اوریجنل ہوں گی۔ ایک منٹ۔" اس نے وہ فولڈر رکھا اور ایک دوسرا نکالا۔ پہلا صفحہ کھولا تو لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ "یہ لو۔ یہ رہیں تمام تصاویر۔ ان کو ٹیلی کرو۔ ہم نے کون سا زیور مس کر دیا ہے۔"
داتن گھوم کے اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ عینک اتار دی اور اب وہ دونوں باری باری تمام تصاویر متعلقہ زیورات کے ساتھ رکھ رہی تھیں۔ پانچ... آٹھ... بارہ... تیرہ...
"اوہ!" آخری تصویر سے متعلق کوئی زیور انہوں نے نہیں بنایا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تالیہ کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ گھڑی کے باکس کے جیسے شیشے کے ڈبے میں رکھا ایک سنہری سکہ تھا۔ پرنٹ آؤٹ پہ اس باکس کی آگے پیچھے سے چار تصاویر لی گئی تھیں۔
"یہ تو کوئی اینٹیک ہے۔" داتن قدرے جوش سے جھکی مگر تالیہ نے بے دلی سے کاغذ پرے کر دیا۔
"اوپر دیکھو کیا لکھا ہے۔ "مظفر شاہ" یہ ملائیشیا کی سلطنت کے سلطان مظفر شاہ کے زمانے کا سکہ ہے۔ **تنکو** کامل کو آرٹ اور ہسٹری میں خاصی دلچسپی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کو سنبھال کر رکھا ہے۔"

"مگر ہم اسے کیوں نہیں چرا رہے۔"

"کیونکہ مظفر شاہ کے سکے آج کل کوالالمپور کے ہر مال سے ملتے ہیں اور سارے نقلی ہوتے ہیں۔ ابھی ان کے کونے کھرچو تو سفید رنگ نکلنے لگے گا اور یہ بھاری ہوتے ہیں۔ جبکہ اصلی سکے اتنی aging اور oxidation (مرکب) کے باعث ہلکے ہونے چاہئیں۔ بالفرض یہ اصلی بھی ہو تو اتنی ویلیو نہیں ہے ان کی۔ رہنے دو بے چاروں کے پاس ان کا سکہ۔"

داتن نے ایک دوسری عینک اٹھائی اور اسے ناک پہ جما کے غور سے کاغذ پہ چھپی تصویر کو دیکھنے لگی۔

"یہ واقعی اصلی سکہ نہیں ہے۔" وہ ناپسندیدگی سے بولی تھی۔ "آج کل کے Forgers (جعل سازوں) کو خدا کا کوئی خوف نہیں۔ ٹھیک ہے میری طرح جعل سازی نہیں کر سکتے وہ' میں جانتی ہوں' لیکن نقلی سکہ تیار کرتے وقت انسان کو چاہیے کہ ایک دفعہ اصلی سکہ بھی دیکھ لے' کیونکہ مظفر شاہ کے اصل سکوں پہ ایک طرف "مظفر شاہ ال سلطان" اور دوسری طرف "نصیر من الدنیا والدین" (دنیا اور دین میں مددگار) لکھا ہوتا ہے۔ اس پہ تو دونوں طرف مظفر شاہ ال سلطان لکھا ہے۔"

داتن کے آخری فقرے پہ وہ منجمد ہو گئی۔ پھر اتنی تیزی سے گردن موڑی گویا برف چٹخی ہو۔

"دونوں طرف مظفر شاہ لکھا ہے؟" اس نے کاغذ داتن کے ہاتھ سے جھپٹا اور اس پہ بے قرار نگاہیں دوڑائیں۔

"میں نے ایسا سکہ پہلے بھی دیکھا ہے۔ ہماری ایک واردات والی جگہ پہ یہ تھا' مگر میں نے اسے تب بھی چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ نیشنل ہسٹری میوزیم میں۔ ہے نا؟ میں نے بھی دیکھا تھا۔" تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میں نجیب بن سلامت کی بات کر رہی ہوں۔ پچھلے سال جب میں نے اس کی پرائیویٹ آرٹ کلیکشن کے بارے میں وژن دیکھا تھا اور ہم نے ان کے ذاتی سیف سے نایاب اینٹیک برتن چرائے تھے۔ تب ایسا سکہ وہاں بھی تھا۔"

"یقیناً" ہوگا' مگر تین سال پہلے' جب تمہارے ہی ایک خواب پہ ہم نے نیشنل ہسٹری میوزیم والی واردات کی تھی' تب یہ وہاں ڈسپلے تھا۔ مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔"

تالیہ نے کرسی کھینچی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ ایک جیسے بہت سے سکے مارکیٹ میں ہوتے ہیں۔"

"نہیں۔ کچھ غلط ہے اس سب میں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارے سامنے یہ سکہ تیسری دفعہ آرہا ہے' مگر ہم نے اسے نہیں چرایا۔"

"ہم واردات کی جگہ سے چند چیزیں ہی چراتے ہیں' ہر چیز تو نہیں اٹھا سکتے نا تالیہ۔"

"بات یہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے سال ایسا ہی سکہ نجیب بن سلامت کے پاس تھا۔ اس کا باکس بھی یہی تھا۔ داتن! نجیب بن سلامت ہماری وجہ سے دیوالیہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی بہت سی آرٹ کلیکشن کو آکشن (نیلامی) پہ ڈال دیا تھا۔ اس کا ریکارڈ پبلک ہوگا۔ ذرا معلوم کرو یہ سکہ اس آکشن میں تھا یا نہیں؟"

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ تنکو کامل اور نجیب بن سلامت دوست ہیں اور میں نے مسز کامل سے سنا تھا کہ جب نجیب پہ برا وقت آیا تھا تو تنکو کامل نے اس کی مدد کی تھی۔ اس کی آکشن سے کوڑیوں کے بھاؤ ملنے والی چیزیں مہنگی خرید کے۔ کچھ پینٹنگز اور۔" اس نے کاغذ اٹھا کے دیکھا۔ "شاید یہی سکہ۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ ایک جیسے بہت سے سکے نہیں ہیں' بلکہ یہ ایک ہی سکہ ہے جو بار بار تمہارے خواب میں آتا ہے؟"

"ہاں۔ میرے گیارہ خواب۔۔۔ بلکہ بارہ۔ ان میں سے تین میں یہ سکہ تھا۔ شاید مزید میں بھی ہو مگر اس کے ساتھ رکھے جواہرات' زیورات' پینٹنگز اور نادر اشیا نے میری آنکھوں کو ہمیشہ اتنا خیرہ کر دیا کہ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔" وہ حیران پریشان نظر آ رہی تھی۔

"میں اس سکے کا ریکارڈ ٹریس کرنے کی کوشش کرتی ہوں' لیکن اگر تم یہ کہہ رہی ہو کہ یہ ایک سکہ پچھلے کئی سال سے ایک شخص سے دوسرے کی تحویل میں جا رہا ہے اور قسمت تمہیں بار بار خواب میں اشارہ دے رہی ہے کہ اسے حاصل کرو تو یہ بہت عجیب بات ہے۔"

مگر وہ سن سی خلا میں دیکھ رہی تھی۔ "میں ہمیشہ اپنے خوابوں کی تعبیر غلط کرتی ہوں۔ کسی کو پانی میں ڈوبتے دیکھوں تو سمجھتی ہوں وہ مرنے والا ہے' مگر چند دن بعد معلوم ہوتا ہے اس کو کوئی اعلا تعلیمی کامیابی ملی ہے کیونکہ پانی "علم" کا سمبل ہے۔ کسی کا زیور چوری ہوتے دیکھوں تو سمجھتی ہوں کہ اس کے ہاں ڈاکا پڑنے والا ہے' مگر اس کو طلاق ہو جاتی ہے اور وہ گروسری اسٹور والی روز میری۔۔۔ میں نے دیکھا اس کے بازو میں سونے کا نیا کڑا ہے' تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ امیر ہونے والی ہے' مگر اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ غریب وہ ابھی بھی ویسی ہے۔ میں ہمیشہ اپنے وژن یا خواب کی غلط تعبیر کرتی ہوں' مگر ان بارہ خوابوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میں نے درست سمجھے ہیں' کیونکہ ان ہی کی وجہ سے ہم امیر ہوئے' لیکن شاید وہ بھی میں نے غلط سمجھے تھے۔" اس کی رنگت ماند پڑ رہی تھی۔ داتن کو افسوس ہوا۔

"تم کام پہ جاؤ' میں اس سکے کو ٹریس کرتی ہوں۔" اس نے اس کا سر تھپک کے تسلی دی تو وہ بے دلی سے اٹھی اور سر ہلا دیا۔ پھر ٹھہری۔

"میں اتنے سال سمجھتی رہی ہوں کہ میری تقدیر مجھ سے یہی سب کچھ چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔ یہ ان کو دیکھنے کا تحفہ مجھے اسی لیے ملا ہے۔ لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ شاید میں نے اس تحفے کو غلط استعمال کیا۔" اس کی آنکھ کا کنارہ بھیگ گیا۔

"تالیہ۔۔۔" داتن نے آگے بڑھ کے اسے شانوں سے تھاما۔ "ہم اس سکے کو ڈھونڈ لیں گے اور اس کو حاصل بھی کر لیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ اب کام پہ جاؤ اور مجھے میرا کام کرنے دو۔" تالیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ لیں۔ اسے کام سے دیر ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

تنکو کامل کی رہائش گاہ پہ۔۔۔ صبح سے روزمرہ کے کام شروع ہو چکے تھے۔ کچن میں تالیہ اور ایک دوسری ملازمہ کھڑی کام میں مصروف تھیں۔ بٹلر ٹرالی کو اپنی نگرانی میں سیٹ کروا رہا تھا اور ساتھ میں فون پہ بات بھی کر رہا تھا۔ ایسے میں تالیہ بے دھیانی سے جگ میں جوس انڈیل رہی تھی۔ چہرے پہ ابھی تک وہی الجھن چھائی تھی اور ہاتھ سست پڑ رہے تھے۔ سارے باندھے اس نے جگ کو ٹرے میں رکھا اور آگے بڑھ گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پہ تنکو کامل سربراہی کرسی پہ بیٹھے خوش مزاجی سے دائیں ہاتھ جلوہ گر اپنی بیوی سے محو گفتگو تھے۔ بچے بھی ناشتا کر رہے تھے۔ ایسے میں وہ جوس لے کر آئی تو دونوں میاں بیوی نے خوش گوار مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"کیسی ہو تالیہ؟ اور تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں سب۔ تھینک یو سر۔" اس نے ادب سے سر جھکایا۔
"میں بیگم سے کہہ رہا تھا کہ اس ماہ سے تالیہ کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔"
"شکریہ سر!" وہ مصنوعی مسکراہٹ اور تشکر کے ساتھ بولی۔ اور ان کے گلاس میں جوس ڈالنے لگی۔
"تالیہ! مجھے مارکیٹ جانا ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ گی۔" مسز کامل نے کہا تو اس نے سر کو ادب سے خم دیا۔ اور کچن میں آگئی، تاکہ جلدی جلدی کام نپٹالے۔
"آخر جمعہ کو آ کون رہا ہے۔ جس کے استقبال کے لیے اتنی تیاری ہو رہی ہے؟" وہاں کھڑی دونوں ملازمائیں نور اور تسنیم آپس میں بات کر رہی تھیں۔ پھر اس سے بھی پوچھا۔ "تمہیں کچھ معلوم ہے تالیہ؟"
"نہیں...." وہ سادگی سے کہہ کے برتن دھونے لگی۔ (میرے جیسی رچ گرل اس وقت ان کے جھوٹے برتن دھو رہی ہے، مجھے فی الحال یہی معلوم ہے۔) جلتے دل کے ساتھ اس نے سوچا تھا۔
کے ایل کا وہ بازار شام کے وقت متوسط طبقے کے لوگوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ مختلف وضع قطع کے لوگ۔ اکثریت چینی نقوش والے افراد کی تھی اور خواتین کی ایک بڑی تعداد کس کے چہرے کے گرد لپٹنے والا حجاب لیے ہوئی تھی۔ جس کو مقامی زبان میں tudung کہا جاتا تھا۔ بازار میں سرخ ٹائلز سے بنی روش تھی اور روش کے دونوں اطراف دکانیں اور ان کے آگے اسٹالز لگے تھے۔ برآمدوں میں کہیں چھتری تلے کرسیاں بھی بچھی تھیں اور لوگ کھا پی رہے تھے۔
ایسے میں تالیہ سامان کے شاپر اٹھائے، مسز کامل کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔
"جو مہمان آ رہے ہیں، ان کے لیے چاول لے رہی ہوں۔ ان کو اچھا چاول بہت پسند ہے۔"
مسز کامل ساتھ میں تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ وہ جیسے ان مہمانوں کے آنے پہ بہت خوش تھیں، مگر ان کا نام کسی وجہ سے نہیں لے پا رہی تھیں، لیکن شاید ان کا دل کسی سے شیئر کرنے کو بہت چاہ رہا تھا۔ تالیہ خاموش رہی۔ پھر یوں ہی پوچھا۔
"بچے بھی آ رہے ہیں ساتھ؟"
"نہیں.... بس دونوں میاں، بیوی آئیں گے۔ ویسے ان کے دو بچے ہیں۔" پھر رک کے تصحیح کی۔ "تین تھے۔ لیکن ان کی بیٹی آریانہ بچپن میں کھو گئی تھی۔ چیئر لفٹ سے گری تھی۔ لاش نہیں ملی، مگر سب کو یہی لگا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس لیے قبر وغیرہ بنا دی تھی۔" پھر وہ چپ ہو گئیں، جیسے بہت زیادہ بول گئی ہوں اور ایک دکان کی طرف چلی گئیں۔ وہ گہری سانس لے کر پیچھے آئی۔
مسز کامل نے اعلا درجے کے چاول نکلوائے اور ان کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگیں۔ تالیہ یوں ہی ان کے ہاتھوں کو دیکھے گئی۔ یک دم جیسے ساری آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ مسز کامل کے ہاتھوں میں بھرے چاول دیکھتے ہی دیکھتے جلنے لگے۔ بس لمحے بھر میں وہ سب راکھ ہو گئے اور ان کے دونوں ہاتھ کالک سے رنگے خالی رہ گئے۔
وہ چونکی۔ سماعت کھل گئی۔ آوازیں آنے لگیں۔ اس نے مسز کامل کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی راکھ نہیں تھی۔ وہ چاول اٹھا اٹھا کے چیک کر رہی تھیں۔ تالیہ نے ایک گہری سانس بھری۔
"میم۔" اس نے ہولے سے ان کو پکارا۔ "کل آپ کی کسی دوست کا فون آیا تھا میں بتانا بھول گئی۔"
"کس کا؟ کیا کہہ رہی تھی؟" وہ چونک کے اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"نام نہیں بتایا، مگر یہ کہا تھا کہ وہ ذرا مصروف ہیں، مگر میں آپ کو بتا دوں کہ صدقہ دے دیں اور آگ وغیرہ سے احتیاط کریں، کیونکہ انہوں نے آپ کے بارے میں برا خواب دیکھا ہے۔"
"کیا۔ کیا دیکھا ہے اس نے؟" وہ بے چین سی ہو کے پوری اس کی طرف گھوم گئیں۔ دونوں اب کاؤنٹر سے

ہٹ کے کھڑی تھیں اور سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔
"یہ کہ آپ نے ہاتھوں میں چاول اٹھا رکھے ہیں اور وہ راکھ میں بدل جاتے ہیں۔ شاید آپ کو چولہے اور ہیٹر وغیرہ سے احتیاط کرنی چاہیے۔"
"اوہ تم نے اچھا کیا' مجھے بتا دیا' لیکن کون سی دوست تھی میری؟"
"نام نہیں بتایا' لیکن کہتے ہیں برے خواب کا بار بار ذکر نہیں کرنا چاہیے' اس لیے بہتر ہے کہ آپ بس صدقہ اور دعا وغیرہ کر دیں۔" اس نے خوب صورتی سے بات کا رخ پھیرا تو وہ سر ہلا کے رہ گئیں۔ البتہ چہرے پہ بے پناہ پریشانی اُمڈ آئی تھی۔
(مجھے لگتا ہے آپ کے ہاتھ جلنے والے ہیں یا آپ کے گھر کو آگ لگنے والی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ یہ وژن میں نے دیکھا ہے' نہ ہی یہ کہ میرے خواب ہمیشہ سچ ہو جاتے ہیں۔ اوہ میرے اللہ۔۔۔ یہ تحفہ نہیں ہے۔۔۔ یہ تو ایک عذاب ہے۔) ان کے ساتھ سر جھکائے بازار میں چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار ان کے ہاتھوں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ گوری کلائی میں انہوں نے خوب صورت سا سونے کا بریسلیٹ پہن رکھا تھا' جس پہ ننھے ستارے جھول رہے تھے۔ تالیہ نے یوں ہی اپنی خالی کلائی کو دیکھا اور پھر ایک دم وہ ٹھٹک کے رکی۔ ذہن کے پردے پہ ایک منظر لہرایا تھا۔
لاکر میں رکھی ڈبی اس میں سجا بریسلیٹ۔ وہ وہیں سن سی کھڑی رہ گئی۔ ایک دم ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ پزل کے بہت سے ٹکڑے اپنے اپنے خانوں میں آ گرے تھے۔
لائبریری کے اندر مقدس' پُر رعب سی خاموشی چھائی تھی۔ اونچے ریکس' کتابوں کی بڑی الماریاں۔۔۔ جگہ جگہ بچھی میزوں پہ مطالعے میں منہمک سے دکھائی دیتے لوگ۔۔۔ کمپیوٹرز کے آگے بیٹھے کام کرتے اشخاص۔۔۔ غرض معمول کا خاموش سا ماحول تھا۔
ایسے میں دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ اس نے صبح کے ملازماؤں والے لباس کے برعکس سرخ خوب صورت اور قیمتی فراک پہن رکھا تھا۔ کہنی پہ ڈرائنگ بیگ تھا اور سر پہ سفید کورا ہیٹ۔ جس سے نکلتے سیاہ بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ دروازے پہ وہ رکی' ہیٹ کو ڈائمنڈ رنگ پہنی انگلی سے ترچھا کر کے سیاہ آنکھیں آس پاس دوڑائیں۔ ایک لائبریرین جو قریب سے کتابوں کی ٹرالی دھکیلتا گزر رہا تھا' اسے دیکھ کے رکا اور جھٹ سلام جھاڑا۔
"السلام علیکم۔۔۔ مس ساشا۔"
تالیہ نے شانِ بے نیازی سے سر کو خم دیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا تو وہ بولا۔
"مسز لیانہ اس طرف ہیں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی اور اسی طرح اٹھی گردن کے ساتھ آگے چلتی گئی۔
کونے میں ایک آڈیو روم تھا۔ شیشے کی دیواروں نے اسے مکمل بند کر رکھا تھا' گویا شیشے کا کوئی ڈبا ہو۔ اندر تنگ سی جگہ پہ وہ پھنس کر بیٹھی سیاہ موٹی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ عینک لگائے' بال جوڑے میں باندھے وہ کتابوں میں الجھی ہوئی تھی۔ آہٹ پہ اس نے نظریں اٹھائیں تو دیکھا' تالیہ دروازہ کھولتی اندر داخل ہو رہی تھی۔
"اتنے سالوں سے یہاں کام کر رہی ہو دا تن! اور ایک ڈھنگ کا آفس بھی نہیں دیتے یہ تمہیں۔" وہ مسکراہٹ دباتے کہتی سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ پرس میز پہ رکھا اور ہیٹ کو مزید ترچھا کیا تو چہرہ اور سیاہ مسکراتی آنکھیں مزید واضح ہوئیں۔
"طیانہ بنت دانش صابری کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ چاہے تو یہ پوری لائبریری خرید لے۔" خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور کے وہ بولی تو تالیہ نے ابرو اونچا اٹھایا۔ "پوری؟"

"چلو۔۔۔ آدھی سہی!" داتن نے ڈھٹائی سے تصحیح کی، پھر ناک سے مکھی اڑائی۔ "اور تمہاری یہ تنقیدی نظریں جو میرے اس کوزی آفس کو پچھلے بیس سیکنڈ سے ملامت کرکے میرے اوپر ترس کھا رہی ہیں نا، میں ان کو کھلے دل سے معاف کردوں گی، کیونکہ تم بھول رہی ہو کہ یہی وہ ڈبا ہے، جس میں بیٹھ کے ہم نے وہ تمام کام پلان کیے تھے جن کے باعث تم آج اس اونچے محل میں رہ رہی ہو۔"

"لگتا ہے بڑے زور کی لگی ہے۔ چچ چچ۔" تالیہ نے افسوس سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ داتن نے چبھتی نظریں اس پہ جمائے ناک سکیڑی۔

"نہیں Sun Tzu کی ماننے والی ہوں، وہ کہتا تھا کہ جب امیر ہو تب غریب نظر آؤ اور جب غریب ہو تب امیر۔"

"اس نے یہ فقرہ طاقت ور اور کمزور کے بارے میں کہا تھا۔"

"مگر اس کا مطلب یہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔"

"اچھا، چائے نہیں پلاؤ گی؟" وہ بور سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ داتن نے افسوس سے اسے دیکھ کے گہری سانس بھری۔

"تمہیں معلوم ہے کہ ایک کپ چائے کے اندر موجود کیفین انسان کو کتنے خطرناک اثرات سے دوچار کرسکتی ہے؟ بے شک شیانگ بادشاہ نے دعوا کیا تھا کہ چائے بہت سی بیماریوں کی دوا ہے، لیکن وہ چونکہ ایک بادشاہ تھا، اس لیے اس پہ کبھی بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ چائے کی زیادتی سردرد، اٹیکس، بے خوابی، سینے میں جلن، متلی، ڈائریا اور کنفیوژن کا باعث بن سکتی ہے۔"

"وہ اسی لیے جب تم میرے گھر آتی ہو داتن تو میری پتی سب سے پہلے ختم ہوتی ہے۔"

"میں ایک موذی چیز سے تمہیں چھٹکارا دلانے کی اپنی طرف سے کوشش کرسکتی ہوں! لیکن اگر تم اس زہریلے مادے کی محبت میں، اس کی لت میں اتنی مبتلا ہو ہی چکی ہو تو میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔"

"اف! تم اتنی لمبی بات کیوں کرتی ہو داتن؟"

موٹی عورت نے میز پہ رکھے ٹریولر مگ کا ڈھکن کھولا اور پیچھے سے تھرماس اٹھا کر اس میں گرما گرم چائے انڈیلی۔ تالیہ نے شکریہ کہنے کو لب کھولے ہی تھے کہ داتن نے تھرماس واپس رکھا، کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی، اور مگ سے گھونٹ بھر کے تسلی سے اسے دیکھا۔ "ہاں تو تم کیسے آئیں؟"

تالیہ نے گہری سانس لی، ایک چبھتی ہوئی نظر اس پہ ڈالی اور گویا ہوئی۔

"تمہیں معلوم ہے، میں کیوں آئی ہوں۔"

"اوکے!" داتن نے مگ پرے رکھا اور اپنا ٹیبلیٹ نکال کے اسکرین اس کو دکھائی، یوں کہ ٹیبلیٹ داتن کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

"یہ ہے وہ سکہ۔" وہاں ایک اعلا کوالٹی کی تصویر نظر آرہی تھی۔ تالیہ آگے ہوئی۔

"نامعلوم ذرائع سے یہ سکہ چند برس پہلے منظر عام پہ آیا تھا۔ تقریباً سترہ سال پہلے۔ یہ سلطان مظفر شاہ کے زمانے کے سکوں سے مختلف ہے، لیکن ہر میوزیم اور ہر بیوپاری نے اس کے متعلق بہت سی کہانیاں سنائی ہیں اور ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ سب جھوٹی ہیں۔ یہ سکہ زیادہ دیر کسی کے پاس ٹھہرتا نہیں، اسے بیچ دیا جاتا ہے یا تحفے میں دیا جاتا ہے یا نیلام ہو جاتا ہے۔ میں اس کا پورا ٹریل تو نہیں ڈھونڈ سکی، لیکن پچھلے سات سالوں میں ہماری۔۔۔" وہ رکی اور مناسب لفظ ڈھونڈا۔ "گیارہ بڑی "جابز" (وارداتوں) میں سے پانچ میں یہ سکہ موجود تھا۔"

"اور باقی میں؟" اس نے بے قراری سے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ ٹیب لے، مگر داتن نے اسے پیچھے

کرلیا اور خفگی سے بھنویں سکیڑیں۔ "اگر تم چند لمحے کا سکوت اختیار کرو اور مجھے خود کو متاثر کرنے کا موقع دو تو میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ بے شک باقی سات وارداتوں میں یہ سکہ موجود نہیں تھا، مگر ان ساتوں جگہوں پہ جو چیزیں موجود تھیں میں نے ان کی لسٹ بنائی تو۔۔۔"

"تو کوئی اور چیز تھی جو ان ساتوں جگہوں پہ موجود تھی' ہے نا۔" وہ تیزی سے بولی تو داتن نے لب بھینچ لیے۔ منہ کا ذائقہ تک خراب ہو گیا تھا۔ مگر ضبط کرکے کہنے لگی۔

"ہاں۔۔۔ میں نے سارا دن لگا کر کرائم سین فوٹوز اور اپنے ریسرچ ورک کو جو ہم نے واردات سے پہلے کیا تھا' اکٹھا کیا اور تمام فہرستوں کو کراس چیک کیا' تو وہ ایک آئٹم تھا جو ان سب میں مشترک تھا۔ بوجھو کون سا؟"

"ملاکہ سلطنت کی ایک ملکہ کا سونے کا بریسلیٹ ہے نا۔"

داتن کے کندھے ڈھیلے ہوئے' منہ کھل گیا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"چونکہ میں چائے بہت پیتی ہوں' اس لیے میری یادداشت بہت اچھی ہے اور آج مسز کامل کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے ان کا بریسلیٹ دیکھ کے مجھے یاد آیا کہ ملاکہ سلطنت کی ایک ملکہ کا بریسلیٹ بھی میں نے ان ہی سات جابز میں سے دو تین میں دیکھا تھا' مگر نظرانداز کر دیا' کیونکہ مجھے وہ نقلی لگا تھا اور ہم ہمیشہ اصلی اور تاریخی آرٹ پہ ہاتھ صاف کرتے ہیں' داتن! اور وہ مجھے تاریخی نہیں لگا تھا۔"

"اگر سب کچھ معلوم ہو گیا تھا تو میرے پاس کیوں آئی ہو؟" داتن نے برا سا منہ بناتے ہوئے ٹیب زور سے بند کرکے میز پہ رکھا۔

"کیونکہ اگر تم نے سارا دن اس کام پہ لگایا ہے تو شاید تمہیں کچھ ایسا معلوم ہوا ہو جو مجھے نہ ہو سکا ہو۔" اس پہ داتن کھلے دل سے مسکرائی۔

"ویسے میں غرور نہیں کرنا چاہتی' لیکن تم متاثر ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ' تالیہ بی بی! کیونکہ نہ وہ سکہ کوئی سکہ ہے' نہ وہ بریسلیٹ کوئی بریسلیٹ ہے۔ یہ دیکھو۔"

داتن نے ٹیب اسکرین اس کے سامنے کی تو وہ چونک کے آگے کو ہو کے دیکھنے لگی۔ وہاں ایک طرف سکے کی تصویر بنی تھی اور دوسری طرف ایک زنجیر والا بریسلیٹ بنا تھا' جس کے اوپر سونے کی مستطیل ڈلی سی تھی' جس کے آخر میں تین دانت بنے تھے۔

"بظاہر یہ ایک سکہ ہے اور وہ ایک بریسلیٹ' لیکن اگر ان دونوں کو جوڑ دو تو۔۔۔" داتن نے مسکراتے ہوئے بٹن دبایا تو ایک اور امیج جنریٹ ہوا' جس میں ان دونوں اشیا کے کنارے ملے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ "یہ دیکھو کیا بنتا ہے۔"

"چابی۔" وہ مسحور سی بولی۔ "یہ ایک چابی کے دو ٹکڑے ہیں' جس کے ساتھ زنجیر لگی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ ایک ٹوٹی ہوئی چابی ہے' جس کو ہمیں ڈھونڈنا ہے اور تمہاری تقدیر بار بار تمہیں اس کی طرف لے جاتی تھی' لیکن تم کبھی سمجھ ہی نہ سکیں۔" تالیہ کی آنکھوں میں چمک سی در آئی تھی۔

"سکہ نکالنا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ کل تنکو کامل کے گھر کچھ خاص مہمان آ رہے ہیں' ڈنر کی افراتفری میں' میں زیورات ادل بدل کرکے سکہ نکال لوں گی۔ سکے کی کاپی ہم اس لیے تیار نہیں کریں گے' کیونکہ بعد میں اگر ہمیں اس کو fence کرنا پڑا تو تنکو کامل یہ دعوا نہ کر سکے کہ اس کے پاس بھی ویسا ہی سکہ ہے' ورنہ ہمیں اس کی اچھی قیمت نہیں ملے گی۔ تم بریسلیٹ کو ڈھونڈو کہ یہ کس کے پاس ہے۔"

وہ بے دبے جوش سے بولی تو داتن نے ٹیک لگائے' سوچ کر ہنکارا بھرا۔ پھر مگ کا ڈھکن ہٹایا تو چائے کی خوشبو بھاپ کے ساتھ اوپر اٹھنے لگی۔ اس نے مگ لبوں سے لگایا' گھونٹ بھرا' اور مگ نیچے کیا۔ اس دوران جیسے الفاظ

جوڑے۔

"جتنا ان دو چیزوں کی ملکیت کی چین کو میں نے دیکھا ہے تالیہ... ان دونوں کو کبھی کسی نے نہیں چرایا۔ ان کو یا مالک بیچ دیتا ہے یا کسی میوزیم کو عطیہ کردیتا ہے۔ جہاں کسی نیلام پہ ان کو فروخت کردیا جاتا ہے یا مالک خود ہی کسی دوست کو تحفہ دے دیتا ہے، مگر..." پھر وہ چپ ہوئی۔ تالیہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، جس کے سامنے چائے کے بے رنگ دھوئیں کے مرغولے تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"مگر ایک عجیب بات مجھے محسوس ہوئی ہے۔" داتن نے کہنا شروع کیا۔

"میرا خیال تھا میرے ساتھ رہ رہ کر تم نے عجائبات پہ حیران ہونا چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں... میرا ذہن ہر اس چیز کو مان سکتا ہے، جس کو لوگ جھوٹ قرار دیتے ہیں، کیونکہ ہماری حکومتیں اور ہمارے دانش ور ہمیں ادنیٰ سمجھ کر ہم سے حقائق چھپاتے آئے ہیں... لیکن... یہ بات پھر بھی عجیب تھی، کیونکہ میں نے نوٹس کیا کہ ہر وہ پرائیویٹ اونر جس کے پاس یہ سکہ یا یہ بریسلیٹ رہا ہے، اس کو کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ کوئی بڑی موذی بیماری۔"

"ہو سکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو داتن۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ بس اس بریسلیٹ کو ڈھونڈو تاکہ ہم جلد از جلد اسے حاصل کر سکیں۔" پھر خلا میں دیکھتے ہوئے وہ گہری سانس بھر کے بولی۔ "مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں نے اتنے سال ضائع کردیے۔ میں کل سے یہی سوچ رہی ہوں۔ میری قسمت مجھے اس چابی تک لے جانا چاہتی تھی اور میں دوسری چیزوں میں پڑی رہی۔ اس چابی کی قیمت ان سب سے زیادہ ہوگی یقیناً۔ مجھے لگتا ہے داتن..." اس نے پرامید نظریں اس پہ جمائیں۔ "یہ وہی بڑی جاب" ہے جس کا میں انتظار کر رہی تھی۔ میری آخری چوری۔ Heist - اور اس سے میں اتنا کمالوں گی کہ پھر دوبارہ کوئی غلط کام نہیں کرنا پڑے گا۔"

"تالیہ... کوئی چوری ہماری آخری چوری نہیں ہو سکتی۔ ہم نہیں بدل سکتے۔ نہ کبھی بدلیں گے۔" اس نے سمجھانا چاہا، مگر وہ بضد تھی۔

"مجھے لگتا ہے میں بدل جاؤں گی۔ اس لیے اس چابی کو ڈھونڈو داتن۔ ایک آخری اونچا ہاتھ مار کے ہم کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے۔ میں فیصلہ کرچکی ہوں۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ ہم اس کی کھوج نہ لگائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کوئی بری شے... کوئی بلا ہماری گھات لگائے نہ بیٹھی ہو۔" وہ بے چین نظر آرہی تھی۔

"تم وہم کر رہی ہو یار۔ حوصلہ رکھو۔" وہ ناک سے مکھی اڑاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیگ بھی اٹھالیا۔ داتن نے سمجھ کے سر ہلا دیا۔

"اوکے... میں اسے ڈھونڈوں گی۔ مگر جو اس روز تم نے خواب دیکھا، تم نے بتایا تھا کہ اس میں بھی تم نے ایک آدمی کو کیچڑ میں لتھڑی چابی تمہاری طرف بڑھاتے دیکھا تھا۔" یاد کرتے ہوئے وہ خود چونکی۔ "کیا وہ یہی چابی تھی؟"

چائے کے مگ کا ڈھکن ہٹا تھا اور اس سے بھاپ ہنوز اُڑا رہی تھی۔ تالیہ ٹھہر گئی۔ خود بھی جیسے وہ چونکی تھی۔

"ہاں... وہ یہی تھی۔" اس نے ٹیبلٹ اٹھا کے پھر سے اس چابی کو غور سے دیکھا۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔ ایک ننھی کلائی پہ بندھا بریسلیٹ۔ پزل کا ایک اور ٹکڑا عین اپنی جگہ پہ آگرا تھا۔

"ویسے وہ آدمی کون تھا تالیہ؟" داتن نے تجسس سے پوچھا، مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔

"میں نے یہ بریسلٹ دیکھ رکھا ہے پہلے۔ مجھے پتا ہے یہ کس کا تھا۔" پھر اس کے چہرے پہ مُردگی آگئی۔ جیسے بے چینی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت ہو۔ "دفنسز ماریہ! آپ نے اچھا نہیں کیا۔" اس نے ٹیبلٹ پٹخا اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ داتن حیرت سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

"اسے کیا ہوا؟"

اگلی صبح جب کوالالمپور کی بلند بالا عمارتیں دھوپ میں سینہ تانے کھڑی تھیں اور نمی سے بوجھل فضا نے ماحول میں حبس سا پیدا کر رکھا تھا، شہر کے ایک مفلوک الحال علاقے میں فلیٹ بلڈنگز کی بالکونیوں میں رسیوں پہ کپڑے سوکھتے دکھائی دے رہے تھے۔ اتوار کے باعث شاید ساری عمارت کی عورتوں نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔

ایسے میں تالیہ بنت مراد ایک فلیٹ بلڈنگ کی گندی میلی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

وہ مالے طرز کا حجاب پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ اور لمبی قمیص جیسا لباس اور اس کے اوپر کس کے لیا گیا اسکارف۔ جس پر مزید ایک دوپٹہ پھیلا رکھا تھا۔ آنکھوں پہ نظر کا چشمہ لگا تھا اور وہ پہلے سے مختلف نظر آرہی تھی۔

تیسری منزل کے ایک دروازے کے سامنے وہ رکی اور بیل بجائی۔

"آرہی ہوں۔" عورت کی آواز سنائی دی جیسے وہ تکلیف میں آہستہ آہستہ چلتی دروازے تک آرہی ہو۔ پھر دروازہ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر خاتون نظر آئیں جن کا چہرہ کریلے کے چھلکے کی مانند جھریوں زدہ تھا اور سفید سرمئی بال چوٹی میں گندھے تھے۔ نظر کے موٹے چشمے سے انہوں نے سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے کو دیکھا تو چہرہ کھل اٹھا۔

"تا... تالیہ... آؤ آؤ۔ بڑے عرصے بعد آئیں تم۔ آجاؤ....." اس نے خوشی سے اسے راستہ دیا۔ وہ سلام کر کے سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ وہ تنگ و تاریک سا فلیٹ تھا۔ سامنے ایک لاؤنج نما چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں صوفے رکھے تھے۔ عورت گھٹنوں کے درد کے باعث ٹیڑھی سیدھی چلتی آگے آگئیں، صوفوں سے کپڑے ہٹائے اور بیٹھنے کو جگہ بنائی۔

"آؤ بیٹھو۔ آج مشین لگا رہی تھی تو سارے کپڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ایک میرے کتنے کپڑے ہوتے ہیں۔ تم بیٹھو میں شربت لاتی ہوں۔"

"اوکے مسز ماریہ۔" وہ مسکرا کے بیٹھ گئی۔ وہ گئیں تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور اس پہ خفگی نظر آنے لگی۔ جسے اس نے پھر سے مصنوعی مسکراہٹ کے پردے میں چھپالیا۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے شربت کی ٹرے رکھ رہی تھیں۔ "اتنا اچھا لگتا ہے تمہیں یوں دیکھ کے۔ ابھی تک اسکول میں پڑھا رہی ہو؟"

"جی۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "دینیات اور میتھس پڑھاتی ہوں۔" وہ نظریں جھکا کے بڑی شرافت سے بولی تھی۔

"شوہر، بچے، سب ٹھیک ہیں۔"

"جی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے تو میں وقت نکال کے آگئی۔" اسکام آرٹسٹ کی مسکراہٹ ویسی ہی سادہ تھی۔

"کبھی ان کو ساتھ بھی لے آؤ مجھ سے ملوانے۔ صرف تصویریں دکھائی ہیں تم نے اب تک۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"بس جب آپ سے ملتی ہوں تو اپنا آپ بھی بچہ لگنے لگتا ہے۔ آپ یتیم خانے کی منتظم تھیں اور تین سال میرا وہاں خیال رکھا تھا آپ نے۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کے پرانی باتیں یاد کرنے کا دل کرتا ہے مسز ماریہ۔" اس نے بات بدلی۔

"خوش رہو، جیتی رہو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "جو بچے یتیم خانہ چھوڑ جاتے ہیں، وہ کبھی واپس نہیں آتے۔ مگر جس طرح تم ملنے آتی ہو، میسج بھیجتی رہتی ہو، دل بہت خوش ہوتا ہے۔"

شربت سے بھرا گلاس دونوں کے درمیان ان چھوا رکھا تھا۔ تالیہ نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس نظریں ان کے بیمار زرد چہرے پہ جمائے رکھیں۔

"مسز ماریہ۔ آپ کو بھی علم نہیں ہو سکا کہ مجھے وہاں کون چھوڑ گیا تھا۔"

"یہ معمہ میں کبھی بھی حل نہیں کر سکی۔ رات کو چرچ بند ہوتا تھا۔ صبح جو پہلا بندہ ادھر گیا' اس کو تم وہیں ملی تھیں۔"

"مجھے وہ سب یاد ہے۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ آپ عبادت کے لیے جلدی آگئی تھیں اور مجھے روک کے کچھ پوچھا تھا آپ نے۔"

"ہاں' میں پھر تمہیں یتیم خانے لے آئی۔ وہیں پولیس بھی بلائی۔ مگر کوئی بھی تمہارے ماں باپ کو نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔ تمہارے کپڑے عجیب سے تھے پھٹے پرانے' میلے کچیلے۔ تمہیں میں نے نئے کپڑے دیے۔ تمہیں تیار کیا۔ اور...." وہ یاد کر کے ذرا جوش سے بولے جا رہی تھیں کہ تالیہ ایک دم بولی۔

"مجھے میرے ماں باپ مل گئے ہیں مسز ماریہ!" مسز ماریہ رکیں۔ منہ کھل گیا۔ بے یقینی سے تالیہ کو دیکھا جس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے اور وہ خوشی سے بتا رہی تھی۔

"ایک ویب سائٹ گمشدہ بچوں کو ان کے ماں باپ سے ملاتی ہے۔ میں نے وہاں اپنے بچپن کی تصویر ڈالی تو ایک جوڑے نے مجھ سے رابطہ کیا۔ سوہالے ہیں مگر امریکہ میں رہتے ہیں۔ میں نے ان کو اپنی ڈی این اے رپورٹ بھیجی تو وہ میچ کر گئی۔ اب میں امریکہ جا رہی ہوں۔"

"واؤ تالیہ۔ واؤ۔" وہ خوشگوار سی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگیں۔ "میں بہت خوش ہوں تمہارے لیے۔ یہ تو انہونی ہو گئی۔ مگر اس وقت وہ کیوں نہیں آئے تھے تمہیں کلیم کرنے؟"

"ان کی مجبوریوں کی لمبی داستان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا لیکن۔۔۔" وہ ٹھہری۔ آواز رازدارانہ سرگوشی میں بدلی اور آگے کو جھکی۔ "انہوں نے بیس ہزار ڈالر کا انعام دینے کا وعدہ کیا ہے میرے کیئر ٹیکرز کو۔ میری لاہور والی فیملی اتنی اچھی نہیں تھی' میں نہیں چاہتی' یہ انعام ان کو ملے۔ میں چاہتی ہوں' یہ یتیم خانے کے لوگوں کو ملے یعنی آپ کو ملے۔" اسکام آرٹسٹ نے پہلا پتا پھینکا۔

"بیس ہزار ڈالر؟" ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

"جی مسز ماریہ! وہ بہت امیر لوگ ہیں۔ میرے بعد ان کی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ خوشی میں کر رہے ہیں یہ سب مگر.... ایک مسئلہ ہے۔"

"کیا؟" ان کی سانس اٹک گئی۔

"وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ ثابت کر کے دوں کہ آپ واقعی مجھے چرچ میں ملی تھیں۔ ظاہر ہے اتنی بڑی رقم دینے سے پہلے ان کو گارنٹی چاہیے کہ آپ واقعی میری کیئر ٹیکر تھیں یا نہیں۔"

"میں۔۔۔ میں کیسے ثابت کروں؟" وہ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں اور مارے جذبات کے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"آپ کوئی نشانی بتا سکتی ہیں۔ کوئی ایسی بات جو صرف آپ کو ہی معلوم ہو۔۔۔۔ اصل میں۔ اصل میں...." اس نے لہجے کو سرسری بنایا۔ نگاہیں ایک لمحے کو بھی خاتون کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔ "کل.... میں مال میں ایک بریسلیٹ دیکھ رہی تھی.... تو مجھے یاد آیا۔۔۔ چرچ کا منظر۔۔۔ میری یادداشت اچھی ہے کافی۔۔۔ چرچ سے لے کر اب تک سب یاد ہے مجھے۔ پہلے یہ بات مجھے اہم نہیں لگی تھی مگر کل۔۔۔ اپنے ماں باپ سے ملنے کے بعد۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ میری کلائی میں ایک بریسلیٹ تھا' جس پہ سونے کی ایک چابی بنی تھی۔ صرف پہلے منظر میں مجھے وہ یاد ہے۔ پھر وہ پتا نہیں کہاں گیا۔ اگر آپ اس کے بارے میں کچھ بتا دیں تو...."

وہ بنا پلک جھپکے مسز ماریہ کو دیکھ رہی تھی جن کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔

"وہ؟" وہ چپ ہو گئیں۔
"چلیں' اگر آپ کو نہیں یاد تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنے والدین کو یتیم خانے والے قاسم صاحب کا نام دے دیتی ہوں تاکہ۔۔۔" وہ اٹھنے لگی تو انہوں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھاما۔
"نہیں نہیں۔۔۔ قاسم نے کیا کیا تمہارے لیے؟ مجھے یاد ہے۔ میں بتاتی ہوں۔" انہوں نے بڑبڑا کے اسے روکا۔ "تمہارے ہاتھ میں ایک بریسلیٹ تھا۔ اصل میں وہ چابی تھی جس کی سنہری چین کو تم نے کلائی پہ پہن رکھا تھا۔ میں نے وہ تمہارے ہاتھ سے اتاری تو وہ ایک دم ٹوٹ گئی۔ مجھے نہیں پتا تالیہ! یہ کیسے ہوا مگر اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ سکہ الگ ہو گیا اور بریسلیٹ ہڈی سی رہ گئی۔ مجھے تمہاری نگہداشت کرنا تھی' تمہارے لیے یتیم خانے میں جگہ بنانا تھی' فنڈز نہیں تھے' میں کیا کرتی تالیہ۔"
"اٹس او کے۔" تالیہ نے نرمی سے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔ "آپ نے وہ چرا لیا کیونکہ آپ کو پیسے چاہیے تھے' میں اس بات کو سمجھ سکتی ہوں۔" پھر اس نے سیل فون کی اسکرین سامنے کی۔ "کیا وہ ایسا تھا؟"
انہوں نے غور سے اسکرین کو دیکھا۔ "ہاں' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ایسا ہی ڈیزائن تھا۔ اتنے سال ہو گئے۔ اب یادداشت جواب دینے لگی ہے۔ آئی ایم سوری مگر میری مجبوری تھی۔" ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میرا ایک رشتہ دار سنار تھا' میں نے وہ اس کو بیچ دیا۔ وہ عجیب سی چیز تھی۔ مجھے اس سے خوف آتا تھا مگر اس کے جانے کے بعد تم چپ ہو گئیں بالکل۔"
تالیہ نے بے اختیار صوفے کی گدی مٹھی میں بھینچ لی۔ اس کا سانس اٹک گیا تھا۔ "اس کے بعد چپ ہوئی؟ مگر آپ لوگ تو کہتے تھے کہ میں ہمیشہ سے چپ تھی' مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔"
"نہیں۔ پہلے چند منٹ جب تک تمہارے ہاتھ میں بریسلیٹ تھا تم نے کچھ باتیں کی تھیں۔ وہ تمہارے ہاتھ میں چمکتا تھا۔ جیسے اس سے روشنی نکلتی ہو۔ میں نے اسے تمہاری کلائی سے اتارا تو وہ بجھ گیا اور چابی دو ٹکڑے ہو گئی۔ مجھے اس سے خوف آیا تھا تالیہ۔"
"میں نے۔۔۔ کیا باتیں کی تھیں۔" اس نے رندھے گلے سے پوچھا تھا۔
"صحیح الفاظ یاد نہیں۔ اتنے سال بیت گئے اب تو تالیہ۔ مگر اتنا یاد ہے کہ تم نے کہا تھا۔ گاؤں والے مصیبت میں ہیں۔ تم ان کے لیے مدد لینے آئی ہو ورنہ سب مر جائیں گے۔ تم نے کہا' تمہیں ان سب کو بچانا ہے۔ میں نے پوچھا' یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے تو تم نے کہا' یہ میرے بابا نے مجھے دیا ہے۔ میں نے تمہارا نام پوچھا تو تم نے کہا تالیہ بنت مراد۔ لیکن جب میں نے وہ بریسلیٹ اتارا تو تم خاموش ہو گئیں' جیسے تمہیں سب بھول گیا ہو۔"
تالیہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے مگر اب کی بار وہ اصلی آنسو تھے۔ "اور کچھ؟"
"اور مجھے یاد نہیں۔ کیا یہ کافی ہو گا تمہارے ماں باپ کو یقین دلانے کے لیے؟"
"ہوں؟" وہ چونکی۔ پھر اپنی کور اسٹوری یاد آئی تو زبردستی مسکرائی۔ "میں ان کو بتا دوں گی۔ اب میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔
"انعام کی رقم کب تک ملے گی؟" وہ بے قراری سے اس کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ وہ بدقت مسکرا کے ان کو اطمینان دلانے لگی۔

☆ ☆ ☆

رات اس پوش علاقے پہ اپنے پر پھیلائے اتری تو حالم کے اس اونچے عالی شان گھر کی بیرونی بتیاں جگمگاتی دکھائی دینے لگیں۔

لاؤنج میں البتہ اندھیرا تھا' صرف بڑی سی ٹی وی اسکرین چمک رہی تھی جس کے سامنے وہ دونوں صوفے پہ بیٹھی تھیں۔

داتن نے سیاہ کھلا لباس پہن رکھا تھا اور ٹانگوں کی قینچی بنا رکھی تھی۔ گود میں پاپ کارن کا پیالہ تھا جس سے وہ بھنے ہوئے تازہ خستہ پاپ کارن نکال نکال کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ نظریں اسکرین پہ جمی تھیں جہاں ایک مالے گیم شو چل رہا تھا۔ ایک فیملی گھر جیتنے ہی والی تھی اور داتن کی سانس رک رک کے آرہی تھی۔

ساتھ پیر اوپر کر کے بیٹھی تالیہ سامنے خلا میں گھور رہی تھی۔ گم صم۔ کسی اور دھیان میں۔ سیاہ بال ہیئر بینڈ لگا کر پیچھے کر رکھے تھے اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ انگلی بے مقصد سی صوفے کے ہتھے پہ بنے ڈیزائن پر پھیر رہی تھی۔

"آخری راؤنڈ ہے... اف اللہ۔" داتن ذرا آگے ہوئی۔

"وہ چابی میری تھی' داتن۔ وہ میرے باپ نے بنائی تھی۔"

داتن چونکی اور گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ اسی طرح صوفے کے ڈیزائن پہ انگلی پھیرتی۔ بے خودی سی بولے جارہی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی تھی۔

"میں آج مسز ہاریہ سے ملنے گئی تھی۔" الفاظ اس کے لبوں سے بہتے جارہے تھے گویا مکئی کے دانے ہوں۔ جو حدت ملنے پہ چیخ چیخ رہے ہوں۔ وہ کہے جارہی تھی اور داتن بھٹے کی خستہ خوشبو سے دہک گئی تھی۔ اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے' آنکھوں میں غصہ ابھر آیا۔

"اس نے تمہارا بریسلیٹ بیچ دیا؟ اف اف۔ خبردار جو آئندہ تم نے مسز ہاریہ کی کوئی — مدد کی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ ایک بددیانت چور ہے!"

"اور میں کیا ہوں؟" اس نے سادگی سے داتن کو دیکھا تو وہ ناک سکیڑ کے رہ گئی۔

"اس عورت نے تین سال میرا خیال رکھا' جب مجھے کوئی اور لینے نہیں آیا۔ مجھے ان پہ تھوڑا غصہ آیا تھا مگر مجھے ان سے گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"خیر... اب کیا کرنا ہے؟"

"تم بریسلیٹ تلاش کرو' میں سکے کو تنکو کامل کے لاکر سے چوری کرتی ہوں۔ کل جب مہمانوں کا رش ہوگا تو میں موقع دیکھ کے اسٹڈی میں چلی جاؤں گی۔"

"کیا تم وہ چابی صرف پیسوں کے لیے چرانا چاہتی ہو تالیہ؟"

تالیہ نے گہری سانس لی' داتن کو دیکھا اور مٹھی بھر کے پیالے سے پاپ کارن اٹھائے۔

"جب تک مجھے یہ یاد نہیں آیا تھا کہ وہ میری چابی ہے' میں اسے دولت کے لیے ہی چرانا چاہتی تھی' مگر اب..."

اس نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے پاپ کارن پھانکے۔ اور بند ہونٹ ہلاتے ہوئے انہیں چبانے لگی۔ لمحے بھر کو لاؤنج میں سناٹا چھا گیا۔ داتن اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو ٹی وی اسکرین کی نیلی روشنی میں دمک رہا تھا۔

"مگر اب شاید مجھے میرے تمام سوالوں کے جواب بھی مل جائیں' میں کون ہوں' کہاں سے آئی ہوں۔ سب معلوم ہو جائے۔"

"اور تمہارے ماں باپ۔ تم ان سے نہیں ملنا چاہتیں؟ اور وہ گاؤں والے جن کا تم نے ذکر کیا تھا؟"

"سچ کہوں تو نہیں' داتن۔ میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ مجھے ان سے نہیں ملنا۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ

وہ دیکھیں، میں کیا بن گئی ہوں۔" وہ تلخی سے مسکرا کے اسکرین کو دیکھنے لگی۔ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ مسز ماریہ کی آواز ہر جگہ گونج رہی تھی۔

(تم نے کہا تھا، گاؤں والے مصیبت میں ہیں۔ تم ان کے لیے مدد لینے آئی ہو ورنہ سب مر جائیں گے۔ تم نے کہا، تمہیں ان سب کو بچانا ہے۔)

اس نے سر جھٹکا۔ (مجھے کسی کو نہیں بچانا۔ مجھے کسی کی مدد نہیں کرنی۔ اب تک تو سب مر کھپ گئے ہوں گے۔ مجھے صرف چابی کو اچھے داموں بیچنا ہے۔ تاریخی نوادرات مہنگے داموں بک جاتے ہیں۔ میرے خواب... ایک جزیرے پہ ایک اونچا محل... بس مجھے یہی سوچنا ہے۔)

"ویسے کل کون آ رہا ہے تنکو کامل کے گھر؟" داتن کی بات نے اس کو گہری سوچ سے نکالا۔

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "جب بڑے لوگ بڑے لوگوں کے گھروں میں آتے ہیں تو وہ ہم چھوٹے لوگوں کو تفصیلات نہیں بتاتے۔ سیکورٹی پروٹوکول۔"

مگر داتن جواب سنے بنا اسکرین کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ فیملی آخری راؤنڈ میں تھی، گھر جیتنے کے بہت قریب۔

☆ ☆ ☆

صبح سے تنکو کامل کے گھر صفائی اور تیاریوں کا ایسا سماں بندھا تھا کہ چند ایک بار تو تالیہ نے بٹلر کو روک کے پوچھنا چاہا کہ "آخر کون آ رہا ہے؟" مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ کون سا وہ وہ بتا دے گا۔ ہونہہ۔

مسز شیلا کامل مضطرب اور پرجوش سی کچن میں ایک ایک چیز اپنی نگرانی میں تیار کروا رہی تھیں۔ باریک ہیل پہنے وہ بالوں کو پارلر سے سیٹ کروائے بے حد خوش اور نروس نظر آ رہی تھیں۔ مگر جب انہوں نے تالیہ اور تسنیم کو کھانا لانے کی ترتیب کی ہدایت دینا شروع کی تو تالیہ کے ابرو حیرت سے اکٹھے ہوئے۔

"پچیس منٹ؟ صرف پچیس منٹ کے لیے وہ لوگ آ رہے ہیں کیا؟"

مسز کامل نے اسے یوں دیکھا گویا اس کی عقل پہ افسوس کیا ہو۔

"ہاں تالیہ۔ پچیس منٹ بھی بہت ہیں۔" اور ناک سے مکھی اڑاتی آگے بڑھ گئیں۔

تسنیم نے کندھے اچکا دیے۔ کسی ملازم کو اندازہ نہ تھا کہ مہمان کون تھے۔ بس بٹلر نے کام کے دوران اتنا بتایا کہ سر کے کلاس فیلو اور ان کی بیگم ہیں۔

تسنیم نے بٹلر کے آگے بڑھتے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کامل صاحب کے کلاس فیلو ہیں تو اچھے خاصے بوڑھے ہوں گے۔ آخر ایک بوڑھے اور بڑھیا کے آنے پہ اتنا ہنگامہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

تالیہ بے اختیار ہنس دی۔ پھر اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے ایپرن پہ سامنے ہاتھ رکھ کے نقلی زیورات کی موجودگی کی تصدیق کی جو پوٹلی کی صورت بیلٹ کے ساتھ اس کی کمر سے بندھے تھے۔ لاکر کھول کے زیورات ادل بدل کرنے کے لیے پچیس منٹ بھی کافی تھے۔

شام ڈھل گئی اور گھر پہ اندھیرا چھانے لگا۔ مالے کے گھر بھی کراچی کے بنگلوں جیسے تھے۔ ویسے ہی لان، پورچ، ڈرائیو وے اور سامنے گیٹ، اونچی چار دیواری۔ کچن کی کھڑکی سے لان نظر آتا تھا۔ وہاں تنکو کامل اپنے بیوی بچوں سمیت کب سے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔

تالیہ منہمک سی کھڑی سلاد پلیٹ میں سجا رہی تھی جب باہر پر رونق سا شور مچا۔ تسنیم اور نور (ساتھی ملازمائیں)

لیک کے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گاڑیوں کے اندر آنے اور دروازوں کے کھلنے بند ہونے کی آوازوں کے ساتھ دعا سلام کی آوازیں بھی گونجی تھیں۔ تالیہ مزے سے سلاد کے قتلے ڈش میں سجاتی گئی۔

"او خدایا۔۔۔ اف اف۔۔۔ کیا تم نے انہیں دیکھا؟" کھڑکی سے باہر جھانکتی تسنیم نے مہمانوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا تو مارے جوش کے اس نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ نور با قاعدہ اوپر اچھلی پھر دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔

"اف۔۔۔ یہ تو۔۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"انہوں نے گرے سوٹ پہن رکھا ہے۔"

"وہ ان کی وائف کو دیکھو۔ اس نے صبح یہی ڈریس مارننگ شو کے انٹرویو میں پہنا ہوا تھا۔ اف، اف۔۔۔"

ان دونوں کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے اور وہ کبھی منہ پہ ہاتھ رکھتیں، کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ مارے جوش کے پکڑتیں۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور افسوس سے سر جھٹکا۔

(خیر۔۔۔ یہ بے چاریاں ملازمائیں ہیں، امیر اور مشہور لوگ دیکھنے کا موقع کہاں ملتا ہے ان کو۔ ان کا ایسا جذباتی ہونا بنتا ہے۔) اس نے سلاد کی ڈش رکھی اور تسلی سے ہاتھ رومال سے پونچھتی آگے آئی۔ ان دونوں کے قریب رکی اور باہر جھانکا۔

گارڈز اور چند افراد کے ہمراہ وہ دونوں میاں، بیوی کار سے اتر چکے تھے اور میزبانوں سے مل رہے تھے۔ گرے سوٹ والا آدمی دراز قد اور دبلا پتلا تھا۔ فٹ اور اسمارٹ۔ مسٹر کامل سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی پشت تالیہ کی طرف تھی۔ پھر وہ پلٹا تو تنکو کامل کے بیٹے علی کے قریب ٹھہرا۔ علی نے اس کا ہاتھ تھاما اور چوم کے آنکھوں سے لگایا۔ یہ مالے لوگوں کا بڑوں سے ملنے کا طریقہ تھا اور تب تالیہ نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا۔

"ہا!" اس نے بے اختیار ہونٹوں پہ ہاتھ رکھا تھا۔ آنکھیں شاک سے پھیل گئیں، سانس اٹک اٹک گئی اور رنگت گلابی پڑنے لگی۔ "اوہ گاڈ۔۔۔ اوہ گاڈ۔۔۔" اس نے بے یقینی سے نور اور تسنیم کو دیکھا جو اتنی ہی بے یقینی سے اور خوشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

وہ شخص اب مسکرا کے بچے کا سر تھپک رہا تھا، پھر چہرہ کامل صاحب کی طرف موڑ کے کچھ کہنے لگا اور ادھر تالیہ مراد کھڑکی میں ہکا بکا سی کھڑی تھی۔ نور نے اس کا کندھا ہلایا۔ "تمہارا فون بج رہا ہے تالیہ۔"

وہ چونکی، پھر ایپرن کی جیب سے فون نکال کر بغیر دیکھے کان سے لگایا۔ نظریں وہیں باہر جمی تھیں۔ دوسرا ہاتھ ابھی تک ہونٹوں پہ تھا۔ اف۔۔۔

"بریسلیٹ کا پتا چل گیا تالیہ۔۔۔! اور تم یقین نہیں کروگی کہ وہ کس کے پاس ہے۔" داتن جوش سے بتا رہی تھی۔
"میری اس شخص سے بات ہوئی ہے جس نے آخری دفعہ اسے بیچا ہے۔ اس سے ایک آدمی نے خریدا تھا، وہ بریسلیٹ اپنی بہن کی سالگرہ کے لیے اور جانتی ہو اس کی بہن کس کی بیوی ہے؟"

"شاید میں جانتی ہوں۔" وہ نظریں باہر ٹکائے بے خودی سی کہہ رہی تھی۔

وہ پورچ میں کھڑا، علی بن کامل کی طرف اشارہ کرکے اس کے باپ سے کچھ پوچھ رہا تھا یا شاید بچے کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ دراز قد تھا، سرو جسم والا، بے حد فٹ اور تیز چلنے والا آدمی۔۔۔

"نہیں، تم نہیں جانتیں۔ اس کی بہن کا شوہر اس ملک کا سب سے پاپولر لیڈر ہے۔"

اس کی رنگت صاف تھی، بے حد صاف۔ نقوش تیکھے مگر بہت پرکشش۔ وجیہہ چہرہ اور چمکتی ہوئی خوب صورت آنکھیں۔ وہ اب تنگو کامل کی بات پہ مسکرا رہا تھا۔

"بارعب جینٹل کا ہونے والا نیا صدر۔"

اس کے بال سیاہ تھے اور نفاست سے برش کرکے پیچھے کر رکھے تھے۔ کانوں کے اوپر سے وہ سفید تھے جو اس کے

چہرے کی نرمی اور وقار میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ اڑتالیس برس کا تھا مگر اپنی فٹنس اور جوان نظر آتے چہرے کے باعث عمر سے دس پندرہ برس کم دکھائی دیتا تھا۔
"ہمارے ملک کا اگلا وزیراعظم۔۔۔ وان فاتح رامزل۔۔۔ اس کے گھر ہے، تمہارا بریسلیٹ، تالیہ۔۔۔"
بے یقین سی تالیہ ہنوز باہر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ دونوں ملازمائیں باہر بھاگ چکی تھیں۔
"اور اگر میں تمہیں یہ کہوں داتن کہ وان فاتح رامزل اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے تو کیا تم یقین کروگی؟" وہ بے خودی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف داتن نے گہری سانس بھری تھی۔
"تالیہ۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ اس کا نام سن کر تم صدمے اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت میں ہو، اس لیے کوئی بات نہیں، ٹھنڈا پانی پیو اور پھر لاکر کی طرف جاؤ۔ بریسلیٹ کا ابھی نہ سوچو۔" اس کے الفاظ نے کوئی بلبلہ سا پھاڑ دیا تھا۔ تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔
"چپ کرو، موٹی کالی مرغی!" وہ جل کر بولی اور فون بند کرکے جیب میں رکھا، پھر کھڑکی سے باہر جھانکا تو پورچ اب خالی تھا۔ یقیناً" مہمانوں کو لے کر میزبان اندر ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے۔ اس نے بے قراری سے کچن کے دروازے کو دیکھا۔ سب ملازم مہمانوں کے آگے پیچھے بھاگ چکے تھے۔ وہ جائے یا نہیں؟
اونہوں۔۔۔ اس نے گہرے گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کیا۔ کندھے اچکائے اور سینے پہ بازو لپیٹ کر وہیں کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔
"میں نہیں جاؤں گی۔ میں کوئی باقی لوگوں کی طرح فاتح رامزل کی اتنی بڑی فین تھوڑی ہوں، جو اپنے ذاتی وقار اور خوداعتمادی کو پس پشت ڈال کر چھوٹے لوگوں کی طرح سیلیبرٹی کے آگے پیچھے بھاگتی پھروں۔۔۔ ہونہہ۔۔۔" وہ اسی طرح اکڑ کے کھڑی رہی۔ چند سانسیں لیں۔ پھر ایک دم بازو نیچے گرائے اور باہر کو بھاگی۔
(مٹی ڈالو وقار اور اعتماد پہ۔ وہ فاتح رامزل ہے۔۔۔ اف۔۔۔ دی فاتح رامزل۔)
تیز تیز دوڑتی وہ ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی تھی۔ چہرہ خوشی سے گلابی سا ہو کر تمتمانے لگا تھا۔ ملازمائیں وہاں پہلے سے کھڑی پرجوش سی سرگوشیاں کررہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے پاس آرکی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر یہاں سے صرف کامل صاحب اور مسز کامل بیٹھے نظر آتے تھے۔ مہمان نہیں۔ تب ہی بٹلر باہر نکلا اور سخت لہجے میں تالیہ کو مخاطب کیا۔
"جوس تم سرو کروگی، جلدی۔"
اس کی رنگت مزید گلابی پڑ گئی۔ جھٹ سر ہلایا اور کچن کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی ٹرے لگائی اور ڈرائنگ روم تک آئی۔ دروازے پہ لگے بیضوی آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ سائڈ کی مانگ نکال کر بالوں کو کس کر جوڑے میں باندھے، وہ سرمئی سفید یونیفارم میں ملبوس تھی۔ چہرہ دھلا دھلایا اور آنکھیں سبز تھیں۔ وہ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ "اف خیر ہے۔" اس نے سر جھٹکا اور اندر داخل ہوئی۔
ڈرائنگ روم میں تیز اے سی چل رہے تھے، مگر اس کے ہاتھوں پہ پسینہ آرہا تھا۔ ٹھنڈے ماحول کو زرد لیمپوں کی روشنیوں نے مزید مسحور کن اور پرفسوں بنا رکھا تھا۔ میزبان جوڑے کے علاوہ مہمان جوڑا اور تین افراد بیٹھے تھے۔ فاتح رامزل سامنے والے صوفے پہ موجود تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلائے وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چہرہ ذرا موڑے کامل صاحب کی بات سن رہا تھا۔ برابر میں اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ اس کے بال بھورے سرخ ڈائی تھے اور بالکل سپاٹ چہرہ لیے ہوئے تھی۔ آنکھیں بے جان تھیں۔ وہ دونوں ٹرے اٹھائے آتی ملازمہ کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ تالیہ باری باری سب کے پاس رک کر جوس پیش کرنے لگی۔

"سوری - میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں۔" جذباتی سی مسز کامل نے اپنے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کے کہا۔ "مگر وان فاتح رامزل اور مسز رامزل۔۔۔ آپ دونوں کا ایک دفعہ پھر شکریہ کہ آپ نے ہمارے گھر کو رونق بخشی۔"

"مائی پلیژر۔۔۔" وہ بھاری مسکراتی آواز میں بولا تھا۔ تالیہ کی اس طرف پشت تھی۔۔۔ یہ آواز۔۔۔ یہ شخص۔۔۔ یہی تھا اس کے خواب میں۔۔۔ (میرے ساتھ رہو۔۔۔ میرے ساتھ رہو۔) اس نے سر جھٹکا اور جھک کے اگلے صاحب کے سامنے ٹرے کی۔

"کیا یہ درست ہے سر! کہ آپ استعفیٰ دے رہے ہیں اور واپس امریکہ شفٹ ہو رہے ہیں؟ ہم نیوز میں سنتے رہتے ہیں۔" کامل صاحب کے سوال پہ تمام نظریں فاتح رامزل کی جانب اٹھی تھیں۔ وہ جواباً "کھنکھارا۔

"دیکھو تنکو کامل۔۔۔! بات یہ ہے کہ فاتح بن رامزل جیسا انسان جو دو دفعہ امریکہ میں اسٹیٹ اٹارنی کا الیکشن لڑ کے منتخب ہوا تھا اور جس کے زمانے میں اسٹیٹ اٹارنی آفس میں پراسیکیوشن کا ریکارڈ مثالی رہا تھا اور جو پندرہ سال پہلے امریکہ چھوڑ کے۔۔۔ امریکی شہریت چھوڑ کے صرف مالے قوم کے لیے واپس آیا تھا اس آدمی کو اتنی لمبی اسٹرگل (جدوجہد) کے بعد اگر باریسن پارٹی کا صدر منتخب ہونے کے لیے اور فنڈز حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کے محل میں ہر روز ماتھا ٹیکنا پڑے 'جیسے وہ تعظیم بدھا ہو اور میں ایک پجاری 'تو نہیں' فاتح یہ نہیں کرے گا۔ مجھ سے یہ منافقت نہیں ہوتی 'کیونکہ ہمارے بادشاہ اور ہمارے وزیراعظم دونوں کو اس وقت جیل میں ہونا چاہیے۔ ہاں۔۔۔ میں جیل میں ان دونوں کو ہر ہفتے وزٹ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اس بات پہ قہقہہ پڑا تھا۔

(مگر فاتح رامزل نے سوال کا جواب نہیں دیا۔) وہ سوچتے ہوئے سپاٹ چہرہ بنائے اب بڑے صوفے تک آ رکی تھی۔ فاتح رامزل کے ایک طرف سے جھک کر ٹرے پیش کی۔ کپکپاتی پلکیں اٹھا کے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ تنکو کامل کو دیکھ رہا تھا 'مسکرا کے۔ ایک شان بے نیازی سے۔ تالیہ کھڑی رہی تو مسز فاتح نے ایک نظر اسے دیکھ کے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔ (وہ یہ جوس نہیں پیتے۔) تالیہ آگے بڑھ گئی۔ دل بجھ سا گیا تھا۔

باہر جا کر وہ وہیں دروازے کی اوٹ میں ٹھہر گئی۔ مسز کامل کہہ رہی تھیں۔

"لیکن آپ ایک ممبر پارلیمنٹ ہیں سر! کیا آپ واقعی استعفیٰ دے رہے ہیں؟"

"تنکو شیلا۔۔۔" وہ ہر ایک کو اس کے فرسٹ نیم سے پکار رہا تھا۔ "میں سیاست میں طاقت یا دولت حاصل کرنے نہیں آیا تھا۔ فاتح بن رامزل ایک Dreamer ہے۔ ایک وژنری۔ جو ایک بہتر ملائیشیا کا خواب دیکھتا ہے۔ مگر مالے قوم کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری رولنگ پارٹی اتنی بھاری اکثریت سے منتخب ہوتی آ رہی ہے کہ پارلیمنٹ میں اس کی کوئی اپوزیشن ہی نہیں رہ گئی۔ کوئی بھی جمہوری گورنمنٹ تب تک صحیح کام نہیں کر سکتی جب تک اس کے خلاف اپوزیشن نہ ہو۔ زندگی کے ہر مقام پہ یہ مخالفت ہوتی ہے 'جو ہم سے ہماری اصلاح کرواتی ہے اور ہم بہتر کام کرتے ہیں۔ اگر باریسن پارٹی ایک اچھی اپوزیشن نہیں بننا چاہتی 'اگر پارلیمنٹ خود کو مضبوط نہیں کرتی تو اخلاقی طور پہ پارٹی صدر بننے یا ممبر پارلیمنٹ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔"

باہر کھڑی تالیہ مسکرا دی۔ (اس نے پھر سے استعفے کا جواب نہیں دیا۔ آہ۔۔۔ سیاست دان۔)

دفعتاً "اس نے گھڑی دیکھی۔ دس منٹ گزر چکے تھے 'پندرہ رہتے تھے۔ ایک بے قرار نظر ڈرائنگ روم پہ ڈال کے وہ چپکے سے وہاں سے کھسک آئی۔ اسٹڈی کی بتی اس نے نہیں جلائی۔ پنسل ٹارچ جلا کر آگے آئی۔ لاکر کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی اور لاکر پہ لگا گول چکر آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔ چند ایک کلک ہوئے 'پھر دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ اس نے پوٹلی نکالی اور لاکر کھول کے زیورات کے ڈبے باہر نکالنے لگی۔ ایک دم وہ ٹھٹک گئی۔ ادھر

ادھر ہاتھ مارا۔ سکے والا باکس غائب تھا۔ اوہ نو۔۔۔ تالیہ نے پریشانی سے سارا الٹ کر کھنگال ڈالا، مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے بے بسی بھرے غصے سے زیورات کو ادل بدل کیا، لاک بند کیا، اصل زیورات یونیفارم میں چھپائے اور باہر نکل آئی۔

اب کے اس نے نور اور تسنیم کو کھانا سرو کرنے دیا اور خود کان لگا کر دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی۔ بٹلر نے گھورا بھی، مگر اس نے چہرے پہ مسکینیت طاری کر کے پلکیں دوبار جھپکائیں تو وہ ہنکارا بھر کے آگے بڑھ گیا۔

اندر گفتگو کا رخ ملائیشین پارلیمنٹ میں زیر بحث توہین رسالت بل کی طرف مڑ گیا تھا۔ فاتح رامزل کے ساتھ آئے افراد اس بارے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے، تین سال کی قید یا بھاری جرمانے والی سزا کسی بھی دین کی توہین کرنے پہ درست ہے۔"

"نہیں میرا خیال ہے اس میں ترمیم ہونی چاہیے۔ اتنی سخت سزا ہونا چاہیے کہ مثال بن جائے۔" مسٹر کامل اور دوسرے افراد باری باری اپنی رائے دے رہے تھے۔ تالیہ نے کان مزید زور سے دروازے کے ساتھ لگایا۔ اسے کافی دیر سے فاتح رامزل کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے سر؟" تالیہ نے پردے کی اوٹ سے جھانکا۔ وہ نگاہیں کامل صاحب پہ جمائے مسکرایا تھا۔ پھر گہری سانس لی۔

"میرا ایک دوست تھا اسکول میں۔ بدھسٹ تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ مگر میرے والد کو وہ بہت برا لگتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مجھے بگاڑ دے گا۔ وہ اس کی عزت نہیں کرتے تھے، باوجود اس کے کہ وہ اس سے کبھی نہیں ملے تھے۔ میں ہر روز ان سے بحث کرتا تھا کہ میں اس کی دوستی سے نہیں بگڑوں گا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ اپنی ٹھنڈی، بھاری اور پرسکون آواز میں اور سب سن رہے تھے۔

"پھر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میرے والد جب اسے جانتے ہی نہیں ہیں تو وہ اس کی عزت کیسے کریں گے؟ تب میں نے ان کو اپنے دوست کی خوبیوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ تنکو کامل! میں نے ان کو بتایا کہ انسان ایک مکمل پیکیج ہوتا ہے۔ اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں، خامیاں بھی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ انسان ہیں جن کے اندر صرف خوبیاں اور اچھائیاں تھیں۔ لیکن ان کے گستاخ کو وہ سزا ملنی چاہیے جو قرآن و سنت کے مطابق ہے، وہ دی جائے، مثالیں سیٹ کی جائیں، لیکن۔۔۔" وہ رکا۔ تالیہ نے گردن مزید اوپر کی۔ وہ ان ہی پرسکون آنکھوں سے ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن کوئی بھی Evil (شیطان) صرف سزا دینے سے ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سے عزت تب کرے گی جب ہم ان کو بتائیں گے کہ وہ کون تھے۔ کیا تھے، کیسے تھے۔ میں جس ملائیشیا کا خواب دیکھتا ہوں نا، وہاں ہمیں مالے قوم کو میڈیا کے ذہنی شکنجے سے نکال کر اپنی سوچ کو آزاد کرنا سکھانا ہو گا۔"

"آپ خوابوں پہ یقین رکھتے ہیں وان فاتح؟" مسز شیلا قدرے نروس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ "مطلب برے خوابوں پہ۔ جیسے میری دوست نے میرے بارے میں خواب دیکھا۔" تالیہ نے بے اختیار دل کو تھام لیا۔ تنکو کامل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی بیوی کو ٹوکا۔ (یہ مناسب موقع نہیں ہے۔) مگر وہ فاتح رامزل کے آنے کی خوشی اور اپنی پریشانی میں گھری کہتی گئیں۔

"اس نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں چاول ہیں جو ایک دم راکھ بن جاتے ہیں۔ آپ دوسری قسم کے خواب دیکھتے ہیں، مگر ایسے خوابوں کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" تالیہ کے گردن کے بال تک کھڑے ہو گئے۔ کان مزید دروازے سے لگائے۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ پھر فاتح نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے۔
"خوابوں میں ہر چیز علامتی ہوتی ہے۔ اس کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ کیا آپ کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع ہے تنکو شیلا؟"
میزبان میاں بیوی ٹن رہ گئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا پھر فاتح کو۔ "جی مگر ہمیں خود چند دن پہلے معلوم ہوا ہے تو آپ کو کیسے۔۔۔؟"
"چاول پیداوار کی علامت ہوتے ہیں۔ ایسا خواب اس لیے آسکتا ہے تاکہ آپ احتیاط کریں یا پھر کسی متوقع حادثے کے لیے تیار رہیں۔" اس کی بات میں ایسی ٹھنڈک تھی کہ مسز کامل کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ دروازے سے لگی تالیہ بھی شل کھڑی رہ گئی۔
فاتح کی بیوی نے بے اختیار ناد ہی نظروں سے اسے گھورا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اسے ایسی بات اتنے عام انداز میں نہیں کہنی چاہیے مگر وہ کسی بھی جذباتی پن سے عاری ٹھنڈا پرسکون سا بیٹھا تھا۔ عصو رامزل پہلی دفعہ بولی۔
"کاش ہمیں بھی آریانا کو کھونے سے پہلے کوئی خواب آجاتا تو ہم اس روز چیئرلفٹ پہ نہ جاتے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔
(آریانا؟ اچھا۔ ان کی بیٹی جو کئی سال پہلے کھو گئی تھی۔) تالیہ کو ان کے انٹرویو میں کئی دفعہ کی دہرائی گئی بات یاد آئی تو اس نے اندر جھانکا۔ فاتح رامزل کا چہرہ سامنے نظر آرہا تھا۔ اس پہ کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ وہی ٹھنڈا' مسکراتا' وجیہہ چہرہ۔ مگر وہ "اعترافاً" سہلا کے بولا تھا۔
"ہاں۔۔۔ وہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ خیر۔" اس نے کندھے اچکا کے گہری سانس لی۔
بٹلر نے اس کی سر کی پشت پر چپت لگائی تو وہ چونکی۔
"تمہارا کچن میں کام پڑا ہے۔ اندر جاؤ۔" اس نے حکم صادر کیا تو وہ منہ بنا کے آگے بڑھ گئی۔
کام کیا خاک کرنے تھے' وہ کچن کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ چند منٹ گزرے اور آوازیں آنے لگیں۔ وہ وہیں جمی رہی۔ وہ لوگ اب راہداری میں آچکے تھے اور باہر جا رہے تھے' مگر کسی وجہ سے ٹھہر گئے تھے۔ تالیہ نے سر نکال کے دیکھا تو برف کا بت بن گئی۔
علی بن کامل اپنے مہمان کو تحفہ پیش کر رہا تھا۔ اور وہ تحفہ۔۔۔ تالیہ کی سانس اٹکنے لگی۔۔۔ وہ وہی شیشے کا باکس تھا جس میں سنہری سکہ رکھا تھا۔
فاتح نے مسکرا کے بچے سے باکس لیا۔ علی کامل اب اس سے منسلک کہانی سنا رہا تھا مگر فاتح رامزل نے باکس کھولا' اور سکہ نکال کے اوپر اٹھا کے دیکھا۔ دونوں اطراف پلٹیں۔
"ویسے یہ اوریجنل نہیں ہے۔ اوریجنل میں ایک طرف نصیر من الدنیا والدین لکھا ہوتا ہے۔ مگر آئی لائیک اٹ۔"
سچائی سے تبصرہ کیا تو میزبان ایک دم شرمندہ ہو گئے مگر وہ آدمی اتنا بے پروا' اتنا بے نیاز تھا کہ اسے ان کے تاثرات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ (اور اس کی بات کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ نہ مان سکتا تھا۔ وہ ملائے قوم کو بہت محبوب تھا۔) ایک ہی فقرے میں اس نے ایمان داری سے پسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا۔ پھر ذرا ٹھہرا۔
"عصو! یہ تمہارے بریسلیٹ کی طرح نہیں لگتا جو تمہیں ایش نے دیا تھا؟ ہے نا۔" مسکرا کے کہتے ہوئے اس نے باکس پیچھے کھڑے اپنے باڈی گارڈ کی طرف بڑھا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ سب اس کے آگے پیچھے چلتے باہر نکل

گئے۔ وہ تیز تیز چلتا تھا اور ہر شخص اس کے قدم سے قدم ملانے کا خواہش مند تھا۔
اور وہ نڈھال سی چوکھٹ سے لگی کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سمبلز۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگ ایک طرف پھینکا اور جوتے اتار کے دوسری طرف اچھالے۔ داتن جو لیپ ٹاپ اور کاغذ پھیلائے صوفے پہ بیٹھی تھی، اسے آتے دیکھ کے تیزی سے اٹھی۔ ایک فکر مند نظر اس کے بے رنگ پریشان چہرے پر ڈالی۔

"تم نے راستے سے فون کر کے اتنی تیزی سے سب بتایا کہ مجھے وہ سمجھنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ تم پریشان نہ ہو تالیہ۔ اب دونوں چیزیں ایک ہی شخص کے پاس ہیں۔ اور......"

"سمبلز۔ میں نے کہا، خواب میں ہمیشہ سمبلز آتے ہیں۔ علامتیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے صوفے پہ گر گئی۔ چند لمبے لمبے سانس لیے پھر نظریں اٹھا کے الجھتی کھڑی داتن کو دیکھا۔

"میں نے دیکھا ہم دو دریاؤں کے سنگم پہ کھڑے ہیں جہاں کیچڑ ہے۔ کیچڑ یعنی "لمپو" اور دریاؤں کا سنگم یعنی "کولا"۔ ہم "کوالا لمپور" میں ملتے ہیں۔ کوالا لمپور ۔۔۔ کے ایل ۔۔۔ ہمارا شہر۔" وہ تیز تیز بولتی جا رہی تھی۔ "آج ہم ملے مگر ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید اس خواب کے پورا ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لیکن میں نے یہ بھی دیکھا تھا داتن کہ اس کے سر پہ ایک پرندہ چکر کاٹ رہا ہے۔ سنہری ٹانگوں والا سرخ پرندہ جس کی آنکھیں ایسی چمکدار نیلی تھیں گویا نیلم ہوں۔"

"آنکھیں نیلم کی طرح؟" داتن نے چونک کے زیر لب دہرایا۔

"ایک ہی پرندہ ہے جو ایسا ہوتا ہے داتن۔ جو صرف خوابوں اور کتابوں میں ہوتا ہے۔ ہما۔ (Pheonix)"
وہ جوش سے بولی تھی۔ رنگت ابھی تک اڑی ہوئی تھی مگر چہرے پہ سکون واپس آ رہا تھا۔

"فاتح رامزل کے سر پہ ہما۔ ہما جو علامت ہے خوش بختی کی دوبارہ جنم لینے ۔۔۔ دوسری زندگی اور ۔۔۔"

"اور حکومت کی۔ داتن۔ طاقت اور حکومت کی۔ فاتح رامزل ہمارا اگلا پردھانہ منتری (وزیر اعظم) بننے جا رہا ہے اور وہ یہ بات نہیں جانتا۔"

"او خدایا ۔۔۔ فاتح رامزل ۔۔۔ نیکسٹ مالے پردھانہ منتری ۔۔۔ واؤ تالیہ ۔۔۔ واؤ۔" داتن نے خوشی سے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔ لیکن پھر وہ ٹھٹک کے رکی۔ "مگر اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ۔۔۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اگلی چوری اپنے مستقبل کے وزیر اعظم کے گھر کرنی ہے۔" ایک عزم سے کہتی وہ اٹھی اور داتن کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مجھے اپنی چابی فاتح رامزل سے واپس لینی ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین سکندر

جواب

مصباح نے تیزی سے چائے کا پانی چولہے پر چڑھایا۔ اس کا موڈ قدرے خراب تھا۔ کیونکہ آج اس نے ویک اینڈ پر اپنی امی کی طرف جانے کا طے کر رکھا تھا۔ علی نے بھی اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ شام کو اسے امی کی جانب ملانے لے جائے گا اور اس نے بھی دل میں طے کرلیا تھا کہ ننھی پریشے کو پورے وقت پر تیار کرلے گی۔

جب سے ننھی پریشے ہوئی تھی۔ اس کی زندگی جیسے مکمل ہو گئی تھی۔ وہ ماتھے پر شکنوں کا جال لیے کچن میں دوپہر کا کھانا تیار کررہی تھی۔

اس کی وجہ اس کی نند رابعہ کی آمد تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دوپہر کو ہلکا پھلکا کچھ تیار کرکے جلدی سے میکے روانہ ہوجائے۔ اب رابعہ آپی اور ان کے بچوں کی آمد کے بعد اس کا یہ سارا پروگرام ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔

پھر رابعہ کے ساتھ ان کے میاں بہروز بھی تھے۔ اس لیے سارے کام خوش اسلوبی سے ہونا ضروری تھے۔ وہ یوں ہی کچھ بھی پکا کر سامنے نہیں رکھ سکتی تھی۔ گھر آنے والی بیٹی داماد کے لیے خاص الخاص پکوان بننے چاہیے تھے۔ یوں نہیں کہ کوئی بھی دال سبزی بنا کر ان کے سامنے سجادی جائے۔

اس لیے ساس کے کہنے پر وہ کڑاہی، پلاؤ اور کباب بنا رہی تھی۔ اور ساتھ میٹھے میں ٹرائفل بھی بنا رہی تھی۔ ان سب کے ساتھ ساتھ چائے کا دور بھی گاہے بہ گاہے چل رہا تھا۔ پریشے کی ریں ریں بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ جو اسے ناگوار گزر رہی تھی۔

"کیا بنا رہی ہیں بھابھی صاحبہ۔" رابعہ آپی نے مسکرا کر کچن میں داخل ہو کر پوچھا۔

اس نے پلٹ کر تیکھی نظروں سے نند کو دیکھا تھا۔

"وہی جو مہمانوں کی آمد پر بنایا جاتا ہے۔" اس نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔

"کافی دیر سے تم کچن میں ہی لگی تھیں۔ باہر آ ہی نہیں رہی تھیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی آکر تم سے مل لوں۔"

رابعہ نے وضاحتی انداز میں کہا۔ کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ مصباح کو اس کی آمد پسند نہیں آئی ہے۔ مگر اس کی وضاحت کے جواب میں بھی مصباح بالکل خاموشی اختیار کیے کاموں میں جتی رہی۔ جیسے اس کو رابعہ کے کھڑے ہونے کی پروا ہی نہ ہو۔

"اور پریشے کیسی ہے؟" وہ بات برائے بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہی ہے۔ اب ذرا کاموں میں مصروف ہوں تو ظاہر ہے بچی بے چاری اگنور ہو رہی ہے۔ اس لیے رو رہی ہے۔" مصباح کا لہجہ سراسر جتاتا ہوا سا تھا۔

"کیا تمہیں ہمارا آنا برا لگ رہا ہے۔ ایسی ہی کوئی بات ہے تو میں آئندہ نہیں آیا کروں گی۔" رابعہ نے بھی اب ناگواری سے دو ٹوک بات کی۔

مصباح کو ایک دم احساس ہوا تھا کہ اس کا رویہ سراسر معیوب ہے اور اسے گھر آنے والی اکلوتی نند سے بہرحال خوش اخلاقی سے ہی پیش آنا چاہیے۔ دوسرا اس کے دل میں یہ بھی خوف پیدا ہو رہا تھا۔ مبادا اس کی ساس اسے اس کے میکے جانے سے ہی نہ روک ڈالے۔ اس لیے معاملہ فہمی اور مصالحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے مصباح نے... اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرلی تھی۔

"ارے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے رابعہ باجی! اصل میں میری طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے شام کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے نا۔ اس لیے جلدی جلدی کام نپٹا رہی تھی۔ پھر وہیں سے گھڑی دو گھڑی اماں کی طرف بھی ملنے جاؤں گی۔" دل کا مدعا اب اس کی زبان پر آیا۔

یوں بھی روز روز رابعہ کی آمد اس کے لیے نہ صرف کاموں کا بوجھ بڑھانے کا سبب بن رہی تھی' بلکہ اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ اور یہ سارے اخراجات اب علی کی جیب پر گراں گزرنے لگے تھے اور یہ ساری سیکھ اس کو بیوی کی جانب سے ہی مل رہی تھی۔ وہ لفظ بہ لفظ وہی زبان بولنے لگا تھا۔ جو اس کو مصباح سے سننے کو دن رات مل رہی تھی۔

وہ بھی مصباح کے نظریات کی عینک لگا کر تمام معاملات کو اسی طرح دیکھنے اور پرکھنے لگا تھا۔

"اور جاب کیسی جارہی ہے علی کی۔" رابعہ آپا کی کم بختی ہی آئی تھی' جو انہوں نے علی کی نوکری کی بابت سوال کرلیا تھا۔ وہ بھی اپنی بھابھی سے۔ مصباح کو تو جیسے ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ فوراً" وضاحت دینے لگی۔

"بس کیا بتائیں' مہنگائی کا دور ہے' ابھی تو پریشے چھوٹی ہے کل کلاں کو اسکول میں جائے گی تو خرچے مزید بڑھ جائیں گے۔ آئے دن کے مسئلے منہ کھولے کھڑے رہتے ہیں اور اس پر امی جان کی دوائیاں اور ان کی بیماری کا خرچ الگ ہے۔ پریشے کے بھی ابھی سے خرچے ہیں۔ اور پھر آئے دن کی مہمانوں کی آمد پر بھی ہزار دو ہزار تو کھڑے کھڑے ہی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ بھگو بھگو کر مار رہی تھی۔ قبل اس کے کہ رابعہ کوئی ترش و تلخ جوابات کا تبادلہ کرتی اس وقت ہی علی کچن میں آگیا۔

"باہر آکر پریشے کو سنبھالو' وہ رو رہی ہے۔ اب مجھ سے نہیں سنبھل رہی ہے۔" علی کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

مصباح نے ہانڈی میں چمچہ چلانا چھوڑا' چولہے کی آنچ دھیمی کی اور باہر نکلی۔

پریشے کا ڈائپر تبدیل کرنے والا تھا اور یوں بھی اتنی دیر ماں سے جدا رہنے کی وجہ سے بچی بے حال ہو رہی تھی۔ مصباح نے اسے کلیجے سے لگایا۔ اس کا منہ ہاتھ دھلایا اور صاف کپڑے پہنا کر تیار کیا۔ پھر فیڈر اس کی دادی کو تھما کر دوبارہ کچن کی جانب دوڑ لگائی۔

شکر ہے کہ وہ بروقت کچن میں آگئی تھی ورنہ سالن نیچے لگ جانے کا احتمال تھا۔ اس نے ساری چیزیں تیار کیں اور سب چیزیں ٹیبل پر لگا کر سب کو کھانے کے لیے آواز دی۔

سب نے دلجمعی سے کھانا کھایا۔ کھانا مصباح نے بے حد لذیذ بنایا تھا۔ اس معاملے میں تو سسرال میں اس کی تعریفوں کے پل بندھتے تھے۔ ابھی رابعہ وغیرہ کھانے سے فراغت ہی حاصل کر رہے تھے کہ علی نے بیوی کی آنکھوں کی تحریر پڑھتے ہی ماں کو اس کے میکے لے جانے کا عندیہ دے ڈالا۔

"ارے آج جانا کوئی اتنا ضروری بھی تو نہیں ہے۔

اتنے دن بعد رابعہ آئی ہے۔ تم کل چلی جانا۔ یوں بھی پچھلے ہفتے ہی تو تم میکے گئی تھیں۔ تمہارا میکہ کون سا دوسرے شہر میں ہے جو جانا ہی نہ ہو سکے۔" ساس کو آج کے دن بہو کا گھر سے باہر نکلنا کھٹک رہا تھا۔

"اماں! میکہ تو رابعہ آپا کا بھی دوسرے شہر میں نہیں ہے۔ اسی شہر میں ہے۔ وہ بھی دوبارہ آ ہی سکتی ہیں۔" علی کے منہ میں بیوی کی زبان بول رہی تھی۔

"شاباش ہے بیٹا۔ اچھی منہ زوری ہے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ خیر تم لوگ کون سا میرے کہنے پر اپنا پروگرام ملتوی کرو گے۔ جاؤ جب طے کر ہی لیا ہے۔" ساس کا دل خراب ہو چکا تھا۔

بعض معاملات میں مائیں بھی اپنے بیٹوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہیں۔ وہ فقط یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ ان کی بیٹی کو اب اپنے میاں سے ہزار صلواتیں سننے کو ملیں گی۔

مصباح جوش اور خوشی سے تیار ہو کر بریشے کو تھامے باہر لپکی تھی۔ مبادا تھوڑی بھی دیر ہو گئی تو موت کا فرشتہ آن دبوچے گا۔ بائیک پر بیٹھتی فاتحانہ انداز میں وہ میکے کی جانب رواں دواں تھی۔ ماں کا گھر جیسے ہی نظر آیا۔ دل اور آنکھوں میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ہو جیسے۔ اس نے اپنائیت سے اپنے میکے میں قدم رکھا تھا۔ سائرہ بھابھی مکمل تیار کھڑی تھیں۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں کیا بھابھی؟" اسے بھابھی کا اتنا تیار ہونا اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔

"ارے نہ سلام' نہ دعا۔ یہ کیا سوال ہوا بھئی۔ اور تم اتنی دیر سے کیوں آ رہی ہو۔ کب سے سب تمہارے منتظر تھے۔" سائرہ بھابھی نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"ارے میری شہزادی آ گئی۔" اماں نے بریشے کو لاڈ سے گود میں بٹھا لیا۔

"میں نے بریشے کے لیے چاکلیٹ لے کر رکھے تھے۔" انہوں نے جھٹ بریشے کو چاکلیٹ تھما دیے۔ وہ خوش ہو کر دائیں بائیں دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔

اسی وقت بھابھی چائے مع لوازمات کے لیے آئی تھیں۔ بازاری سموسے اور بازاری نمکو تھی۔ اور نت نئے اقسام کے بسکٹ تھے۔ ساتھ میں چائے۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔ اس نے تو اماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ آرام سے کھانا کھا کر رات کو جائے گی۔ مگر یہاں تو جلد از جلد ٹرخانے والا معاملہ تھا۔ علی کی جانب اس نے چور نظروں سے دیکھا۔ مگر علی اس جانب متوجہ ہی نہ تھے۔

"اماں' ہم لوگ تو رات کا کھانا بھی کھائیں گے کیا اس کی تیاری نہیں ہے۔ مجھے علی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔" اس نے دبے دبے لفظوں میں ماں کے ساتھ لگ کر دھیمی آواز میں لب کشائی کی تھی۔

"تمہاری بھابھی کا میکے جانے کا ارادہ ہے آج' تم تو جانتی ہی ہو کہ آج کا دن ہی ہوتا ہے محسن کے پاس۔ اس کے بعد تو ہفتے بھر ——— شدید مصروفیت ہوتی ہے۔" اماں بھی اپنی جگہ مجرم سی بن گئی تھیں۔

"یعنی ہم لوگوں کے لیے ایک وقت کا کھانا بنانا بھی بھابھی کے لیے عذاب ٹھہرا۔" اس نے ناگواری سے جتایا تھا۔

ابھی اماں کوئی جواب نہ دے پائی تھیں۔ جب بھابھی کی آمد ہوئی تھی۔ عبایا میں لپٹا ہوا ان کا وجود اور چمکتا ہوا چہرا۔

"اوکے آنٹی! اب ہم چلتے ہیں۔" انہیں جانے کی جلدی تھی۔

"بھابھی! تھوڑی دیر تو ٹھہرتیں' آپ تو فوراً ہی جانے کو تیار ہو گئیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"ارے بھئی تم کون سا دوسرے شہر سے آئی ہو۔ روز کا تو آنا جانا ہے۔ پھر کسی دن بیٹھ کر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ آجاؤ بھئی جلدی سے بیگم۔" یہ محسن بھائی تھے۔ جو بہو علی کی طرح بیگم کی زبان بول رہے تھے۔

مصباح کی نگاہ اپنی ماں کے چہرے پر پڑی' یہاں ہو بہو ان کی ساس جیسی بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے لگا کہ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا ہو۔ سارے منظر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہوں۔

مگر نہیں۔ ایک بات بالکل واضح تھی' وہ تھا احساس بے بسی۔

☆

عطیہ خالد

پنچ کلیانی

"بس کر دے علی احمد کے ابا' بس کر دے..... کیا جان لے کر چھوڑے گا اب۔"

"میں ٹانگیں توڑ ڈالوں گا اس الو کے پٹھے کی۔" مجھے بچاتے بچاتے اماں اور چھنو کو بھی اچھی خاصی مار پڑ گئی تھی۔

"ابا گندا' ابا گندا۔" میں نے ابا کے باہر نکلتے ہی جی بھر کے اسے برا بھلا کہا۔

چھنو کو چھوڑ۔ ماریں اور تو اور اماں کو بھی دانتوں سے کاٹ لیا۔ ابا نے مار مار کے مجھے نیلو نیل کر دیا تھا۔ اماں ہلدی اور گھی والا گرم دودھ مجھے پلا رہی تھیں میں آنسو پونچھتا لگاتار بکواس کر رہا تھا۔ ابا نے مجھے اس سے قبل کبھی اس بے دردی سے نہیں مارا تھا۔ گودوں میں اٹھا کے پھرنے والی ٹیپ (ٹائپ) تو ابے کی کبھی بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ ایک آدھ دھکے سے بھی آگے بڑھنے والا نہیں تھا۔ لیکن آج اس نے نہ صرف مجھے کبوتر اڑاتے دیکھ لیا تھا بلکہ میرے ہاتھ میں موجود سگریٹ بھی دیکھ لی تھی۔ اوپر سے ماسٹر صاحب سے میرا رزلٹ بھی وصولا تھا۔ میں سارے ہی مضمونوں میں فیل تھا۔ پرائمری پاس میرا ابا' مجھے پڑھانے کا بڑا شوقین تھا۔

"اماں! ابا کو بتا دے اگر اس نے مجھ پر ہاتھ چکا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔" میں نے سوچا بڑک مارنی ہے تو چھوٹی نہیں مارنی چاہیے۔

"ہائے ہائے، یہ کیسی بات کی تو نے علی احمد!" اماں تو یہ سن کے ہی مرنے والی ہو گئی تھی۔

خیر جیسے بھی ہوا، اس نے ابے تک میری دھمکی منتقل کی۔ اس کے بعد ابے نے دوبارہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی غلطی نہیں کی۔ اب میں کبوتر بھی اڑاتا اور اسکول بھی نہ جاتا۔ مگر ابے نے پھر مجھ پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا۔

"اماں! ابا کو نہ ہوا کسی چیز کا شوق؟" میں نے کبوتر کو منقی کھلاتے ہوئے بڑے ترنگ میں اماں سے پوچھا۔

"ادھر آ میں بتاؤں تجھے۔ اپنی اماں کا کھیڑا چھڈ۔" ابا نے احاطے کی طرف آتے ہوئے میری بات سن لی تھی۔

"تیرے جیسے گھٹیا کبوتر بازوں والے شوق نہیں ہوئے کبھی تیرے پیو کو۔" ابا نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

آکڑ تو ابا کی ہمیشہ سے بڑی تھی۔ "شیخی خورا نہ ہو تو۔" میں دل ہی دل میں بولا۔

"مجھے شوق تھا پنج کلیانی کا ہمیشہ سے۔"

"پنج کلیانی؟"

"آہو پنج کلیانی۔ جس مہج کے چاروں کھرے اور تھوتھنی سفید ہو۔ پنج کلیانی ہوتی ہے وہ۔ بڑی قیمتی مہج ہوتی ہے۔ ڈنگروں والی بات نہیں ہوتی کوئی اس میں۔"

"تو پھر؟" میں دل ہی دل میں ہنسا۔

"تو نے دیکھی نہیں کبھی وہ چیز۔ کیا بات ہوتی ہے اس کی۔ ہمارے زمینداروں کے گھر ہوتی تھی ایک۔ آہا۔ ہا۔ شاندار چیز۔ پورا احاطہ سج جاتا تھا۔"

ابا کا چہرہ کبھی میرا یا چھنو کا ذکر کرتے ہوئے بھی ایسا نہیں چمکا ہوگا جیسا اس وقت چمک رہا تھا۔

"پر ماڑی قسمت۔ عمر لنگھ گئی پر پنج کلیانی نہ ملی۔"

"سارا احاطہ بیچ دوں اگر جو کہیں سے مل جائے۔" ابا نے سامنے کھڑی چار بھینسوں اور تین گائیوں کی طرف حقارت سے اشارہ کیا۔

"ایک پنج کلیانی کے پیچھے!" میری آواز میں شدید حیرانی تھی۔

"ایک پنج کلیانی، دوسرے پلو تھی کے جوڑویں پتر حق ہا۔" ابا نے پرنا سر پر لپیٹ لیا اور لسی کا چھنا خالی کر کے چھنو کو پکڑا دیا۔

"کرماں والیاں نوں ملدے نے ایہو جیہے شوق بسم اللہ کر کے۔" ابا کسی اور ہی دنیا میں بولا اور وضو کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہوتی ہوگی پنج کلیانی۔" میں سارے پنڈ کے جانور دیکھتا پھرا لیکن مجھے وہ کہیں نظر نہ آئی۔ پنج کلیانی تک تو خیر تھی مگر ابے نے دوسری خواہش کا اظہار کر کے میرے اندر کی اکڑ، میرا اکلوتا ہونے کا فخر و غرور چھین لیا تھا۔ اب نہ میں چھنو کو مارتا نہ کبھی اماں سے لڑتا۔ ابا کو پیٹھ پیچھے گالیاں دینا تو میں نے کب کا چھوڑ دیا تھا۔ یہ سب چھوڑ کر بھی سکون کی نیند نہ آئی تو میں نے پنجرہ کھول کے سارے کبوتر اڑا دیے۔ اماں اور چھنو کے روکتے روکتے بھی میں نے پنجرہ بھی توڑ پھوڑ ڈالا۔ اور سارا دن مارا مارا پھرتا رہا۔ اور اگلے دن صبح صبح اٹھ کر بنا ناشتہ کیے اسکول چلا گیا۔

"ماسٹر جی! مجھے دسویں میں وظیفہ لینا ہے۔"

"اوئے شاباش میرا پتر۔" ماسٹر جی کو میری بڑ پر یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو، انہوں نے خوشی کا اظہار اتنا کیا کہ میں نے سوچا کہ میرا وظیفہ ضرور ابے کو خوش کر دے گا۔ میں نے پہلے ہی دن سارا زور لگانے کی کوشش کی۔ شام میں بھی ماسٹر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ حساب لے کر۔ بس چھ مہینے تک میں نے کتابوں سے سر نہ اٹھایا۔ اماں اور چھنو کتنی حیران تھیں، مجھے دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ چھنو آٹھویں کلاس میں تھی۔ ہر

سال اول آئی تھی۔ میں نویں کی تیاری کر رہا تھا۔ امتحان سے پہلے ہونے والے کچے امتحانوں میں میں اول آیا۔ لیکن ابھی بھی مجھے خود پر یقین نہیں تھا۔

بورڈ کے پرچوں کی ڈیٹ شیٹ آئی۔ پہلا پرچہ ریاضی کا تھا۔ میں رات کو جلدی سو گیا۔ اور صبح اذانوں سے بھی پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ اندر والے کمرے میں کوئی گھٹ گھٹ کے رو رہا تھا۔ میں گھبرا کے وہاں پہنچا تو دیکھا اماں سجدے میں تھیں۔ میں حیران رہ گیا۔ اماں کیوں رو رہی تھیں؟ یہ تہجد کا وقت تھا۔ اگر اماں میرے لیے ایسے رو کر دعا کردیں تو مجھے ضرور وظیفہ مل جائے۔ میں واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اماں نے آکر چیمنو کو پھونک ماری۔ پھر مجھے پھونک مار کر میرا ماتھا بھی چوما۔ اسی پل موذن نے اذان دی۔ میں نے تھوڑا کسمسا کر آنکھیں کھول دیں جیسے میں ابھی اٹھا ہوں۔

"اٹھ گیا میرا پتر! جا نماز پڑھ آ مسجد میں۔"

مسجد تو میں شرم کے مارے نہ گیا۔ عید کے عید مسجد کی شکل دیکھنے والے کو لوگ مسجد میں دیکھ کے مذاق اڑاتے یقینا"، لیکن گھر میں، میں نے نماز پڑھ لی۔

"اماں میرے لیے رو رو کر دعا کرنا۔" میں کہتا ہوا جھپاک سے گھر سے نکل آیا اور اماں نے یقینا" رو رو کر دعا کی تھی جو میرے سارے پرچے بہت اچھے ہو گئے۔ اور جس دن میرا رزلٹ نکلنا تھا۔ ماسٹر صاحب خود ہمارے گھر آگئے تھے۔ میں نے تیسری پوزیشن لی تھی۔ اماں نے سارے پنڈ میں لڈو بانٹے۔ ابا بھی خوش تھا۔ بظاہر تو ایسا ہی لگتا تھا لیکن اس نے ایسا کوئی اظہار نہ کیا جس سے مجھے اپنا کھویا ہوا فخر واپس مل جاتا۔ میں اماں کے بار بار منہ چومنے پر ناراض ہو گیا۔

ابا خوش ہوتا نظر نہ آیا لیکن ماسٹر جی نے مجھے اتنی شاباشی دی کہ میں پھر پڑھنے میں پیچھے نہ ہوا۔ اب اکثر میری آنکھ اذانوں سے پہلے کھل جاتی اور میں کوٹھری سے گھٹ گھٹ کر آنے والی آوازیں سنتا رہتا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے کامیاب کروانے والی یہی دعا ہی تھی۔ تو کیا اماں ابا کے لیے ایسی دعا نہیں کر سکتی تھی رو رو کے' اس کو پنج کلیانی مل جاتی یا پلوٹھی کے جوڑ دیں بیٹے۔ میں سوچتا رہتا۔

جس روز میں نے دسویں میں پہلی پوزیشن لی اس دن میں رزلٹ لے کر سیدھا ابا کے پاس پہنچا۔ ابا احاطے میں اکیلا تھا۔

"ابا! میں اول آیا ہوں اور پورے فیصل آباد میں۔" میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔

"ہمم" لمبا سا ہنکارہ بھر کے اس نے اخبار دیکھا اور ذرا کا ذرا مسکرایا پھر دوسری خبریں پڑھنے لگ گیا۔ اور میں پاگلوں کی طرح سامنے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ پھر سارا دن میں باہر ہی رہا۔ نہر کنارے بیٹھے مجھے شام ہو گئی تھی۔ گھر آیا تو میرے آگے آگے دروازے سے حکیم محمد رمضان داخل ہو رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ کے چونک گیا۔ گھر میں تو سب خیر ہے۔ یہ حکیم صاحب تو اللہ خیر رکھے' کبھی مریض دیکھنے کے علاوہ کسی کے گھر نہیں جاتے۔ اندر نظر پڑی تو ابا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔

حکیم صاحب نے نبض پکڑی ہوئی تھی۔

"ملیریا کا حملہ ہے۔ میں دوائی بھیج دیتا ہوں۔ دودھ کے ساتھ صبح شام ایک ایک پڑی۔ مٹھوں کا توڑا صبح منگوالو۔ پانی کی جگہ وہی چوسے جائیں۔ بالڑے کو آدھے گھنٹے بعد میرے مطب پر بھیج دینا دوائی کے لیے۔"

"السلام علیکم۔" حکیم صاحب ابھی اپنے مطب تک نہ پہنچے ہوں گے کہ میں پیچھے بھاگا گیا۔

"ابے کو کیا ہوا ہے حکیم صاحب! صبح تو ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"اوہو بالڑے' ابھی بھی ٹھیک ہے۔ یہ تاپ شاپ تو جان کا صدقہ ہیں انسان کی۔ اب تم جاؤ۔ عشا کی نماز کے بعد آنا دوائی لینے۔"

میں بھاگتا ہوا گھر واپس پہنچا۔ سیدھا بیٹھک میں۔ جہاں ابے کی چارپائی بچھی تھی۔ اماں اسی کمرے کے کونے میں جاء نماز بچھائے نماز میں مشغول تھیں۔ میرا دل چاہا کہ میں ابا کا سر تک تانا ہوا کھیس نیچے کردوں اور اس سے باتیں کروں۔ چھنو بھی وضو کرکے گیلا منہ ہاتھ لیے آئی اور اماں کے ساتھ جاء نماز پر کھڑی ہوگئی۔ مجھے کمرے کی خاموشی سے ہول آنے لگا مگر میں جی کڑا کرکے موڑھے پر بیٹھا' ابے کی طرف دیکھتا رہا۔

ساری رات میں نے اس کے سرہانے جاگ کے گزاری۔ اذانوں کے وقت ابے نے پانی مانگا۔ میں بھاگ کے پانی لے آیا۔

اماں نے سہارا دے کر اس کو اٹھایا۔ میں نے گلاس اس کے منہ سے لگادیا۔ بس ایک گھونٹ لے کہ اس نے بس کردی اور میری طرف دیکھا۔ اس کی نظر سے پورے کا پورا علی حسن نکلا اور مجھ میں سما گیا۔ ایسا کیا تھا اس پل میں آج بھی سمجھ نہیں سکا۔

ابے کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی.... پھر وہ پوری کی پوری کیسے مجھ میں آبسی؟ اماں نے نہ بین ڈالے' نہ سینہ کوبی کی' نہ ہی پچھاڑیں کھائیں۔ لیکن اس کے بعد میں نے اس کی آنکھیں آج تک سوکھی نہیں دیکھیں۔

اور میں؟ میں پتا نہیں کب میں نہ رہا' ابا ہوگیا۔ ابا کی رخصتی کے سارے کام کرتا میں علی احمد نہ رہا تھا' میں علی حسن ہوگیا تھا۔ سولہ سالہ علی احمد نے جب باون سالہ علی حسن کو لحد میں اتارا تو وہ سولہ سالہ نہ رہا تھا۔ اس کی عمر پل میں دہائیاں پار کرگئی تھی۔ اور وہ اب باون سال کا تھا۔ نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ پورے باون سال کا....

☆ ☆ ☆

کوئی بہت بڑا زمین دار نہیں تھا ابا۔ لیکن جتنی بھی زمین تھی' زرخیز تھی۔ محنتی تھا رج کے۔ بارش زیادہ برسے یا کم' جلدی برسے یا دیر سے' کبھی پریشان نہیں ہوتا تھا وہ۔ ہمارا گھر سادہ ضرور تھا' مگر آرام دہ تھا۔ پکا اور ہوادار۔ ابے نے خود بنوایا تھا' پرانا گھر گرواکے۔ کھلا احاطہ ایک طرف تھا۔ کمرے تھے۔ گھر میں اماں کے لیے ساری شہری سہولتیں تھیں۔ فریج' کپڑے دھونے اور سکھانے کی مشین سالوں سے ہمارے گھر میں تھی۔ میرے اور چھنو کے پاس کبھی جوتے کپڑے کی کمی نہیں ہوئی تھی۔ جیب خرچ تو نہیں ملتا تھا پر مانگنے پر ابے نے کبھی نہ نہیں کی تھی۔ کھانا بھی ہمیشہ اچھا ملا۔ میں تو گوشت کے بنا کبھی سالن کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"اب جب میں گھر کا سارا سودا سلف خود لا رہا تھا تو مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابا ہم سب پر کتنا خرچ کرتا تھا۔ بینک کا کھاتہ چیک کیا تو اس میں صرف بیس ہزار روپیہ تھا جو ایک زمین دار کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ اس نے میرے اور چھنو کے نام سے پانچ سالہ اسکیم میں دو' دو لاکھ روپیہ جمع کروایا ہوا تھا۔ اور خود ابا... اس نے ساری زندگی چار خانوں والے تہبند میں کھدر کے کرتے میں ہی گزاری تھی۔ اماں ایک بار اس کے لیے بند گرگابیاں لے آئی تھی شہر سے تو اس کو غصہ چڑھ گیا تھا۔

کیا ابا ہم سے پیار کرتا تھا؟

☆ ☆ ☆

مجھے اب اپنی تبدیلیوں پر حیرت نہ ہوتی۔ جب میں لسی کا چھنا ایک سانس میں پی کے چھنو کو پکڑاتا۔ اماں کے سوالوں کے جواب میں بس ابے کی طرح ہوں' کرتا۔ چھنو کے سر پر ہاتھ پھیرتا۔

احاطے میں چارپائی ڈال کے کاموں سے سارے کام کرواتا۔ میں ذرہ بھر بھی تو اجنبی نہ لگا تھا خود کو۔ مجھے اپنی پچھلی زندگی سے اپنا کوئی میل نظر نہ آتا۔ میری ساری دلچسپی کماد بیچنے' کھاد لانے' مونجی کا سودا کرنے' ہاریوں کے جھگڑے نپٹانے کے اردگرد گھومتی تھی۔

بھوری ست پڑی تھی صبح سے۔ میرے قدم آپ ہی آپ حکیم صاحب کے مطب کی طرف مڑ گئے۔ اس کے لیے پھکی دیتے ہوئے انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کبھی وقت ملے تو آجایا کرو بالڑے۔" کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ مجھے یوں تو جانے کا وقت شاید کبھی نہ ملتا' لیکن بھینسوں اور گائیوں کی چھوٹی موٹی تکلیفوں کے لیے کبھی پھکی بنوانے چلا جاتا تو کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ آج بھی میں وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ ماسٹر صاحب آنکلے۔

"کئی دنوں سے تم سے ملنے کے لیے وقت نکال رہا تھا علی احمد!" اس پرانے نام سے مجھے آج کئی دنوں بعد کسی نے پکارا تھا۔

"کیا پڑھائی کو بالکل خیر باد کہہ دو گے بیٹا۔" انہوں نے بڑی شفقت سے پوچھا۔ جواباً" میں خاموش رہا۔ میں اب کیسے پڑھ سکتا تھا۔ میں کالج چلا جاتا تو علی حسن کی ذمہ داریوں کا کیا کرتا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ تم ایف اے کا کورس منگوالو اور پرائیویٹ امتحان کی تیاری کرو۔ اللہ نے چاہا تو بی اے تک کا کورس پڑھانے میں مجھے کسی قسم کی دقت نہ ہوگی۔"

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ ممکن تھا؟"

"ایک سبجیکٹ تم انگلش لٹریچر رکھ لو۔ باقی جو چاہو اپنی مرضی سے۔۔۔"

"واہ! واہ! آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔" حکیم صاحب تو جھوم گئے۔

"آپ کورس منگوا لیے ماسٹر صاحب۔" حکیم صاحب نے مجھے تھپکی دی۔

"جی ٹھیک ہے۔" میرے منہ سے یہی نکلا۔

اماں نے جو مجھے کتابوں کا بنڈل لاتے دیکھا اور پرائیویٹ پڑھنے کی بات سنی تو جھولی پھیلا پھیلا کر ماسٹر صاحب کے لیے دعائیں کرنے لگیں۔ گائے نے دو بچھیاں دیں تو اماں نے ایک وقت کا دودھ ماسٹر صاحب کے گھر بھیجنا شروع کردیا۔ ان کے ہزار انکار کے باوجود۔۔۔ میں روزانہ ڈول ان کے گیٹ سے لٹکا آتا۔

ساتھ والے گاؤں کی بوڑھی ماسی چھیمی ایک دن آئی۔ اس کو ابے کے گزرنے کا اب پتا چلا تھا۔ میں مونجی کا حساب کتاب کرکے آرہا تھا۔

"اماں! گھر کے لیے کتنا چاول رکھنا ہے؟" میں نے ماسی چھیمی سے پیار لیتے ہوئے پوچھا۔

"پتر میرا حصہ بھل نہ جاویں۔"

"نہیں ماسی' نہیں بھلتا۔ چاول گھر پہنچ جائیں گے۔"

وہ دعائیں دیتی رخصت ہوگئی۔ تو اماں نے بتایا کہ ابا کس کس کو اناج اور راشن بھجواتا تھا۔ مونجی' کنک' کماد سب میں سے حصہ لگتا تھا۔ میں بھی سب جگہ باقاعدگی سے حصہ پہنچانے لگا۔ رمضان شروع ہونے لگا تو کہاں کہاں راشن جانا ہے' اماں نے مجھے لسٹ دے دی۔ میں نے سب جگہ خود وہ سامان پہنچایا۔ مولوی صاحب' قاری صاحب کے کپڑے۔ میں خرچ کرتا جاتا خاموشی سے۔۔۔ پیسے کی کبھی کمی نہ ہوئی۔

ابے کی طرح سارے کام کرکے رات گئے اس کی ہی چارپائی پر لیٹتا تو اسی کی طرح صبح اذانوں کے وقت اٹھ بیٹھتا۔ مسجد سے شرمانے والا علی احمد اب کہیں نہیں تھا۔ یہ تو علی حسن تھا۔ میرے اندر موجود علی حسن جو پوری تسلی سے وضو کرتا اور مسجد چلا جاتا۔ وہاں سے

سیدھا میں قبرستان جاتا۔ بار بار کتبہ پڑھتا رہتا اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا۔ سارے دن میں مجھے کیا کیا کرنا ہے۔ خود بخود میری سمجھ میں آجاتا اور اس کے بعد کھیتوں کا چکر لگاتا اور واپس آکر ناشتا کرتا' لسی اور پراٹھے کا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی یہ ناشتا نہ کیا تھا۔ میں ناشتے میں انڈے کھاتا تھا۔ ابے کے جانے کے چوتھے دن جب اماں نے خود ناشتا بنایا تو اس نے میرے سامنے انڈا بھی رکھا اور لسی بھی۔ میں نے انڈے کی پلیٹ پیچھے کرکے لسی کا گلاس اٹھا کر ابے کے چھنے میں الٹا کے پی لیا۔ اس دن کے بعد اماں مجھے اسی طرح لبالب بھر کے لسی کا چھنا دیتی تھی جسے میں ایک ہی سانس میں پی کے اور ابے کی طرح شکر الحمدللہ کہہ کر اٹھ جاتا۔

☆ ☆ ☆

کماد مل میں پہنچایا تو میں نے احاطے میں دو بھینسوں اور ایک گائے کا اضافہ کرلیا۔ یہ میری ابے کے بعد پہلی بڑی خریداری تھی۔ میں ماسٹر جی کو ساتھ لے کر گیا تھا۔ نہ جانے کیوں ساری منڈی میں میری آنکھیں پنج کلیانی کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نہیں تھی۔ میں نے منڈی کے مالک کو اپنا نمبر لکھوا دیا کہ اگر کبھی پنج کلیانی ہو تو مجھے ضرور بتائے۔ پنج کلیانی کی چاہ میرے اندر خودرو بوٹے کی طرح اگ آئی تھی۔۔۔ میں روز اس کو پانی دیتا۔۔۔ نوک پلک سنوارتا' بڑے پریم سے اس کو پال رہا تھا۔۔۔ ابے کی طرح۔۔۔

آج اس کو گزرے پورے تین سال ہوگئے تھے۔ اس سارے عرصے میں کہیں کوئی بکھرا بکھرا ہوا علی حسن نام کا ذرہ' کوئی خو' کوئی عادت ایسی نہیں تھی جو مجھ میں نہ آن سمائی ہو۔ میں نے بی اے پارٹ ون کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا تھا۔ ابے کی طرح شام میں فارغ ہو کر باہر دوستوں میں بیٹھنے کے بجائے میں بیٹھک میں چارپائی پر کتابوں کی مجلس لگالیتا۔ ان کی محفل مجھے بہت بھائی تھی۔ ماسٹر جی سے تو روز ہی ملاقات ہوتی۔ حکیم صاحب کی طرف بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتا تھا۔ زندگی کی کتاب دونوں بزرگوں سے پڑھتا' سمجھتا۔

☆ ☆ ☆

وقت پر لگا کے اڑ گیا۔

"بیٹا! چینو کے دن مانگ رہی ہے تیری خالہ۔"

"اتنی بڑی ہوگئی چینو" میں نے حیرانی سے روٹیاں پکاتی چینو کو دیکھا۔

"سب تیاری تو میں نے کرلی ہے۔ بس فرنیچر اور بارات کی روٹی کا انتظام کرنا ہے تم نے۔ شہری بارات ہے۔"

"آپ فکر نہ کرو اماں۔ سب انتظام ہوجائے گا۔"

میں چینو اور اماں کو ساتھ لے گیا اور سب خریداری کرلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چینو کی رخصتی کا دن بھی آگیا۔ اس کی مہندی میں مجھے اور اماں کو ایک ساتھ ہی ماسٹر جی کی مومنہ بھاگئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے بے حد اچھی لگی۔ میں ابھی اپنی کیفیت پر پوری طرح حیران بھی نہ ہوا تھا کہ اماں نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھ لیا۔ میری رضامندی ملتے ہی اماں نے ماسٹر جی سے بات کرلی اور چینو کی رخصتی سے پہلے میرا نکاح ہوگیا۔

اب اماں کو اسے گھر لانے کی جلدی تھی اور اماں سے زیادہ مجھے۔ بس دو ماہ بعد ہی مومنہ ہمارے گھر آگئی۔ ابا کے جانے کے بعد یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے میرے مشینی انداز کو کچھ بدلا تھا۔ میں انگلش ایم اے کے پیپروں سے فارغ ہوچکا تھا۔ لیکن میری کتابوں سے دوستی اسی طرح تھی۔ مومنہ کو بھی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ مشترک شوق نے ہماری دوئی کو مزید کم کردیا تھا۔ میں جب شہر جاتا اس کے لیے نئی کتابیں ضرور لاتا۔ چینو بھی اکثر آجاتی۔ اس کے کہنے پر میں نے کار لے لی۔ اب شہر آنے جانے کی سہولت تھی۔ یوں بھی اب مومنہ کا چیک اپ کروانے شہر جانا پڑتا تھا۔

بچے جڑواں تھے۔ بیٹے یا بیٹی میں نے پوچھنے سے منع کردیا تھا۔

"یا باری تعالیٰ دونوں بیٹے ہوں۔" میرے دل سے اکثر لاشعوری طور پر دعا نکلتی۔ ابا بھی شاید ایسے ہی چاہتا ہو گا اور میری پیدائش پر وہ بجھ گیا ہو گا؟ شاید اس لیے وہ مجھ سے پیار نہیں کرتا تھا۔

کیا وہ مجھ سے پیار کرتا تھا؟

کیا میں اپنے بچوں سے یا بچیوں سے پیار کروں گا؟ یہ خیال آتے ہی میری سوچوں کا دھارا انجانی راہوں کی طرف مڑ جاتا۔ وسوسے اندیشے۔ میں تو عورتوں سے زیادہ وہمی ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بچوں کی صورت حال دیکھتے ہوئے مومنہ کے آپریشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے تھیٹر میں جاتے ہی اماں نے جاء نماز بچھالی تھی۔ اس کی امی اور ماسٹر جی بھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھے۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر نے خوشی کی نوید سنائی۔ دونوں بیٹے تھے اور ماں اور بچے بالکل ٹھیک تھے۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ میں شکر کے احساس سے لبریز ہو گیا۔ میری روح بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز تھی۔ جب ان دونوں فرشتوں کو میں نے دیکھا تو عجیب سی انجانی مسرت کا احساس ہوا۔ میں بار بار ان کو چومتا، بہت خوش تھا۔

اماں اور باقی سب بھی بہت خوش تھے۔ لیکن مجھے لگتا میری خوشی کا اندازہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ لگتا تھا جیسے ابا میرے اندر کھلکھلا کر ہنس رہا ہو۔

"وبسم اللہ! جی آیاں نوں!" ان دونوں کو اٹھاتے ہوئے علی احمد نہیں بولا تھا، علی حسن بولا تھا۔ مومنہ کی جس دن اسپتال سے چھٹی ہوئی، مجھے منڈی سے فون آ گیا۔

"چودھری صاحب جی! پنج کلیانی لئی بسم اللہ کریے فیر۔" میں اڑتا ہوا پہنچا تھا ماسٹر جی کے ساتھ۔

واہ! واہ! کیا چیز بنائی تھی میرے سوہنے رب نے۔ رنگ روپ تو اس کا ایسا تھا کہ بندے کے بندوں کا چھوڑ شہری بندوں کا دل بھی موہ لیتی۔ کالی سیاہ لشکتی ہوئی سفید کھر اور سفید تھوتھنی۔ میں منہ مانگے داموں اسے لے کے گھر آ گیا۔ شام ڈھل چکی تھی، جب میں نے اسے لا کے احاطے میں باندھا۔ میں بے اندازہ خوش تھا۔

صبح فجر کے وقت دو چار چھینٹے پڑ کے ہوا چل پڑی تھی۔ نماز پڑھ کر میں قبرستان پہنچا۔ کتبہ پڑھنا شروع کیا تو ابا مسکرا کر بولا۔

"وبسم اللہ... جی آیاں نوں۔" میں نے حیران ہوئے بغیر لمبی سی دعا کی اور واپس آ گیا۔ احاطے کی لہریں بہریں ہی آج تو اور تھیں۔ محلے کے بچے اور عورتیں پنج کلیانی کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ اماں نے میووں والے لڈوؤں کے ٹوکرے رکھے تھے ہر آنے والے کا منہ میٹھا کروانے کے لیے۔

☆ ☆ ☆

آج دونوں بچوں علی حسن اور حسن علی کا عقیقہ تھا۔ سارے گاؤں میں گوشت بانٹ کر فارغ ہوتے ہوتے دوپہر ڈھل گئی تھی۔ میں احاطے میں چارپائی ڈال کر چار خانے والا تہبند باندھے بیٹھا تھا۔ بالکل ابے کی طرح۔ مجھے اس کی محبت میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ اماں اندر سے آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

"آج علی حسن کی تینوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔ اک وا اک پتر تھا نا علی حسن تو اس کو بڑی چاہ تھی کہ دو بیٹے ضرور ہوں۔ تو چھوٹے ہوتے بڑا بیمار رہتا تھا۔ تیری حیاتی کے لیے بڑی دعائیں مانگی تھیں علی حسن نے۔ بڑی فکر کرتا تھا وہ تیری۔ رب سوہنے نے ساری ہی سن لیں اس کی۔ کیسی پیاری جوڑی دے دی۔ احاطہ بھی سج گیا پنج کلیانی سے..."

"اور تیسری خواہش کون سی اماں؟" میں ایک دم حیران ہوا۔

"تیرے انگریزی میں ایم اے کرنے کی خواہش پتر! وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں۔" آج ہی تو میرا رزلٹ آیا تھا۔

میرے اندر بیٹھا علی حسن کھلکھلا رہا تھا۔

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمنی۔ ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ، وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ آئے کت اور وسامہ، معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمنی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے، رامین، کیف اور فہینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔
باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش

آمنہ ریاض

دشت جنوں
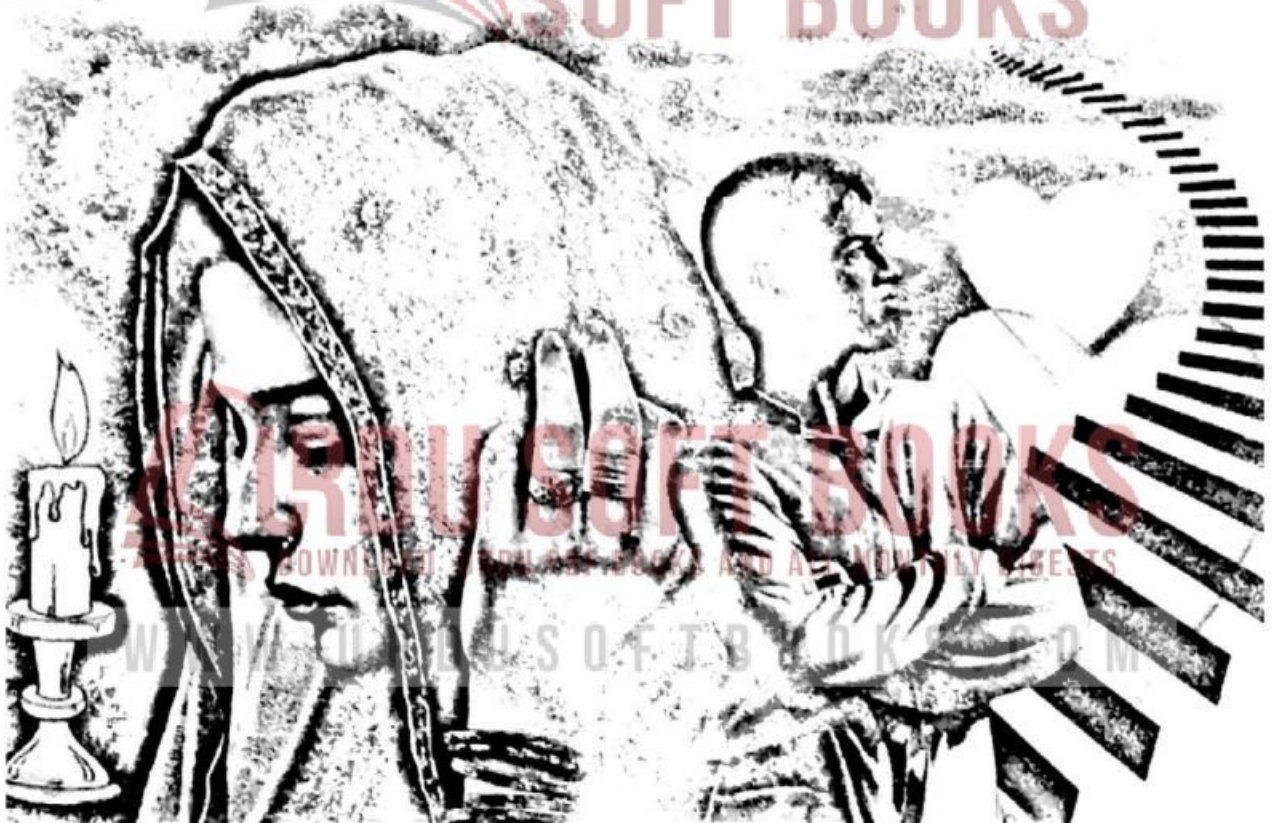
محترم قارئین

اگر آپ کو ہماری یہ کتاب اچھی لگے تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے

Google پر جا کر Urdu Novels سرچ کر کے ہماری ویب سائٹ

www.urdusoftbooks.com کو ایک مرتبہ وِزٹ کر لیں

اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ Google کے پہلے پیج پر نظر نہ آئے تو

دوسرے یا تیسرے پیج پر چیک کر لیں،

وہاں آپ کو مزید اچھی کُتب ڈاؤن لوڈ کرنے کو ملیں گی۔ شُکریہ

Page 2 of about 17,100,000 results (0.24 seconds)

Urdu Novels Archives - Download Free Pdf Books
pdfbooksfree.pk/category/urdu-novels/
Ambar Naag Maira Maut Ka Taaqub Ki Wapsi series contains 100 complete **novels**. All **novels** of this series promote amazing historical fiction stories for […].

Urdu Novels | Urdu Writers - aanchalpk.com - Aanchal Magazine
www.aanchalpk.com/urdu-novels.html
Urdu Novels reading online and also reading aricles urdu stories novels for all the pakistani and indian womens all the collection of your favourite urdu writes ...

Urdu Novels | Urdu Books and Urdu Novels - Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com/2017/03/urdu-novels.html
When we talk about novels, it has sequential and global history of about two thousand years. Lot of unfold stories are available to read and explore. **Urdu novels** ...

Hasil By Umera Ahmed - Urdu Novels Online
www.urdunovelsonline.com/2014/09/hasil-by-umera-ahmed/
Sep 15, 2014 - Read **Urdu Novel** Online Hasil By Umera Ahmed. ... Latest Novels : Main Kisi Ka Husn e Khyal Hun **Urdu Novel** By Sonia Chaudhary05/03/ ...

نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے، مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی، ماموں، معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں، مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ رد و کد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے، مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں، مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو دادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلا پیمانے پر کرداتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خود کشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے، اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خود کشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے پر اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔

پندرہویں قسط

وہ دونوں پریشان بلکہ کسی حد تک حواس باختہ ہی بیٹھے تھے۔

"یہ نہیں ہو سکتا، اسیب جیسی کوئی چیز یہاں پر ہے ہی نہیں، کوئی ضرور ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے؟" آئے کت کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کا خون بالکل خشک ہو رہا تھا۔

"لیکن اس بار ہمارا وہم نہیں ہو سکتا ہم دونوں نے اسے دیکھا ہے۔" معاویہ نے فکرمندی سے کہا۔
"نظروں کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ آنکھوں دیکھی چیزیں بھی سچ نہیں ہوتیں۔" اس نے چڑچڑے پن سے کہا تھا۔
"یہ تو میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آسیب اور بدروح جیسا کچھ نہیں ہے فلک بوس میں۔ یہ وسامہ کا ذہن تھا جس نے من گھڑت کہانیاں بنائی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے، جو ہمیں آسیب کا جھانسا دے کر بے وقوف بنا رہا ہے۔" وہ اتنے پریقین لہجے میں کہہ رہی تھی کہ کچھ دیر کے لیے معاویہ اس کا چہرہ ہی دیکھتا رہ گیا۔
"مجھے لگتا ہے ہم نے پھر غلطی کر دی۔ شادی کرنے کے لیے ہمیں فلک بوس آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" معاویہ نے کہا۔
"نہیں۔ فلک بوس آنا ہماری غلطی نہیں ہے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم اپنے دشمن کو ایک بار پھر کھلا چھوڑ رہے ہیں۔" آئے کت نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میں نے بھی وسامہ کے ساتھ فلک بوس میں دو سال گزارے ہیں۔ ان دو سالوں میں وہ آسیب مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ وہ وسامہ کا وہم تھا اور کچھ نہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ آسیب ہے ہی نہیں۔ تو فلک بوس میں ایسا کون ہے، جو ہمیں آسیب بن کر ڈرانا چاہتا ہے۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے اور وہ ان تمام پہلوؤں پر غور کر رہی ہے جو ممکنات میں سے تھے۔ آسیب کی موجودگی اس کے اندر ڈر کو جنم دے سکتی تھی لیکن دشمن کا احساس پریشانی کا سبب بن رہا تھا۔
"آسیب اسی صورت میں ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے جب ہم پر اس کا کوئی قرض واجب الادا ہو۔ تم خود سوچو جو عورت ایک سو سال پہلے مر چکی ہے۔ بالفرض اگر اس کی روح فلک بوس میں بھٹکتی بھی پھرتی ہے تو وسامہ نے اس کا کیا بگاڑا ہو گا کہ اپنا بدلہ پورا کرنے کے لیے اس نے وسامہ جیسے اچھے انسان کو ہی مار دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈرا سکتی تھی۔ جسمانی طور پر چوٹ پہنچا سکتی تھی لیکن قتل کیوں کرے گی وہ اس کو؟ تم مانو یا نہ مانو۔ کوئی نہ کوئی ایسا ہے جو ہم سب کو مارنا چاہتا ہے اور وہ ہی ہمیں اس آسیب کا نام لے کر اس کا سایہ دکھا کر ڈرا رہا ہے۔"
وہ پریشان تھی اور پریشانی میں ہی بولتی جا رہی تھی۔
معاویہ پریشانی سے اسے دیکھتا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔
"اتنے گیسٹس انوائیٹڈ ہیں یہاں۔ مجھے فکر ہے وہ آسیب مہمانوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"
"پھر وہی بات۔ تم کیوں آسیب آسیب بول رہے ہو؟" وہ تڑپ کر بولی تھی۔
"کیونکہ اسی آسیب نے میرے بھائی کی جان لی ہے۔" معاویہ اس سے زیادہ تڑپ کر بولا۔
"اور میں نہیں چاہتا وہ آسیب یہاں مزید کسی کو کوئی نقصان پہنچائے۔"
"اگر تم میری بات مانو گے تو کچھ نہیں ہو گا۔ یقین کرو میری بات کا۔" وہ منت سے بولی تھی۔
"کیا چاہتی ہو تم؟ کیا کروں میں۔" وہ ذرا حیران ہو کر بولا تھا۔
"مجھے چھت پر جانے دو۔" اس نے ایک دم سے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
"وہ سایہ جو ہم نے چھت پر دیکھا جب تک میں اس کا پتا نہ چلا لوں سکون سے نہیں بیٹھوں گی۔" اپنے لہنگے کی

فال کو دونوں طرف سے انگلیوں سے ذرا سا اٹھاتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن اگلا قدم اٹھنے سے پہلے معاویہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

"پاگل پن مت کرو۔ میں تمہیں نہیں اوپر جانے دوں گا۔" وہ قطعیت سے بولا تھا۔

"پاگل پن میں نہیں ہم کر رہے ہو۔ ڈر کر بیٹھے رہیں گے تو وہ جو کوئی بھی ہے اسے اور شہ ملے گی۔"

"اور وسامہ کے بعد اگر اس نے تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچایا تو؟" اس نے جان بوجھ کر جملے کے آخر میں ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیا تھا۔

"میں تو زندہ رہ کر بھی مرے ہوؤں سے بدتر ہو جاؤں گا آئے کت! اسے کھونے کے بعد اب تمہیں بھی گنوا دینے کا حوصلہ نہیں ہے میرے اندر۔" وہ بہت منت اور بے چارگی سے بول رہا تھا۔

"دنیا میں چند ہی لوگ ہیں جن سے میں نے محبت کی ہے اور وہی چند لوگ میری زندگی میں باقی نہیں رہے... پہلے ماں، پھر وسامہ اور اب تم بھی۔"

وہ جذباتیت کی انتہا پر تھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ آئے کت کا دل ویسے ہی پگھلا جیسے تب پگھلا تھا جب وہ شادی کے لیے ہاں کہنے پر منت کر رہا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا معاویہ! میری بات کا یقین کرو۔" ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے منت سے کہا لیکن اتنی ہی شدت سے معاویہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہرگز نہیں... لیکن اگر تمہیں شک ہے تو ہم گارڈز کو بلا کر فلک بوس کی چیکنگ کر لیتے ہیں اگر وہ واقعی کوئی آسیب نہیں جیتا جاگتا انسان ہے تو اتنی سخت سیکیورٹی میں چھپ کر... نہیں رہ سکتا۔ ابھی سب پتا چل جائے گا۔"

انہوں نے سیکیورٹی انچارج کو بلوا کر سارے فلک بوس کو چھان مارا۔ ایک ایک کمرہ، ایک ایک راہ داری اور ایک ایک خفیہ راستہ تک دیکھ لیا، یہاں تک کہ تہ خانہ بھی نہیں چھوڑا۔ (مہمانوں کو جنگلی جانور کے اندر گھس آنے کا خدشہ کہہ کر ٹال دیا) لیکن کوئی ہوتا تو ملتا۔ عجیب لوگ تھے جو ہوا کا تعاقب کرنے لگے تھے۔ بھلا تاریکیوں میں بھی کبھی سائے ملے ہیں وہ تو سورج ڈھلتے ہی رات کی سیاہی میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب کو گھر سے نکلے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ جب روشن امی کو اس کی فکر لاحق ہوئی۔

"میں ذرا شیرو کو بھیجتی ہوں کہ فریحہ کے گھر پتا کر کے آئے۔ یہ خوش نصیب پتا نہیں کہاں رہ گئی ہے۔"

"آجائے گی خوش نصیب! آپ اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔" ماہ نور نے کہا۔ وہ انسٹی ٹیوٹ سے آج جلدی گھر آگئی تھی اور اب کچن ٹیبل پر چائے کا کپ رکھے، پیر اوپر کرسی پر جمائے فرصت سے بیٹھی ماں کو دن بھر کی روداد سنا رہی تھی۔

"پہلے بھی تو اکثر خوش نصیب فریحہ کے گھر اتنا اتنا ٹائم لگا کر آتی ہے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن میرا دل پتا نہیں کیوں بہت گھبرا رہا ہے۔" وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

"اچھا آپ ایسا کریں تھوڑی دیر جا کر لیٹ جائیں۔ رات کا کھانا میں بنا لوں گی۔" وہ ان کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر جلدی سے بولی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس بھی آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں تم دن بھر کی تھکی ہوئی آئی ہو۔ یہ سب کہاں کرتی پھرو گی۔"

"پہلے بھی تو کرتی تھی امی!" وہ نرمی سے بولی۔
"اچھا اب جائیں ناں ۔۔۔ فضیلہ چچی نے کچن میں کھڑے دیکھ لیا تو مزید چار کام انہیں یاد آ جائیں گے جنہیں آپ کا کرنا ہی ضروری ہوگا۔"
"ماہ نور!"
"جی امی!"
"تم سے ایک ضروری بات بھی کرنا تھی۔"
"ساری باتیں اب رات کو ہوں گی۔ آپ جا کر لیٹ جائیں بس۔" ماہ نور نے انہیں زبردستی کچن سے نکالا اور خود ہنڈیا بنانے کے لیے سبزی کاٹنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب خوف زدہ' ہراساں اور پریشان سی دروازہ زور زور سے کھٹکھٹا رہی تھی۔
"شامیر! شامیر دروازہ کھولو ۔۔۔ پلیز کوئی ہے' میری مدد کرو۔" وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور چیخ چیخ کر کسی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی اور بے بسی کے شدید ترین احساس کے زیر اثر رو رہی تھی۔ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے اور جب تک سمجھ آیا بہت دیر ہو چکی تھی۔ خود کو عقل کل سمجھنے کی عادت بالآخر اس کے گلے پڑ گئی تھی۔
دروازے سے مایوس ہو کر وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف آئی لیکن پردے کے پیچھے جو بڑی سی کھڑکی تھی اسے مضبوط سلاخوں سے بند کیا گیا تھا۔ خوش نصیب نے سلاخوں کو کھینچ کر خوب زور لگا کر توڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بے کار ہی گئی۔ مایوس ہو کر وہ وہاں سے بھی ہٹ گئی اور کمرے کے درمیان کھڑی ہو کر سوچنے کی کوشش کرنے لگی کہ یہاں سے بچ نکلنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے لیکن ذہن بالکل ماؤف سا ہو رہا تھا۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔
"یہ سب کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ ۔۔۔ آخر شامیر کیا چاہتا ہے؟ یا اللہ مجھ پہ رحم کر دے ۔۔۔ میں نے کسی کا دل دکھایا ہو تو مجھے معاف کر دے۔ میں دوبارہ کبھی گھر سے نہیں نکلوں گی۔ میں کبھی کسی کی بات کا بھروسہ نہیں کروں گی۔"
خوف اور پریشانی نے جیسے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ہی ختم کر دیا تھا۔ پریشانی کے مارے بالکل ہسٹیریکل ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن باہر کوئی ہوتا تو اس کی التجا سنتا۔
معاً" اس کے دل میں نجانے کیا سمائی۔ وہ سیدھی واش روم میں گئی اور وہاں کوئی روشن دان وغیرہ تلاش کرنے لگی۔ جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی ذریعہ بن سکے۔ روشن دان تھا لیکن وہ اتنا اونچا تھا کہ خوش نصیب چاہ کر بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔
مایوس ہو کر وہ باہر نکلی اور کمرے میں ادھر ادھر چکر کاٹنے لگی۔ تب ہی اس کی نظر کمرے کی دیوار گیر الماری پر پڑی۔ الماری کے ایک دروازے سے پانی کی ایک باریک سی دھار باہر آ رہی تھی۔ وہ چونک سی گئی الماری سے پانی کیسے نکل سکتا ہے۔ کچھ چونک کر اور کچھ محتاط انداز میں وہ الماری کی طرف بڑھی اور الماری کھول دی۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جسے وہ الماری سمجھ رہی تھی۔ دراصل وہ ایک تنگ اور تاریک سا پسیج بنا ہوا تھا۔ اس راستے سے گزر کر لازمی طور پر بنگلے کا کوئی پوشیدہ پورشن وغیرہ تھا اور نکاس کے ناقص انتظام

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

کی وجہ سے پانی باہر نکل آیا تھا۔ اندر ایک بدبو بھی مستقل محسوس ہو رہی تھی۔ خوش نصیب نے دوپٹے کا پلو ناک پر رکھا اور دل کڑا کر کے اندر داخل ہو گئی۔
اسے کچھ علم نہیں تھا۔ یہ راستہ اسے کس طرف لے کر جانے والا ہے۔ ذرا آگے جا کر یہ سیدھا ایک راہ داری میں مڑ جاتا تھا۔ جوں ہی خوش نصیب اس دوسرے راستے میں داخل ہوئی سامنے اسے ایک دروازہ نظر آیا جو ادھ کھلا سا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور احتیاط سے دروازے کی درز سے اندر جھانکا اور اندر نظر ڈالتے ہی اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ پلو والا ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس نے اپنے لبوں پر جما لیا تھا۔
سامنے ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا۔ کمرے میں دھواں سا پھیلا ہوا تھا اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ سامنے دیواروں پر شیطان کی شبیہات ٹنگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ عین درمیان میں آمنے سامنے چٹائیاں بچھائے شامیر اور بیری کے مزار کا ملنگ بابا آنکھیں بند کیے یوگا کے انداز میں کوئی آسن جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان میں کسی جانور کی ہڈیاں' تازہ گوشت' ناریل اور چمکتے خنجر پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ شامیر نے کالے رنگ کا عجیب و غریب وضع کا چغہ سا پہن رکھا تھا' گلے میں پتھروں کی مالائیں پہنی ہوئی تھیں اور چہرے پر کالے رنگ کی عمودی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ ایک نظر میں تو خوش نصیب اسے پہچان ہی نہیں پائی تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ اسے جبران کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سینے پر بازو باندھے' ماتھے پر بل ڈالے کھڑا شامیر اور ملنگ بابا کو دیکھ رہا تھا۔ خوف سے مرنے کے قریب پہنچی ہوئی خوش نصیب اپنی چیخ روکے درز سے جھانک رہی تھی۔ معاً" اس کا ہاتھ دروازے پر لگا اور کھٹکا سا ہوا۔ جبران نے فوراً" سر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ جہاں خوش نصیب کھڑی تھی۔
اس کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے اور کنپٹی کے قریب ایک رگ زور زور سے حرکت کرنے لگی۔
خوش نصیب ترنت وہاں سے ہٹی اور الٹے قدموں چلتی ہوئی وہاں سے بھاگی۔ کمرے میں پہنچ کر اس کا دل جیسے پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کس قدر بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ اس کا اندازہ اسے از سر نو ہونے لگا تھا۔
کون لوگ تھے یہ اور آخر خوش نصیب سے کیا چاہتے تھے؟ یہ سوال اژدھے کی طرح اسے نگلنے کو تیار کھڑا تھا۔
اس کی ٹانگوں سے جیسے جان نکل رہی تھی اور سارے جسم پر جیسے کپکپی سی طاری تھی۔ لیکن اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا ہے اور کیسے یہاں سے نکلنا ہے لیکن کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسی اثناء میں کمرے کے دروازے کے باہر کچھ کھٹ پٹ سی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے لاک کھولا گیا ہو۔ خوش نصیب نے سٹ پٹا کر ادھر ادھر دیکھا اور کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جسے وہ اپنے تحفظ کے لیے استعمال کر سکے۔ جلد ہی اسے ایک آرائشی گلدان نظر آیا جو کمرے کے ایک کونے میں رکھا گیا تھا۔ اس نے جھپٹ کر گلدان اٹھایا اور ایسی پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی جیسے اندر آنے والے کا اندر داخل ہوتے ہی سر ٹھونک دینے کا ارادہ ہو۔ گرفت میں مضبوطی لیکن چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ٹانگیں بھی باقاعدہ کانپ رہی تھیں۔
لاک ٹھک کی آواز کے ساتھ کھلا اور جبران کی شکل دکھائی دی۔ اس کے اعصاب کھنچے ہوئے تھے اور خوب صورت چہرہ پر طیش نظر آتا تھا۔
خوش نصیب الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی لیکن گلدان پر اس نے گرفت مزید مضبوط کر لی تھی۔
"ہٹو۔۔۔ پیچھے ہٹو میرے پاس مت آنا۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
"اس راز کو رکھو اور جلدی چلو میرے ساتھ۔" اس نے عجلت کہا۔
"تت' تم نے سنا نہیں۔۔۔ تت تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" اس کے سننے کی صلاحیت بھی جیسے خوف کے زیر اثر آ چکی تھی۔

اس کی پیشانی پر کئی بلوں کا اضافہ ہوا۔
"کم عقل لڑکی! میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔۔۔ اپنی خیریت چاہتی ہو تو جلدی چلو میرے ساتھ۔" اس نے ڈانٹ کر کہا۔
خوش نصیب کو چند منٹ لگے اس کی بات سمجھنے میں اور ساتھ ہی گلدان پر گرفت بھی قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔
"کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟"
"تم لڑکیوں کی عقل اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہے؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔
"وہ ملنگ اور شامیر ابھی چلہ کاٹ رہے ہیں۔۔۔ جب تک قربانی اور حاضری کے لیے وہ لوگ تمہیں لینے آئیں گے، میں تمہیں یہاں سے نکال چکا ہوں گا۔"
"قق۔۔۔ قربانی؟ حاضری؟ یہ تم کیا بول رہے ہو۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ ہراساں ہو کر بولی تھی۔ شامیر تو مجھے یہاں تم سے ملوانے کے لیے لے کر آیا تھا۔"
"دیکھو۔۔۔ مجھے نہیں پتا شامیر کیا بتا کر تمہیں یہاں لے کر آیا ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ یہاں تمہارے ساتھ اگلے ایک آدھ گھنٹے میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بعد تم کسی کو تو کیا خود کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوگی۔۔۔ وہ تم پر جن کی حاضری کروائیں گے اور اس کے بعد اپنے شیطانوں کے قدموں میں تمہاری بھینٹ چڑھادیں گے۔ سننے میں یہ باتیں شاید عجیب سی لگ رہی ہوں لیکن وہ لوگ یہی سب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"
خوش نصیب کے جسم کے سارے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔
"جن، بھوت، آتما، آسیب۔۔۔ ان سب کا دنیا میں کوئی وجود ہے یا نہیں لیکن اس مخلوق کے نام پر دنیا میں بہت دھوکے ہوتے ہیں اور تم مانو یا نہ مانو لیکن ان میں سے ہی ایک دھوکا تمہارے ساتھ ہونے جارہا ہے۔"
"اب اپنی خیریت چاہتی ہو تو چلو میرے ساتھ۔" یہ آخری بات اس نے قدرے غرانے والے انداز میں کہی تھی۔
خوش نصیب کی جیسے جان ہی نکل رہی تھی لیکن اسے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔
"اب چلو۔۔۔ کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟" وہ جھنجلایا۔
"میں، میں تم پہ کیسے بھروسا کر سکتی ہوں۔۔۔ تت یہ تم کون سا انسان ہو۔" بے ساختہ خوش نصیب کے منہ سے پھسلا اور اس کا چہرہ ناگواری سے بھنچ گیا۔
"مرضی ہے تمہاری۔۔۔ کسی بھروسامند انسان کے انتظار میں بیٹھی رہو، میں چلتا ہوں۔" بے مروتی سے کہتا وہ جانے لگا تو خوش نصیب کو ہوش آیا۔
"رکو۔۔۔ رکو۔۔۔ میں آتی ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ تقریباً سر پر پیر رکھ کر اس کے پیچھے دوڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

سیکیورٹی چیکنگ کے بعد ان دونوں کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن آئے کت کا دل عجیب طرح سے پریشان ہو گیا تھا تو دوسری طرف معاویہ کے ذہن و دل میں شکوک اور خدشات جنم لے رہے تھے۔ شادی کی رسومات کو ابھی کئی دن تک چلنا تھا لیکن معاویہ کے اصرار پر نکاح کی رسم اگلے ہی دن طے کرلی گئی۔ ہر ایک نے اس سے اس عجلت کا سبب پوچھا لیکن وہ محبت کا بہانہ بنا کر ٹالتا رہا۔ صرف آئے کت جانتی تھی وہ کسی بدمزگی کے خدشے کے تحت یہ جلدی مچا رہا تھا اور نکاح کے فوراً بعد فلک بوس سے نکل جانا چاہتا تھا۔

نکاح سے کچھ دیر پہلے وہ آئے کت سے ملنے اس کے کمرے میں گیا۔ بیوٹیشن اور اس کی مددگار لڑکیاں اسے سجانے سنوارنے میں مصروف تھیں۔

"ہم آپ کو دلہن سے ملنے نہیں دیں گے۔" بیوٹیشن نے اسے دیکھ کر دروازے پر ہی شوخی سے کہا تھا۔

معاویہ کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے دروازے میں ہی کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ دور سنگھار میز کے سامنے آئے کت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی کمر دروازے کی طرف تھی اور وہ ذرا سا گردن اور چہرے کو موڑے معاویہ کی باتوں پر کان لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کے چہرے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اونچے جوڑے کی وجہ سے صراحی دار گردن کا خم کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔

"میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں رکھتا۔" اس نے مسکراہٹ چھپا کر ذرا سنجیدگی سے کہا۔

"آگے سے ہٹیں اور مجھے اندر آنے دیں۔"

وہ سب فوراً "محتاط ہو کر آگے سے ہٹیں اور معاویہ اندر آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے ان سب کو باہر جانے کا حکم دیا تو وہ آگے پیچھے باہر نکل گئیں۔ معاویہ آئے کت کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ بولنے کا ارادہ تھا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی ہر لفظ بھول گیا۔ اس کی بات آئے کت کے حسن کی نذر ہو گئی۔

اس کا شاہی لباس' اس کے زیورات اور اس کی آرائش۔۔ کیا چیز تھی جو اس پر اس کے وجود کا حصہ نہ معلوم ہوتی ہو۔

آئے کت نے بت بنے اس کو خود کو دیکھتے پایا تو اس کی آنکھوں میں چمکتی ستائش کو حق کی طرح وصول کرتے ہوئے مسکرائی اور سنگھار میز کے آئینے میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" گو کہ اس کے سوال میں سوال نہیں۔ پورا ایک جواب پنہاں تھا۔ وہ جانتی تھی' وہ اس وقت دنیا کی سب سے خوب صورت دلہن لگ رہی ہے۔ اس کے حسن کو کسی کے لفظوں کی ضرورت نہیں۔ محبوب کی آنکھیں جب ستائش کے رنگوں سے بھر جاتی ہیں تو محب کا دل لفظوں کی قید سے آزاد ہو کر دھڑکنے لگتا ہے۔

"میں نے دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت چہرہ نہیں دیکھا۔ تم اب تک کہاں تھیں؟" وہ جیسے اس کے حسن کے سحر میں گم صم سا بول رہا تھا۔

"یہیں تھیں۔ لیکن تمہیں کبھی دکھائی ہی نہیں دی۔" وہ شرمیلی مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولی۔

وہ ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ آئے کت نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو بولا۔

"کاش! تم مجھے پہلے دکھائی۔۔ دی ہوتیں آئے کت! کاش!"

وہ نہ اس کی ہنسی کا مطلب سمجھی نہ بات کا۔

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی معاویہ!"

"میں ٹھیک ہوں۔ بس پریشان ہو گیا ہوں' وقت بڑی ظالم شے ہے' کہیں تمہیں بھی مجھ سے چھین نہ لے۔"

"نہیں کوئی ایک دوسرے سے چھین نہیں سکتا اب۔ اپنے اپنے حصے کے مصائب اپنے اپنے حصے کی مجبوریوں کا بوجھ اٹھا چکے ہیں ہم۔ اب ہم اپنی زندگی جئیں گے۔ اپنی خوشیوں سے جھولیاں بھریں گے۔" وہ پریقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں ایسا ہی ہوگا۔" وہ گہری سانس بھر کر اس کی طرف پلٹا۔

"میں نے اپنی محبت کا حصار باندھ دیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" وہ مسکرایا

ذرا سا جھکا اُس کے سر پر بوسہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔
آئے کت گردن موڑے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔
معاویہ چلا گیا اور باہر آکر خود بھی تیار ہونے لگا۔ دنیا کی سب سے خوب صورت دلہن کے لیے اسے دنیا کا سب سے جاذب نظر دلہا بننا تھا لیکن وہ بھول گیا تھا محبتوں کے حصار آنے والے مصائب کا راستہ کب روک سکتے ہیں۔ محبت تو ایک بے کار سا جذبہ ہے جو انسان کو طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ تو دے سکتا ہے لیکن محبوب کو ناگہانی سے نہیں بچا سکتا۔

بشام کے سینے پر دل کی طرح دھڑکتے فلک بوس کا قصہ مختصر۔
نکاح خواں گواہان کی معیت میں جب نکاح نامے پر سائن کروانے دلہن کے کمرے میں پہنچے تو کمرہ خالی تھا اور دلہن اس ہیولے کی طرح غائب ہو چکی تھی جس کے تعاقب میں پھر ساری زندگی معاویہ اردشیرازی دوڑتا رہا لیکن اس کا سراغ نہ پا سکا۔
اور یوں معاویہ اردشیرازی اور آئے کت کی محبت کی کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔
بشام کی جاہل کمزور عقیدہ عورتوں کی بات درست ثابت ہو گئی اور فلک بوس کا آسیب ایک اور محبت کو نگل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جبران تھا یا عبدالجبار۔ کوئی عام انسان تھا یا ناری مخلوق۔
خوش نصیب صرف اتنا جانتی تھی وہ اس کا محسن تھا جو اسے موت کے منہ سے نکال لایا تھا۔ جب تک سوسائٹی کی حدود سے نکل کر گاڑی مین روڈ پر نہیں آ گئی خوش نصیب چپ چاپ بیٹھی اپنی منتشر کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر دروازے کے بالکل ساتھ چپک کر بیٹھی ہوئی تھی اور بار بار کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو دانت بھینچے سامنے دیکھتا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔
جب خوش نصیب تھوڑا سنبھل گئی تو اس نے گلا کھنکھار کر اور ڈرتے ڈرتے بات کرنا شروع کی۔
"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے مجھے اتنی بڑی مشکل سے نکال دیا۔"
وہ خاموش ہی رہا۔
"اگر تمہارے دل میں انسانیت نہ جاگتی تو یقیناً" اب تک میری بھینٹ چڑھائی جا چکی ہوتی۔" اپنی بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے تھے۔
اس نے گردن موڑ کر خوش نصیب کو دیکھا اور شاید اس کی روئی ہوئی شکل دیکھ کر اسے تھوڑا ترس آ گیا۔ تب ہی قدرے نرم لہجے میں بولا۔
"تمہیں تمہارے بڑوں نے یہ نہیں سکھایا کہ اجنبیوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے؟ میں حیران ہوں تم شامیر جیسے انسان پر بھروسا کیسے کر سکتی ہو۔"
"شامیر جیسا انسان ___ مطلب؟"
"اس کے ماتھے پر لکھا ہے وہ کتنا بڑا فراڈ ہے ___ کسی کی شکل و صورت اچھی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کا دل بھی صاف ہی ہوگا۔ تم لڑکیاں اچھی شکل اور پرسنالٹی دیکھ کر ہمیشہ متاثر کیوں ہو جاتی ہو۔" وہ بے رحمی سے تبصرہ کر رہا تھا۔
خوش نصیب کی نازک طبیعت ایسی پوزیشن میں نہیں تھی کہ برا مناتی اور اپنے محسن کی باتوں کا تو ہرگز نہیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" خوش نصیب نے مردہ سے لہجے میں کہا۔
"وہ اجنبی نہیں ہے میری چچی کا رشتہ دار ہے۔ کئی دنوں سے ہمارے گھر میں رہ رہا ہے۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"لیکن یہ باتیں کسی پر اعتماد کرنے کے لیے کافی تو نہیں ہیں۔ تم اس کے ساتھ اکیلے گھر میں چلی گئیں۔ مجھے یہ بات کافی عجیب لگ رہی ہے جبکہ تمہیں دیکھ کر یہ بھی پتا چل رہا ہے کہ تم کردار کی بری لڑکی نہیں ہو۔"
"اس کامپلی منٹ کے لیے شکریہ۔" اس نے آنسو پونچھ کر کہا۔
"یہ کامپلی منٹ نہیں ہے۔ صرف کمنٹ ہے۔" وہ ناگواری سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
خوش نصیب نے ذہنی بوجھ سے تنگ آکر دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔
"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں اتنی بڑی بیوقوفی کیسے کر سکتی ہوں۔ میری روشن امی نے ہم بہنوں کو اپنی عزت کی حفاظت کرنا سکھایا ہے۔ اپنی سیلف ریسپکٹ کو ہمیشہ اولیت کے درجے پر رکھنے کا درس دیا ہے۔ پھر میں شامیر کی باتوں میں کیسے آگئی۔" وہ ایک دم سے الجھ گئی تھی۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا اور بڑا زور ڈالنے کے باوجود اسے یاد نہیں آرہا تھا اس نے شامیر کی باتوں پر بھروسہ کیسے کر لیا۔
"میرا خیال ہے میں سمجھ سکتا ہوں تمہارے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔" وہ پر سوچ انداز میں بولا۔
"شامیر ہپناٹزم کا ماہر ہے۔۔۔ تمہارے ساتھ جو بھی ہوا ہے یا ہو تا رہا ہے وہ یقیناً" شامیر ہپناٹزم کر کے کروا تا رہا ہو گا۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟" وہ شاکڈ ہوئی۔
"میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ شامیر ہپناٹزم کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا اچھا mind reader (ذہن پڑھنے والا) بھی ہے۔۔۔ اور تم شکل سے ہی ایک بے وقوف لڑکی لگتی ہو۔ یقیناً" اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تم اسے سب سے آسان ہدف محسوس ہوئی ہوں گی لیکن خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ شامیر کوئی اتنی بھی توپ چیز نہیں ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔"
خوش نصیب کو لفظ بے وقوف پر اچھا خاصا اعتراض تھا لیکن یہ وقت کسی قسم کے اعتراضات کے لیے مناسب نہیں تھا۔
"شامیر نے تو مجھ سے کہا تھا اس کے پاس کوئی مؤکل ہے۔۔۔ جو مجھے تنگ کرتا رہا ہے اور اسی جن سے چھٹکارا حاصل کرنے میں یہاں آئی تھی۔"
"تمہیں جن سے چھٹکارا چاہیے تھا اور مجھے ایک روح کی تلاش نے شامیر سے ملوا دیا تھا۔ اپنے کچھ بہت عزیز رشتوں کو کھو دیا تھا میں نے۔ کچھ سوالوں کے جواب چاہیے تھے جن کی تلاش میں میں شامیر سے آملا اور یہاں آکر مجھے احساس ہوا وہ کس قدر جھوٹا انسان ہے۔ نہ اس کے پاس کوئی مؤکل ہے نہ وہ روحوں کو بلوا سکتا ہے۔۔۔ ہاں وہ انسانوں کو بھٹکاتا ضرور ہے۔"
"لیکن وہ جن۔۔۔" وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔
"اس نے ضرور ایسا ہی کہا ہو گا۔۔۔ لیکن کوئی مؤکل وؤکل نہیں ہے اس کے پاس۔۔۔ ہاں البتہ وہ اللہ کی ناری مخلوق کو قابو کرنے کی کوششوں میں جتا ہوا ہے اور اسی مقصد کے لیے وہ مزاروں اور ملنگوں کے پاس بھی جاتا ہے۔۔۔ جو کہ سراسر بے وقوفی ہے۔۔۔ تم دیکھنا اس کے ارادے ایک دن اسے مروائیں گے۔ اگر اللہ یہ چاہتا کہ جنات انسانوں پر قابو پائیں یا انسان جنات کو اپنے زیر اثر رکھیں تو وہ ہماری دنیائیں بھی ایک ہی بناتا۔۔۔ تمہیں پتا ہے جنات کو انسانوں کی دنیا میں دخل دینے کی ہرگز اجازت نہیں ہے نہ ہی انسان جنات کی دنیا میں دخل اندازی کر

سکتے ہیں۔۔۔ لیکن جو ایسا کرتا ہے وہ پھر اس کا نقصان بھی اٹھاتا ہے۔"

"اگر شامیر ایک بار مجھے ہپناٹائز کر سکتا ہے تو بار بار کر سکتا ہے۔۔۔ ایک بار میں اس کے چنگل سے نکل گئی۔۔۔ لیکن دوبارہ ایسا ہوا تو۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"تم اگلی بار ایسی نوبت ہی نہ آنے دینا۔" وہ تحمل سے بولا۔

"ایسے لوگوں کا سب سے اہم ہدف آنکھیں ہوتی ہیں۔ تم دوبارہ نہ شامیر کی بات غور سے سننا نہ اس کی آنکھوں میں جھانکنا۔۔۔ تمہارے دماغ پر کبھی قابو نہیں پا سکے گا۔۔۔ اور ہاں۔" اس نے گاڑی خوش نصیب کے بتائے ہوئے مقام پر روک دی۔

"اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔۔۔ جب بھی تمہیں ایسا محسوس ہو کہ کوئی غیر مرئی طاقت تم پر قابض ہو رہی ہے قرآن پڑھ لیا کرنا۔۔۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔"

اس نے بٹن دبا کر خود کار دروازہ کھول دیا تھا۔ خوش نصیب چونکی۔

"تم نے میری اتنی مدد کی۔۔۔ لیکن ابھی تک میرا نام بھی نہیں پوچھا۔"

"نام پوچھ کر کیا کروں گا۔۔۔ تمہاری جان انسانیت کے ناتے بچائی ہے اور انسانیت کے معاملات میں نام نہیں پوچھے جاتے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔

"لیکن تم تو جن ہو۔۔۔ تمہارا انسانیت سے کیا کام۔" وہ ہونق سی شکل بنا کر بولی۔ تو اس کا دل چاہا اپنا سر ہی پیٹ لے۔

"یقین مانو۔ جتنی تم شکل سے بے وقوف لگتی ہو اس سے ہزار گنا زیادہ بے وقوف ہو۔۔۔ شامیر نے اگر تمہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تو بالکل صحیح کیا۔۔۔ تم مر کھپ جاتیں اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ میں کوئی جن ون نہیں ہوں بی بی! ایک عام انسان ہوں۔ مٹی سے بنا ہوا بالکل ویسے ہی جیسے تم ہو۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ میرے سر میں جو دماغ ہے وہ ٹھیک ٹھاک کام کرتا ہے۔" وہ بہت چڑ کر بولا تھا۔

خوش نصیب نے شرمندہ ہو کر اپنا سر جھکا لیا اور گاڑی سے اتر گئی۔ پھر کھڑکی میں جھکی اور شرمندہ سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"میں اپنے محسن کو ساری زندگی یاد رکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ اگر تم جبران نہیں ہو تو۔۔۔ تو پھر کون ہو؟" اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

"معاویہ۔۔۔ معاویہ اردشیر ازی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور گیئر پر ہاتھ رکھ کر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"امید کرتا ہوں ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔"

وہ گاڑی زن سے بھگا لے گیا۔ اڑتے ہوئے بالوں اور دوپٹے کے ساتھ خوش نصیب تھکی ہاری سی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

تین دن گزر گئے لیکن وہ بخار جو خوش نصیب کو چڑھا اس نے اترنے کا نام نہ لیا۔

اس کا رنگ خوف سے پیلا پڑ گیا اور آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے۔

اگر شاہ جنات کے نام سے وہ فرشتہ صفت انسان اسے اس دلدل سے نہ نکالتا تو اب تک وہ تباہ و برباد ہو چکی ہوتی۔ بلکہ اپنی بربادی کا ماتم منانے کے لیے زندہ بھی نہ ہوتی۔ جان بچا کر واپس تو آ گئی لیکن ایسے آئی کہ اس کی ذہنی دنیا بدل چکی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا خود کو عقل کل سمجھ کر وہ کتنی بڑی غلطی کرتی رہی

ہے۔ اب تک زندگی میں وہی سب کیا تھا جو اسے ٹھیک لگا تھا۔ روشن امی جتنی سرزنش کرتی رہی ہوں۔ ماہ نور نے تحمل اور برداشت کے جتنے اسباق پڑھائے ہوں۔ خوش نصیب نے وہی کیا جو اسے ٹھیک لگا اور زندگی میں ہمیشہ اس نے نقصان ہی اٹھائے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی اتنی بے بسی اور ذلت اور ڈر محسوس نہیں کیا تھا۔
شامیر کے عزائم پورے ہو جاتے تو اب تک یقیناً" وہ ایک جیتے جاگتے انسان سے ایک کٹی پھٹی لاش بن چکی ہوتی۔

خوش نصیب کو رہ رہ کر افسوس ہوتا کہ کیوں شامیر کی باتوں میں آگئی۔ کیوں اس کی امارت اور اچھی شکل پر ریجھ گئی۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ لڑکا جو اچانک سے اٹھ کر اس سے محبت کا دعوے دار ہو رہا ہے اس کی عام سی شکل و صورت پر کیسے فریفتہ ہو سکتا ہے۔ آخر ایسا تھا ہی کیا اس میں۔ نہ حیام جیسی روشنیاں بکھیرتی رنگت نہ منہا جیسی غزالی آنکھیں۔ نہ فہمینہ جیسا قد بت۔ حتیٰ کہ اس کے پاس تو ماہ نور جیسے ٹھنڈا میٹھا لب و لہجہ بھی نہیں تھا جو اس کی ساری خامیوں کو دبا دیتا۔
اس کے پاس تو بس دوسروں کے منہ توڑتے ہوئے جوابات تھے۔ ذہنی پریشانیاں تھیں۔ جو وہ تڑاتڑ دوسروں پر وارتی رہتی تھی اور اپنے تئیں خوش ہوتی تھی کہ دیکھا۔ کیسا چپ کرایا انہیں۔
سوال یہ تھا کہ اس نے کیوں نہیں سوچا شامیر اسے محبت کا نام لے کر بیوقوف بنا سکتا ہے؟
یہ حادثہ اسے سر سے پیر تک بدل گیا تھا اور مزے کی بات یہ کہ اس کی خاموشی کو فضل منزل کے ایک ایک فرد نے نوٹ بھی کیا تھا۔
پتا نہیں وہ سچ مچ خاموش ہو گئی تھی یا خاموش ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرے پر سو درے اسی اثناء میں شامیر بھی واپس آگیا۔ خوش نصیب کو دیکھتے ہی وہ دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا تھا۔ خوش نصیب نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔
شامیر نے اس کے سامنے آکر راستہ روکا تھا۔

"ناراض ہو؟"
"ناراض دوستوں سے ہوا جاتا ہے۔ میں تمہیں اتنی بھی اہمیت نہیں دیتی۔" خوش نصیب نے غرا کر کہا تھا۔
"اپنی بہتری چاہتے ہو ناں تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ سب کو تمہاری اصلیت بتا دوں گی۔"
"ارے میں تو ڈر گیا۔ دیکھو میری تو ٹانگیں بھی کانپنے لگی ہیں۔" سنجیدگی سے بولتا وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"تم واقعی خوش نصیب ہو۔ ورنہ مجھ سے بچ کر نکلنا آسان نہیں تھا۔۔۔ اب میری ایک بات کان کھول کر سنو۔ اپنی جان پیاری ہے تو اپنی زبان بند رکھنا۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک بار تم مجھ سے بچ نکلی ہو تو دوسری بار بھی قسمت تمہارا ساتھ دے۔ میری بات سمجھ گئیں ناں۔"
خوش نصیب کو اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ یہ وہ شامیر نہیں تھا جسے اب تک وہ جانتی تھی اور ملتی رہی تھی۔ یہ کوئی اور تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ تھیں اور بولتے ہوئے وہ ایسا لگتا تھا جیسے آگ اگلتا ہو۔
خوش نصیب بات سمجھی یا نہیں لیکن خاموش ضرور رہی۔ شامیر مڑ کر چلا گیا۔ خوش نصیب کا تنفس اور دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ بس نہ چلتا تھا اس کا منہ ہی نوچ ڈالے۔

☆ ☆ ☆

یہ اس سے چند روز بعد کی بات ہے۔ دوپہر کے بعد جب صباحت بیگم' فضیلہ چچی کے پورشن میں جا کر

بیٹھیں۔ فضیلہ بیگم اس وقت پرانی اون کا سوئیٹر ادھیڑنے کی کوششوں میں تھیں۔ جٹھانی کو دیکھ کر ساری اون سمیٹی ایک طرف اور ان کے کان میں گھس کر رازداری سے بولیں۔

"کیوں آپا! پھر کچھ پتا چلا؟"

صباحت تائی جان نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"میں سمجھی نہیں، کس بارے میں پوچھ رہی ہو؟"

"ارے خوش نصیب کی بات کر رہی ہوں۔۔۔ کچھ پتا چلا خود کشی کیوں کر رہی تھی؟" وہ مزید رازداری سے آنکھیں مٹکا کر پوچھ رہی تھیں۔ صباحت بیگم گہری بیزار کن سانس بھر کر رہ گئیں۔

"خود کشی نہیں کر رہی تھی۔۔۔ وہ نیند میں چل رہی تھی اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے کہ کئی دن اسے یاد رکھا جائے اور بار بار دُہرایا جائے۔" وہ نرمی سے بولی تھیں۔

"نیند میں چلنا معمولی بات نہیں ہوتی آپا! صیام بتا رہی تھی یہ ذہنی بیماری ہوتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں یاد آیا سائیکالوجیکل ڈس آرڈر۔۔۔ اچھا خاصا لگ رہا ہوتا ہے انسان لیکن دماغ میں بیماری کی جڑیں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔۔۔ اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو خوش نصیب تو پہلے ہی مجھے نفسیاتی مریضہ لگتی ہے۔ ایسے ہی تو ہر ایک کی زندگیاں عذاب نہیں کیے رکھتی۔" وہ ناک چڑھا کر کہنے لگیں۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔۔۔ میری معلومات اصل میں کافی کم ہیں۔" وہ فضیلہ بیگم کی زبان کی دھار سے ڈرتی تھیں اس لیے قائل ہوں یا نہیں عموماً"ہاں میں ہاں ملا کر رکھنا ہی بہتر سمجھتی تھیں۔

"کیا پکا رہی ہو؟ میں تو کالے چنے ہلکی آنچ پر رکھ کر آئی ہوں۔۔۔ تمہارے بھائی صاحب کو کالے چنوں کا شوربہ بڑا پسند ہے۔" انہوں نے موضوع بدلنے کی شعوری سی کوشش کی تھی۔

"اسی لیے تو بتا رہی ہوں آپ کو کہ خوش نصیب کی بیماری کو معمولی نہ سمجھیں۔" فضیلہ بیگم نے گفتگو کی گاڑی کو اسی ٹریک پر لاتے ہوئے کہا۔

"کل کلاں کو اسی نیند کے چکر میں کوئی اور گل کھلا آئی تو دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے ہم۔"

"توبہ ہے فضیلہ! تم بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔" وہ چڑ ہی تو گئیں۔

"میں آپ کو صاف بتا رہی ہوں آپا! روشن سے کہیں یا خوش نصیب کا علاج کروائے یا پھر کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر شادی کر دیں۔ سنا ہے لڑکیوں کے بہت سے ذہنی مسائل بھی شادی کے بعد دب جاتے ہیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ یہ کسی لڑکے کا ہی معاملہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ کتنا چپ چپ رہنے لگی۔ پہلے کیسے تڑخ تڑخ کر جواب منہ پر مارتی تھی۔ آج کل جو مرضی کہہ لو۔ آواز نہیں نکلتی اس کی۔"

"اس میں کون سی بڑی بات ہے' ماں نے سمجھا دیا ہوگا۔"

"صدقے جاؤں میں آپ کی سادگی کے۔ پہلے بھی تو یہی ماں تھی۔۔۔ اس سے پہلے کیوں نہ سمجھانے کا خیال آیا۔" طنز۔

"تم آخر اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتیں۔۔۔ خوش نصیب بھی ہماری اپنی بچی ہے۔ ایسے معمولی باتوں کو اچھالیں گے تو چھینٹیں خود پر بھی پڑیں گے۔" وہ نرمی سے کہنے لگیں۔

"ہائے ہائے ہماری بچی بول ہونے لگی۔ بھئی مجھے تو دو بیٹیاں ہی کافی ہیں البتہ آپ کا اسے گود لینے کا ارادہ بن رہا ہے تو آپ کی مرضی۔" وہ تنک کر بولیں اور آنکھیں پھیرلیں۔

"میں تو سوچ رہی تھی آج صیام کے ابو سے بھی بات کروں گی۔ کسی اچھے ذہنی امراض کے ڈاکٹر کو دکھائیں خوش نصیب کو۔۔۔ ویسے بھی یتیم بچیاں ہیں' ہم خیال نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔"

"ہاں، صحیح کہہ رہی ہو۔"

"آپ بھی میری ایک بات سن لیں آپا! کیف کے لیے جب بھی لڑکی دیکھنے کا ارادہ ہو، میری بچیوں کا خیال بھی رکھیے گا۔۔۔ گو کہ ماں ہو کر یہ اپنے منہ سے یہ بات کہنا مناسب تو نہیں لگتا لیکن کیا کریں مجبوری ہے۔۔۔ اللہ نے خاندان بھی ایسا دیا ہے، ہمیں جنہیں خود سے ہماری مجبوریاں نظر ہی نہیں آتیں۔۔۔ لیکن اللہ کا شکر ہے اس نے ہمیں کسی کا منہ دیکھنے کا محتاج نہیں رکھا۔ صیام کی شادی تو میں شامیر سے ہی کروں گی۔"

"اچھا۔۔۔ شامیر کی والدہ نے ایسی کوئی بات کی ہے کیا؟" وہ خوش ہو کر پوچھنے لگیں۔

"باضابطہ طور پر تو نہیں۔۔۔ لیکن اشارتاً" وہ کئی بار مجھے کہہ چکی ہے۔۔۔ ویسے بھی آپ نے دیکھا نہیں شامیر کا جھکاؤ صیام کی طرف کتنا ہے۔"

"ہاں، یہ تو غور کیا ہے میں نے۔" وہ آہستہ سے بولیں۔ دل تو چاہ رہا تھا، صاف کہہ دیں۔ شامیر کا جھکاؤ ہے یا صیام کا؟ لیکن نقص امن کا خدشہ تھا سو چپ ہی رہیں۔

"بس پھر آپ کیف کے لیے منہا کو ذہن میں رکھیے گا۔۔۔ ایسا نہ ہو بالا ہی بالا رشتہ طے کر کے بیٹھ جائیں اور ہمیں کان و کان خبر نہ ہو۔"

"بھئی کیف کی شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے ہمارا۔" زچ ہو کر کہنے لگیں۔

"ارادہ بنتے کون سا دیر لگتی ہے آپا!"

"میں ذرا ہنڈیا دیکھ لوں۔" صباحت بیگم سٹپٹا کر کہنے لگیں اور جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

اسی شام کیف کی آمد ایسی ہی ثابت ہوئی جیسے گرم دوپہر کے بعد شام ڈھلے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ باغ و بہار بھی ایسا تھا، آتے ہی فضل منزل میں رونق دوڑا دی۔ ہنسی مذاق، قہقہے ایسا لگا۔ سوئی ہوئی زندگی جاگ اٹھی ہو۔
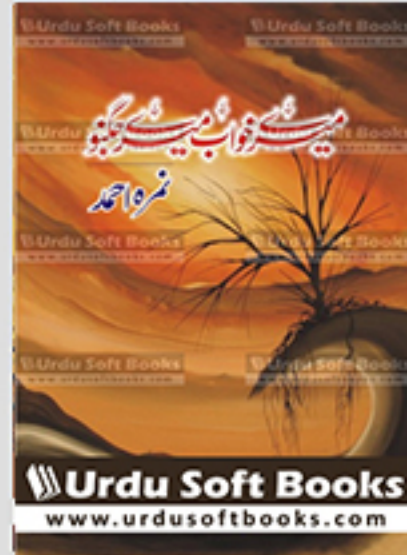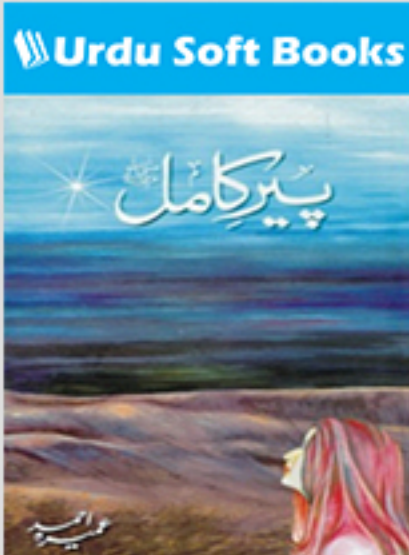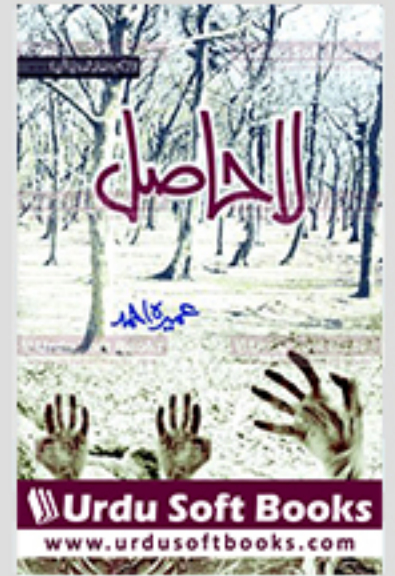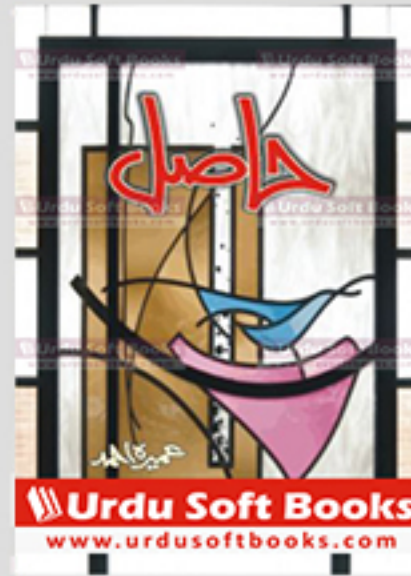
پتا نہیں کیوں لیکن خوش نصیب کو اس کی امید سے بڑی تسلی ہوئی۔ ایسا لگا دل کو قرار سا آگیا ہو۔
وہ بھی اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر جان گیا کہ کوئی بات ہے جو اسے پریشان کر رہی ہے۔ رات گئے جب پچھلے صحن میں فضل منزل کی ساری ینگ جنریشن اکٹھی ہو کر بیٹھی تو ان میں شامیر بھی شامل تھا۔ خوش نصیب نے وہاں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور اپنے کمرے میں آکر کروٹیں بدلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا شامیر کو فضل منزل سے کیسے بھگائے۔ جو اسے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ کل کو کسی بھی دوسری لڑکی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ کوئی اتنی بھی معمولی بات نہیں تھی کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ لیکن وہ جانتی تھی کوئی بھی اس کی بات پر اعتبار نہیں کرے گا۔ وہ اپنی زبان درازی سے خود کو ناقابل اعتبار بنا چکی تھی اور شامیر کا راز فاش کرنے کے لیے کسی ٹھوس بنیاد کی ضرورت تھی۔
اگلے روز اسے کیف سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ کچن سے ناشتے کے نام پر چائے کا ایک کپ لے کر نکل رہی تھی کہ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
"کیا بات ہے؟ اتنا برا منہ کیوں بنایا ہوا ہے؟ تم بیمار رہی ہو کیا؟" سیدھے انداز میں سیدھا سوال تو ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اتنی سی بات پوچھنے کی دیر تھی کہ خوش نصیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ خود کو اتنا کمزور اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔
کیف چونک گیا۔
"کیا بات ہے خوش نصیب! سب خیر تو ہے ناں؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔
"سب خیر نہیں ہے کیف! میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کس سے بات کروں۔" اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا تھا۔
"مجھے بتاؤ۔۔۔ کیا مسئلہ ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟" اس کا بس نہ چلتا تھا اس کی ساری پریشانی سمیٹ لے۔
"ت۔۔۔ تم اعتبار کرو گے میرا؟"
"کم سے کم تمہیں مجھ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ ذرا سی ناراضی کے ساتھ بولا تھا۔
"دنیا میں جب کوئی ایک انسان بھی ایسا نہ ہو جو تمہارا اعتبار نہ کرے تو بھی کیف تمہارا اعتبار کرے گا۔۔۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تمہیں کبھی میری محبت کا یقین ہی نہیں آیا۔"
وہ کیا کہہ رہی تھی یہ کیا کہہ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" خوش نصیب نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا لیکن اسی وقت صباحت تائی جان آگئیں۔
"کیف! ذرا میرے ساتھ نزہت کے گھر چلو ایک بڑا ضروری کام ہے۔" وہ چادر اوڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
"امی! پلیز ابھی نہیں۔"
"ارے دس پندرہ منٹ کا کام ہے۔۔۔ موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے جاؤ گے تو کون سا قیامت آجائے گی۔" چڑ کر کہا۔
"چلو چلو۔۔۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر لے جانے لگیں۔ کیف نے جاتے جاتے خوش نصیب کو اشارہ کیا کہ بعد میں بات سنتا ہوں لیکن خوش نصیب کی آنکھوں میں مایوسی پھیل گئی کیونکہ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ یہ بھی۔۔۔ دوبارہ نہیں آسکے گا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قدسیہ یاسمین

آپ کا باورچی خانہ

جوابات سے پہلے ہمارے تعارف کا اعزاز تو حاصل کرلیں۔

ہمارا نام سلیقہ بانو' اماں کا نام تہذیب بیگم اور نانی کا نام تمیز آرا۔ یہ الگ بات کہ دونوں کے شوہران کے نام کے ساتھ "بد" کا سابقہ ضرور لگاتے ہیں۔

ہم اپنے نام کی طرح سلیقہ شعار ہیں' لیکن صرف پہننے' اوڑھنے کی حد تک' شادی سے پہلے تو بس ایک ہی کام تھا۔ بننا سنورنا' خوب صورت اور جدید ڈیزائن کے سوٹ پہن کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر ریموٹ ہاتھوں میں لے کر سارا دن ٹی وی دیکھنا۔ مرمر کر جیسے تیسے ایف اے کرہی لیا' مگر بتاتے سب کو ایم اے ہیں۔ (آپ سے اب کیا چھپانا؟ اور کسی نے سند تھوڑی مانگ کر دیکھ لینی ہے۔)

ابا کا ہوٹل تھا اور خوب چلتا تھا۔ تینوں ٹائم کا کھانا ہوٹل سے آتا تھا۔ چائے صبح کو ہوٹل سے آیا کرتی تھی اور ڈبل روٹی گھر میں گرم کرتے تھے' لیکن جب ڈبل روٹی بھی گرم کرنا عذاب لگنے لگا تو پھر صرف چائے اور ابلے انڈے پر آگئے۔

انڈے ہماری جان۔۔۔ ہمارا پہلا پہلا عشق۔۔۔ ہاں جی میں۔۔۔ چلیں اس کی کہانی بھی آپ کو سنا دیتے ہیں۔

جب ہم پیدا ہوئے تو وہ ناشتے کا وقت تھا۔ ابا ناشتا کررہے تھے۔ اس وقت ہوٹل پر انڈے نہیں ابلتے تھے۔ نانی نے مارے باندھے انڈا ابالا جو کہ "پکا" کم اور "کچا" زیادہ تھا۔ ابا نے غصے میں پوری کی پوری "زردی" ہمارے منہ میں انڈیل دی۔ (اسی لیے تو نانی کہتی ہیں' ہم بہت مضبوط معدے کے مالک ہیں۔) سو اسی دن سے' اسی وقت سے ہم "گرفتار عشق انڈاز" ہوگئے۔ یعنی پنگوڑے سے ہی ہمیں انڈے سے محبت ہوگئی۔ وہ دن اور آج کا دن ہمارا انڈے سے ناغہ نہ ہوا۔

اور ہمیں یاد ہے جب پہلی بار ہمارے شوہر نے ہم سے پوچھا کہ "تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟" تو ہم نے آنکھیں بند کرکے جواب دیا۔ (بھئی ایک دن کی دلہن تھے ہم۔)

"انڈا۔"

"کیا تم نے کبھی کسی سے عشق کیا؟" (نئی نویلی دلہن سے بھلا اس طرح کے سوال کرتے ہیں۔)

"ہاں۔۔۔ جھولے سے ہی عشق کیا۔" اور اس بات پر یقیناً میاں صاحب "دھک" سے رہ گئے ہوں گے۔

"انڈے" سے۔۔۔ ہم نے مزے سے جواب دیا اور ان کی رکی سانس بحال ہوئی اور اس سے پہلے کہ انڈا نامہ شروع ہوتا۔ انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

"کھانے میں سب سے اچھا کیا بنالیتی ہو؟"

"انڈا بہت اچھا ابالتی ہوں۔"

"پھر "انڈا" کہیں میری چڑ ہی نہ بن جائے یہ انڈا۔" میاں صاحب بڑبڑائے۔۔۔ لیکن ہم نے بڑے آرام سے سن لیا۔ ہماری سماعت بھی قابل رشک ہے۔

سوالنامے پر نظر پڑی تو سوچا ہم بھی جواب لکھیں۔ ہم بھی تو سلیقہ ہیں کام کے نہ سہی نام کے تو ہیں۔ تو آئیے ذرا سوالوں سے دو دو ہاتھ کرلیں۔

کھانا پکاتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟
باتوں کا خیال تو اس وقت رکھا جائے تا جب کھانا پکایا جائے۔ شادی سے پہلے تو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے سارا دن

گزار دیتے تھے۔ دودھ ملائی جیسی رنگت کو اور زیادہ "دودھ ملائی" بنانے میں لگے رہتے اور ہماری پھپھو حضور جب بھی آتیں ہماری بلائیں لیتے نہ تھکتیں۔
"سلیقہ تو بالکل گڑیا ہے، ہاتھ لگانے سے ہی میلی ہو جائے" پھپھو کے یہ الفاظ سن کر ہم اور زیادہ "مصروف کوشش بیوٹی" ہو جاتے۔
اور پھر ہمارے اسی رکھ رکھاؤ اور خوب صورتی نے ہماری پھپھو کو اتنا دیوانہ کیا کہ وہ اپنے لاڈلے نخریلے، ہیرو جیسے بیٹے کے لیے ہمارا رشتہ لے آئیں۔ نہ صرف رشتہ بلکہ ہفتے کے اندر اندر شادی کا شور بھی ڈال دیا۔ (کیونکہ انہوں نے حج پر جانا تھا۔)
ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر امی کے کان پر تو

جوں تک نہ رینگی۔ انہوں نے کیش پھپھو کے ہاتھوں میں تھمادیا کہ سلیقہ کی ضرورت کی چیزیں بھی وہ خود خریدیں۔

یہ تو شادی کے بعد پتا چلا کہ پھپھو نے ہم سے دشمنی کی کہ اپنے لاڈلے نخریلے بیٹے کے حوالے ہمیں کردیا۔ جو ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے۔ کھانا کھانے میں اتنا نخرہ کہ بازار کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ہر چیز گھر کی بنی ہوئی۔ کیک' بسکٹ' ڈبل روٹی' مکھن' جیم' کیچپ' دہی' سالن' سب کچھ گھر کا۔

پھپھو کا سارا دن کچن میں گزرتا۔ (یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔) بیکنگ' کوکنگ سب کچھ پھپھو خود کرتیں۔ شادی کے کچھ دن ایسے گزرے جیسے ہم جنت میں آئے ہوئے ہیں۔ بل دار پراٹھے' مکھن' دہی' دودھ' چنے' انڈے یہ تو ناشتا ہوتا تھا۔

اور دوپہر کا کھانا آئے ہائے کیا بتائیں۔ غرض سب کچھ گھر کا بنا لذیذ ترین ہوتا تھا۔ مگر یہ عیش صرف دس دن رہے۔ پھپھو اور پھوپھا حج پر چلے گئے اور ہماری نازک جان کو عذاب میں ڈال گئے۔ ہم تو خود کو "جنت سے نکلی ہوئی عورت" کہنے لگے۔ (وہ دس دن جنت میں گزرے تھے نا۔)

پھر تو سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ "غذا کا خیال رکھیں "غذائیت" کا خیال رکھیں یا "پسند" کا۔"

مہمان گھر میں آجائیں اور وہ بھی اچانک۔۔۔

تو جناب ہم خود کو اتنا مصروف کرلیتے ہیں اور ایسی بھاگ دوڑ میں لگ جاتے ہیں کہ مہمان بے چارے خود ہی شرمندہ ہوجاتے ہیں۔ (ایسا صرف ان دنوں ہوا جب پھپھو حج پر تھیں۔ ورنہ تو پھپھو خود ہی سنبھالتیں مہمانوں کو۔)

مہمانوں کے لیے فوری ڈش۔۔۔ اور ہم۔۔۔

ارے کیوں مذاق کرتی ہیں؟

ہم "دیر" تک کی ڈش بھی نہ بنا سکیں اور آپ فوری ڈش کی بات کرتی ہیں اور ویسے بھی ہم بڑے چالاک ہیں۔ جب کھانے والے مہمان آجائیں نا۔۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ کلن ادھر لائیں بھئی۔۔۔ ہم کوئی نہ کوئی چوٹ کھا جاتے ہیں اور پھر کھانا مجبوراً" بازار سے آتا ہے۔ ہیں ناہم چالاک۔۔۔

دیکھیں نا کھانا تو مہمانوں کو ضرور کھلاتے ہیں۔ باہر ہی کا سہی۔ اب بنانا جو نہیں آتا تھا' کیا کریں۔

صبح کا ناشتا۔۔۔

ارے کیا بات کرتی ہیں ناشتے کی۔ شادی سے پہلے تو ہمارا ناشتا ابلا انڈا اور چائے ہوا کرتی تھی' مگر شادی کے بعد۔۔۔ کیا بتائیں۔۔۔ ہمارے میاں کو بادشاہوں والا ناشتا چاہیے تھا اور ہم ایسے سلیقہ مند کہ ہم تو فقیروں والا ناشتا بھی نہ بنا سکیں۔

دل تو بڑا کرتا تھا کہ پراٹھے ہوں۔ فرائی انڈے ہوں۔ مزے دار چائے ہو' مگر ہم ان سب چیزوں کے بنانے سے ناواقف تھے اور فرائی انڈا۔۔۔ فرائی انڈا دنیا کا مشکل ترین کام۔۔۔

ہم نے بھی ایک دن انڈا فرائی کیا تھا۔ اپنے ان کے لیے۔۔۔ اور ہم نے کتنے انڈے برباد کیے' یہ صرف ہم جانتے ہیں۔ کبھی زردی ٹوٹ جاتی' کبھی ٹیڑھا ہو جاتا۔ کبھی زردی بالکل پتھر' کبھی سفیدی جل جاتی۔

سوچا تھا کہ ایک بھی انڈا اچھی شکل کا بن گیا تو ڈبل روٹی کے ساتھ بہلا پھسلا کر میاں کو کھلادیں گے' مگر انڈے نے صحیح نہ بننا تھا' نہ بنا۔ ان انڈوں کو پہلے سرحد پار یعنی شاپر میں ڈال کر محفوظ ٹھکانے پر بھیجا اور پھر بڑی بھولی اور مسکین شکل بنا کر "ان" کے پاس آئے۔

"دیکھیں پراٹھا اور انڈا وہ بھی فرائی' دونوں آج کل جان کے دشمن ہیں۔ بہت سی بیماریاں ہو رہی ہیں۔ بلڈ پریشر' دل کے امراض۔" ڈر تو رہے تھے' اگر انہوں نے کہہ دیا کہ سادہ روٹی بناؤ تو سادہ روٹی کون بنائے گا۔

"اب یہ جان کا عذاب پراٹھا (ہماری جان کا تو ہے' بنانا جو نہیں آتا۔) چھوڑیں صرف ابلا انڈا اور دودھ لیا کریں فل ناشتا۔"

انہوں نے سر تا پاؤں ہمیں دیکھا۔ ہم خواہ مخواہ دوپٹا موڑ کر شرمانے لگے۔ کڑی نگاہوں سے ہمیں گھورا اور فقط اتنا بولے۔

"ناشتے پر کوئی سمجھوتا نہیں۔ جاؤ ویسا ناشتا بناؤ جیسے

امی بناتی ہیں۔"

"ویسا ناشتا..." ہماری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ ایک کام ہمیں نہیں آتا تھا' بے ہوش ہوتا' ورنہ ہم بے ہوش ہی ہو جاتے اور ویسے بھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے ہماری شادی کو' بھلا بے ہوش ہوتے اچھے لگتے کیا۔

"ہاں... ویسا ناشتا..." انہوں نے پاؤں پسارے اور دوبارہ کمبل تان لیا۔ یعنی اب نکل لو یہاں سے...

مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق کچن میں آئے۔

اف خدایا... اتنا ظلم کیسے سہہ پائیں گے بھلا ہم۔

آٹا... اور وہ بھی گندم کا نہ کبھی کھایا نہ گوندھا' نہ پکایا۔ آٹا گوندھنا شروع کیا' جس کی الف' ب کا ہی پتا نہیں تھا۔ پانی ڈالا۔ پھر آٹا ڈالا۔ پانی' آٹا' پانی' آٹا' یہ کچھ آدھا گھنٹا تو چلتا رہا۔ مگر آٹا تو بننے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بڑی ساری پرات مکمل بھر چکی تھی آٹے اور پانی سے۔

اب کے ہم نے "اور" آٹا اور "اور" پانی ڈالا تو پرات کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ چھلک چھلک کر ادھر ادھر گرنے لگا۔ یا خدا! ہم کیا کریں۔ بے بسی کی انتہا پر تھے ہم۔

یہ اور تو سب کچھ تھا' مگر وہ آٹا نہیں تھا جس سے میاں صاحب کے لیے پراٹھا بن سکے۔ یہ آٹا جلد از جلد ضائع کر دینا چاہیے' ورنہ اگر وہ کچن میں آ گئے تو ہمارے نام کے ساتھ بھی "بد" کا سابقہ لگ جائے گا۔ ہمیں بڑا ڈر لگتا تھا ہمارے نام کے ساتھ "بد" لگے' اس لیے تو چپ چاپ کچن میں چلے آئے تھے۔

ہم بھری ہوئی پرات سنک کے پاس اٹھا کر لے جانے لگے' لیکن نیچے آٹا گرا ہوا تھا' اسی سے پھسل کر زمین بوس ہو گئے اور وہ "پتلا" آٹا پورے کچن کے فرش پر سیمنٹ کی طرح چپک گیا۔ خود بھی سارے کے سارے آٹے میں لتھڑ گئے۔ یعنی "آٹا آٹا" ہو گئے۔

اگر بیٹی خالد ہوتی تو قسم سے 'پانی پانی کے بجائے "آٹا آٹا" گانا شروع کر دیتی۔

خیر جیسے تیسے اٹھے۔ پرات کو دھویا۔ ابھی کچن تو اتنی جلدی صاف نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی ہم ابھی اپنا حلیہ بدل سکتے تھے۔ سو پرات دھو کر دوبارہ اس میں آٹا ڈالا' پھر سے کوشش کرنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ اتنی دیر ناشتے میں... آگے کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں پوری کھل چکی تھیں۔

"اف... یہ کیا..." آگے بڑھے' مگر فرش پر بکھرے آٹے نے انہیں مزید آگے آنے کی اجازت نہ دی اور وہ وہیں "فلم لیٹ" ہو گئے۔ انہیں یوں دیکھ کر ہم تیزی سے سوکھے آٹے کی پلیٹ سمیت ان کی طرف بڑھے' لیکن دوبارہ پھسل کر آٹے سمیت ان کے اوپر جا گرے۔ پلیٹ اڑتی ہوئی دور جا گری اور سارا آٹا ان کے اوپر۔

قسم سے کیا فلمی سین تھا۔

آٹا سارے کا سارا ان کے بالوں اور چہرے پر لگا تھا۔ کپڑے سارے آٹے سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اوپر سے ہم آٹے سے لتھڑے ان کے اوپر ہمارے ہاتھ ان کے چہرے پر' خود ہم تو "آٹا آٹا" ہو رہے تھے وہ بے چارے بھی آٹا آٹا ہو گئے اور ہم بے خود ہو کر ان کے چہرے کو تک رہے تھے۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" وہ دھاڑے اور ہم ان کے اوپر سے پھسل کر فرش پر جا گرے۔ وہ انتہائی احتیاط سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیسی عورت ہو تم؟ انتہائی پھوہڑ۔" انہوں نے غصے سے ہمیں گھورا اور ہماری روح بس پرواز کرنے والی تھی کہ ابھی کہہ دیں گے "بدسلیقہ" مگر شکر ہے صرف پھوہڑ کہہ کر ہی ان کا غصہ نکل گیا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ انہوں نے ہمیں بدسلیقہ نہیں کہا۔" یعنی ابھی فی الحال ہم "بد" کے سابقے سے بچ گئے تھے اور اب ہر ممکن کوشش کرنا تھی کہ "بد" ہمارے نام کے ساتھ نہ لگے تو یہ تھا ہمارے ناشتے کا حال۔

آپ خود سوچیں ذرا پھر کیا ہوا ہو گا؟ جی نہیں... وہ نہیں ہوا جو آپ سوچ رہی ہیں' بلکہ انہوں نے کہا۔

"جب تک امی نہیں آتیں بریڈ' انڈا اور دودھ کا

گلاس دیا کرو۔" مگر انڈا۔ تو انڈا وہ خود ہی فرائی کر لیتے۔ ایسی کیا بات ہے بھلا؟ چند منٹ ہی تو لگتے ہیں انڈا فرائی کرنے میں۔ کون سا مشکل کام ہے بھلا۔ ہیں بھئی؟"

کچن کی صفائی۔؟

کچن کی صفائی کبھی کرنا ہی نہیں پڑی' کیونکہ کچن کبھی گندا ہوا ہی نہیں تھا' نہ کوکنگ' نہ برتن دھونے کا جھنجٹ' نہ صفائی' نہ مسالے کے ڈبے' سو ہمارا کچن ہر دن چم چم کرتا رہتا اور کام والی روز آکر مزید چمکا جاتی اور ہمیں تو لگتا ہے' پھپھو نے ہمارا کچن دیکھ کر ہی ہمارا رشتہ مانگ لیا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ کچن سے ہی عورت کا سلیقہ نظر آتا ہے' تو لگتا ہے پھپھو بے چاری بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ تو پردہ رہ گیا۔ پھپھو حج پر چلی گئیں۔ ورنہ۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوتا۔

ہاں شادی کے بعد جب پہلی دفعہ کچن میں گئے تو کچن کی حالت جو ہم نے کی اس نے تو ہمارے اوسان ہی خطا کر دیے۔ ارے بھئی۔۔۔ ہم اس دن کی بات کر رہے ہیں جس دن ہم "آٹا آٹا" ہو گئے تھے۔ جیسے تیسے کر کے میاں کو تو آفس بھیجا' مگر کچن۔۔۔

خدا خدا کر کے سعیدہ باجی دس بجے آئیں' پہلے تو وہ کچن میں گئیں اور پھر گھبرائی ہوئی باہر نکل آئیں۔ پھر کچن میں گئیں۔ پھر ہمارے پاس بھاگی آئیں۔

"اے بیٹا! کیا تمہارے کچن میں آٹے کا سیلاب آیا ہے؟ یا آٹے کا سونامی آیا ہے؟"

"سعیدہ باجی! آج کوئی اور کام مت کریں' بس صرف کچن کی صفائی کریں۔" ہم نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تو بیٹا پتا تو چلے آخر ہوا کیا ہے؟" سعیدہ باجی بھی پوری وکیل تھیں۔ شکر ہے میاں صاحب چلے گئے تھے۔ ورنہ وہ تو کہہ دیتے کہ تمہاری بٹیا سلیقہ مندی دکھا رہی تھی۔ مذاق کی بری عادت ہے نا ہمارے "ان" کی۔ خیر اس دن تو بے چاری سعیدہ باجی نے کچن صاف کر دیا' مگر ساتھ میں وارننگ دے دی کہ آئندہ اگر ایسا کچن ہوا تو وہ کبھی صاف نہیں کریں گی۔ "یعنی ایسا نہیں چلے گا۔" اس کے بعد ہم نے کسی ایسے کام میں ہاتھ ڈالا ہی نہیں جس سے کچن کا امن خطرے میں پڑے۔ ایسے کام چپکے چپکے' باتوں باتوں میں سعیدہ باجی سے کرا لیتے۔

مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟

نہ جی نہ۔۔۔ "مرنا ہے' جینا ہے' گھر میں۔ کھانا ہے' پینا ہے' گھر میں۔" انہیں باہر کے کھانوں سے الرجی اور ہمیں گھر میں پکانے سے الرجی لیکن ہمیں ہی جھکنا پڑا۔

سعیدہ باجی سے درخواست کی وہ ہمیں کچھ سکھائیں اور انہیں بھی بڑا شوق تھا آپا زبیدہ بننے کا۔ بڑی خوشی سے ہمیں سکھاتیں۔

انڈا فرائی کرنا سیکھا۔ تڑکے والی دال سیکھی۔ آٹا گوندھنا سیکھا۔ انڈے کا سالن بنانا سیکھا۔ اور پھپھو کے آنے تک وہی انڈے کا سالن اور دال بدل بدل کر کھلاتے رہے۔

منی منی سی روٹیاں بھی بنانے لگے' یہ بات بہت اچھی لگی کہ خاموشی سے کھا لیتے۔ یہی بہت تھا ہمارے لیے۔ سو باہر کا کھانا ایک خواب اور صرف خواب' جو کبھی بھی پورا نہیں ہو گا۔

موسم کو دیکھ کر ڈش کا انتخاب۔

ارے انتخاب کا حق کس کو ہے بھلا؟ ہم تو بندھ گئے ان کے حکم کے ساتھ۔ وہ پھپھو کے جانے اور معرکتہ الآرا ناشتا بنانے کے کچھ دن بعد کی بات تھی۔ جب موسم بڑا عاشقانہ ہو رہا تھا اور انہوں نے آتے ہی پتا ہے کیا کہا۔

"بڑا خوب صورت موسم ہے' دھواں دار بارش ہو رہی ہے' پکوڑے تل دو۔"

"پکوڑے اور ہم۔" ہم نے انہیں یوں دیکھا جیسے سنگین قسم کا مذاق کر رہے ہوں۔

"ہاں پکوڑے۔۔۔ کیوں بنانے نہیں آتے کیا؟"

مگر ہم انا کے مارے فوراً" بولے۔ "کیوں نہیں' یہ مشکل کام ہے بھلا؟" بہت سا تھوک نگلا۔

"چلو پھر تل کر بنا لیتے ہیں۔"

آہاہا کتنی رومانٹک آفر تھی۔ لیکن اگر وہ ساتھ کھڑے ہوں گے تو ہمارا پھوہڑپن بھی تو ان پر کھلے گا۔ (حالانکہ یہ کھلنے والی بات نہیں تھی، یہ تو کھلی ہوئی بات تھی۔)

"نہیں ہم بنالیں گے۔" تھوک پھر منہ میں جمع ہو رہا تھا۔ سو ہم نے پھر حلق میں نگلا۔

"نہیں، نہیں، اکٹھے بناتے ہیں، مزا آئے گا۔" سو ہمارا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے آئے۔ "چلو تم بیسن گھولو، میں آلو کاٹتا ہوں۔"

اب بیسن کیسے گھولا جائے، کہیں پھر کچن کا وہی حال نہ ہو جائے، اب تو سعیدہ باجی نے بھی صاف کر کے نہیں دینا تھا۔

"ہمیں بیسن گھولنا نہیں آتا۔" ہم نے ساری انا کو بالائے طاق رکھ کر کہہ بھی دیا۔

"تم نے کبھی پکوڑے نہیں تلے؟"

"نہیں۔" ہم نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ حقیقتاً بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔ (کیا تھا اماں! سب کچھ اگر سکھا دیتیں تو، نہ خود سیکھا، نہ ہمیں کچھ سکھایا۔) ہم نے اماں سے شکوہ کیا۔

"ویری گڈ۔ تمہاری صاف گوئی اچھی لگی اور تمہاری سچائی پسند آئی۔ اگر اس دن ناشتے کا بھی بتا دیتیں تو اچھا تھا۔" انہوں نے پیار سے کہا اور ہم نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے بھئی؟" وہ تو گھبرا ہی گئے۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔ ہم آپ کو بڑا نخریلا سمجھتے تھے۔" آنسو ابل ابل کر نکل رہے تھے ہمارے۔

"تو تعریف کیا آپ رو کر کرتی ہیں؟" انہوں نے شوخی سے ہمیں دیکھا۔

اور ہمارے آنسو وہیں جم گئے اور کتنے پیار سے انہوں نے ہمیں بیسن گھولنا اور پکوڑے تلنا سکھایا۔ ہم زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔

"میں امی کی مدد ضرور کرتا ہوں ہر کام میں۔ کوکنگ میں، پکنگ میں، امی سارا دن اکیلی لگی رہتی ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آفس سے آ کر یا چھٹی کے دن سارا وقت امی کے ساتھ، میں ہر کام کر لیتا ہوں۔ تم اگر پہلے بتا دیتیں تو میں تمہیں سب کچھ سکھا دیتا۔" انہوں نے بڑی سادگی سے کہا۔

اور ہم ان کی اس سادگی پر گوڈوں گٹوں سمیت پورے کے پورے مر مٹے۔

ہمیں وہ انڈوں سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔ یوں کہیں کہ ہم ان کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔

تو پھر آہستہ آہستہ ہم بھی سب کچھ سیکھنے لگے۔ اپنے لیے نہیں ان کے لیے۔۔۔ کہ اب ان سے عشق جو ہے۔ اور یقین واثق ہے، پھپھو کی مدد سے بالکل پھپھو کی طرح سلیقہ شعار ہو جائیں گے اور "بد" کا ڈر نکل جائے گا۔

اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں آپ؟

اگر یہ بات شادی سے پہلے پوچھی جاتی تو ہم کہتے کون سی محنت کہاں کی محنت، تینوں ٹائم کا کھانا گھر پہنچ گیا پکا پکایا۔ پھر کیا مسئلہ۔۔۔ مگر شادی کے بعد پتا چلا کہ "محنت" ہی تو "محبت" ہے اور "محبت" ہی "محنت" سکھاتی ہے۔

وہ شخص جس نے چالیس دن تک ہماری بدسلیقگی کو برداشت کیا اور "بد" کا سابقہ بھی نہیں لگایا۔ ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ ماتھے پر شکن لائے بغیر ہمارے پکے بدمزا کھانے کھائے۔ اس شخص کے لیے تو ہم سراپا محبت ہیں۔ سو اب محنت اور محبت دونوں شامل ہیں ہمارے کھانوں میں۔

کوئی ٹپ۔۔۔

کھانا بنانا سیکھیں، سلیقہ سیکھیں، برداشت کرنا سیکھیں، تاکہ آپ کے نام کے ساتھ شوہر کوئی "بد" کا سابقہ نہ لگا سکے اور کچن کی ایک ٹپ تو ہم بھی دے سکتے ہیں۔

انڈا ابالتے وقت پانی میں اگر نمک ڈال دیں تو انڈا بہت اچھا ابلے گا۔ بے تحاشا کھڑا کریں۔ کس کس کو یہ بات پتا نہیں تھی۔ دیکھا ہم نے آپ کی معلومات میں اضافہ کیا نا۔

او کے۔۔۔ خوش رہیے۔ جلد ہی اب اپنی سلیقہ شعاری کی داستان لے کر حاضر ہوں گے۔

☆

"بے شرم، بے حیا۔ ایسی گھٹیا حرکت کرنے سے پہلے ہمارے تعلق کا تو سوچا ہوتا۔" انگلیوں کے نشان اس کے گالوں پہ نمایاں تھے۔

"کاش آج کا دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔" آنکھوں میں نفرت لیے وہ دھاڑی۔

"زندگی میں اس سے زیادہ شرمندگی اور ندامت کا لمحہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"آخر میرا قصور کیا ہے؟" کمرے میں گونجتی اس کی فریاد کسی بھی دل تک دستک دیے بنا پلٹ آئی تھی۔

"نکل جاؤ یہاں سے، آج کے بعد میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کیا تعلق اتنی جلدی ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا بھروسہ یوں آنا"فانا"شک کی قبر میں دفنا دیا جاتا ہے۔

"یہ سچ نہیں ہو سکتا، یقیناً" یہ کوئی خواب ہے۔" بہت بھیانک خواب ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت۔ جھوٹ نے سچ پہ پردہ ڈال دیا تھا۔ چہرے پہ ندامت لیے اس نے خود پہ اٹھتی سب کی نفرت بھری نگاہوں کو دیکھا اور بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

مندی لگے گی تیرے ہاتھ ڈھولک بجے گی ساری رات

جا کر تم ساجن کے پاس بھول نہ جانا یہ دن رات

پورا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ فاخرہ کا خوشی سے تمتماتا پرسکون چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ

نادیہ احمد

مکمل ناول

آج ان کے لیے کتنا بڑا دن ہے۔ لان سے تیز میوزک کی آواز گھر کے اندر تک آرہی تھی۔ گھر کا اندرونی حصہ پیلے گیندے کے پھولوں سے سجا تھا۔ ملازمہ مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے فاخرہ کے ہمراہ لاؤنج سے باہر نکل رہی تھی جو خود بھی ہاتھوں میں پیلے گجروں کی ٹوکری تھامے ہوئے تھیں۔ اسی وقت ایہا لاؤنج میں داخل ہوئی اور فاخرہ کے چہرے پہ ایک خوب صورت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"السلام علیکم تائی امی۔" پیلا اور نارنجی انگرکھا پہنے وہ آج بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ فاخرہ نے ملازمہ کو آگے جانے کا اشارہ کیا اور خود ایہا سے بات کرنے رک گئیں۔

"وعلیکم السلام۔" ان کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح شفقت تھی۔

"ثانیہ اب تک تیار نہیں ہوئی؟" پھولوں کی ٹوکری سے ایک گجرا اٹھا کر اپنے ہاتھ میں پہنتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"ابھی کہاں... دیکھو نا اس لڑکی کو کتنا وقت لگاتی ہے تیاری میں اب میں اکیلی کیا کیا دیکھوں۔"

"تائی امی آپ پریشان مت ہوں مجھے بتائیں کیا کام کرنا ہے، میں سب کروا دوں گی۔"

فاخرہ کو اس پر جی بھر کر پیار آیا تھا۔ تھی تو ان کے دیور کی بیٹی لیکن اس گھر میں اس کی وہی حیثیت تھی جو سویرا اور ثانیہ کی تھی۔ دیوار سے دیوار ملی تھی پھر بھی مجال ہے جو اتنے سالوں میں کبھی دونوں بھائیوں کے درمیان ناچاقی ہوئی ہو اور اس کا زیادہ کریڈٹ فاخرہ کی سلجھی ہوئی طبیعت کو جاتا تھا۔

"ارے بیٹا! فی الحال تو تم ثانیہ کو اس کے کمرے سے نکالو۔ سب مہمان پہنچ گئے ہیں اور یہ لڑکی اب تک نیچے نہیں آئی۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"آپ فکر نہ کریں، میں اسے لے کر آتی ہوں۔" گجرے کا ہک لگا کر ایہا لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

ہم سے مایوس نہ ہو اے شب دوراں کہ ابھی
دل میں کچھ درد چمکتے ہیں اجالوں کی طرح

کھڑکی کے کھلے پٹ سے اندر آتے سرد ہوا کے جھونکے اس کے بے کیف وجود کو کپکپا رہے تھے۔

رات کے اس پہر اس کے دل کی دنیا کی طرح باہر بھی ویرانی اور اندھیرا تھا۔ نیند کو آنکھوں سے بغاوت کیے تو شاید صدیاں بیت چکی تھیں۔ کھڑکی کے چوکھٹے سے اپنا چہرہ باہر نکال کر اس نے برفیلی ہواؤں سے اپنے چہرے کو جلتا ہوا محسوس کیا۔ اس پل کسی نے اس کی وہیل چیئر کو پیچھے سے کھینچ لیا۔ اس نے بمشکل گردن گھما کر دیکھا۔ دلاور خان غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت میں شکوہ بھری نظروں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ ایک زخمی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا۔ دلاور خان نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے دونوں پٹ مضبوطی سے بند کرنے کے بعد دبیز پردے گرا دیے۔ باہر کی سردی اور ویرانی سے رابطہ یکدم منقطع ہوا تھا۔

"رات بہت ہو چکی ہے، اب سونے کی کوشش کرو۔" اسے بستر پہ لٹا کر وہ تنبیہی انداز میں بولا۔ کمرے کی بتیاں بجھا کر نائٹ بلب روشن کرنے کے بعد اسے شب بخیر کہتا باہر نکل گیا۔ نیند آنا ناممکن تھی پھر بھی اس نے بوجھل آنکھوں کو موند لیا تھا اور یوں دنیا سے اس کا ناتا ٹوٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ثانیہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ایہا نے دروازے کی ناب گھمائی۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ بنا دستک کے وہ بے تکلفی سے اندر داخل ہونے لگی پر کمرے سے آتی ثانیہ کی آواز نے اس کے قدموں کو روک لیا۔

"اچھا اگر نہ بھیجوں تو کیا کر لو گے۔" ثانیہ کی شوخ آواز ایہا کے کانوں سے ٹکرائی۔ ایہا نے جھری سے اندر جھانکا۔ ثانیہ کی پشت تھی اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کان سے فون لگائے کھڑی تھی۔

"ارے باپ رے باپ' شادی سے پہلے یہ تیور۔"

ایبہا قصداً" اندر داخل نہیں ہوئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی' ثانیہ کس سے فون پہ بات کر رہی ہے۔ وہیں کان لگائے کھڑی اس کی باتیں سنتی رہی۔

"اور اگر جو میں شادی سے ہی انکار کردوں تو؟"

پیلے اور گلابی کام دار شرارے میں ثانیہ کا خوب صورت سراپا غضب ڈھا رہا تھا۔ وہ حسین تھی۔ سب سے الگ' سب سے منفرد۔ اتنی خوب صورت کہ اس پر سے نگاہ ہٹانا مشکل ہو جائے۔ ایبہا نے اسے سرتاپا دیکھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔

"خبردار' میری بہن کو راستے کا کانٹا کہا تو' یہ گستاخی میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔" یقیناً" دوسری طرف سے کچھ شرارتی جملے اچھالے گئے تھے۔

"اچھا اب فون بند کرو' پہلے ہی کتنی دیر ہو گئی ہے۔ جانتے ہو نا امی کتنا غصہ کر رہی ہوں گی۔" ثانیہ کے چہرے پہ ایک انوکھی سی چمک تھی' اس کے انداز میں غرور اور مان تھا جو کسی بہت اپنے کی بدولت بہت خاص لوگوں کا نصیب ہوتا ہے۔ ایبہا کو اس پل ثانیہ پہ رشک آیا تھا یا پھر ہمیشہ آتا تھا۔

"اچھا بابا' بھیجتی ہوں۔ اب خوش؟" ثانیہ کی خوشی میں ڈوبی آواز ایبہا کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں ساحر میں بھی تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں۔ اب تو فون بند کردو' کیوں مجھے ڈانٹ پڑوانے کے چکروں میں ہو۔" ایبہا کنفیوز سی حالت میں کھڑی اب شاید پلٹنے کو تھی کہ اسی پل ثانیہ کی نظر اس پہ پڑ گئی۔

"واؤ ایبہا یو لک سو پریٹی۔" اچانک ثانیہ نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور ایبہا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی اور محبت اکٹھے نمودار ہوئے۔ ایبہا جو جانے کے لیے پر تول رہی تھی مجبوراً" اسے اندر آنا پڑا۔

"اور تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ پتا ہے تائی امی کتنا غصہ کر رہی ہیں۔" خود پہ حتی الامکان قابو پاتے اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"دراصل ساحر کی کال آ گئی تھی اور تم تو جانتی ہو' اس سے باتیں کرتے ہوئے وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔" ساحر کا نام لیتے ہوئے ثانیہ کے چہرے پہ خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اپنی مسکراہٹ کو زیر لب دباتے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی موتیا کے پھولوں کی لڑی کو اٹھا کر اپنے بالوں میں لگانے کی کوشش کی۔

"ذرا یہ گجرا میرے بالوں میں سیٹ کرنا پلیز۔"

ایبہا نے سر جھٹک کر اس کے بالوں میں گجرا سیٹ کر دیا۔

"ایک تو تمہاری تیاریاں۔ ایک کو گھائل کر کے دل نہیں بھرا اور کتنوں کی جان لینی ہے۔" اس کا انداز ہلکا پھلکا اور بہت حد تک ثانیہ کو ستانے والا تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں۔ دونوں میں بچپن سے گہری دوستی تھی۔ اسکول کے بعد کالج اور اب یونیورسٹی بھی ایک ہی ساتھ جانا ہوتا۔ ثانیہ کی کوئی بھی بات ایبہا سے

پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ اپنا سب کھایا پیا بہت آرام سے ایبہا کے آگے اگل دیتی تھی اور ایسا ہی وہ ایبہا کے متعلق بھی سوچتی تھی۔ ایبہا کی بھی کوئی بات' کوئی راز ثانیہ سے چھپا نہیں تھا۔

"شٹ اپ! ساحر کے علاوہ کسی اور کو دیکھتی ہے میری جوتی۔" ثانیہ نے تنک کر ایبہا کو گھورا۔ اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتے وہ اب خود پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈال رہی تھی۔ اب تک لڑکے والوں کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ اطمینان کے ساتھ کمرے میں گھسی تھیں ورنہ فاخرہ کی طرف سے بلاوا آچکا ہوتا۔

"اچھا یہ میری کچھ زبردست سی پکچرز بنا دو' مجھے ساحر کو بھیجنی ہیں۔" ثانیہ اب بالکل تیار تھی۔ سر سے پاؤں تک اپنی مثال آپ۔ اس کی کاجل بھری خوب صورت آنکھیں اس کے چہرے کا سب سے دلکش حصہ تھیں یا پھر ان میں ساحر کی محبت کا عکس انہیں حسین بناتا تھا۔

"حد ہے ثانیہ! اتنی بھی کیا بے صبری ہے اس کو۔ اتنا ہی تمہیں دیکھنے کو بے چین تھا تو پھر آیا کیوں نہیں شادی پہ؟" ثانیہ نے اپنا اسمارٹ فون ایبہا کی طرف بڑھایا۔ ساحر کی فرمائش پہ وہ جلد سے جلد اسے اپنی تصاویر واٹس ایپ کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ایبہا کی ناگواری کو خاطر میں نہ لا کر اس نے چند پوز بنائے۔ ایبہا نے اس کی تصاویر اتاریں اور فون واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب آجائے گا تو شادی پہ چھٹی کیسے لے گا؟" وہ اب جلدی جلدی ان تصویروں کو دیکھ کر ساحر کو بھیج رہی تھی۔ ایبہا نے آنکھیں گھمائیں۔

"تم اور اس کے خلاف کچھ سن کر خاموش ہو جاؤ' اس دن یقیناً" قیامت ہوگی۔" ایبہا سر جھٹک کر مسکرائی۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ اکثر ثانیہ اور ساحر کا جھگڑا ہوتا اور ثانیہ اس کے سامنے ساحر کی کسی اختلافی بات کا رونا روتی لیکن جہاں ایبہا ہاں میں ہاں ملاتی' ثانیہ پارٹی بدل لیتی اور یہ قصہ یک طرفہ نہیں تھا۔ ایبہا جانتی تھی ساحر کی دیوانگی بھی ثانیہ کے لیے کم نہیں ہے۔

"تو تم اس کے خلاف بولتی ہی کیوں ہو۔" اس نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ؟" اس کے موڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے ایبہا نے شرارت سے اپنی کہنی اس کی کمر میں ماری۔

"کیا جادو کیا ہے اس نام کے جادوگر نے تم پر؟" وہ دونوں کمرے سے نکل کر اب سویرا کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔

"اس جادو کو محبت کہتے ہیں۔ ایبہا جی۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

"وہ اتنی دور بیٹھا ہے ثانیہ' پتا نہیں کتنی لڑکیوں سے ملتا ہوگا۔ اتنا اندھا اعتبار... کبھی کبھی مجھے تم بالکل لیلیٰ لگتی ہو۔"

دو سال پہلے جب ساحر لندن گیا تھا تو ایبہا نے یہی سوچا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فاصلے اس محبت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیں گے۔ ان دونوں کی چاہت میں وہ پہلی سی شدت نہیں رہے گی۔ چاہے محبت کتنی ہی اندھی کیوں نہ ہو پر دو براعظموں کی دوری اس کی شدت پہ اثر انداز ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے ہی بے قرار تھے' ان کی محبت میں وہی تپش تھی جو چار سال پہلے ان کی منگنی کے وقت ایبہا نے محسوس کی تھی۔

"ان میں سے کوئی ایک بھی ثانیہ رضا نہیں جو ساحر کے دل تک پہنچ سکے۔"

سویرا کے کمرے کے دروازے پہ رک کر ثانیہ نے پر اعتماد انداز میں کہا۔ ایبہا نے عجیب نظروں سے ثانیہ کو دیکھا۔ اس پل وہ مسکرانا بھی بھول گئی تھی۔ اس کے لفظوں میں چھپا طنز ایبہا کو چبھا تھا۔

"اور ہاں' وہ مجنوں ہے اسی لیے میں تمہیں لیلیٰ لگتی ہوں۔" ایک پل رک کر ثانیہ نے اگلا جملہ کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی جبکہ ایبہا وہیں کھڑی

رہی۔

☆ ☆ ☆

مہندی کے فنکشن کا انتظام لان میں تھا۔ اسٹیج پہ لکڑی کا جھولا رکھا ہوا تھا جسے گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ دولہا اور دولہن کو وہیں بیٹھنا تھا۔ فنکشن مشترکہ تھا اور اب تک بہت سے مہمان آچکے تھے۔ ثانیہ اور ابیہا کی سنگت میں سویرا آئی تو ایک ساتھ بہت سے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ ملٹی کلر کے شرارے پہ دلکش کام والا پیلا دوپٹہ سر پہ اوڑھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ فاخرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کا ماتھا چوما۔ وہ بہت حسین نہیں تھی لیکن پیاری تھی۔

"میری ابھی فون پہ بات ہوئی ہے' وہ لوگ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم سویرا کو اسٹیج پہ لے جاؤ۔" سویرا نے جھجکتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ فاخرہ نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے ثانیہ کو آگے جانے کا اشارہ کیا۔ ثانیہ اور ابیہا نے اسے پھولوں سے سجے جھولے پہ بٹھایا۔ مہمان تقریباً سب ہی پہنچ چکے تھے پر لڑکے والوں کی آمد اب تک نہیں ہوئی تھی۔ سویرا کو جھولے پہ بٹھا کر ثانیہ اور ابیہا رشتے داروں سے ملنے چلی آئیں۔

"ماشاءاللہ میری بیٹی تو بہت پیاری لگ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح سب سے منفرد۔" رشدہ نے محبت سے ثانیہ کی بلائیں لیں۔ ثانیہ لاڈ سے پھوپھی کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑی تھی۔

رشدہ' رضا حیدر اور مبین حیدر کی اکلوتی بہن تھیں۔ کئی سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کے شوہر کے انتقال کے بعد ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ساحر اور ان کا مہکتی ان کا سہارا تھے۔ رضا حیدر کی طرف ہمیشہ ہی ان کا لگاؤ بہت زیادہ رہا تھا۔ ایک تو وہ بڑے بھائی ہونے کا حق بخوبی نبھا رہے تھے دوسرے ساحر کا رجحان ہمیشہ سے ثانیہ کی طرف تھا۔ وہ سویرا کا ہم عمر تھا۔ ان دونوں میں اچھی دوستی تھی لیکن ثانیہ پہ وہ دل و جان سے فدا تھا۔ کمپیوٹر انجینئرنگ میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ ایک مناسب ملازمت کر رہا تھا۔ دو سال پہلے اسے کمپنی کی طرف سے لندن میں ملازمت کا موقع ملا۔ وہ اس چانس کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تو ثانیہ سے شادی کی تھی لیکن ثانیہ کی نامکمل تعلیم اور سب سے بڑھ کر سویرا کی شادی نہ ہونا اس کے ارادوں میں حائل تھا۔

"یہ ابیہا بھی تو آج چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔" رشدہ نے پاس کھڑی ابیہا کو بھی پیار کیا لیکن اس میں وہ والہانہ پن اور اپنائیت نہیں تھی جو ثانیہ سے منسوب تھی۔ وہ انہیں ساحر کی وجہ سے اور بھی پیاری تھی۔

"ویسے بھابھی ارینجمنٹ تو بہت شان دار کیا ہے آپ نے۔" اس مختصر بات کے بعد وہ اب فاخرہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ ابیہا ہمیشہ سے بیک گراؤنڈ میں تھی۔ وہ ایک بار پھر بیک گراؤنڈ میں ہی چلی گئی تھی۔ اسے وہاں اپنا کھڑا ہونا بیکار محسوس ہوا۔ لب کاٹتے ہوئے وہ بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر آہستہ آہستہ چلتی سویرا کے برابر جا بیٹھی۔

"یہ سب ثانیہ اور تمہارے بھائی کی پلاننگ ہے۔ یہ جو کہتی ہے' وہ آنکھیں بند کر کے کرتے جاتے ہیں۔" رشدہ کی آنکھوں میں ثانیہ کے لیے محبت بھرے جذبات تھے' ثانیہ بڑے مان سے ان کا ہاتھ تھامے وہاں پورے حق سے کھڑی تھی۔ یہ حق اسے ساحر نے دیا تھا۔ اس کی محبت نے دیا تھا۔

"ان کی لاڈلی بھی تو بہت ہے۔" رشدہ نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"ایک کسی' پوچھو مت۔ اب شادی کی ساری دوڑ بھاگ میں نے اور سویرا نے کی۔ یہ میڈم ایک ہفتے سے سہیلیوں کو بلا کر ڈھولکی رکھ کر بیٹھی تھیں۔" فاخرہ کے لہجے میں شکایت سے زیادہ محبت تھی۔

"یہی تو ہنسنے بولنے کے دن ہوتے ہیں اور پھر خوشی کا موقع ہے بچیاں ناچ گانا نہیں کریں گی تو کیا ہم بوڑھے

کریں گے۔"

"پھوپھو ہونا ابھی اس لیے یہ سب کہہ رہی ہو۔ ایک بار ساس بن جاؤ گی نا تو روز مجھے شکایتوں بھری کال کیا کرو گی۔" فاخرہ بھی آج بہترین موڈ میں تھی۔ اللہ نے اتنی بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ جب سے سویرا کی شادی طے ہوئی تھی وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھیں۔

"بہو نہیں بیٹی بنا کر لے جاؤں گی اور مجھے یقین ہے، میری بیٹی اپنی ہر ذمہ داری بہت اچھے انداز میں پورے کرے گی۔" رشدہ فوراً" بولیں۔ اسی وقت لڑکے والوں کی آمد کی اطلاع ملی اور سب لوگ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"بڑی دیر کر دی، ہم تو کب سے آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔" فاخرہ اور ثمینہ مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے ملیں۔

"دراصل باذل کو لاسٹ منٹ پہ ایک ایمرجنسی ہو گئی۔ بس اسی وجہ سے ہم بھی لیٹ ہو گئے۔" فاخرہ کا ہاتھ تھامے ثمینہ نے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتائی۔ باذل اب بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ بات سب کو حیران کر رہی تھی اسی لیے ثمینہ کا لہجہ بھی معذرت والا تھا۔

"اللہ خیر کرے، باذل بیٹا ٹھیک تو ہے نا؟ وہ آپ کے ساتھ نہیں آیا۔" فاخرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"الحمد للہ۔ باذل بالکل خیریت سے ہے۔ سائیٹ پہ ایک حادثہ ہو گیا تھا بس وہاں ہی بزی تھا۔ میری بات ہوئی ہے اس سے، کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔"

باذل کی نئی فیکٹری کی تعمیر چل رہی تھی۔ وہ بہت جلد ایک نیا یونٹ کھول رہا تھا۔ اسی تعمیراتی کام کے دوران زیر تعمیر عمارت کا کچھ حصہ گر گیا تھا۔ یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی اور عین مہندی والے دن یہ حادثہ سب کو ہی بوکھلا گیا تھا۔ ثمینہ نے مختصر الفاظ میں اصل بات بتائی۔ وہ خود بہت اپ سیٹ تھیں۔

"اچھا آپ کھڑی کیوں ہیں، آئیے بیٹھتے ہیں۔" خود کو کمپوز کرتے ہوئے فاخرہ نے سب رشتے داروں سے ان کا تعارف کروانا شروع کیا۔ سویرا سے مل کر ثمینہ اپنی قریبی دوست زینب کے ساتھ سامنے رکھے ایک صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

باذل بختیار، کاروباری دنیا میں چمکنے والے ستارے کی مانند تھا۔ ایک اعلا تعلیم یافتہ اور کامیاب بزنس مین۔ اس کے والد کا انتقال بچپن میں ہو چکا تھا۔ ثمینہ نے تنہا اس کی پرورش کی۔ حال ہی میں اس نے اپنے والد کے درمیانے درجے کے کاروبار کو ری اسٹیبلیش کیا تھا اور بہت کم وقت میں ترقی کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ اپنی پرکشش شخصیت کی بدولت اسے اپنی سوسائٹی کی لڑکیوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس کے گرد یوں منڈلاتی تھیں جیسے شمع کے گرد پروانے لیکن وہ ثمینہ کے وعدے کا پاس رکھ رہا تھا کہ بہو تو وہ اپنی مرضی اور پسند کی لے کر آئیں گی۔

آج کا دن بے حد تھکا دینے والا تھا لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی لیٹ ہو چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا اس کی پیاری ماں کا موڈ خراب ہو۔

چھ فٹ قد، گوری رنگت، ذہین آنکھیں اور تیکھے نقوش۔۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح پرکشش دکھ رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل سے اس نے اپنا پسندیدہ کلون اٹھایا۔ ماتھے پہ بے ترتیبی سے بکھرے بالوں میں انگلیاں چلاتے وہ اپنی تیاری سے نہ صرف مطمئن تھا بلکہ کچھ کچھ فخر بھی محسوس کر رہا تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اپنا والٹ، قیمتی گھڑی، موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

اس سے پہلے کہ ایک بار پھر ثمینہ کی کال آ جائے اسے جلد سے جلد وہاں پہنچنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا سوچ رہی ہو زینب؟" وہ پوچھے بنا رہ نہیں پائی۔

"میں نے تمہیں آج سے پہلے اتنا خاموش نہیں دیکھا۔" وہ ان کی سب سے قریبی سہیلی تھیں۔ دونوں کالج کے زمانے کی دوست تھیں۔ آج تیس سال بعد بھی ان کے درمیان تعلقات ہمیشہ کی طرح گہرے تھے۔

"تم نے سویرا کا انتخاب کیوں کیا۔" وہ گہری نظروں سے اسٹیج پہ بیٹھی سویرا کے ساتھ ثانیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ شوخ انداز میں ہنستی مسکراتی ثانیہ' ایپھا کے ساتھ مل کر سویرا سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ ثمینہ کی نظروں نے زینب کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"کیوں؟" ذرا تامل کے بعد وہ دوبارہ بولیں۔ "کیا کمی ہے سویرا میں زینب؟"

"کمی تو کوئی نہیں' ماشاء اللہ سویرا بھی بڑی پیاری لڑکی ہے۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولیں۔ "لیکن میرا خیال ہے اگر تم باذل کے لیے سویرا کے بجائے ثانیہ کا انتخاب کرتیں تو زیادہ مناسب تھا۔ اب دیکھو نا ہمارا باذل کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔ ماشاء اللہ ایک کامیاب بزنس مین اور اس پہ اتنی پرکشش شخصیت' یہ لڑکی اس کے ساتھ بہت سوٹ کرتی۔" اپنی آخری بات پہ زور دیتے ہوئے اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"تم چاہتی ہو' اپنا لائق فائق' شاندار بیٹا کسی ایسی لڑکی کی جھولی میں ڈال دیتی جو اپنی اداؤں اور حسن سے اسے چار دن میں ہاتھوں پہ ڈال لیتی اور مجھے سائیڈ آؤٹ کر دیتی۔" وہ خاصی سنجیدہ تھی۔ زینب کو ان کی بات سن کر اچھا خاصا شاک لگا تھا۔

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو ثمینہ' تمہارا بیٹا تم پہ جان چھڑکتا ہے۔ اب دیکھو نا' تم نے جہاں کہا' جس سے کہا اس نے شادی کے لیے ہاں کر دی۔ پھر کیا ضروری ہے کہ تم دل میں ایسے فضول خدشات پالو۔" ثمینہ نے پہلو بدلا۔

ان دونوں کی نظریں اب بھی اسٹیج پہ بیٹھی ثانیہ پہ ہی مرکوز تھیں۔ سامنے میز پہ رکھی مہندی کی تھالی ایپھا کے ہاتھ میں تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تھالی ثانیہ کے شرارے پہ جا گری۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور اپنا لہنگا صاف کرنے لگی۔ اس کے چہرے پہ مایوسی تھی۔ مہندی کا نشان نمایاں نظر آرہا تھا۔ ایپھا نے شرمندگی سے معذرت کی۔ ثانیہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور پھر اگلے ہی پل وہ اسٹیج سے اتر گئی۔ ثمینہ اور زینب کی نگاہیں اب بھی اسی کے تعاقب میں تھیں۔ اس کا رخ گھر کی طرف تھا۔

"ثمینہ! مجھے یہ بہت اچھی لگی۔" زینب اپنے دل کی بات کہے بنا نہیں رہ سکی۔ ثمینہ نے سنجیدہ انداز میں زینب کی طرف دیکھا۔

"مرد کو اپنے بس میں کرنے کے لیے فقط خوب صورتی کافی نہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے' یہ کام سویرا نہیں کرپائے گی۔ تمہیں باذل پہ اعتبار ہونا چاہیے۔"

"تم باذل کو نہیں جانتیں زینب۔ اس کا ٹیسٹ بہت مختلف ہے۔ اس کی سوچ بہت اونچی اور انتخاب بہت اعلا ہے۔ اس نے یہ شادی فقط میری خوشی کے لیے کی ہے ورنہ اس کے اردگرد خوب صورت لڑکیوں کا ہجوم کم نہیں تھا اور میری خوشی کی خاطر وہ اس لڑکی کو اس کی صحیح جگہ پہ رکھے گا۔" ثمینہ کے انداز میں یقین تھا۔ زینب کو پہلی بار احساس ہوا کہ جتنا وہ انہیں جانتی ہیں' وہ اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔ زینب کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر سامنے سے آتے باذل کو دیکھ کر یکدم رک گئیں۔ سفید شلوار قمیص میں وہ اپنی آن بان کے ساتھ دھیمے قدموں سے چلتا آرہا تھا۔ ثمینہ کو دیکھ کر اس کے سنجیدہ چہرے پہ مسکراہٹ ابھری۔ ثمینہ کی آنکھیں بھی بیٹے پہ مرکوز تھیں۔

"کتنا انتظار کروایا ہے' سب لوگ پوچھ رہے ہیں تمہارا۔" وہ اب ان کے قریب آچکا تھا۔ ثمینہ نے شفقت سے ماتھا چوما۔

"چلیں اب جلدی جلدی آپ لوگ اپنا کام کرلیں'

میرا کوئی پتا نہیں۔" اس نے شرارت سے کہا۔ فاخرہ بھی اب وہاں آچکی تھیں۔ تینوں ایک ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھے جہاں سویرا نروس بیٹھی اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ مہندی کی رسم شروع ہو چکی تھی۔ سب باری باری آکر دولہا اور دلہن کا منہ میٹھا کروا رہے تھے۔ اسی وقت اظفر کا فون بجا۔ روحیل کا نمبر دیکھ کر اس نے جلدی سے کال اٹینڈ کی۔

"کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے نا؟" ثمینہ کا ہاتھ تھامے وہ اسٹیج سے اتر آیا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اب پریشانی میں بدل چکی تھی۔

"ممی، معاملہ بڑھ رہا ہے۔ کوئی چینل والے پہنچ گئے ہیں۔ بلاوجہ چھوٹی سی بات کی بریکنگ نیوز بن جائے گی۔ میں جا کر ہینڈل کرتا ہوں۔" اسی وقت فاخرہ اور رضا حیدر بھی وہاں چلے آئے۔

"معذرت چاہتا ہوں۔ اس وقت مجبوری ہے، جانا ہوگا۔" اپنی شخصیت کے برخلاف وہ بہت شائستہ انداز میں بولا۔

"ہم سمجھ سکتے ہیں بیٹا۔ اللہ آپ کو آسانی دے۔" رضا حیدر نے کہا۔ ثمینہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداع کہہ کر اظفر فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ثانیہ گھر کی مین انٹرنس سے نکل کر لان میں آئی۔

"بازل بھائی ابھی تک نہیں آئے؟" فاخرہ نے مختصر الفاظ میں ساری بات بتائی۔ اس کا چہرہ یکدم اتر گیا۔

"اتنی جلدی آکر چلے بھی گئے۔" اس کی آواز میں حیرت تھی۔ "میں تو ابھی ملی بھی نہیں، میں نے رسم بھی کرنی تھی۔" اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"اب سب رسمیں کل کر لینا اور مل بھی لینا۔ اور جا کر دیکھو سویرا کو۔ وہ اپ سیٹ لگ رہی ہے۔" فاخرہ نے کہا تو وہ بہن کے پاس چلی آئی۔

☆ ☆ ☆

رضا حیدر کی فیملی کا شمار متموّل خاندانوں میں ہوتا تھا۔ دونوں میاں بیوی نہایت سلجھے ہوئے اور ملنسار طبیعت کے تھے۔ رضا حیدر کا درمیانے درجے کا ذاتی کاروبار تھا۔ بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے اگر انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی بہن کا خیال رکھا تو فاخرہ نے بھی سسرال میں بڑی بہو ہونے کا بھرم نبھایا۔ خاوند کی وفات کے بعد رشدہ کی مالی معاونت یا مبین حیدر کی کاروبار میں ان کی مدد کرنے کے باوجود انہوں نے ساری زندگی اس بات کو کبھی جتایا نہیں تھا۔

رشدہ نے جب ساحر کے لیے ثانیہ کا ہاتھ مانگا تو انہوں نے ایک بار بھی اپنے اور ان کے سوشل اسٹیٹس کو نہیں دیکھا بلکہ بخوشی اس رشتہ کو قبول کیا۔ رشدہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش ہر صورت پوری کرنا چاہتی تھیں اور ثانیہ انہیں ویسے بھی بہت عزیز تھی۔ ان کی تو کب سے خواہش تھی کہ ثانیہ اور ساحر کی شادی ہو جائے۔ دو سال پہلے منگنی پہ فاخرہ بہ مشکل رضا مند ہوئی تھیں کیونکہ انہیں یہ خوف تھا، بڑھتی عمر کے ساتھ چھوٹی بہن کا پہلے رشتے کا ٹھپہ لگ کر سویرا کی شادی میں اور بھی رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ سویرا اور ثانیہ میں چار سال کا فرق تھا۔ سویرا یوں تو بہت سلجھی ہوئی اور اچھی پیاری لڑکی تھی لیکن ثانیہ سے اگر اس کا موازنہ کیا جائے تو اس کی شخصیت بالکل ماند پڑ جاتی تھی۔ ثانیہ کے لیے منگنی کے بعد بھی رشتوں کی قطار لگی رہی اور سویرا اس دوران مسلسل نظر انداز ہوتی رہی۔ اس بات نے سویرا کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمیشہ کی طرح گھٹنوں میں سر دیے وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ سب اپنے کمروں میں سو رہے تھے ایسے میں کسی کو کیا پتا چلتا کہ ہمیشہ سب کے سامنے ہنسنے مسکرانے والی ایبھا اپنے دل میں کونسا غم چھپائے بیٹھی ہے۔ اپنی عزیز از جان سہیلی ثانیہ کے لیے کتنی

نفرت کو دبا رکھا ہے۔

ثانیہ چاہے جانے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ ایبہا کو وہ وقت یاد آیا جب وہ دونوں بی ایس کے تیسرے سال میں تھیں۔ یہ وہی دن تھے جب ایبہا نئی نئی ساحر کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی۔ ایک دن ثانیہ نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ایبہا کو ساحر کی طرف سے ملنے والا پیغام محبت سنا کر اپنی چاہت کا راز دار بنا لیا۔ ایبہا کے خوابوں کا محل چکنا چور ہوا تو ثانیہ سے اس کی دوستی میں پہلی دراڑ پڑی۔ وہ خوب صورت تھی لیکن یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ثانیہ کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں، پھر بھی دل خوش فہم کو یہ امید تھی کہ ساحر کی توجہ پالے گا پر افسوس... اس کے التفات کا مرکز ثانیہ تھی 'ایبہا' نہیں۔ پتا نہیں وہ یہ کیسے بھول گئی تھی کہ جب جب وہ سامنے ہوتی ہے 'خاندان کی ہر لڑکی پس منظر میں چلی جاتی ہے... یہاں تک کہ اس کی اپنی سگی بہن بھی۔ ایبہا آج تک یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر ثانیہ میں ایسی کیا خاص بات ہے جو اس میں نہیں۔ خوب صورت تو وہ بھی ہے، سب یہی کہتے ہیں لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ جہاں ثانیہ رضا ہوتی ہے، وہاں اس سمیت کوئی دوسرا نظروں میں نہیں آتا۔

اس درد نے اس کے اندر آگ لگا دی اور ہر دن اس جلن میں اضافہ ہوا کیونکہ ثانیہ اس سے ہر وہ بات شیئر کرتی جو ساحر سے متعلق ہوتی۔ وہ ہنستے ہوئے سنتی، خود پہ جبر کر کے مسکراتی پر اپنا بھرم قائم رکھتے ہوئے اس نے کبھی ثانیہ پہ یہ راز نہ کھلنے دیا تھا کہ اس کے دل میں آج بھی ساحر کے لیے جنون کی حد تک محبت کے جذبات موجود ہیں۔

اچانک اسے ہر شے سے وحشت ہونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

سرخ جوڑے میں وہ عرش کی حور نہ سہی پر اس سے کم بھی نہیں لگ رہی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے نکاح کے کاغذات پہ دستخط کرتے ہوئے وہ اپنی آنکھوں کے رستے دل کا غبار نکالنا چاہتی تھی لیکن ثانیہ نے اسے روک دیا۔ وہ دوپہر سے مستقل اس کے ساتھ تھی۔ ایک منٹ کے لیے بھی اس نے سویرا کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی تھی اور آج کے دن اسے اس کے خاص ہونے کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ کل رات سے سویرا بجھی بجھی سی تھی۔

کل رات کی تقریب میں جب وہ ایک مختصر وقت کے لیے اس کے برابر بیٹھا مگر اس سے بہت دور تھا۔ ایک دم اجنبی... اس کا سرد رویہ سویرا کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

فاخرہ نے کہا وہ پریشان تھا، ثانیہ نے اسے ہر طرح مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ثمینہ نے بارہا اسے باذل کی حالیہ پریشانی کا بتایا... وہ سمجھ رہی تھی، سمجھنا چاہتی تھی پھر بھی وہ بے چین تھی۔ باذل نے اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا احساس کمتری اور بھی بڑھ گیا تھا۔ فرسٹریشن اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔

"آپی پلیز، اپنے چہرے کے زاویے تو ٹھیک کرو، سب لوگ کہیں گے کیسی دلہن ہے جو تھوڑا سا بھی نہیں مسکرا رہی۔"

ثانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ سویرا کا ہاتھ نہایت سرد تھا۔

"ڈر لگ رہا ہے۔" وہ اچانک بولی اور ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔ سویرا نے اس بے موقع ہنسی پہ آنکھیں دکھائیں۔

"وہ بھوت نہیں تمہارا شوہر ہے اور ٹرسٹ می تم آج اتنی خوب صورت لگ رہی ہو آپی کہ وہ بھی عاشق ہو جائے گا۔" پیار سے پچکارتے ہوئے ثانیہ نے اس کا اعتماد بحال کرنا چاہا۔

"اب چلیں؟" ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ لاتے سویرا نے سر ہلایا۔ اس کا ہاتھ تھامے ثانیہ اسے برائیڈل روم سے باہر لے آئی۔ وہ دونوں اب اسٹیج کی طرف جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

جو نظروں کو بھا جائے' اسے نظر انداز کرنا آسان
ہوتا ہے پر جو سیدھا دل میں اتر جائے۔ اسے کیونکر
بھلایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی آنکھوں کے رستے سیدھی
اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس پل جب پہلی بار اس
نے اسے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ حسن کس بلا کا نام ہوتا
ہے۔ سرخ رنگ شاید ہی کسی پہ جچا ہو گا جتنا اس پر جچ
رہا تھا۔ اس کے ماتھے کی بندیا کے چمکتے نگینوں سے
زیادہ دمک ان دو آنکھوں میں تھی جو شاید اس دنیا کی
سب سے پرکشش آنکھیں تھیں۔ وہ مجمع میں کھڑی
سب سے جدا لگ رہی تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی
اس کی طرف آ رہی تھی اور اسے لگا اس پل زمانہ ٹھہر
گیا ہے۔ ایک ہاتھ سے سویرا کا بازو تھامے وہ شوخ
مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے پرشوق نظروں سے اس کی
طرف دیکھتی اسٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بازل نے
حسرت و شوق سے اس کی طرف دیکھا اور نگاہ ہٹانا بھول
گیا تھا۔ اس لمحہ وہ نہ تو اس شہر کا مشہور بزنس مین اور
انٹیلیکچول تھا اور نہ ہی ایک میچور اعلا تعلیم یافتہ
انسان.... اس کے متاثر کن حسن کے سامنے ہتھیار
ڈالے وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور
پھر اسی پل اس کی نگاہ ساتھ چلتی سویرا پہ پڑی جو ثانیہ کا
ہاتھ تھامے دھیمے قدموں سے چلتی اسی کی طرف آ رہی
تھی۔ چند لمحے پہلے دل کی دنیا میں سجی رنگوں کی محفل
بے نور ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ
غائب ہو چکی تھی۔ سویرا اب ثانیہ کے ساتھ اسٹیج پہ
پہنچ چکی تھی۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں
اب بھی ثانیہ پہ تھیں جو سویرا کی بیٹھنے میں مدد کر رہی
تھی۔ وہ اسے پرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی اور بے
تحاشہ مسکرا رہی تھی اور پھر وہ اسٹیج سے چلی گئی۔ بازل
کو لگا کہ چراغوں میں اب روشنی نہ رہی۔ وہ اب بھی
بے وقوفوں کی طرح وہاں کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"چلو' سب ذرا ادھر ادھر ہو جاؤ' اب میری باری
ہے۔" اس کی پیاری راج دلاری بہن کی شادی تھی
اور دودھ پلائی کی رسم کرنے کا تو اسے ویسے بھی بے حد
شوق تھا۔ وہ شوخ انداز میں کہتی دودھ کا سجا ہوا گلاس
تھامے اسٹیج پہ آ گئی تھی۔ آج پہلی بار اس کا سامنا بازل
سے ہو رہا تھا۔ اس نے بس اس کی تصویر ہی دیکھی تھی
اور پہلی نگاہ میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بازل کی
تصویر اس کی شخصیت کا دس فیصد بھی نہیں ہے۔ وہ
واقعی کسی بھی لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ ہو سکتا ہے۔
سویرا کو اسٹیج پہ بٹھاتے وقت ثانیہ نے اس کے چہرے
پر جو سنجیدگی اور غرور دیکھا تھا' وہ اس پہ واقعی جچتا تھا۔

"لگتا ہے ثانیہ دودھ پلائی میں بھاری تحفہ کا مطالبہ
کرنے والی ہے۔" مجمع کو پرے دھکیلتی' اپنا بھاری
لباس سنبھالے سج سج چلتی وہ مسکراتی ہوئی اس کے
بالکل سامنے آ بیٹھی تھی۔

"حق بنتا ہے میرا' آخر اکلوتی سالی جو ٹھہری۔" وہ
اک ادا سے بولی تھی۔ بازل اس پل اسی کو دیکھ رہا تھا۔
ثانیہ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا جس میں اس نے
گلاس تھاما ہوا تھا اور بازل نے بڑے استحقاق کے
ساتھ گلاس پکڑنے کے بجائے ثانیہ کی انگلیوں پہ اپنا
دایاں ہاتھ رکھ دیا۔ ایک پل کو دونوں کی نظریں
ٹکرائیں۔ کچھ عجیب سی آگ تھی ان آنکھوں میں کہ
ثانیہ کو اپنا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا۔ ارد گرد بہت سے
لوگ جمع تھے لیکن کسی کا بھی دھیان اس طرف نہیں
گیا تھا۔ دودھ کا گلاس لبوں سے لگائے وہ اب بھی اپنے
ہاتھ سے اس کی کانپتی انگلیوں کو روکے ہوئے تھا۔
ثانیہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس کی آنکھیں
حیرت سے پھیل گئیں۔

"تو پھر کیا پیش کروں اکلوتی سالی جی۔!" اگلے ہی پل
اس کے ہاتھ کی گرفت ثانیہ کے ہاتھ پہ نرم پڑی تو
ثانیہ نے جلدی سے گلاس میز پہ رکھ دیا۔ وہ اٹھنے ہی
والی تھی جب بازل شرارت سے اس کی طرف جھک کر
شرارتی انداز میں بولا۔ سب لوگ شور مچا رہے تھے اور
ثانیہ کو مشورے دے رہے تھے مگر وہ صرف حیرت سے
بازل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کن اکھیوں

سے سویرا کو دیکھا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے ثانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ گھونگٹ کی اوٹ سے اس نے سر ہلا کر ثانیہ کو اپنا مطالبہ بتانے کا کہا۔ وہ اب خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی اور پہلے والی کیفیت کی جگہ اب اس کے چہرے پہ بھرپور اطمینان تھا جو یقیناً" اپنے ساتھ بیٹھے بازل کے خوشگوار موڈ کی بدولت تھا۔ ثانیہ کے ہونٹوں سے کوئی بھی لفظ نہ نکلا لیکن وہ یہاں سے ایسے ہی اٹھ نہیں سکتی تھی۔ بہت محتاط انداز میں گلاس کے نیچے رکھی چھوٹی پلیٹ اٹھا کر ثانیہ نے نسبتاً" فاصلے سے بازل کی طرف بڑھائی۔ بازل کی لو دیتی نظروں سے اس کے گال جل رہے تھے۔ وہ مستقل اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بنا دیکھے بہت سے نوٹ ثانیہ کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں رکھ دیے۔ سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔ ثانیہ ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھی اور سب کو پیچھے دھکیلتی بہت دور چلی گئی۔ ہال کے کونے میں رکھی میز پہ پلیٹ بمعہ پیسے پٹختے ہوئے اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا ثانیہ! سب خیریت تو ہے نا۔ تم اچانک وہاں سے چلی کیوں آئیں؟" ایبھا کی آواز پہ چونک کر اس نے پیچھے دیکھا جو آنکھوں میں کئی سوال لیے اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ایک پل کو ثانیہ کو شک گزرا اس نے بازل کو اس کا ہاتھ پکڑے دیکھا ہو گا۔ لیکن وہ تو سب نے ہی دیکھا تھا لیکن یہ سب ایک اتفاق سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے یہی سوچ کر کسی کے بھی ذہن میں ایسا کوئی منفی تاثر نہیں ابھرا پر ثانیہ کی بے چینی بھی غلط نہ تھی۔ اپنی انگلیوں پہ بازل کے مضبوط ہاتھ کا دباؤ وہ اب تک محسوس کر رہی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ایبھا! شاید تھکاوٹ اور اتنی بڑی گیدرنگ کی وجہ سے دل عجیب سا ہو رہا ہے۔" ثانیہ جلدی سے برائیڈل روم کی طرف چلی گئی اور ایبھا نے حیرت سے پہلے ثانیہ کو اور پھر میز پہ رکھے ان نوٹوں کو دیکھا جس کو وہ دیکھے بنا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے اب تک اپنا لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ وہ ان ہی بھاری کپڑوں اور زیورات کے ساتھ بیڈ پہ آلتی پالتی مارے لیپ ٹاپ سامنے رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس وقت ذہن خاصا الجھا ہوا تھا لیکن ساحر کی فرمائش تھی کہ وہ اسے سجا سنورا دیکھنا چاہتا ہے تو تمام تر تھکاوٹ، ذہنی انتشار اور پریشانی کے باوجود وہ طے شدہ وقت کے مطابق اس سے بات کر رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ذہن کسی اور سمت میں بھٹک رہا تھا۔

"یہ کیسی شکل بنائی ہوئی ہے؟" ساحر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ یک دم چونکی۔

"میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔" ثانیہ نے نچلا لب بے دردی سے کاٹا۔

"وہ نظر آ رہا ہے لیکن پتا تو چلے آخر ہوا کیا ہے؟" اس کا انداز تشویش بھرا تھا۔ لیکن یہی تو سب سے بڑی مشکل تھی۔ ثانیہ اسے کچھ بتا ہی تو نہیں سکتی تھی۔ اپنے اندر ہو رہی اتھل پتھل کا اظہار کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

"ام.... وہ.... کچھ نہیں۔ بس میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ثانیہ گڑبڑا کر بولی۔ آج جو کچھ ہوا اس کا ذکر تو اسے ساحر سے بھی نہیں کرنا تھا۔

"کبھی موڈ ٹھیک نہیں ہے، کبھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے حقیقت پسندانہ انداز میں تبصرہ کیا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

"کم آن ثانیہ، تمہیں مجھ سے باتیں چھپاتے شرم نہیں آتی۔" اس کا لہجہ باقاعدہ شرمندہ کرنے والا تھا۔

"میں.... نہیں تو، میں کچھ بھی تو نہیں چھپا رہی تم سے۔" وہ واقعی اپنی بے وقوفی پہ پچھتا رہی تھی۔ اسے آج کے دن ساحر سے بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر کرنی ہی تھی تو خود پہ قابو رکھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے تاثرات چھپانا سرے سے جانتی ہی نہ تھی۔

"جھوٹ بولتے ہوئے تم اور بھی اسٹوپڈ لگتی ہو۔"

وہ چڑ کر بولا تو ثانیہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا مطلب؟" اس نے گھور کر اسکرین کی طرف دیکھا جہاں ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے ساحر بڑے پرسکون موڈ میں بیٹھا نظر آرہا تھا۔

"میں اسٹوپڈ لگتی ہوں؟" دائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنی سمت اشارہ کرتے ثانیہ نے تصدیق کی۔

"ہمم... تھوڑی تھوڑی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں جارہی ہوں۔" اس نے دھمکی دینے والے انداز میں اپنا ہاتھ لیپ ٹاپ کی طرف بڑھایا۔

"ثانیہ سنو تو۔" اس نے نروٹھے انداز میں دیکھا۔

"کب سے پوچھ رہا ہوں 'ہوا کیا ہے' اب کچھ بتاؤ بھی تو۔" ساحر صلح جوئی سے بولا تو ثانیہ بھی کچھ دھیمی پڑی۔

"تمہیں بتانے سے کیا ہو جائے گا۔" انگلیاں مروڑتے اس نے نظریں چرائیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ساحر کو کیسے سمجھائے۔ آج ہال میں جو کچھ ہوا وہ ثانیہ کے لیے کسی الیکٹرک شاک سے کم نہ تھا۔ وہ نہ تو چھوٹی بچی تھی اور نہ ہی بیوقوف جو خود پہ اٹھتی کسی مرد کی نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ پاتی' اس پہ بازل نے جس دیدہ دلیری سے سب کے سامنے اس کا ہاتھ چھوا... بھلے چند ہی پل کو ہی سہی' چاہے اس پہ اتفاق کا ملمع ہی کیوں نہ چڑھا ہوا تھا۔ پر ثانیہ وہ سب نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

"یار' دونوں ساتھ مل کر پریشان ہولیں گے اور کیا؟" ساحر کی بات پہ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا جہاں وہ فل شرارتی موڈ میں تھا۔

"ویسے تم آخری بار سیریس کب ہوئے تھے؟" اس نے ناامیدی سے سرہلایا۔

"جب تمہیں پروپوز کیا تھا۔" ساحر کا جواب برجستہ تھا۔ اب کی بار ثانیہ بھی کھل کر مسکرائی تھی۔ ساحر کے سوا شاید ہی کوئی ثانیہ رضا کے موڈ کو اتنی جلدی ٹھیک کرنے کا گر جانتا تھا۔ باتوں کا رخ بدل چکا تھا اور اب دونوں کے درمیان وہی معمول کی باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ مگر اس کے بارہا سوال کرنے پر بھی ثانیہ نے ساحر کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ بھلے ساحر سے اس کی لاکھ بے تکلفی ہو اور ان دونوں کے درمیان کتنا ہی مضبوط اور با اعتماد تعلق کیوں نہ ہو' وہ اسے یہ سب نہیں بتا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

بازل خود کو اس وقت دنیا کا احمق ترین انسان تصور کر رہا تھا۔ اسے خود پہ دل بھر کے غصہ آرہا تھا۔ اسے وہ وقت یاد آرہا تھا جب ثمینہ نے پہلی بار اس کی شادی کا قصہ چھیڑا تھا۔ ایسا نہیں تھا اس کے ذہن میں اپنی شریک حیات کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ اس کے اردگرد خوب صورت اور اسمارٹ لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس کے ذہن پہ اس وقت اپنا کاروبار سوار تھا۔ وہ بہت آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اور اسی دوران اس کی جان سے پیاری ماں نے اسے سویرا کی تصویر دکھائی۔

"اچھی ہے۔" تصویر پہ ایک سرسری نگاہ ڈال کر اس نے دو لفظوں میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اور تصویر واپس میز پر رکھ دی تھی۔

وہ لڑکی خوب صورت تھی۔ اس کے لباس و انداز سے مشرقیت جھلک رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں حیا تھی جو بازل کے اردگرد منڈلانے والی لڑکیوں میں ہرگز نہیں تھی۔ اس کو ناپسند کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ تو بہرحال وہ اس وقت سوچ نہیں سکتا تھا اور اس پہ ثمینہ کا اصرار... کیونکہ انہیں وہ لڑکی بے حد پسند آئی تھی۔ وہ جب بھی شادی کرے گا اپنی ممی کی پسند سے ہی شادی کرے گا۔ اپنا بارہا کا کیا ہوا وعدہ وہ آج پورا کر رہا تھا۔ لیکن فرماں برداری کی یہ قیمت ادا کرنا پڑے گی ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

قیمتی ٹائلوں سے بنے باتھ روم میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے بازل نے لب بھینچ کر اپنے کالر کے بٹن کھولے۔ اس کا غصہ اس وقت شدت اختیار

کر چکا تھا۔ اپنے کمرے میں سویرا کی موجودگی دماغ میں دھماکے کر رہی تھی۔ وہ اس پہ ایک نگاہ ڈالے بغیر باتھ روم میں چلا آیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی جس سے اس نے پورے ہوش و حواس میں اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ وہ کیسے اس کی اس گھر اور اپنے کمرے میں موجودگی پہ سوال اٹھا سکتا تھا۔ اپنا غصہ اس نے باتھ روم کے دروازے پہ اتارا تھا۔ سویرا نے چونک کر سر اٹھایا لیکن بازل اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔
اس عالی شان محل نما گھر کے شاندار کمرے میں بیٹھے اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا اس پہ بازل کی سرد نگاہیں اسے اور بھی ہراساں کر رہی تھیں لیکن وہ اس وقت کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔
ثانیہ کو پہلی نظر میں دیکھ کر اسے یہی احساس ہوا تھا کہ وہ اس کا آئیڈیل ہے۔ اس کے ہاتھ میں سجا ہوا دودھ کا گلاس تھا جو وہ بازل کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور بازل کو وہ آنکھیں اس دنیا کی سب سے حسین آنکھیں لگ رہی تھیں۔ اس وقت اسے خود پہ قابو نہیں رہا تھا۔ وہ اس حسین مجسمے کو ہاتھ بڑھا کر چھو لینا چاہتا تھا۔ اور اس نے اپنے دل کی سنی تھی۔ گلاس پکڑنے کے بہانے اس حسن کی دیوی کو چھو لیا تھا۔ وہ اس کے چھونے سے بے قرار ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ اس کا کپکپاتا ہاتھ بازل کے ہاتھ کے دباؤ میں تھا۔
لب کاٹتے ہوئے اس نے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پہ مارے۔ شیشے میں اس وقت اس کا اپنا عکس ناقابل شناخت تھا۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ منزل سامنے ہو کر بھی اس کی دسترس میں نہ تھی۔ اسی پل آئینے میں ثانیہ کی شبیہ ابھری۔ وہ بے تحاشا خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے اور پھر اچانک اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ یہ وہی پل تھا جب بازل نے ثانیہ کو چھوا۔ اس کے چہرے پہ حیرت اور بے یقینی نمایاں تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو پھولوں کی سیج پہ بیٹھی سویرا کو دیکھ کر اس کے قدم
ایک بار پھر رک گئے۔ زندگی بھی انسان سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ جو آپ چاہتے ہیں وہ ہو نہیں سکتا۔ پر اس سب میں سویرا کا کیا قصور تھا۔ وہ اسے تو سزا نہیں دے سکتا تھا۔ کچھ پل سوچتے ہوئے گزرے اور پھر خود کو بہت حد تک نارمل کرتے ہوئے نپے تلے قدموں سے چلتا بازل سویرا کے بالکل سامنے آ بیٹھا۔ سویرا بیڈ پہ ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے سویرا کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھایا اور مخمل کی ڈبیہ میں رکھی قیمتی ہیروں جڑی انگوٹھی اس کی نازک انگلی میں پہنا دی۔ سویرا کے سینے سے ایک سکون کا سانس خارج ہوا۔ وہ اچانک ہی بہت پر سکون ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو انہوں نے حسرت اور بے بسی سے دلاور خان کے مایوس چہرے کی طرف دیکھا۔
"آج اس کی سالگرہ ہے۔" دلاور خان نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔
"میں خود چلی جاتی ہوں اس کے کمرے میں، تم وہیں ناشتہ لگوا دو۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"اس نے منع کیا ہے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" دلاور خان کی بات سن کر ان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔
"میں ماں ہوں اس کی۔" وہ بے دم سی ہو کر کرسی پہ گر گئیں۔
"اسے کچھ وقت دیں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا آپا!" دلاور خان کے پاس ہمیشہ کی طرح دلاسے تھے پر اندر سے وہ بھی جانتا تھا اب کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ علاج مرض کا ہوتا ہے بدگمانی کا نہیں۔
"دو سال سے تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ سب کچھ مزید بگڑتا ہی جا رہا ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔
"مایوسی گناہ ہے اور اگر آپ مایوس ہو گئیں تو اسے

کیسے سنبھالیں گی۔ اللہ پہ بھروسا رکھیں اور اس کے حق میں دعا کریں۔ ماں کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ اسے کیسے سمجھاتیں کہ پچھلے دو سالوں سے ان کی زبان سے اس ایک دعا کے سوا شاید ہی کوئی دوسری دعا نکلی ہو۔ اس کی خاموشی، اس کا سب سے الگ تھلگ اور بیگانہ ہو کر خود کو یوں اذیت دینا ان کو چھلنی کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

شادی والے دن ہی پہلی بار بازل اور ثانیہ کا آمنا سامنا ہوا تھا اور اس ملاقات نے دونوں کو ہی بے چین کیا تھا۔ رات بستر پہ کروٹیں بدلتے گزری تھی۔ صبح سے کئی بار فاخرہ کا بلاوا آچکا تھا۔ وہ جانتی تھی اسے نیچے کیوں بلایا جا رہا ہے اسی لیے بہانہ بنائے بستر پر پڑی رہی۔ مگر ملازمہ کے تیسری بار بلانے پر بھی جب ثانیہ نیچے نہیں آئی تو مجبوراً فاخرہ کو خود اس کے پاس جانا پڑا۔

"میں پوچھتی ہوں، آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ نہایت غصے میں تھیں۔ ثانیہ نے اب تک شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا۔

"امی! کوئی مسئلہ نہیں، بس میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" اس نے ناخنوں کو کھرچتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ تو کوئی معقول وجہ نہ ہوئی بہن کے گھر نہ جانے کی۔ وہ انتظار کر رہی ہو گی۔ کیسا لگے گا، میں ناشتہ ایبها کے ہاتھ بھجوا دوں۔" رسم کے مطابق آج صبح کا ناشتہ سویرا کی سسرال پہنچانا تھا اور ظاہر ہے اکلوتی بہن ہونے کے ناتے یہ ذمہ داری ثانیہ کو ہی نبھانی تھی مگر کل رات کے بعد ثانیہ خود میں بازل کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی۔

"امی! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔" وہ جھنجلائی۔

"دیکھو ثانیہ، یہ وقت اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ سب ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے اور باہر تمہارے ابا غصے سے گرم۔ بہتر ہو گا مجھ سے بحث کرنے کے بجائے تم یہ سامان گاڑی میں رکھواؤ اور جاؤ۔ ان لوگوں کو فون کر دیا ہے وہ بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔" فاخرہ نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا اور کمرے کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ ثانیہ کے پاس اس کے سوا اب دوسرا کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ سویرا کے سسرال جائے۔

☆ ☆ ☆

ثانیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس عالیشان بنگلے میں قدم رکھا۔ رضا حیدر کا خاندان کم حیثیت نہ تھا پر یہاں آکر تو واقعی کمپلیکس ہو رہا تھا۔ بازل سے اس بار اس کا سامنا بہت نارمل انداز میں ہوا تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد وہ سویرا کے پاس ہی تھی اور بازل نے ایک کے بعد دوسری بار اس کی طرف نظر بھر کے بھی نہیں دیکھا تھا جس سے ثانیہ کو خاصا حوصلہ ہوا تھا۔ اس کے تمام شکوک و شبہات اس ملاقات کے بعد دم توڑ چکے تھے بلکہ سویرا کو اتنے اچھے موڈ میں اور چہکتے دیکھ کر تو وہ اور بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب کل رات جو کچھ بھی ہوا وہ فقط اتفاق ہی تھا یا شاید بازل کی شرارت کا ایک انداز پر سویرا واقعی بہت خوش قسمت تھی جو اتنا بڑا خاندان اور ایسا شان دار شوہر اس کا مقدر تھا۔ اسے سویرا کی قسمت پہ رشک آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دو دن سے انہوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی کیونکہ اس نے کمرے میں آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ اس کی حساس طبیعت سے واقف تھیں۔ جو لوگ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں وہ ٹوٹ کر بکھر بھی بہت جلدی جاتے ہیں۔

"کیا کوئی اپنی ماں کو یوں سزا دیتا ہے؟" اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اجنبیت دیکھ کر وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی تھیں۔

"یہ سزا تو میرے لیے قدرت نے تجویز کی ہے ممی۔" اس نے بے بسی سے لب کاٹے۔

"اللہ اپنے بندوں کو سزا نہیں دیتا، بس ایک آزمائش ہے اور تم نے اسی پہ ہمت ہار دی۔" اس کے

بالوں کو سہلاتے وہ محبت سے بولیں۔
"جب اپنے بیچ راہ میں ساتھ چھوڑ جائیں تو ہمت کیونکر باقی رہتی ہے؟" وہ اس کے درد کو سمجھتی تھیں پر اب تو اس بات کو بہت وقت گزر چکا تھا بس اسی کی زندگی اس ایک نقطے پہ منجمد ہو گئی تھی۔
"اپنے بیچ راہ میں تنہا نہیں چھوڑتے اور جو ذرا سی مشکل آنے پہ راستہ بدل لے وہ اپنا ہرگز نہیں ہو سکتا میری جان۔ اس فرق کو سمجھ لو تا کہ زندگی آسان ہو جائے ورنہ اس اذیت اور گھٹن میں جینا مشکل ہو جائے گا۔" کئی بار کی کہی بات کو ایک بار پھر دہرایا تھا پر جواب میں اس کے لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ ابھری۔
"یہاں جینا چاہتا بھی کون ہے۔" وہ تڑپ اٹھی تھیں۔
"میری ممتا کا اور امتحان مت لو پلیز۔" وہ اپنے آنسوؤں پہ بندھ نہ باندھ پائی تھیں، اس نے نفی میں سر ہلا کر کچھ کہنا چاہا پر انہوں نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔
"میں تمہیں ایک بار پھر سے اپنے پیروں پہ چلتے اور ہنستے کھیلتے دیکھنا چاہتی ہوں۔" التجائیہ انداز میں کہتے اپنے دونوں ہاتھ بے بسی سے اس کے سامنے جوڑے تھے۔ ماں کی تڑپ دیکھ کر شاید اس کا دل بھی کانپا تھا اسی لیے لب کاٹتے کچھ بھی مزید کہنے سے گریز کیا اور پھر جو اس کے کانوں نے سنا وہ زندگی کا خوب صورت جملہ تھا۔
"ٹھیک ہے ممی مجھ کو اس دل میں جینے یا اس مطلبی دنیا کو دوبارہ دیکھنے، پرکھنے اور آزما کر خود کو تکلیف دینے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی پر صرف آپ کی خاطر مجھے اپنا علاج کروانا منظور ہے۔" دو سال، ہاں پورے دو سال لگے تھے انہیں اپنی اکلوتی اولاد کو اس خود ساختہ ڈپریشن سے نکالنے میں اور آج اتنی منت سماجت اور سمجھانے بجھانے کے بعد بالآخر انہیں مثبت جواب مل ہی گیا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے دلاور خان کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی ان دونوں کی باتوں سے خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ سرہلاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ آخر اسے ڈاکٹر کو کال جو کرنا تھی۔

☆ ☆ ☆

اب سے پہلے جو لوگ سویرا کی شادی نہ ہونے کو لے کر باتیں بناتے تھے اب وہی اس کی خوش قسمتی کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ خاندان میں ہر کوئی اسی بات کا چرچا کر رہا تھا۔ شادی کے بعد رشدہ، ہمین حیدر کے گھر آئیں تو تبسم بھی یہی قصہ لیے بیٹھی تھیں۔
"کچھ کچھ اندازہ تو تھا کہ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، لیکن اتنی اونچی جگہ رشتہ کیا ہے اس کا تو بالکل اندازہ نہیں تھا۔" رشدہ کے دل میں بھی یہی بات کھٹک رہی تھی۔
"ارے آپا! میں تو خود حیران رہ گئی ہوں۔ جس طرح فاخرہ بھابھی نے سویرا کو اتنے سالوں سے اچھے رشتے کے چکر میں گھر بٹھایا ہوا تھا، ہم نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی کہ اب کوئی ڈھنگ کا لڑکا اسے بیاہنے آئے گا۔" تبسم جو منہ میں آیا کہہ کر خود کو ہلکا کرنے پہ یقین رکھتی تھیں۔
"چلو دیر آید درست آید۔" رشدہ نے مزید کسی تبصرے سے اجتناب کیا آخر کو دوہرا رشتہ تھا رضا حیدر سے اور وہ نہیں چاہتی تھیں کوئی بات یہاں کی وہاں پہنچے۔
"ویسے آپا۔۔۔ مجھے تو اب آپ کی فکر ہو رہی ہے۔" تبسم کی بات پہ رشدہ چونکیں۔
"میری فکر؟ وہ کیوں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔
"ایک داماد اتنا رکھ رکھاؤ والا، شہر کا جانا مانا رئیس اور دوسرا۔۔۔" رشدہ کو بھی یہ بات اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی پر تبسم نے تو منہ پہ کہہ ڈالی۔
"برا مت مانیے گا یہ سوچ میں فرق تو آ ہی جاتا ہے نا۔ ان ماں بیٹیوں کے دماغ آج کل بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولیں۔
"یہ سب تو مقدر کی باتیں ہیں۔ سویرا کے مقدر

میں جو تھا وہ اسے مل گیا۔ اب اگر ثانیہ کا نصیب ہو گا تو اللہ ساحر کو بھی نواز دے گا۔" رشدہ نے مناسب انداز میں بات ختم کی۔ پر ان کے ماتھے پہ پریشانی کی لکیریں واضح تھیں۔

☆ ☆ ☆

دل کے کورے کاغذ پہ بننے والی پہلی شبیہہ مٹانا گر اتنا ہی آسان ہوتا تو بازل آج خود کو اس دنیا کا سب سے پرسکون انسان تصور کرتا۔ جنون کی روشنائی دل ہی نہیں روح پہ بھی ان مٹ نقوش چھوڑ گئی تھی۔ وہ کم عمر اور جذباتی نہیں تھا۔ ثانیہ کی کشش پہ قابو پاتے ہوئے اس نے خود کو یہی تاویلیں دی تھیں۔ سویرا کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی نارمل تھا۔ بظاہر سب ٹھیک تھا مگر وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اسے تنہائی درکار تھی۔ کچھ وقت اپنے ساتھ گزارنے کی خواہش تھی۔ وہ آفس چلا آیا تھا شاید کام میں دھیان لگ جائے اور وہ اپنی اندرونی بے چینی پہ قابو پا سکے۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ ساحر کا نام دیکھ کر دھڑکتے دل سے اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ساحر کی بے ساختہ اور پرجوش ہیلو کہنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیسے ہیں آپ؟" اپنے خشک لبوں پہ زبان پھیرتے اس نے بہ مشکل پوچھا۔

"ایہا تم، اس وقت... میرا مطلب ثانیہ کا فون تمہارے پاس۔" اس کا اس گھر میں آنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ یہاں کا دروازہ اس کے لیے کبھی بند نہ ہوتا تھا کیونکہ دونوں گھروں کے لان کی دیوار میں ایک دروازہ آمدورفت کے لیے سالوں سے بنا ہوا تھا۔ ساحر کی آواز میں اب کی بار نہ تو پہلے والا جوش تھا نہ ہی بے ساختگی بلکہ اس کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔ یقیناً وہ اس پل ناامید ہوا تھا۔

"میں نے پوچھا کیسے ہیں آپ؟" اس نے لب کاٹتے ہوئے سوال دہرایا۔

"آئی ایم سوری، تھینک یو... پر ثانیہ کہاں ہے؟"

ایہا کے سینے سے ایک گہرا سانس خارج ہوا تھا۔

"ثانیہ کچن میں بزی تھی۔ میں کمرے میں آئی تو سیل فون بج رہا تھا۔ آپ کی کال دیکھی تو اٹینڈ کرلی، سوچا حال احوال ہی پوچھ لوں۔" ساحر کے استفسار پر جواب مفصل تھا۔ گو ساحر کی بے پروائی سے دل میں ٹیس اٹھی تھی۔ پر ایہا نے خود کو حد درجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ سالوں سے اپنے اندر پنپتے غم کو سینے میں چھپائے بظاہر خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی تو اب ساحر کے سامنے کیونکر بکھر جاتی۔

"آپ آئے نہیں سویرا آپی کی شادی پہ اتنا انجوائے کیا ہم نے۔" اس سے پہلے کہ ساحر کال منقطع کر دیتا وہ مزید بولی۔ اور کچھ نہیں تو کچھ دیر اس کی آواز ہی سن لے حالانکہ اس ظالم نے ایک بار بھی اس کا حال نہیں پوچھا تھا۔

"اپنی شادی پہ انجوائے کرنے کا پلان ہے اسی لیے چھٹیاں ضائع نہیں کیں۔" ساحر کا انداز شرارتی تھا پر ایہا کو اس پل اپنی طرف انگارے اچھلتا محسوس ہوا۔

"بازل بھائی کمال کی شخصیت ہیں قسم سے۔ ثانیہ کے ساتھ تو بہت گہری دوستی ہو چکی ہے۔ رشتہ بھی تو ایسا ہے نا اور پھر آپ تو ثانیہ کی عادت جانتے ہی ہیں، اسے تو بس ایک منٹ لگتا ہے کسی سے بھی بے تکلف ہونے میں۔" ایہا کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ آج اگر وہ چین سے نہیں سوئے گی تو رقابت کی آگ میں ساحر کو بھی جلنا چاہیے۔ کم سے کم دل کو یہ اطمینان تو ملے گا کہ وہ تنہا نہیں جل رہی۔

"یہ بتاؤ تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو۔ کبھی گھر بھی ٹک جایا کرو۔ بے چاری چھوٹی ماں اکیلی لگی رہتی ہیں اور تم ثانیہ کے ساتھ گپیں لگا کر وقت ضائع کرتی رہتی ہو۔" جواب اس کی امید کے برخلاف آیا تھا۔ وہ آسانی سے موضوع بدل چکا تھا اور ایہا کا موڈ شدید آف ہو گیا تھا۔

"ثانیہ آگئی ہے 'آپ اس سے بات کریں اور میری طرف سے اللہ حافظ۔" کمرے میں داخل ہوتی ثانیہ کو دیکھ کر ایبہا نے جلدی سے بات ختم کی۔ فون ثانیہ کو تھما کر وہ کچھ کھسیانی ہوئی لیکن ثانیہ کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے یقیناً" کچھ سنا نہیں۔ وہ اب ساحر سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی تھی۔ چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ آنکھوں میں حیا کے ڈورے عود آئے تھے۔ اس کے گال گلابی ہو رہے تھے۔ **ایبہا** کا وجود جل رہا تھا۔ ساحر کو ثانیہ سے بدگمان کرنے کا پہلا موقع اسے قدرت نے دیا تھا پر ناکامی نے اس کا منہ چڑایا تھا۔ کچھ پل وہ گم صم ثانیہ کے کمرے میں بیٹھی رہی اور پھر بنا کسی سے کچھ بھی کہے اپنے گھر واپس لوٹ آئی۔

☆ ☆ ☆

وہ سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھے انگلی سے بستر کی چادر پہ نامعلوم لکیریں بنا رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بنا بھی وہ اس کی آنکھوں میں لکھا شکوہ پڑھ سکتی تھی۔ وہ خاموش تھا اور یہی خاموشی اسے اندر ہی اندر مار رہی تھی پر وہ مجبور تھی۔

"زندگی خالی جذبات کے سہارے تو نہیں گزاری جا سکتی 'حقیقت کی دنیا میں ایسی بے شمار چیزیں ہوتی ہیں جو جذبات اور محبت سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔" بہت سوچ بچار کے بعد اس نے وہ الفاظ تلاش کیے تھے جن سے اپنا دفاع کر سکے۔

"تم روز اول سے میری پابند نہیں ہو **عیشال**! اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے اپنی محبت تم پہ کبھی نافذ نہیں کی۔" ارزق نے سرد لہجے میں کہا۔ **عیشال** نے شرمندگی سے لب کاٹے۔

"میں جانتی ہوں اس وقت میں تمہیں بہت خود غرض لگ رہی ہوں۔ مشکل وقت آنے پہ راستہ بدل لینے والی بے وفا عورت۔ لیکن خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو ارزق' اگر یہ حادثہ تمہاری جگہ میرے ساتھ پیش آتا تو کیا تم مجھے چھوڑ نہ دیتے؟" اس نے چبھتے لہجے میں سوال کیا۔ اپنی شرمندگی چھپانے کا شاید اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا۔

"میں اتنی دیر سے یہی تو سوچ رہا ہوں **عیشال**! کہ اگر خدانخواستہ یہ حادثہ میری جگہ تمہارے ساتھ ہوا ہوتا تو میں تمہیں کس طرح چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔" ارزق کی بات اور انداز دونوں اسے زمین میں گاڑ رہے تھے۔ وہ جلد از جلد اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔

"تم اب بھی جذبات سے کام لے رہے ہو۔ اپنے متعلق ہی سوچ رہے ہو۔ یہ صرف میری اکیلی کی زندگی ہوتی تو میں شاید تم سے شادی کرنے کا سوچ بھی لیتی پر میں اپنے پیرنٹس سے کیا کہوں؟" وہ چڑ کر بولی تھی۔

"میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں 'ان کے مجھ سے وابستہ کچھ ارمان اور امیدیں ہیں اور اگر وہ نہیں چاہتے تو میں کیسے ان کے خلاف جا کر ایک ایسے شخص کا انتخاب کروں جو خود اپنی ہر ضرورت کے لیے دوسروں کا محتاج بن چکا ہے۔" ارزق خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس پل اسے خود سے شدید نفرت ہوئی تھی۔ اتنے سال اس نے **عیشال** سے محبت کے سوا کچھ اور نہیں کیا تھا اور اب اس محبت کے ہاتھوں اتنی توہین ہوتے دیکھ کر وہ خود سے نگاہیں ملانے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

"**عیشال**! اگر اتنے طویل تعلق کے بعد بھی تم مجھے سمجھ نہیں سکیں تو شاید یہ میرا ہی قصور ہے کہ میں تمہیں کبھی اپنا موقف سمجھا ہی نہیں پایا۔" خود پہ قابو پاتے ارزق نے زخمی انداز میں کہا۔

"بہر حال تم میری فکر مت کرو۔ یہ تمہاری زندگی ہے اور تمہیں اپنا ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرنے کا حق ہے یوں بھی ان حالات میں ہماری شادی ہونا تو ناممکن سی بات ہے کیونکہ اس کے لیے دو لوگوں میں محبت ہونا ضروری ہے۔"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں ارزق..." **عیشال** نے کہنا چاہا پر ارزق نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کرا دیا۔ اسے اب اس بحث سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”تم مجھ سے محبت کرتی تھیں عیشل! یا شاید میں ایسا سوچتا تھا کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔“ بستر پہ پڑے اپنے بے حرکت وجود پہ ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پہ اس نے آنکھیں کھولیں تو عیشل کمرے سے جا چکی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اس کے بیڈ کی چادر پہ ہیروں جڑی وہ انگوٹھی چھوڑ گئی تھی جو ارزق نے اسے منگنی والے دن پہنائی تھی اور جسے وہ اب ہاتھ بڑھا کر چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

اسپتال کے پرسکون کمرے میں بستر پہ بیٹھے ارزق یاور نے ایک سرد طویل سانس بھر کر خود کو ماضی کی اذیت سے نکالنے کی سعی کی۔ دو سال پہلے اس کی زندگی مکمل تھی۔ عیشل فیروز اس کی زندگی میں صبح بہار کی طرح وارد ہوئی تھی۔ وہ اس پہ دل و جان سے فدا تھا۔ دونوں کی منگنی انتہائی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ جلد ہی وہ دونوں شادی کے اٹوٹ بندھن میں بندھنے والے تھے۔ پر قسمت کو اس داستان میں حقیقت کا رنگ بھرنا منظور نہ تھا۔ ارزق اور عیشل کی محبت کو آزمائش کی کسوٹی پہ پرکھا جانا تھا۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ ایک انتہائی سنگین روڈ ایکسیڈنٹ میں ارزق کی ریڑھ کی ہڈی پہ گہری چوٹیں آئی تھیں جو اسے مستقل معذوری دے گئی تھیں۔ وہ چل پھر تو کیا اپنی مرضی سے ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔ گو اس کا علاج چل رہا تھا اور سب دروازے بند نہیں ہوئے تھے پر عیشل اس پہ اپنے دل کا دروازہ بند کر چکی تھی۔ اس دن وہ اکیلی اس کی زندگی سے نہیں گئی تھی بلکہ ارزق کی امید، اس کا حوصلہ بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کے اندر جینے کی آس، ایک بار پھر اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی آرزو مٹ چکی تھی۔ پچھلے دو سال سے وہ ڈپریشن اور ناامیدی کی زندگی جی رہا تھا۔ اس نے کسی بھی قسم کا علاج کرانے سے منع کر دیا تھا۔ خود کو اپنے کمرے تک محدود کر کے اس سنگدل دنیا سے اپنا ہر تعلق ختم کر رکھا تھا۔

ماں کے کہنے پر دو سال کے طویل اور تکلیف دہ وقت کے بعد بالآخر اس نے ایک بار پھر اپنا علاج کروانے کی ہامی بھری تھی۔ اسی سلسلے میں پچھلے تین ماہ سے وہ لاس اینجلس میں تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی حالت میں بہتری آ رہی تھی پر آج بھی اس کے اندر عیشل کی محبت کا ماتم جاری تھا۔

☼ ☼ ☼

آج دفتر میں اس کا آخری دن تھا۔ کل سے اس کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں۔ پر اس وقت اس کا دماغ اس قدر ماؤف تھا کہ اس سے کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا۔ عجیب سے ابہام و اندیشے تھے جو اس وقت سر کا درد بنے ہوئے تھے۔ ان کی محبت کو منزل ملنے والی تھی۔ اگلے ماہ ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ سب کچھ اس کے حق میں ہوتا آیا تھا، ہو رہا تھا پھر کیوں سب کی باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ ایہا کی کسی بھی بات پہ اس نے سرے سے دھیان دیا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی بات تھی بھی نہیں جو ساحر کو ثانیہ سے بدگمان کر پاتی لیکن چند دن پہلے رشدہ نے جو کچھ کہا، وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ پچھلے ہفتے ساحر کی جب رشدہ سے بات ہوئی تو وہ اسے خلاف معمول کچھ خاموش اور بجھی بجھی سی لگیں۔

”کیا بات ہے امی! آپ اپ سیٹ لگ رہی ہیں۔“ اس نے تشویش سے پوچھا تھا۔

”اپ سیٹ تو نہیں ہوں ہاں لیکن فکر مند ضرور ہوں۔“ رشدہ کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔ سویرا کی شادی طے ہوتے ہی رشدہ نے ثانیہ اور ساحر کی شادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اس بار ساحر اپنی سالانہ چھٹیوں پہ گھر آ رہا تھا اور رشدہ کی شدید خواہش تھی کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ سویرا کی شادی نہ ہونے تک تو فاخرہ متذبذب تھیں مگر اب جو سویرا کو رخصت کیا تو رشدہ نے بھی شادی کی تاریخ لے کر دم لیا۔ ایک ہفتے بعد اسے پاکستان جانا تھا پر رشدہ کا یہ انداز... وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”خیریت! ایسا کیا ہو گیا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

"تمہاری اور ثانیہ کی شادی کو لے کے فکر ہو رہی ہے مجھے۔" رشدہ کی بات پہ اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ رشدہ کو بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا پر دل پہ ایک ان دیکھا خوف بھی حاوی ہو رہا تھا۔ وسوسے اور خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ خاندان میں ہوتی چہ میگوئیاں انہیں مزید احساس کمتری کا شکار کر رہی تھیں۔

"اس میں فکر کرنے والی کون سی بات ہے۔ چار سال بعد بالآخر ہماری نیا بھی پار لگنے والی ہے۔ آپ کو تو بلکہ خوش ہونا چاہیے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا لیکن رشدہ اب بھی سنجیدہ تھیں۔

"تم تو جانتے ہو سویرا کی شادی کس خاندان میں ہوئی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

"ہاں مگر اس بات کا میری اور ثانیہ کی شادی سے کیا تعلق امی؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"ایک بہن اتنے اونچے اور کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی ہو اور دوسری کی شادی ہم جیسے سفید پوش گھر میں ہو جائے۔۔۔ مسئلہ تو اپنے آپ شروع ہو جائے گا۔" وہ ان کی منطق پہ حیران ہوا تھا۔

"کون سے زمانے کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں امی آپ، میری اور ثانیہ کی شادی کے پیچھے ہماری سالوں کی انڈر سٹینڈنگ ہے اور کیا آپ ماموں کی فیملی یا ثانیہ کو جانتی نہیں۔ انہوں نے کب سوشل اسٹیٹس اور مال و دولت کو اہمیت دی ہے۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا، رشدہ ایسی بات کیسے سوچ سکتی ہیں۔ تمام عمر اس نے انہیں اپنے بھائی، بھابھی اور ان کی اولاد کی تعریفیں کرتے دیکھا تھا پھر اچانک وہ ایسے خدشات کو دل میں جگہ کیوں دے رہی تھیں۔

"اسی زمانے کی باتیں کر رہی ہوں ساحر! تم کچھ نہیں جانتے ہو، یہاں ہر کوئی یہی بات کہہ رہا ہے۔ خود فاخرہ یہ بات کئی بار جتا چکی ہے کہ ثانیہ کے لیے تو انہیں رشتوں کی کمی کبھی تھی ہی نہیں۔ یوں جیسے انہوں نے تمہارا رشتہ قبول کر کے ہم پہ کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔" گو فاخرہ یا رضا حیدر کے نزدیک رشتے سب سے اہم تھے اور کبھی ہلکے پھلکے ماحول میں کہی

فاخرہ کی بات کو رشدہ اب انتہائی سنجیدگی سے دل پہ لیے بیٹھی تھیں کیونکہ اندر ہی اندر وہ اپنا اور سویرا کے سسرال کا موازنہ کر کے خود بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھیں۔

"یہ بات آپ سے مامی نے کہی ہے؟" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا، رشدہ کی اس برین واشنگ کے پیچھے تبسم کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور وہی مسلسل رشدہ کو ایسی باتیں سنا سنا کر خائف کر رہی ہیں پر وہ واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ ثانیہ سے اس کی بات چیت معمول والی ہی تھی۔ نہ اس کا رویہ بدلا تھا نہ وہ خود پھر بھی اگر اس کی ماں اپ سیٹ تھی تو کچھ تو ہو رہا تھا۔ بیٹے کے ساتھ اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کرتے ہوئے انہوں نے اس کے دل کا بوجھ بڑھا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آئس کریم کھاؤ گی؟" اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے اس کی گاڑی کی برابر والی نشست پہ سمٹی ہوئی وہ خاموش بیٹھی تھی۔ بازل کی بات پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر بنا سوچے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سویرا کا پلان تھا، تمہیں واپسی میں آئس کریم کھلائیں گے۔" بازل نے بہت کمپوزڈ اور دھیمی مسکراہٹ سے کہا۔ وہ مکمل توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور تمام راستے میں یہ پہلا جملہ تھا جو اس کی زبان سے نکلا تھا۔

"نیکسٹ ٹائم۔۔۔۔ جب آپی بھی ساتھ ہوں گی۔" وہ بدقت مسکرائی تھی۔

"ویسے بھی آپ کو آپی کے پاس جلدی واپس جانا چاہیے، انہیں آپ کی ضرورت ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سڑک پہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور رات ابھی جوان تھی۔

"بہت پیار کرتی ہو تم سویرا سے، بہت خیال رہتا ہے اس کا۔" وہ بنا دیکھے بھی بازل کی نظریں اس پل خود پہ محسوس کر رہی تھی۔

"سویرا آپی جیسی بہن اللہ قسمت والوں کو دیتا ہے اور میں خود کو بہت خوش نصیب تصور کرتی ہوں۔"
اس کا انداز باقاعدہ جتانے والا تھا۔ بازل کے لبوں پہ مسکراہٹ ابھری۔

پچھلے چند ماہ میں ثانیہ بہت زیادہ نہ سہی مگر اس حد تک بازل کی طرف سے مطمئن ہو چکی تھی کہ پچھلے تمام خدشات کو اپنا وہم اور بازل کا شرارتی رویہ سمجھ کر فراموش کر چکی تھی۔ یوں تو اس کی بازل سے ملاقات بہت کم ہوتی تھی پر ان گنتی کی ملاقاتوں میں بھی وہ اس سے بہت رسمی انداز میں ملتا تھا۔ سویرا شادی کے بعد اس کی سنگت میں اتنی خوش تھی کہ ثانیہ کے بازل کی ذات کے حوالے سے سارے ابہام ختم ہو چکے تھے اور اب تو ویسے بھی ان کا رشتہ ایک نئے موڑ پہ آپہنچا تھا۔ سویرا امید سے تھی۔ آج ہی یہ بات اس نے فاخرہ کو بتائی تھی اور پھر وہ ثانیہ کو لے کر فوراً اس سے ملنے چلی آئی تھی۔ شام کو اچانک رضا حیدر کی کال آگئی تو فاخرہ نے واپسی کا ارادہ کیا پر سویرا نے ثانیہ کو زبردستی اپنے پاس روک لیا۔ وہ ابھی بہن کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی خوشی کی خاطر ثانیہ کے نہ نہ کرنے پر بھی فاخرہ اسے سویرا کی طرف چھوڑ گئی تھیں۔ سویرا کا ارادہ تھا کہ رات کے کھانے کے بعد وہ اور بازل اسے گھر ڈراپ کر آئیں گے پر گھر سے نکلتے ہوئے اچانک سویرا کو چکر آگیا۔ ثمینہ اور بازل دونوں ہی اس کی طرف سے فکر مند تھے تو اسے آرام کرنے کو کہا اور ثمینہ نے ثانیہ کو گھر ڈراپ کرنے کی ذمہ داری بازل پہ ڈال دی۔ گو ثانیہ کی خواہش تھی کہ وہ رضا حیدر کو کال کر کے بلا لے پر سویرا اور ثمینہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ چاروناچار اسے بازل کے ساتھ گھر آنا پڑا۔

"بازل بھائی! آپ اندر آئیں نا پلیز! ایسے باہر سے چلے جائیں گے تو امی اور بابا دونوں کو اچھا نہیں لگے گا۔" وہ اسے باہر سے ہی ڈراپ کر کے جانا چاہتا تھا پر ثانیہ کو یہ بات مناسب نہ لگی۔ ظاہر ہے وہ اس گھر کا داماد تھا اور اسے اندر نہ بلانے پہ فاخرہ اور رضا حیدر دونوں ہی ثانیہ کی کلاس لے لیتے۔

"لیٹ ہو جاؤں گا' سویرا میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"
ثانیہ کو بازل کی سویرا کے لیے یہ فکرمندی اچھی لگی پھر بھی وہ اسے زبردستی اندر لے ہی آئی تھی۔

☆☆☆

اس نے اپنے برابر میں بے خبر سوئی اپنی بیوی کو ایک نظر دیکھا اور پھر اکتائے ہوئے انداز میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اسے اس وقت سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی، یہی سوچ کر وہ باہر لان میں چلا آیا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جب سے گھر آیا تھا عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ اسے اس وقت ہر شے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ خود کو ہر طور سمجھا چکا تھا پر یہ دل تھا جو بغاوت پہ آمادہ تھا۔

اپنی شادی کی رات بازل نے خود سے تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی پسند کا احترام کرتے ہوئے اپنی شادی کو نبھائے گا۔ ثمینہ کی اس کی زندگی میں مرکزی حیثیت تھی اور وہ سویرا کے معاملے میں جو کہتی تھیں بازل وہی کرتا تھا۔ وہ ثانیہ کو فقط اپنی بیوی کی بہن کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور اس کے سوا اس سے کوئی بھی دوسرا تعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا پر یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ جب جب اس سے ملتا تھا' جب جب اسے دیکھتا تھا دل بے اختیار گھٹتا جاتا تھا پر وہ بازل بختیار تھا' کوئی عام انسان نہیں جو اپنی کسی اوچھی حرکت سے خود کا تماشا بنوا لیتا۔ پر آج اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ آج اس مختصر وقت میں اس نے ثانیہ کے حسین چہرے پہ خوشی کے اتنے بہت سے رنگ یکجا دیکھے تھے جو دھنک کے سات رنگوں کو بھی مات دے رہے تھے۔ اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی اور بازل اس خوشی کا منبع دیکھ کر شدید ہتک اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہو گیا تھا۔ ثانیہ کے کہنے پر وہ اندر چلا گیا تھا پر وہاں ساحر اور رشدہ کی موجودگی اس کے اور ثانیہ دونوں کے لیے ہی ایک سرپرائز تھی۔ گو کہ یہ سرپرائز ثانیہ کے لیے ہی تھا کیونکہ ساحر نے اپنے آنے کی خبر ثانیہ سے چھپائی

تھی اور اب وہاں سب ہی بڑی بے چینی سے اس کے منتظر تھے۔

وہ رسمی انداز میں ساحر سے ملا تھا اور کچھ ایسا ہی انداز ساحر کا بھی تھا۔ ثانیہ بھی سب کی موجودگی میں ساحر سے بہت ریزرو انداز میں ملی تھی پر ثانیہ کے چہرے کی روشنی وہ بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ اسے شدید حیرت اور کچھ کچھ غصہ آرہا تھا کہ ثانیہ اس عام سی پرسنالٹی والے شخص پہ اپنی محبت کس طرح نچھاور کر رہی ہے۔ وہ بس چند منٹ میں ہی واپس چلا آیا تھا پر اس کا موڈ شدید آف تھا۔ وہ رات بازل کے اعصاب پہ بہت بھاری تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم کچھ زیادہ ایٹی ٹیوڈ نہیں دکھانے لگی ہو وائف ٹوبی۔" آئس کریم پارلر میں بیٹھے اس نے چھیڑا۔

"اور تم کچھ زیادہ ڈیمانڈنگ نہیں ہوتے جارہے ہزبنڈ ٹوبی۔" اپنے پسندیدہ فلیور کی ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کو انجوائے کرتے وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

"ملنے کا ہی تو کہہ رہا تھا۔" ساحر نے جتایا۔

"امی کو پتا چل گیا نا تو جوتیاں پڑیں گی۔" انداز ڈرانے والا تھا۔

"یہ اچانک سے بڑی مامی ولن کیوں بن گئی ہیں۔" ساحر کب ڈرنے والوں میں تھا۔

"بقول ان کے شادی سے چند دن پہلے کی ملاقاتیں منہ پہ پھٹکار ڈال دیتی ہیں۔" ساحر نے بمشکل ہنسی روکی۔

"وہ تو پہلے سے پڑی ہوئی ہے۔" سنجیدگی سے زیرلب کہا تھا لیکن ثانیہ کے کان اسی کی طرف لگے تھے۔

"تم نے اس لیے بلایا تھا مجھے؟ ایبھا کے ساتھ شاپنگ کا بہانہ بنا کر نکلی ہوں گھر سے صرف تمہاری خاطر.... یہ سننے کے لیے کہ میرے منہ پہ پھٹکار پڑی ہے۔" وہ بے یقینی سے بولی۔ چمچ کپ میں پھینک کر وہ اب منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"اچھا چل چھوڑنا' اب یہ اوور ایکٹنگ لگ رہی ہے۔" ساحر مزے سے اپنی آئس کریم پہ ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"اس سے اچھا تھا تم واپس ہی نہ آتے میرا دل جلانے کے لیے۔" اس ایک جملے نے خاصا سکون دیا تھا۔ وہ پھر سے آئس کریم کھانے لگی تھی۔ آخر غم بھی تو غلط کرنا تھا۔

"یار! تم لڑکیوں کا دل جلنے پہ کون سا لمبا چوڑا خرچ آتا۔ ذرا سا چھیڑ دو' دل جل گیا' سہیلی کو کسی اچھے لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پہ دیکھا' دل جل گیا۔ کلاس فیلو کے ہاتھ میں اماں سے چھپا کر لیا ہوا فرینڈ کا دیا ہوا اسمارٹ فون دیکھا' دل جل گیا اور تو اور کام والی ماسی کو اپنے ڈیزائنر سوٹ کا ریپلیکا پہنے دیکھا دل جل کر خاکستر ہو گیا۔" وہ ایک سانس میں انگلی کی پوروں پہ گنتا مزے لے لے کر اسے سنا رہا تھا۔

"تم ایک بات مجھے کنفرم بتادو۔ شادی کے بعد بھی اگر میرے ساتھ ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو....." ثانیہ میز پہ ہاتھ مار کر بولی۔

"اتنا گھامڑ سمجھ رکھا ہے کیا جو شادی کے بعد ایسی جلی بھنی باتیں کروں گا۔"

جب سے وہ آیا تھا' ملاقات بس گھر تک محدود تھی۔ کچھ دنوں میں شادی ہونے والی تھی تو فاخرہ نے صاف لفظوں میں منع کر دیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے ساحر کے ساتھ گھومنے پھرنے یا شاپنگ کا سوچے بھی مت۔ ساحر کا اصرار تھا تو آج ایبھا کے ساتھ شاپنگ کے بہانے مجبوراً" اسے آنا ہی پڑا تھا۔ ایبھا مال میں اپنی خریداری کرتی پھر رہی تھی جبکہ ثانیہ یہاں بیٹھی ساحر کی باتوں پہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ ثانیہ کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور ثانیہ اس کی عادت جان کر بھی بہ آسانی تنگ ہوتی رہتی تھی۔ ساحر کو پتا تھا اسے چڑانا مشکل نہیں۔

"شادی کے بعد تو باتیں ہوں گی عارض و رخسار کی۔" وہ ایک ردھم میں بولا تو ثانیہ نے بھنویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"گھنی زلفوں کی۔" وہ سنجیدہ تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

"خوشبو کے جھونکوں کی۔" ثانیہ اسے مسلسل دیکھتے پورے انہماک کے ساتھ گال پہ ہاتھ ٹکائے کہنی میز پہ رکھے اس کی طرف متوجہ تھی۔

"ایک سے ایک حسین و جمیل گوریاں کام کرتی ہیں میرے آفس میں۔ تمہیں پہلے اس لیے نہیں بتایا کہ تم یقین نہ کرتیں لیکن لندن واپس جا کر میں تمہیں ملواؤں گا ان چندے آفتاب چندے مہتاب قسم کی لڑکیوں سے..... اور پھر... تم دیکھنا۔" وہ اسی سنجیدگی سے بولا تو چند لمحے ثانیہ اس کی بات کو سمجھ ہی نہیں پائی اور جب بات سمجھ میں آئی تو ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم سے شادی کرتی ہے میری جوتی ساحر! اب واپس جا کر ان ہی عارض و رخسار کو دیکھ کر غزلیں کہنا اور میں..... اور..... بس میں جا رہی ہوں۔" میز پہ پڑا نیپکین اٹھا کر ساحر کو مارا اور اپنا بیگ کاندھے پہ اٹھا کر ڈالتے وہ اب دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ساحر نے لب دبا کر ہنسی کو روکا۔

"تم لڑکیاں بھی نہ کتنی جل ککڑی ہوتی ہو۔ دن رات اپنی تعریفیں سن کر بیزار نہیں ہوتیں مگر جہاں زبان سے کسی دوسری عورت کی تعریف سنی، سمجھو تیل کے کنویں میں آگ لگ گئی۔" اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے واپس کرسی پہ بٹھایا۔ وہ آرام سے بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر ساحر کو ناراضی سے دیکھا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
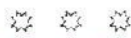
ملازمہ نے چائے اور لوازمات سے بھری ٹرالی لاؤنج میں رکھی۔ گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کے کپ ان کے سامنے رکھ کر وہ اب باقی کا سامان میز پہ سجا رہی تھی۔ سویرا تھکے تھکے انداز میں صوفے پہ بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں مسکراہٹ تھی پر چہرہ اترا ہوا تھا۔

"کام تو جیسے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ اب تو وقت بھی نہیں بچا اور مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔" فاخرہ نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ ثانیہ نے جوس کا گلاس زبردستی اسے تھمایا جسے اس نے منہ بنا کر ہونٹوں سے لگایا۔

"امی! آپ تو خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ماشاء اللہ سب تیاریاں تو اتنے اچھے سے ہو چکی ہیں۔ آپ بس ٹینشن مت لیں۔" حالانکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی ماں کو تسلی دی۔

"کیسے ٹینشن نہ لوں بچے، ادھر شادی سر پہ ہے ادھر تمہاری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔" ثمینہ کے بھائی کی اوپن ہارٹ سرجری تھی۔ وہ اچانک ہی امریکہ چلی گئی تھیں اور سویرا گھر پہ اکیلی تھی۔

"یہ دیکھو، ثانیہ کی جیولری پک کرنے نکلے تھے ہم دونوں، میں نے اس سے کہا مجھے سویرا سے ملے بغیر چین نہیں آئے گا ابھی چلو۔"

اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی جو کہ ان دنوں اکثر ہی ہو جاتی ہے۔ اس کی کال آئی تو اس وقت وہ شاپنگ کے لیے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ فاخرہ کے لیے گھر کی طرف واپس قدم بڑھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں مارکیٹ سے سیدھی اس کی طرف چلی آئی تھیں۔

"اچھا کیا آپ دونوں نے چکر لگا لیا۔ میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو۔" ثانیہ نے زیورات نکال کر سویرا کو دکھائے۔ وہ دونوں اب زیورات پہ ہنس ہنس کر تبصرہ کر رہی تھیں۔

"ویسے مجھے تمہاری ساس کا اس وقت امریکہ جانا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تمہیں یوں نوکروں کے سہارے چھوڑ گئی ہیں۔ ان دنوں میں تو کتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" فاخرہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"آپ کو پتا ہے نا امی! وہ تفریح کرنے نہیں گئیں بلکہ بازل کے ماموں کی اوپن ہارٹ سرجری ہے۔ ان کا وہاں ہونا زیادہ اہم تھا اور میں اکیلی کیوں ہوں؟ میرے پاس آپ سب ہیں، بازل ہیں۔" سویرا نے اپنے تئیں

تسلی دی۔ حالانکہ بازل ان دنوں اچھا خاصا مصروف تھا یا پھر یہ مصروفیت ثانیہ کی اگلے ہفتے ہونے والی شادی کی سوچوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔

"تم ایسا کرو بس اب میرے ساتھ چلو۔ ہفتے بعد بھی تو آنا ہے ثانیہ کی شادی میں شرکت کے لیے تو بس ابھی آجاؤ۔ کم سے کم میری نظروں کے سامنے تو رہو گی۔" فاخرہ جیسے طے کر کے آئی تھیں۔ فیصلہ کن انداز میں کہا تو سویرا کچھ گھبرا سی گئی۔

"آجاؤں گی امی! بازل سے بات کر چکی ہوں' وہ کہہ رہے تھے۔ طبیعت کچھ بہتر ہو جائے تو چلی جانا ایک دو دن میں امی کی طرف اور ساتھ ہی وعدہ بھی لیا ہے کہ کوئی اچھل کود نہیں کرنی اور نہ ہی خود کو تھکانا ہے۔ بس ریسٹ کرنا ہے فل ٹائم۔" اس نے ماں کو مطمئن کیا۔

"لو بھلا میں کرنے دوں گی تمہیں کوئی ایسی حماقت۔ تم نے بس آرام کرنا ہے اور خوش رہنا ہے۔" فاخرہ برجستہ بولیں۔ داماد کا نام سن کر دھیمی پڑی تھیں۔

"ویسے امی! آپی کا لگتا ہے مجھے اپنا دل نہیں چاہ رہا بازل بھائی کو اکیلے چھوڑنے کا۔ یہ تو بس اب اپنے پیا کو پیاری ہو چکی ہیں۔" ثانیہ کا انداز بھرپور شرارتی تھا۔

"کیوں فکر کرتی ہو محترمہ' بس کچھ دن اور پھر تم بھی پیا کو پیاری ہو جاؤ گی۔ پھر پوچھوں گی کتنے چکر لگتے ہیں میکے کے۔"

"سنالو جتنی باتیں سنانی ہیں' میں ہرگز شرمندہ ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ اس معاملے میں سویرا کا الٹ تھی۔

"ویسے میں نے تو اس شہر میں ہونا ہی نہیں اور بے چارہ ساحر یوں بھی بازل بھائی کی طرح بزنس مین تو ہے نہیں جو میرے آئے دن کے ایئر ٹکٹ کے خرچے برداشت کرے گا۔" وہ مزے سے بولی تو سویرا نے بھی بھرپور قہقہہ لگایا۔

"چپ بدتمیز۔ ایسے نہیں کہتے۔" فاخرہ نے گھرکا۔ "اس لڑکی کی بھی تو زبان نہیں رکتی ہے۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے۔" "نہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا اس پل بازل اور ساحر کا موازنہ۔"

"امی مذاق کر رہی ہے۔" سویرا نے لب دبا کر ہنسی کو روکا۔ ثانیہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ فاخرہ کی ڈانٹ کا اس پہ کم ہی اثر ہوتا تھا۔

"ایسی بات مذاق میں بھی کیوں بولی جائے۔ کل کو ساحر کے سامنے کہہ دے تو وہ کیا سوچے گا۔ یہ رشتے بہت حساس ہوتے ہیں اور ایسی باتیں مسائل کھڑے کر دیتی ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے امی' جیسے آپ تو ساحر کو جانتی ہی نہیں۔ وہ ایسی اسٹوپڈ باتیں نہیں سوچتا ہے۔" ثانیہ نے چپس اٹھا کر کھاتے ہوئے لاپروائی سے ہاتھ مارا جبکہ دوسری طرف ماں کی سنجیدگی پہ سویرا کی ہنسی کو بھی بریک لگ چکا تھا۔

"جو بھی ہے' بس خیال رکھا کرو۔ اللہ تم دونوں بہنوں کو اپنے گھر میں شاد و آباد رکھے۔ میری تو ہر سانس کے ساتھ یہی دعا نکلتی ہے کہ تمہاری خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔" وہ ماں تھیں اور مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خوشیوں کی دعائیں مانگنے والی اور جب جھولی خوشیوں سے بھر جائے تو ان کے کم ہونے کے خوف میں گھری۔ وہ چھت ہوتی ہیں جو اولاد کو موسموں کی سختی' تند ہواؤں اور زمانے کی سختیوں سے اپنی محفوظ پناہ میں رکھتی ہیں۔

"آمین۔" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔

"اچھا۔ اب کافی وقت ہو گیا ہے' ہمیں چلنا چاہیے۔ دل تو میرا یہی تھا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو پر جیسے مناسب سمجھو۔" فاخرہ چیزیں سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چلتے چلتے ایک بار پھر وہی بات دہرائی تھی۔

"کہہ رہی ہوں ناں' آجاؤں گی۔ کیوں فکر کرتی ہیں۔" سویرا نے تسلی دی۔

"اکیلی ہو یہاں' فکر تو رہے گی ناں مجھے۔" وہ محبت سے بولیں اور اس کا ماتھا چوما۔

"اچھا تو ثانیہ کو میرے پاس چھوڑ دیں۔" ثانیہ جیولری کے ڈبے بیگ میں رکھتی رک گئی۔ سویرا نے

فاخرہ کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا۔

"لڑکی! عقل کو ہاتھ مار، اس کی شادی ہے اگلے ہفتے، اس کو یہاں کیسے چھوڑ دوں بھلا۔" فاخرہ نے دوٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ایسا سوچا بھی جا سکتا تھا پر اب تو بالکل نہیں۔

"ایک رات کی تو بات ہے امی! اس بہانے ہم دونوں بہنیں ڈھیر ساری باتیں کرلیں گے۔ تھوڑا سا کوالٹی ٹائم ساتھ گزار لیں گے۔" سویرا کبھی ضد نہیں کرتی تھی لیکن آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یا اکیلے پن کا احساس۔ وہ ساتھ جا نہیں سکتی تھی تو اپنی کمپنی کے لیے بہن کو روک لیا۔

"نہیں سویرا! مجھے تو یہ مناسب نہیں لگ رہا بیٹا۔ تمہارے بابا کو بھی اچھا نہیں لگے گا۔" فاخرہ جزبز کھڑی تھیں۔ سویرا کا اصرار اپنی جگہ۔ پر شادی سے ایک ہفتہ پہلے ثانیہ کو کہیں چھوڑنا۔ سوچ کر ہی عجیب لگ رہا تھا۔ دن کی خیر تھی وہ اکثر یہاں رہ جاتی تھی پر...

"کچھ نہیں ہوتا امی، میں آج رات آپی کے پاس رک جاتی ہوں، بازل بھائی سے بھی بات کرلوں گی کہ آپی کو میرے ساتھ بھیج دیں اور کل انہیں ساتھ لے کر ہی آؤں گی۔" سویرا کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ مزید کچھ نہیں بولی اور ثانیہ کو اس کی اتری ہوئی شکل بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ دل تو اپنا بھی نہیں تھا پر اپنی جان سے پیاری بہن کی خوشی کی خاطر اتنا تو وہ کر ہی سکتی تھی۔ وہ رک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسٹڈی روم کے دروازے پہ بے حس و حرکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اندر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اگر یونہی کھڑی رہی تو چکرا کر گر پڑے گی اسی خوف سے اس نے دروازے کا پٹ مضبوطی سے تھام کر خود کو سہارا دیا۔

"بے شرم، بے حیا۔ ایسی گھٹیا حرکت کرنے سے پہلے میرے اور اپنے تعلق کا تو سوچا ہوتا۔" ثانیہ نے دونوں ہاتھوں سے بازل کی قمیص تھام رکھی تھی اور وہ اسے کھینچ رہی تھی۔ اس ساری زور آزمائی میں بازل کی قمیص کے کئی بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ بازل نے غراتے ہوئے اس سے اپنا گریبان چھڑایا اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پہ مارا۔ اس کی انگلیوں کے نشان ثانیہ کے گالوں پہ نمایاں تھے۔ ثانیہ لڑکھڑا کے فرش پر گری۔

"دیکھا اپنی بہن کا گھٹیا پن، کیسی شرمناک حرکت کر رہی تھی یہ میرے ساتھ۔" بازل کی آواز پہ چونک کر ثانیہ نے منہ اٹھایا اور اس کی نظروں کا تعاقب کرتے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں سویرا ساکن کھڑی تھی۔

"میری تو زبان ساتھ نہیں دے رہی۔ کن الفاظ میں تمہیں بتاؤں یہ..." وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہتا سویرا کی طرف بڑھا۔ اس کے ہر لفظ میں شدید نفرت پنہاں تھی۔ ثانیہ نے حیرت زدہ نظروں سے بازل اور سویرا کو دیکھا۔

"میرے بارہا سمجھانے کے باوجود یہ لڑکی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ہزار بار کہا اسے، رشتوں کے تقدس کا خیال کرو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ دنیا کیا کہے گی؟ پر اس کی آنکھوں پر تو... لالچ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔" سویرا کا ہاتھ تھامے بازل نے جذباتی انداز میں کہا۔ وہ غصے اور نفرت سے سر جھٹکتا ثانیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اتنا بڑا جھوٹ بولتے آپ کو شرم نہیں آئی؟" ثانیہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔ بازل کے تھپڑوں سے نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ چہرہ انگلیوں کے نشانوں اور شرمندگی سے لال تھا۔

"آپی! یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔ آپ نہیں جانتیں اس نے میرے ساتھ زبردستی..." روتے روتے لفظ منہ میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ سویرا ایک ٹک اس کو دیکھ رہی تھی۔

"جھوٹا میں ہوں یا تم؟" بازل کی آواز پہ سویرا نے

اس کی طرف دیکھا۔

"مجھ پہ اتنا بڑا بہتان لگا رہی ہو۔ بتاؤں تمہاری بہن کو ہم کس کس طرح اپنی اداؤں سے مجھے بہکانے کی کوشش کرتی رہی ہو۔" بازل تلخی سے بولا اور اس پل اس نے سویرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا۔

"شٹ اپ!" ثانیہ غرائی۔

"یو شٹ اپ۔" بازل اس سے بڑھ کر چلایا۔

"سویرا! پوچھو اس سے، یہ اتنی رات کو میری اسٹڈی میں کیا کرنے آئی تھی۔" بازل نے سویرا کا بازو تھام کر اسے سوال کرنے کے لیے اکسایا۔

"میں خود یہاں نہیں آئی تھی بلکہ تم نے مجھ سے کافی منگوائی تھی۔" ثانیہ کی بات پر بازل کے لبوں پہ ایک تلخ مسکراہٹ ابھری جبکہ سویرا نے ناقابل یقین نظروں سے ثانیہ کی طرف دیکھا۔

"لیکن بازل تو کافی پیتے ہی نہیں۔" سویرا کی آواز بہت دور سے آئی تھی۔ ثانیہ نے چونک کر پہلے سویرا کو اور پھر میز پہ پڑے سرد کافی کے کپ کو دیکھا۔

"جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ سچ پہ لاکھ پردے ڈالو سامنے آ ہی جاتا ہے۔ سویرا! یہ یہاں کافی کے بہانے میرے ساتھ وقت بتانے آئی تھی۔ مجھے اپنے حسن کے جال میں پھانس کر بہکانے کی کوشش تو یہ بہت دیر سے کر رہی تھی پر میں نے کبھی اس پر دھیان ہی نہیں دیا اور تمہیں بھی اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ تمہیں دکھ نہ پہنچے۔" ثانیہ نے کچھ کہنا چاہا پر سویرا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"آج بھی یہ یہاں مجھ سے ایسی ہی بے حیائی کی باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کو سنجیدگی سے شٹ اپ کیا تو میرے گلے لگ گئی۔ میں نے تنبیہہ کی کہ میں آج سویرا کو سب کچھ بتا دوں گا تو لگی میرا گریبان نوچنے۔" بازل نے تیز لہجے میں بولتے اپنی قمیص کے کھلے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔

"بکواس بند کرو۔ میری بہن کو جھوٹی من گھڑت کہانی سنا کر میرے خلاف کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟" ثانیہ نفرت سے پھنکاری۔

"آپی! میں سچ کہہ رہی ہوں، انہوں نے خود کچن میں آ کر مجھ سے کافی لانے کا کہا تھا۔" بازل نے بے ساختہ سر تھام لیا۔

"میں نے آج تک کبھی کافی پی ہی نہیں۔ مجھے تو الرجی ہے کافی سے۔" وہ بے اختیار بولا۔

"سویرا! بات دراصل یہ ہے کہ یہ میری دولت، میرے سوشل اسٹیٹس سے بری طرح متاثر ہے۔ بارہا مجھ سے کہہ چکی ہے کہ ساحر سے شادی کا فیصلہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے اور یہ بہت پچھتا رہی ہے۔ اب بھی جب میں نے اسے ڈانٹا تو آپے سے باہر ہو گئی اور تم نے بھی تو دیکھا یہ کیسے میرے گلے پڑ رہی تھی۔" بازل نے تفصیل سے ساری بات سویرا کو سنائی۔ سویرا کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔" ثانیہ نے روتے ہوئے کہا۔

"اس کی حالت دیکھو اور میرا حلیہ چیک کرو سویرا۔ تمہیں خود پتا چل جائے گا کون کس سے دست درازی کر رہا تھا۔" بازل نے ثانیہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپی! یہ..... میری بات سنیں پلیز....." اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، سویرا نے ایک زوردار طمانچے سے اس کا منہ لال کر دیا تھا۔

"کاش آج کا دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت آجاتی۔" آنکھوں میں نفرت لیے وہ دھاڑی تھی۔ ثانیہ نے بے ساختہ اپنا گال تھام لیا۔

"زندگی میں اس سے زیادہ شرمندگی اور ندامت کا لمحہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" بازل نے تاسف سے کہا۔

"نکل جاؤ یہاں سے، آج کے بعد میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کیا تعلق اتنی جلدی ٹوٹ جاتے ہیں؟ کیا بھروسا یوں آناً فاناً شک کی قبر میں دفنا دیا جاتا ہے۔

"آپ اس شخص کی جھوٹی باتوں میں آ کر اپنی بہن

پہ شک کر رہی ہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"تم جیسی ہوتی ہیں بہنیں۔ اپنی بہن کا گھر خراب کرتے تمہیں شرم نہیں آئی ثانیہ! ساری زندگی میں نے خود پہ تمہاری برتری برداشت کی اور بس اتنا ہی تھا تمہارا ظرف؟ بہن کو اپنے سے بہتر زندگی گزارتا نہیں دیکھ سکیں تم۔ ساتھ ہی اپنی گھٹیا اوقات دکھا دی۔" بازل اب قدرے مطمئن کھڑا تھا جبکہ سویرا غصے سے تھر تھر کانپتی ثانیہ پہ برس رہی تھی۔

"میں ابھی ابو کو کال کر کے بلاتی ہوں کہ آکر تمہیں یہاں سے لے جائیں اور آج کے بعد مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔" وہ اسی پل اسٹڈی سے باہر نکل گئی تھی۔ بازل کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کا ایک بج چکا تھا۔ فاخرہ گھر میں جلے پاؤں کی بلی طرح چکر لگا رہی تھیں۔ متعدد بار رضا حیدر، ثانیہ اور سویرا کو کال کر چکی تھیں پر ان کی کال کسی نے اٹینڈ نہیں کی تھی۔ بارہ بجے کے قریب سویرا کی کال رضا حیدر کو موصول ہوئی تھی اور وہ ان سے کچھ بھی کہے بغیر گھر سے نکل گئے تھے۔ وہ ان کی یک طرفہ بات سے بس اتنا ہی اندازہ لگا پائی تھیں کہ سویرا بے تحاشا رو رہی تھی اور انہیں "فوراً" آنے کا کہہ رہی تھی۔ انہیں خود پہ شدید غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے انہیں اکیلے کیوں جانے دیا پر وہ انہیں ساتھ لے کر جانے پہ تیار بھی کب تھے۔ ان کا دل برے برے وسوسوں سے دہل رہا تھا۔

پورچ میں گاڑی کی آواز سن کر ان کے سینے سے ایک پرسکون سانس خارج ہوا تھا۔ وہ "تقریباً" بھاگتے ہوئے صدر دروازے تک گئیں۔ اور اسی پل رضا حیدر تھکے تھکے قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیر گھسیٹتی، سر جھکائے اور چہرے پہ زخموں کے نشان لیے ثانیہ بھی اندر چلی آئی۔ فاخرہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ انہوں نے رضا حیدر کے چہرے کو دیکھا۔ ان کے چہرے پہ تھکن تھی اور اس لمحے وہ فاخرہ کو اپنی عمر سے سو سال بڑے لگے تھے۔

فاخرہ سے نظریں چراتے وہ بس چپ چاپ صوفے کی طرف بڑھے اور گرنے کے انداز میں اس پہ بیٹھ گئے تھے جبکہ ثانیہ سر جھکائے اب بھی چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔

"میں کہتی ہوں، آخر ہوا کیا ہے رضا صاحب؟" ان کے بارہا پوچھنے پر بھی جب رضا حیدر نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ پھٹ پڑی تھیں۔

"کیوں اتنی رات کو سویرا نے آپ کو ایمرجنسی میں بلایا تھا اور یہ ثانیہ۔ اس کو کیا ہوا ہے؟ اس کے چہرے اتنی چوٹ کیسے لگی؟" وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ فاخرہ کی طرف دیکھ رہے تھے جو شدید پریشانی کے عالم میں ان دونوں سے مسلسل سوال کر رہی تھیں اور وہ اسی کشمکش میں تھے کہ فاخرہ کو بتائیں تو کیا۔

"آپ لوگ مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں آخر۔ پلیز مجھے بتائیں سب ٹھیک تو ہے نا۔ میرا دل بند ہوئے جا رہا ہے۔" فاخرہ نے "تقریباً" روتے ہوئے کہا۔ ثانیہ کی آنکھوں سے نکلتا کھارا پانی اس کے رخساروں پہ بہہ رہا تھا۔ وہ لب کاٹتی اب بھی کسی بت کی طرح اسی مقام پہ کھڑی تھی۔

"فاخرہ! مجھ سے اس وقت کچھ مت پوچھو۔ پلیز میں تمہاری کسی بھی بات کا جواب نہیں دے پاؤں گا۔" رضا حیدر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"ثانیہ! تم بتاؤ۔ وہاں ایسا کیا ہوا تھا جو سویرا نے تمہارے پاپا کو بلایا۔ سویرا اور بازل ٹھیک تو ہیں نا؟" رضا حیدر سے مایوس ہو کر انہوں نے اب کی بار ثانیہ کو متوجہ کیا۔ یہ اس کا ہی دل جانتا تھا، وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ دونوں مجھے کچھ نہیں بتائیں گے تو میں خود سویرا کو کال کر کے پوچھتی ہوں، معاملہ کیا ہے۔" ثانیہ نے نہ تو کوئی جواب دیا تھا نہ ہی ماں کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ فاخرہ دو ٹوک انداز میں کہتے ہوئے صوفے سے اٹھی تھیں۔

"رک جاؤ فاخرہ۔" بالآخر رضا حیدر کی زبان کا قفل ٹوٹا تھا۔ "بیٹھو۔" کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے کہنا

شروع کیا۔ ساری بات فاخرہ کو سنا کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا جبکہ فاخرہ حیرت اور پریشانی سے ان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ثانیہ اور بازل؟ اوہ میرے خدایا!" فاخرہ کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا کرنے گئی تھیں تم اسٹڈی میں اتنی رات کو؟؟" اچانک وہ صوفے سے اٹھیں اور ثانیہ کو جھنجھوڑتے ہوئے غصے سے پوچھا۔

ثانیہ کسی بت کی طرح خاموش کھڑی تھی۔

"بتاؤ مجھے، بولتیں کیوں نہیں کچھ؟" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ ثانیہ کی چمڑی ادھیڑ دیں۔

"اسے کچھ مت کہو، اس کی کوئی غلطی نہیں ہے فاخرہ۔" رضا حیدر کی لرزتی آواز پہ فاخرہ نے پلٹ کر دیکھا۔

"میں جانتا ہوں، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بہتان لگا رہا ہے ہماری معصوم بچی پر۔ سچ تو یہ ہے، وہ خود ایک بدنیت انسان ہے۔" انھوں نے غصے سے کہا۔

"جب آپ یہ سب اتنے وثوق سے کہہ رہے ہیں تو سویرا کو وہاں اس گھٹیا شخص کے پاس کیوں چھوڑ آئے ہیں رضا۔ اسے بھی ساتھ لے کر آتے۔" فاخرہ کو ان کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جیسے اس سارے قصے سے الجھ سی گئی تھیں۔ ایک ساتھ اتنی بہت سی پریشانیوں نے آگھیرا تھا۔ ان کا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔

"وہ گھٹیا شخص تمہاری بیٹی کا شوہر ہے فاخرہ! اور اس حالت میں جبکہ وہ خود اس پہ اندھا بھروسا کرتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن پہ لگائی تہمت کا یقین کر رہی ہے تو میں کس طرح اسے وہاں سے اپنے ساتھ لے آتا۔"

رضا حیدر نے انہیں وہ پہلو یاد دلایا جو خود ان کے بھی ہاتھ باندھ رہا تھا۔ بازل کا گریبان پکڑنا ان کے لیے مشکل نہ تھا مگر کس دل سے اپنے ہاتھوں بیٹی کا گھر اجاڑتے۔ عمر کے اس حصے میں ایک جہاں دیدہ انسان کے لیے سچ اور جھوٹ کی پرکھ کرنا مشکل مرحلہ نہیں ہوتا پر سویرا ان کی کوئی بھی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اسے ثانیہ پہ شک نہیں یقین تھا کہ اس کے شوہر کو ورغلانے میں سو فیصد اسی کا کردار ہے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے سویرا کا۔ وہ نہیں جانتی ثانیہ کو، اپنی بہن پہ اعتبار نہیں اسے اور شوہر پہ ایسا اندھا بھروسہ ..... میں کرتی ہوں اس سے بات۔" ساری بات جان کر فاخرہ بری طرح پریشان ہو گئی تھیں۔

"مجھے نہیں لگتا یہ وقت اس بحث کے لیے مناسب ہے۔ جب ذرا رک کر ٹھنڈے دماغ سے سوچے گی تو خود سمجھ جائے گی۔"

"ثانیہ! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" کچھ سوچتے ہوئے فاخرہ نے پاس کھڑی ثانیہ کا کندھا تھپتھپایا اور اسے جانے کا کہا۔ ثانیہ کسی روبوٹ کی طرح اشارہ ملتے ہی مریل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی جبکہ نڈھال سے انداز میں فاخرہ صوفہ پہ رضا حیدر کے برابر جا بیٹھیں۔ نیند آج ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ پر وہ نہیں جانتی تھیں، یہ رت جگے ان کا مقدر بننے والے ہیں۔

☆ ☆ ☆

ان دونوں کو گپیں لگاتے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور جب گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ بازل ڈنر کے بعد سے اپنی اسٹڈی میں تھا۔ سویرا جانتی تھی، یہ اس کا روز کا معمول ہے اور وہ رات گئے تک کام کرنے کا عادی ہے۔

ثانیہ کے لیے گیسٹ روم کھلوا دیا گیا تھا۔ ویسے تو اس گھر میں ملازموں کی فوج تھی پر رات کے اس پہر وہ سب اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے۔ سویرا نے اسے کافی کا پوچھا تو اس نے صاف منع کر دیا۔ وہ اس وقت کافی پی کر اپنی نیند خراب کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ سویرا سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ وہ کافی بنانے کچن میں چلی آئی۔

"اگر کافی بنا رہی ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنا دو

پلیز۔" ثانیہ نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔
"امید کرتا ہوں' زحمت نہیں ہوگی۔" بازل نے کچن کے دروازے میں کھڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔
"اس میں زحمت والی کیا بات ہے۔" ثانیہ نے نفی میں سرہلایا۔
"میں اسٹڈی میں ہوں۔" وہ فوراً" ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ ثانیہ ایک بار پھر کافی کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ چند منٹ بعد وہ اپنی اور بازل کی کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے دھیمے قدموں سے چلتی اسٹڈی کے دروازے تک گئی۔ جہازی سائز میز کے دوسری طرف رکھی آفس چیئر پہ بیٹھا بازل اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے جھجکتے ہوئے قدم اندر بڑھائے۔
"بیٹھو۔ اگر کوئی اور کام نہیں تو کافی ساتھ پیتے ہیں۔" کافی کا مگ میز پہ رکھ کر وہ واپس پلٹ رہی تھی کہ بازل بے اختیار بولا۔ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی پر کوئی بدمزگی نہ ہو اس لیے بہانہ بھی کچھ مناسب ہونا چاہیے تھا۔
"پتا نہیں تمہارے ساتھ ایسی سچویشن کبھی ہوئی ہے یا نہیں کہ غضب کی پیاس ہو اور سامنے رکھا شیریں پانی پینے کو لب ترس رہے ہوں پر خود پہ ضبط کرتے ہوئے اس آگ میں جھلستے رہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی بازل نے کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ثانیہ حیرت اور ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"ظاہر ہے ایسی حالت میں کون بے وقوف صبر کرتا ہے۔ مجھے پیاس لگی ہو اور پانی سامنے ہو تو میں بھلا کیوں چھوڑوں گی۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ واپسی کا قصد کیا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ اسے اپنی کلائی پہ بازل کے ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی۔ وہ سرتاپا کانپ گئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ فرش پہ گر کر چکنا چور ہوا تھا۔
"میں بھی کچھ ایسا ہی کرنا چاہتا تھا۔ ایک بار چھو کر بار بار چھونے کی تمنا پہ زنجیریں باندھتے ہوئے میرے اندر بھی آگ لگی ہے ثانیہ۔" اسے اپنی سمت دھکیلتے بازل نے اس کے سراپے کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ ثانیہ کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئی تھیں۔
"کیا بدتمیزی ہے یہ' چھوڑیں میرا ہاتھ بازل بھائی۔" بازل کو پرے دھکیلتے ثانیہ نے پوری طاقت سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی پر وہ ناکام رہی۔
"تم نہیں جانتیں جب سے تمہیں دیکھا ہے' میرا چین و سکون غارت ہوگیا ہے۔ بہت کوشش کی ہے خود پہ قابو رکھنے کی پر تمہیں حاصل کرنے کی لگن اتنی زور آور ہے کہ مجھے خود پہ اختیار نہیں رہا۔" ثانیہ کی آنکھوں میں دیکھتے اس کا انداز اتنا بے خوف تھا کہ وہ لرز گئی۔ بدن میں اس پل کاٹو تو لہو نہ تھا۔
"کیسی چیپ باتیں کر رہے ہیں آپ....." کانپتے لبوں سے وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی۔ بازل نے اب بھی اس کی کلائی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ ثانیہ مسلسل اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی تگ و دو میں لگی تھی۔
"اس میں چیپ کیا ہے؟ محبت کرتا ہوں تم سے۔ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی کیا رکھا ہے اس ٹٹ پونجیے میں؟" اس کے کان کے بالکل پاس سرگوشی کرتے ہوئے بازل نے سفاکی سے کہا۔
"چھوڑ دو اسے ... ٹرسٹ می۔ تمہیں ملکہ بنا کر رکھوں گا۔ دو جہاں کی خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا کہ دنیا رشک کرے گی تم پر۔" اس بار ثانیہ خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے نفرت سے اسے خود سے پرے دھکیلا۔
"مجھ سے ایسی گھٹیا اور گری ہوئی بات کرتے آپ کو شرم نہیں آئی۔" اسے یقین تھا' بازل کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ وہ اب تک شاک کی کیفیت میں تھی۔ بازل اسے اپنی دولت سے متاثر کرنے کی ناکام

کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے کیا بتاتی کہ محبت دولت کے انبار کی شرط پہ نہیں کی جا سکتی۔ یہ دل سے روح کا رشتہ ہے۔

"محبت میں شرم کیسی؟ یہ جو مجنوں، رانجھا، فرہاد کی فرضی داستانوں پہ لوگ مر مٹ جاتے ہیں نا... ان سے کہیں بڑھ کر میرے دل میں تمہاری محبت ہے۔" بازل نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ ثانیہ نے اسے دھکا مار کر خود سے پیچھے ہٹایا۔

"محبت اور ہوس میں فرق نظر نہیں آتا آپ کو؟" اسے اس کمرے سے، بازل کی دسترس سے نکلنا تھا "فوراً" سے پہلے اور وہ بے بسی سے لب کاٹتی راہ فرار کا سوچ رہی تھی۔ بازل کا مضبوط وجود دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے تو بس تم نظر آتی ہو... ہر گھڑی، ہر جگہ۔ اس وقت سے جب پہلی بار تمہیں سرخ جوڑے میں نور برساتے دیکھا تھا۔ چین لوٹ لیا تھا میرا تمہارے حسن نے۔ اپنے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں بھرتے وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ثانیہ نے زور سے چیخنا چاہا پر اس پہ خوف اس شدت سے حاوی تھا کہ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

"تم ہاں کہہ دو تو سویرا کو ابھی کے ابھی طلاق دے سکتا ہوں۔" اس نے جنونی انداز میں ثانیہ کو خود سے قریب کیا۔

"لعنت ہو تم پر، میری بہن تمہیں فرشتہ سمجھتی ہے لیکن تم تو... انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں ہو۔" ثانیہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے نکلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھے ثانیہ اس کمرے سے نکل کر سویرا کے پاس جانا چاہتی تھی۔

"بازل بختیار کو نہ سننے کی عادت نہیں ہے۔ جو میری نظروں میں سما جائے میں اسے کسی اور کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔" وہ غراتا ہوا اس کی طرف لپکا تھا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کیے بعد دیگرے اس کے چہرے پہ دو تین تھپڑ دے مارے۔

"گھٹیا انسان، تمہیں رشتوں کا تقدس پامال کرتے شرم نہیں آتی۔" اس کے گریبان کو نوچتے ہوئے وہ ہذیانی انداز میں چلائی اور اس کھینچا تانی میں بازل کی قمیض کے کئی بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہی اور یکدم بازل نے اسے زوردار تھپڑ مارتے ہوئے اپنا گریبان چھڑایا۔ اسٹڈی کے دروازے پہ کھڑی سویرا کو دیکھ کر اس نے "فوراً" پینترا بدلا تھا اور اپنی ہوس اور کم ظرفی کو جھوٹ کا لبادہ پہنا کر سارا الزام ثانیہ پہ ڈال دیا۔ سویرا نے ثانیہ کی ایک نہ سنی تھی اور اس سے اپنا ہر تعلق توڑ لیا تھا۔ اسے بازل پہ ثانیہ سے زیادہ اعتبار تھا۔

یہ سچ نہیں ہو سکتا، یقیناً "یہ کوئی خواب ہے۔ بہت بھیانک خواب ہے۔ لیکن نہیں۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یہ حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت۔ جھوٹ نے سچ پہ پردہ ڈال دیا تھا۔ چہرے پہ ندامت لیے اس نے خود پہ اٹھتی بازل کی فاتحانہ نگاہوں کو دیکھا تھا۔

بستر پہ چت لیٹی چھت کو گھورتی ثانیہ نے بے آواز آنسو بہاتے بے بسی سے آنکھیں موند لی تھیں۔ کاش وہ اس رات کی صبح نہ دیکھ پائے۔ دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

ایہا نے آدھی رات کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے رضا حیدر کی گاڑی پورچ سے نکلتے دیکھی۔ اسے حیرت اور پریشانی نے آگھیرا تھا۔ برسوں سے وہ رضا حیدر کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ صبح خیز تھے اور جلد سونے کے عادی تھے۔ ثانیہ آج رات سویرا کی طرف رک گئی تھی، یہ بات بھی ایہا کے علم میں تھی۔

"کہیں کوئی ایمرجنسی نہ ہو گئی ہو۔ میں کال کر کے پتا کرتی ہوں۔" ایہا نے تبسم کو بتانا ضروری سمجھا تھا۔ وہ "فوراً" ہی کال ملانے لگی تھیں۔

"میرا خیال ہے، تھوڑی دیر انتظار کر لیتے ہیں امی،

ہو سکتا ہے تایا ابو کسی بہت ضروری کام سے نکلے ہوں۔" ایہا نے انہیں کال کرنے سے روک دیا تھا۔ مبین حیدر سوچکے تھے ورنہ زیادہ بہتر تو یہی تھا کہ وہ خود بھائی سے معلوم کرتے۔ تبسم بھی اس کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ ایہا کا ذہن خاصا منتشر تھا۔

"جو بھی ہے، صبح پتا چل ہی جائے گا۔" جب سوچ سوچ کر ذہن تھک گیا پر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو خود کو تسلی دیتی بستر پہ لیٹ گئی پر نیند کو تو جیسے آج آنکھوں سے عداوت ہو گئی تھی۔ باہر سڑک پہ رکنے والی گاڑی کی ہیڈلائٹس کھڑکی کے پردے سے چھن چھن کر تاریک کمرے کو روشن کر رہی تھیں اور وہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ یہ گاڑی رضا حیدر کی ہی ہے۔ یقیناً" ان کی واپسی ہو چکی تھی۔ وہ لپک کر بستر سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اوپر کی منزل پہ بنے ایہا کے کمرے سے رضا حیدر کے گھر کا پورچ صاف نظر آتا تھا۔ گاڑی سے ثانیہ اور رضا حیدر کو اترتے دیکھ کر ایہا کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پورچ کی زرد روشنی میں ثانیہ کا اترا ہوا چہرہ اور رضا حیدر کا تھکا تھکا انداز..... وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی نیچے اتری تھی۔ اس بار تبسم کو کچھ بھی بتانے کی بجائے وہ خود اندرونی دروازے سے ثانیہ کے گھر میں داخل ہوئی۔ اب تو اسے واقعی تشویش ہو رہی تھی کہ آخر اتنی رات کو ثانیہ گھر واپس کیوں چلی آئی۔ لاؤنج کا دروازہ کھلا تھا اور ثانیہ اندر جانے کے بجائے وہیں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اندر سے فاخرہ اور رضا حیدر کے بولنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں جو بات کر رہے تھے اس نے ایہا کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ چپ چاپ پورچ کے ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے سارا قصہ سنا اور پھر دبے قدموں واپس پلٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو آج اور ابھی ہم دونوں میں سے کسی ایک کو چننا ہو گا۔" وہ بے تحاشا رو رہی تھی لیکن فاخرہ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں بازل اس کا زبردست انداز میں برین واش کر چکا تھا۔ فاخرہ نے جتنا سمجھایا، نتیجہ صفر نکلا۔

"مجھے آپ کی قیاس آرائی نہیں سننی۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے۔ اب کسی دلیل کی گنجائش کہاں بچتی ہے۔" وہ اسے کیا سمجھاتیں کہ خود جانتی تھیں وہ اس وقت اپنی نہیں بازل کی آنکھوں سے دیکھ اور سمجھ رہی ہے۔ انہوں نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔

"وہ اس وقت کسی کی کوئی بھی بات نہیں سنے گی۔ بہتر ہے اسے تھوڑا وقت دو سوچنے اور سمجھنے کے لیے۔ وہ ثانیہ سے بہت بدگمان ہے۔" رضا حیدر کے نزدیک فی الوقت اس مسئلے کا یہی حل تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے تمام پہلوؤں پہ غور کر رہے تھے۔

"ثانیہ کی شادی تک بالکل خاموش رہو۔ سویرا کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیں گے۔ اچھا ہے یہ شادی کے بعد ساحر کے ساتھ لندن جا رہی ہے۔ سویرا جب ٹھنڈے دماغ سے ساری باتوں پہ غور کرے گی تو خود ہی صحیح اور غلط کا فرق سمجھ جائے گی۔" رضا حیدر نے راز دارانہ انداز میں سمجھایا۔ روز گھر میں رشتے داروں کا آنا جانا تھا، ایسی حالت میں اس بات کی کسی کو ہوا لگنا بھی کئی مسائل کو جنم دے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہاں سے محبتوں کا زوال ہوتا ہے

"یہ چوٹ کہاں سے لگی؟" مہمانوں کی آمد متوقع تھی پر ساحر کا اچانک بغیر بتائے گھر چلے آنا فاخرہ کو حواس باختہ کر گیا تھا۔ وہ فاخرہ سے سلام دعا کے بعد ان کے لاکھ بہانوں کے باوجود سیدھا ثانیہ کے کمرے میں گیا تھا۔ کل رات سے وہ اپنے کمرے میں تھی۔ چوٹ کتنی اور کہاں لگی تھی، یہ کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ جسم سے زیادہ اذیت روح جھیل رہی تھی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ زخم مزید نمایاں ہو گئے

تھے۔ کیونکہ کسی نے ان پر مرہم نہیں لگایا تھا۔

"گر گئی تھی۔" ساحر کی طرف دیکھے بغیر اس نے وہ کہا جو فاخرہ نے تاکید کی تھی۔ انہوں نے اسے اپنی قسم دے کر کہا تھا کہ کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگے۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" وہ بالکل سامنے بیٹھا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"جھوٹ کیوں بولوں گی؟" لہجہ بے تاثر تھا۔

"سوال کا جواب سوال نہیں ہوتا ثانیہ!" وہ فی الفور بولا۔

"اس سے پہلے تو تمہیں کبھی میرے سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" اس نے سر اٹھایا۔ آنکھوں کی سوجن اور لالی ساحر کو مزید الجھا گئی تھی۔

"اس سے پہلے ہمارا تعلق الجھنوں کے سراب میں بھٹکا بھی تو نہیں تھا۔" ساحر کا لہجہ ترش تھا۔ یہ وہ ساحر نہیں تھا جسے ثانیہ اتنے سالوں سے جانتی تھی۔

"تو سوال تعلق پہ آن پہنچا ہے۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"جب سچ کو جھوٹ کی چادر اڑھانے کی کوشش کی جائے' وہاں تعلق سوال ہی بن جاتے ہیں۔" وہ گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا ثانیہ نے نظریں جھکالیں۔

"میری ایک بات یاد رکھنا ثانیہ۔ انسان سیڑھیوں سے گر جائے تو اٹھ کر کھڑا ہو سکتا ہے مگر کسی کی نظروں سے گر کر اٹھنا ممکن نہیں۔" اس کا تنبیہی انداز ثانیہ کو اپنے رشتے کی کمزوری کا احساس دلا رہا تھا۔ لیکن وہ ساحر کے اندر ہو رہی جنگ سے بے خبر تھی۔

ایبہا کو قدرت نے یہ سنہری موقع دیا تھا۔ ترپ کا پتا اس کی جھولی میں گرا تھا تو وہ اسے اپنے حق میں کیوں نہ استعمال کرتی۔ صبح اس نے ساحر کو فون کر کے ثانیہ اور بازل کے متعلق ہر بات بتادی تھی لیکن سارا الزام ثانیہ کے کھاتے میں ڈال کر۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم ایبہا؟ اگر یہ مذاق ہے تو انتہائی بھونڈا مذاق ہے۔" ساحر کا دل ہرگز اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

"میرے ساتھ مذاق والا تعلق کبھی نہیں رکھا آپ نے۔ لیکن ظاہر سی بات ہے آپ کو بھلا میری کسی بات پہ یقین کیوں آئے گا۔" ثانیہ کے چہرے پہ لگے زخم ایبہا کی باتوں کی تصدیق کر گئے تھے۔ اس پہ ثانیہ کا جھوٹ اور بکھرا ہوا وجود اس کو بے موت مار رہا تھا۔ دل میں لاکھ بدگمانی سہی پر وہ ثانیہ کو صفائی کا موقع دینا چاہتا تھا۔

"اتنا ہی اعتبار ہے مجھ پر ساحر! یہی تھی تمہاری چاہت کی انتہا' وہ عمر بھر ساتھ نبھانے کے وعدے' وہ ہر مشکل میں ساتھ دینے کی قسمیں... بس! پہلی آزمائش پہ ہار مان لی۔" ثانیہ کے لیے ساحر کے اعتبار میں پڑی یہ دراڑ کل رات بازل کی کمینگی سے زیادہ تکلیف کا باعث تھی۔

"لفاظی بہت کرلی ثانیہ! اب ذرا کچھ حقائق پہ بات ہو جائے۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں بولا۔

"مجھے کٹہرے میں کھڑا کرنے سے پہلے تم فیصلہ کر چکے ہو ساحر۔ دل میں بدگمانی کی گرہ باندھ کر گھر سے نکلے ہو۔ میرا کوئی جواب تمہیں مطمئن نہیں کر سکتا۔" یہ تضحیک ناقابل برداشت تھی۔

"پر میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔" دل کے رشتوں کو صفائیاں درکار نہیں ہوتی ہیں۔

"میں صفائی دینے کے لیے تیار نہیں۔ تم نے محبت کو شک کے دائرے میں کھڑا کر کے بہت ارزاں کر دیا پر مجھے اس کی یہ توہین قبول نہیں۔" وہ اس گمان سے نکل چکی تھی کہ پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود فقط ایک شخص اسے بنا کسی سوال و جواب معتبر سمجھتا ہے۔ ساحر غصے سے اٹھ کر چلا گیا تھا جبکہ ثانیہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

محبت کی پہلی شرط اعتبار ہوتی ہے اور ساحر یہیں ناکام ہو گیا تھا۔ جلتی پہ تیل کا کام رشدہ کی باتوں نے کیا تھا۔ ایبہا کی جھوٹی داستان مرچ مسالے لگا کر سننے کے

بعد کون سی ماں ایک بد کردار لڑکی کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کرتی ہے۔ وہ بھی ایسی لڑکی جو دولت کے لالچ میں اپنی ہی سگی بہن کا گھر کو برباد کرنا چاہے۔ ساحر کا شادی سے انکار اس کا تنہا فیصلہ نہیں تھا۔ رشدہ اس میں برابر کی شریک تھیں۔

رضا حیدر اور فاخرہ کے لیے یہ خبر کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ وہ دونوں ساحر کو سمجھانے گھر پہنچے پر وہ اور رشدہ ان کی کسی صفائی پہ اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

شادی سے چند دن پہلے رشتہ ٹوٹنا بدنامی کا ایک نیا در کھول گیا تھا۔ صور پھونکے بنا قیامت آگئی تھی۔ ثانیہ پے در پے ملنے والے درد سہتی پتھر بنتی جا رہی تھی۔ آنے والی خوب صورت زندگی اپنے محبوب کے سنگ بتانے کا خواب آنکھوں میں ٹوٹ کر انہیں لہولہان کر چکا تھا۔ یہ اذیت اور بدنامی جو اس کا مقدر ٹھہری تھی اس کی قوت برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی وہ خاموش تھی۔ ایک بھی آنسو بہائے بغیر اس نے فاخرہ کے آنسو پونچھے تھے۔ رضا حیدر کو دلاسے دیے تھے۔ وہ دونوں نازک مزاج، شوخ اور شرارتی ثانیہ کے اس روپ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ ان دونوں کو کسی بچے کی طرح سنبھال رہی تھی پر کب تک.... اعصاب شل تھے اور اس پہ ستم ساحر کی شادی کی خبر، اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رشدہ کو اندر ہی اندر ایک بات کھائے جا رہی تھی کہیں ساحر اب ثانیہ کے غم کو سینے سے لگا کر تمام عمر یونہی تنہا نہ بتا دے۔ وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اگر بنا شادی کے لندن واپس چلا گیا تو شاید کبھی رشدہ کو اس کی خوشی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ وہ اسے تنہا رہ کر ثانیہ کی بے وفائی کے غم میں ہلکان ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یہ وقت سوچنے کا نہیں عمل کرنے کا تھا۔ انہیں کچھ بھی کر کے ساحر کو شادی کے لیے راضی کرنا تھا۔ لڑکی ان کی نظر میں پہلے ہی تھی۔

اتنا تو خوب جانتی تھیں، چند سال پہلے تبسم کا رجحان بھی ایبہا اور ساحر کے رشتے میں تھا پر جب رشدہ نے ثانیہ کے لیے دامن پھیلایا تو وہ پیچھے ہو گئیں۔ ایبہا کی کون سی کہیں بات چیت چل رہی تھی جو وہ رشتہ مانگنے میں جھجک محسوس کرتیں۔ اپنی فریاد لے کر پہنچ گئیں بھائی کے دروازے پہ۔ مبین حیدر کو بہن کا یہ فیصلہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا لہٰذا صاف لفظوں میں معذرت کر لی البتہ تبسم کچھ جز بز سی دکھائی دی تھیں پر خاوند کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رشدہ مایوس لوٹی تھیں۔ وہ تو دل میں پکا ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ بیٹے کی شادی اسی تاریخ پہ ہو گی پھر چاہے خونی رشتوں کا بھرم ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ایبہا تک انکار کی خبر پہنچ چکی تھی۔ وہ فوراً "ماں کے پاس گئی۔

"ہاں بولو۔" تبسم کو حیرت ہوئی۔

"بابا سے کہیں، وہ پھوپھو کو میرے رشتے کے لیے ہاں کر دیں۔" انداز دوٹوک تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو ایبہا! عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا؟" تبسم کو شاک لگا تھا۔

"اس میں مضائقہ ہی کیا ہے امی! پھوپھو خود رشتہ لے کر آئی ہیں تو آپ کو کس بات پہ اعتراض ہے۔ ویسے بھی یہ تو آپ کی بھی خواہش تھی۔"

"ہاں تھی میری بھی خواہش لیکن اب حالات کچھ اور ہیں۔" مبین حیدر کا خوف نہ ہوتا تو وہ اسی وقت ہاں کر دیتیں۔ پر اپنے شوہر کی باتیں سن کر وہ بھی اس رشتے پہ فاتحہ پڑھ چکی تھیں۔

"حالات کچھ بھی ہوں، مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں شادی کروں گی تو صرف ساحر سے، ورنہ اس کے بعد میرے لیے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈنے کی زحمت مت کیجیے گا۔" وہ بغاوت پہ اتر آئی تھی۔

"تمہارے بابا کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ کبھی اپنے بھائی سے یہ دشمنی مول نہیں لیں گے۔ ویسے بھی دیوار سے دیوار جڑی ہے اور ان کے گھر خبر پہنچی تو کہرام

مچ جائے گا۔" تبسم نے مبین حیدر کی بات دہرائی۔

"میں کسی کہرام سے نہیں ڈرتی۔ اگر آپ نے بابا سے بات نہ کی تو میں خود کہہ دوں گی۔ کہہ دیجئے گا انہیں بیٹی کی خوشیاں زیادہ عزیز ہیں یا بھائی سے رشتہ نبھانا۔"

اپنی اندھی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ اگر دوست کی پیٹھ میں چھری گھونپ سکتی تھی تو باپ کا سر بھائی کے سامنے جھکانا کون سا مشکل تھا۔ ایمہا کی ضد کے سامنے مبین حیدر کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تبسم کی مکمل سپورٹ بھی اس کے ساتھ تھی۔

رشدہ تک یہ خبر پہنچی تو جیسے دل کی مراد بر آئی۔ پر اگلا مرحلہ ساحر کو منانے کا تھا جو واپسی کے لیے پر تول رہا تھا۔ رشدہ کی بات سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ دل میں ثانیہ کے لیے لاکھ بدگمانیاں سہی پر ایسے کیسے محض چند دنوں میں اس کی شبیہہ دل سے نکال کر کسی اور کو وہاں بسا لیتا۔ رشدہ اس ردعمل کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔ اپنی بیوگی اور ممتا کے واسطے دے کر اسے زبردست طریقے سے جذباتی بلیک میل کرنے کے بعد بالآخر ایمہا سے شادی کے لیے رضامند کر لیا تھا۔ تین دن بعد سادگی سے نکاح کر کے وہ ایمہا کو رخصت کروا لائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اس لڑکی کی ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے پہ بہتان لگانے کی۔" ثمینہ نے تمکنت سے کہا۔ سویرا سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی جبکہ دوسری طرف بازل انتہائی مطمئن تھا۔ وہ دو دن پہلے امریکہ سے واپس آئی تھیں۔ ماحول کی کشیدگی اور سویرا کے میکے کی طرف سے خاموشی' ان کا ماتھا ٹھنکا تھا اور جب اندر کی بات معلوم ہوئی جو کہ ظاہر ہے بیٹے کی زبانی جھوٹ ہی تھا۔ ثمینہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"اس جیسی بیسیوں گھومتی ہیں اس کے ارد گرد مگر میرے بیٹے نے کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا کیونکہ وہ اپنی نگاہ کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔" ثمینہ کے انداز میں مان تھا۔

(ان میں سے کوئی ثانیہ رضا نہیں تھی نا)۔ ضمیر پہ چوٹ پڑی تو اس نے خود کو توجیہہ دی۔

"میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس نے تم سے شادی کی۔" دوسری طرف بیٹھے بازل نے پہلو بدلا۔

(اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی)۔ یہ اعتراف وہ خود سے بیسیوں بار کر چکا تھا۔ جب بھی ثانیہ کو دیکھتا۔ جب بھی اس کے متعلق سوچتا' وہ جھنجلا کر فقط ایک بات سوچتا تھا۔

"غضب خدا کا ہمارے ہی گھر میں وہ ہماری عزت اچھال رہی تھی۔ ہم ہی پہ تہمت لگانا چاہی۔" ثمینہ کی برداشت سے باہر تھا یہ سب۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے سویرا کا انتخاب کیا تھا۔ بازل کی شخصیت کے سامنے سویرا دب سی گئی تھی۔

"چھوڑیں ممی! یہ مڈل کلاس لڑکیوں کی مینٹیلیٹی ہوتی ہے۔" وہ اس سب لیکچر سے بور ہو رہا تھا۔ سویرا نے شرمندگی سے لب کاٹا۔

"ایک بات تو طے ہے سویرا! اگر تمہیں تھوڑی سی بھی اپنے خاوند اور اس کی عزت کی پرواہ ہے تم اب اپنی بہن سے کوئی واسطہ نہیں رکھو گی۔" ثمینہ نے جو بات غصے اور جذبات میں کہی وہی بات بازل اسے محبت کے جھانسے میں سمجھا چکا تھا۔

(یہ مائیں بھی نا کتنی خوش فہم ہوتی ہیں۔ اولاد پہ اندھا اعتبار کرتی ہیں۔ محبت اور جذبات کی پٹی آنکھوں پہ باندھ کر وہ نہایت آسانی سے ان کا ہر مسئلہ حل کر دیتی ہیں) ریموٹ کنٹرول سے چینل بدلتے بازل نے سوچا اور پھر سر جھٹک کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ مضطرب سے ایئرپورٹ پہنچے تھے۔ ویٹنگ ایریا میں کھڑے ایک ایک پل صدیوں پہ محیط تھا۔ اور پھر وہ نظر آیا۔ سنجیدہ اور پروقار۔ جسے اپنے پیروں پہ چلتا دیکھنے کی خواہش چند ماہ پہلے ماند پڑنے لگی تھی۔ جس

کے نامراد دل نے وجود کو ایک طویل مدت تک وہیل چیئر کا محتاج رکھا تھا' سالوں بعد اسے اپنے پیروں پہ چلتے دیکھنا ماں باپ کے لیے اتنا ہی خوش کن لمحہ ہوتا ہے' جب بچہ اپنی پیدائش کے بعد پہلا مکمل قدم اٹھاتا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا وہ اپنے علاج میں مکمل تعاون کرے گا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے اس تک پہنچے تھے۔ یاور حیات اور فہمینہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئے تھے۔ ان دونوں کے لیے آنسوؤں پہ بند باندھنا دشوار تھا۔ دلاور خان بھی پاس کھڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ پرندے کی پہلی اڑان کی خوشی مناتے وہ تینوں اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ایک وہ تعلق تھا جو مایوسی دے گیا تھا اور ایک یہ تعلق ہے جس کی بدولت وہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ گو آنکھوں میں اب بھی اداسی تھی پر وہ دھیما سا مسکرایا تھا۔ آج زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جو کچھ ہوا' اسے برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ' زندگی کی تلخیاں ہمیں تجربہ دیتی ہیں' مضبوط کرتی ہیں۔ ان سے سبق لے کر آگے چلنا سیکھو۔"

یہ رضا حیدر تھے جو اس کے بالوں کو سہلاتے ہمیشہ کی طرح اسے امید اور حوصلہ دے رہے تھے۔ آج تین دن بعد وہ مکمل ہوش میں آئی تھی۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اور چہرے پہ چھائی مردنی دیکھ کر کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہ ثانیہ ہے۔ جس کا چہرہ گلاب کے پھول کی مانند ترو تازہ رہتا تھا۔ جس کے دامن میں خوشیوں کے انبار بن مانگے بھرے ہوئے تھے۔ پاس ہی فاخرہ بیٹھی تھیں اس پہ آیات کا ورد کرتی وقفے وقفے سے پھونک مار رہی تھیں۔ بری نظر جو لگ گئی تھی اسے۔ پل بھر میں سب جل کر خاک سیاہ ہو گیا تھا۔ فاخرہ تو اس وقت کو کوس رہی تھیں جب انہوں نے ساحر کو سچ بتانے سے منع کیا تھا۔ نہ وہ ثانیہ کو اپنی قسم دیتیں' نہ ساحر اس درجہ بدگمان ہوتا۔ آج ثانیہ اس کرب سے گزر رہی تھی تو انہیں اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بابا۔" وہ بمشکل کہہ پائی تھی۔ چہرہ لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا پر ماں باپ کے چہرے کی مایوسی کیسے برداشت کرتی۔ وہ دونوں پہلے ہی سویرا کی وجہ سے شدید پریشان تھے۔ وہ انہیں مزید دکھی نہیں کر سکتی تھی۔ تین دن سے وہ دونوں ہی اسپتال میں تھے۔ ایک وقت تھا ثانیہ کو سوئی چبھ جاتی تو سب لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ موت و حیات کی کشمکش سے گزری پر کوئی پوچھنے نہیں آیا۔ سچ ہے دنیا میں بس اک ماں باپ کا تعلق ہی اتنا بے لوث ہوتا ہے۔ جو برے سے برے حالات میں بھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑتے۔

اس کی طبیعت میں بہتری دیکھ کر دو دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ وہی گھر تھا' وہی کمرہ لیکن اداسی اور وحشت سے گھرا تھا۔ جانتی تھی یہ دل کی کیفیت ہے اور وہ خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اپنے لیے نہیں اپنے والدین کے لیے۔ وہ انہیں کوئی خوشی نہیں دے پائی تھی مگر انجانے میں ان کے لیے دکھ کا موجب ضرور بن گئی تھی۔ ایک طرف سویرا کی ناراضی مسلسل تھی تو دوسری طرف بھائی اور بہن بھی چھوٹ گئے تھے۔ اتنے بہت سے رشتوں کا بھرم ٹوٹتے دیکھنا بڑا جو کھم تھا جو فاخرہ اور رضا حیدر اس عمر میں خاموشی سے سہہ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

جذبہ کوئی بھی ہو' اس کی شدت کا نتیجہ مثبت نہیں ہوتا ہے۔ محبت ہو یا نفرت' شدت جذبات کی پٹی آنکھوں پہ بندھ جائے تو انسان کو نہ تو کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی اور وہ تو بیک وقت یہ دونوں جذبات اپنے اندر سموئے خود کو اذیت دے رہی تھی۔

"وہ بہت بدل گئے ہیں پھوپھو۔" اس کا حد درجہ خود کو نظر انداز کرنا تکلیف دیتا تھا۔

"اس کا غم ابھی نیا ہے۔ اسے کچھ وقت دیتا' وہ

ٹھیک ہو جائے گا ایبہا۔" رشدہ ان دونوں کو ہی سمجھا رہی تھیں۔ بیٹے کی خاموشی ان کے دل پہ بھی نشتر چلاتی تھی لیکن جانتی تھیں ایک بار اس کا دھیان ایبہا کی طرف لگ گیا تو وہ ماضی کو فراموش کر دے گا۔

شادی کے فوراً" بعد ساحر کی خاموشی اور ایبہا سے احتراز برتنا اس کے دل میں کانٹے چبھوتا تھا۔ وہ جس نے اپنی پوری عمر اس ایک شخص کی الفت کی نذر کر دی۔ اپنی دوستی وار کر ثانیہ کا اعتبار ہار کر پایا تھا اسے پر وہ نادان تھی جو یہ سمجھتی تھی ثانیہ سے بدول کر کے اس کے خلاف زہر بھر کر وہ ساحر کے دل سے اسے نکال دے گی۔ دل میں تو آج بھی اس کے ثانیہ ہی بسی تھی۔ کبھی اس کی چاہت پھولوں کی طرح مہکتی تھی تو آج اس کی بے وفائی کانٹا بن کر سینے میں چبھ رہی تھی پر تھی تو وہ آج بھی اس کے دل میں ہی نا۔ رشدہ کے دلاسے اوائل دنوں میں اس کی ہمت بندھاتے تھے پر اب وہ اس سب سے اکتا گئی تھی۔ پاکستان میں تو سسرال کے ساتھ ساتھ میکے کی بھی سپورٹ تھی پر جب سے وہ لندن آئی تھی تنہائی کاٹتی تھی۔ ساحر کے پاس اس کے لیے فرصت نہ تھی اور ایبہا کے پاس تو جیسے فرصت ہی فرصت تھی۔ ایسے میں ہر وقت اپنا موازنہ ثانیہ سے کرتے رہنا اور بات بے بات ساحر سے الجھنا اس کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ وہ محبت سے اس کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام ہو گئی تھی تو جھگڑا کر کے اس کا دھیان اپنی جانب مبذول کرنے لگی۔ ہر لڑائی کے بعد اسے ثانیہ کی بے وفائی کا طعنہ دینا نہ بھولتی اور ساحر کے دل میں ثانیہ کے نام کی پھانس کچھ اور گہرائی میں اتر جاتی۔ زخم بھرتا بھی تو کیسے کہ ایبہا اپنے ڈپریشن میں ہر بار وہاں چرکے لگاتی۔ وہ اگر ثانیہ سے متنفر تھا تو ایبہا سے بھی نالاں رہتا۔

"وہ مجھے ثانیہ کے نام پہ ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی امی۔" رشدہ کے سمجھانے پہ وہ پھٹ پڑا تھا۔

"تم اسے توجہ نہیں دو گے، اس کا خیال نہیں رکھو گے تو شکوہ تو کرے گی نا وہ ساحر۔" رشدہ کی باتوں نے اسے دھیما کیا تھا۔ محبت کا قرینہ ایبہا جانتی تو کبھی ان دونوں کے درمیان بدگمانی کی یہ دیوار کھڑی نہ کرتی۔ وہ حاصل کے چکر میں الجھی اپنا وقار گنوا چکی تھی۔ پیار کو پانے کی غرض میں دوستی جیسے پاک رشتے میں نقب لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو اپنے وہ کاروباری دوست یاد ہیں جن سے ایک دو بار ڈنر پہ ملاقات ہوئی تھی۔" یاور حیات اسٹڈی میں بیٹھے پورے انہماک سے کتاب پڑھ رہے تھے۔ فہمینہ نے بنا کسی تمہید کے بات کا آغاز کیا۔

"بھئی میرے تو بہت سے دوست ہیں اور ان سے بارہا ڈنر پہ تمہاری بھی ملاقات ہو چکی ہے۔" یاور حیات نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر سوال کیا۔

"وہ شاید حسینی بھائی کے بزنس پارٹنر ہیں۔ ان ہی کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی بڑی پیاری سی بیٹی بھی ہے۔" فہمینہ نے ریفرنس دیا۔

"تم رضا حیدر کی بات کر رہی ہو؟" انہوں نے فوراً" پوچھ لیا۔

"جی جی وہی۔ ثانیہ! یہی نام تھا ان کی بیٹی کا۔ بڑی ہنس مکھ اور خوب صورت بچی تھی۔" فہمینہ کو نام بھی یاد آگیا تھا۔

"میں ارزق کے لیے کنسیڈر کر رہی تھی اسے۔" آسودگی اور امید کی کرن ملتے ہی خواہشات کی کونپلیں ہری ہو گئی تھیں۔

"ارزاق مان جائے گا؟" وہ یکدم چونکے تھے۔

"کیوں نہیں مانے گا۔ ساری زندگی ایسے تو نہیں گزارے گا۔ ویسے بھی اب وہ بدل گیا ہے۔ تھوڑا چپ چپ رہتا ہے لیکن دھیان بدلے گا تو یہ سب بھی ٹھیک ہو جائے گا ان شاءاللہ۔"

ارزق کی جسمانی حالت ہی نہیں اس کا مزاج بھی بدل رہا تھا۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں نہ صرف وہ جسمانی طور پر فٹ ہو چکا تھا بلکہ ذہنی طور پہ بھی بہتر ہوا تھا۔ آفس کی روٹین بھی سیٹ ہو گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ

اس کا سوشل سرکل بھی لوٹ آیا تھا۔ ایک وقت تھا وہ بہت ہنس مکھ اور شوخ تھا مگر اب سنجیدگی مزاج کا حصہ بن چکی تھی پر وہ اس فیز سے نکل آیا تھا جہاں آج سے تین ساڑھے تین سال پہلے کھڑا تھا۔

"فہمینہ! کسی کے گھر سوال لے کر جانے سے پہلے اپنے بیٹے کو مکمل اعتماد میں لے لینا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی عزت دار شخص کو ہماری وجہ سے خفت اٹھانی پڑے۔" یاور حیات نے تنبیہہ کی۔ ارزق میں لاکھ بدلاؤ آیا تھا پر وہ آج بھی **عیشل** کو بھولا نہیں تھا اور یہ بات یاور حیات ہی نہیں **فہمینہ** بھی اچھی طرح جانتی تھیں۔

"آپ بے فکر رہیں میں اسے راضی کر کے ہی یہ قدم اٹھاؤں گی۔ ابھی تو خیر یہ بھی نہیں معلوم اس بچی کی شادی نہ ہو گئی ہو۔" انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

☼ ☼ ☼

زندگی رکتی نہیں چلتی رہتی ہے، غم ہو یا خوشی پر جب تک سانس ہے جینا مجبوری ہے۔ وہ بھی ان نشیب و فراز سے گزر کر بالآخر سنبھل گئی تھی۔ مرتے دم تک ساتھ نبھانے کے وعدے پانی کے بلبلے کی طرح آزمائش کی آندھی میں تحلیل ہو گئے تھے۔ کبھی صبح کا آغاز جس کے نام سے ہوتا تھا جو دھڑکن کی طرح سینے میں دھڑکتا تھا، مہینوں ہوئے اسے بھول چکا تھا۔ شاید وہ تو اب اس کا نام بھی یاد نہ رکھنا چاہتا ہو۔ نفرت کرتا ہو اس سے۔ یہ باتیں، یہ سوچیں ثانیہ کا سکون غارت کرتی تھیں۔ دوسری طرف بہن کی بدگمانی اس کا دل جلاتی تھی۔ فاخرہ کے خاموش شکوے، وہ جب ان کی طرف دیکھتی ان کی آنکھوں میں مہینوں سے بیٹی کی صورت نہ دیکھنے کا کرب صاف نظر آتا اور ثانیہ کو اپنا آپ مجرم محسوس ہوتا۔ اب تو سویرا کی ڈلیوری کے دن بھی قریب تھے۔ فاخرہ اس سے کم ہی ذکر کرتیں پر اکثر وہ انہیں بابا کے ساتھ سویرا کے متعلق گفتگو کرتے سن چکی تھی۔ یہ تاسف بھی جان نہ چھوڑتا تھا کہ خون پانی سے بھی ہلکا نکلا۔

ان حالات میں ان تمام سوچوں سے فرار کا واحد راستہ جو ثانیہ کو نظر آ رہا تھا وہ خود کو حد درجہ مصروف رکھنا تھا۔ گھر بیٹھی رہتی تو مایوسی اور ڈپریشن مار ڈالتا۔ رشتے داروں کے سوال و جواب جینے نہ دیتے۔ حالانکہ یہاں جینا کون چاہتا تھا، پر یہی تو مجبوری تھی۔ ایم۔ فل کے داخلے شروع ہوئے تو اس نے بھی اپلائی کر دیا۔

آج وہ یونی ورسٹی سے تھکی ہاری واپس آ رہی تھی جب راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ گاڑی ایک طرف روک کر وہ تاسف سے لب بھینچے اس ناکارہ ٹائر کو دیکھ رہی تھی کہ اپنے عقب سے آتی مانوس آواز پہ چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

"ہیلو ثانیہ۔" سامنے وہ مسکراہٹ چہرے پہ سجائے کھڑا تھا۔

"وہ ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میں ڈرائیور کو کہتا ہوں، وہ بدل دے گا۔" انداز اتنا دوستانہ اور بے تکلف تھا جیسے برسوں کا گہرا تعلق ہو۔

"میں نے تم سے مدد نہیں مانگی۔" ثانیہ نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غرائی۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

"رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا۔" گرے سوٹ میں وہ دل جلانے کی حد تک ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں قیمتی رولیکس گھڑی، ڈیزائنر سن گلاسز اور جدید انداز میں تراشیدہ بالوں کو جیل سے جمائے وہ بہت مطمئن تھا۔ انتہائی پرسکون۔

"بکواس بند کرو۔" ثانیہ کی برداشت ختم ہو گئی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ لاک کیا اور وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"سنا ہے وہ تمہارے لور بوائے نے شادی کر لی۔ وہ بھی تمہاری **بیسٹ فرینڈ** سے۔" اس کے قدم من من کے ہو گئے تھے۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی، پر ایک قدم آگے بڑھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

"وہ محبت اور اعتبار کے دعووں کا کیا ہوا جن کی خاطر تم نے مجھے ٹھکرایا تھا۔" سینے پہ ہاتھ باندھے وہ

مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں خوف نہیں آتا؟" وہ پلٹی۔

"بازل بختیار کسی سے نہیں ڈرتا۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"اللہ سے بھی نہیں؟" یک دم بازل کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ لفظوں کا جادوگر اگلی بات کہنا بھول گیا۔

"میرے پاس اپنی بے گناہی کا ثبوت نہ سہی، پر میرا گواہ رب ہے۔ یاد رکھنا اس کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔" ثانیہ دو قدم آگے بڑھی۔ بازل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوف اور بنا جھجکے اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ اس کے چہرے کا ہر رنگ غائب ہو چکا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پہ ثانیہ نے اک حقارت بھری نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر تیزی سے چلتی سڑک پار گئی۔ سڑک پہ چلتی خالی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور لمحوں میں اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ بازل اب بھی خاموش اور سنجیدہ کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ممی! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"زیادتی تو تم کر رہے ہو۔ اپنے ساتھ اور ہم سب کے ساتھ۔" فہمینہ فیصلہ کر چکی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر اس کے پاس یہ مدعا لے کر آئی تھیں اور اس کے احتجاج کا مناسب جواب بھی ان کے پاس موجود تھا۔

"میں کیا کر رہا ہوں؟ آفس جانے لگا ہوں، دوستوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا ہے۔ ہنستا ہوں، بولتا ہوں۔ کھا پی رہا ہوں۔ اب کیا ضروری ہے کہ شادی بھی ابھی کے ابھی ہو جائے۔"

وہ بظاہر نارمل تھا لیکن اندر آج بھی کرب سانسیں لیتا تھا۔ پہلا پیار بھلانا اختیار میں نہ تھا۔ ایسے میں فہمینہ کی فرمائش کہ اب شادی کر لو کیونکہ لڑکی تو وہ پہلے ہی دیکھ چکی ہیں۔ اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

"اب نہیں تو کب؟ ساری زندگی اکیلے بسر نہیں ہوتی ارزق۔ اس لڑکی کو بھول کیوں نہیں جاتے تم؟" وہ ناراضی سے بولیں اور اپنی بات کے اختتام پہ جتا بھی دیا۔ یہ اس کی دکھتی رگ تھی جسے آج بھی دبانے سے ٹیسیں اٹھتی تھیں۔

"بھول چکا ہوں۔ اسے بھول چکا ہوں، پر ٹھکرائے جانے کی اذیت کو بھولنا میرے بس میں نہیں۔ اپنا اعتماد کھویا ہے میں نے ممی! تھوڑا سا تو وقت دیں کہ اس بکھرے ہوئے مان کو سمیٹ سکوں۔ کیا ڈالوں گا کسی کی جھولی میں جب اپنی ذات کھوکھلی ہو گی۔" وہ بے ساختہ بولا۔ اب یہ اعتراف تو ان کے سامنے کر نہیں سکتا تھا کہ وہ عشال کو اب بھی نہیں بھولا تھا۔

"تم کچھ مت کرنا۔ اس خلا کو وہ خود پُر کر دے گی۔ اسے موقع دینا ارزق۔ وہ تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دے گی۔" اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر انہوں نے سمجھایا۔ وہ لب بھینچے خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا۔ چہرہ بے تاثر تھا۔

دلاور خان کمرے میں داخل ہوا تو فہمینہ کی گفتگو سے ساری بات کا اندازہ بخوبی ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بہانہ بناتا دلاور خان نے مداخلت کی۔

"آپا! آپ بے فکر ہو کر رشتے کی بات چلائیں۔ اسے میں خود منا لوں گا۔ اب اس کا انکار نہیں سنیں گے ہم۔" وہ بہت سالوں سے اس کے قریب تھا اتنا تو حق رکھتا تھا۔ ارزق کے لفظوں کی طرح وہ اس کی خاموشی بھی سمجھتا تھا۔ ارزق نے گہری سانس لی پر بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف فہمینہ اب دلاور خان کے ساتھ اسے بھی اپنی پسند اور اس لڑکی کے خاندان کے متعلق بتا رہی تھیں۔ اس کا انکار اب پسپائی اختیار کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سویرا کو اللہ نے بیٹے جیسی نعمت سے نوازا تھا۔ ثمینہ کے تو پاؤں زمین پہ نہ ٹکتے تھے۔ وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ ایسے میں سویرا سے وہ جو تھوڑی سی رنجش ثانیہ کے حوالے سے دل میں موجود

تھی۔ ختم ہو چکی تھی۔ گھر میں شاندار پارٹی رکھی گئی تھی۔ عقیقہ کی بہت بڑی دعوت تھی۔ تمام ملنے والوں، دوستوں کو مدعو کیا گیا تھا سوائے سویرا کی فیملی کے۔ ثمینہ نے دوٹوک انداز میں انہیں دعوت دینے سے منع کردیا تھا۔ پے درپے کامیابیاں اور خوشیاں بازل بختیار کو ہٹ دھرم اور خود اعتماد بنائی جارہی تھیں۔ ثانیہ کے ساتھ جو بھی کیا۔ وہ اس پہ ہرگز نادم نہیں تھا۔

"پسند آیا؟" ہیرے جڑا قیمتی نیکلس دیکھ کر سویرا نہال ہو گئی تھی۔

"ہمم.... بہت۔" اس ڈیزائنر نیکلس کی چکا چوند چوندھی کچھ ایسی تھی وہ کچھ بول ہی نہیں پارہی تھی۔

"تم میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئی ہو۔ پروڈکشن شروع ہوتے ہی ملکی و غیر ملکی کمپنیوں کی طرف سے آرڈر کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اس وقت ہمارے یونٹ کے مقابلے میں نیشنل لیول کی ایک بھی کمپنی نہیں۔" وہ بہت کم اپنی ذاتیات اس سے شیئر کرتا تھا لیکن آج کل زندگی اس پہ مہربان تھی اور بھلے وہ چند دن پہلے ثانیہ کی خاطر اسے چھوڑ دینے کا دعوا کر رہا تھا مگر بیٹے کی پیدائش کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ وہ سب بھول چکا تھا۔

"اور یہ پیاری سی خوشی۔" بے بی کاٹ میں سوئے بیٹے کا ماتھا چوما۔

"سعد بازل بختیار۔" یہ نام اس نے ہی رکھا تھا۔

"بازل! ایک بات کہوں۔" اسے اتنا خوش دیکھ کر سویرا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بولو میری جان اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟" شرارت سے اس کے کھلے بالوں کو چھیڑنے لگا۔

"میں سوچ رہی تھی امی، ابو کو اطلاع دے دیتے تو وہ سعد کو دیکھنے آجاتے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ بازل نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔" اس کے ماتھے بل دیکھ کر سویرا گھبرا گئی تھی۔ وہ اتنا خوش تھا سویرا کو لگا شاید اتنے ماہ بعد اس کا غصہ بھی کم ہو گیا ہو۔

"کیا تم سب بھول چکی ہو؟" وہ غصے میں نہیں تھا پر ناراض تھا۔

"میں کچھ بھی نہیں بھولی میں تو صرف اتنا چاہتی تھی۔ کہ امی سے مل لیتی۔" وہ نظریں جھکائے بولی۔ اسے ثانیہ سے اب بھی شکایت تھی پر ماں، باپ تو اس کے بھی تھے۔ مہینوں سے اس نے ان کی خیریت نہیں پوچھی تھی، ان کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر تک ان تک نہیں پہنچائی تھی۔ اسے یاد آیا اس کی پریگنینسی کی خبر نے فاخرہ کو کیسا نہال کردیا تھا۔ کتنی فکر لگی رہتی تھی انہیں اس کی طبیعت کی۔ آج اگر وہ بھی اس خوشی میں شامل ہو جاتیں تو.... وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"یاد ہے انہوں نے مجھے کتنا ذلیل کیا تھا تمہاری اس چھوٹی بہن کی خاطر، جس نے لالچ میں اندھی ہو کر اپنی ہر حد پار کرلی تھی۔" بازل نے ملامتی انداز میں کہا۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے والی مسکراہٹ اور خوشی غائب ہو چکی تھی۔

"سوچتا ہوں اس وقت اگر تم بھی اپنے پیرنٹس کی طرح میرا ساتھ دینے کے بجائے اپنی بہن پہ یقین کرلیتیں تو۔" اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر وہ اب جذباتیت کا سہارا لے رہا تھا۔ سویرا کو احساس ہوا اس نے غلط وقت پہ غلط بات کہہ دی۔ اس کی وجہ سے بازل کا موڈ خراب ہو گیا۔

"سوسائٹی میں میرا ایک نام ہے، رتبہ ہے۔ میری کریڈیبلٹی ہے۔ اس لڑکی کی وجہ سے...." بازل نے لب بھینچے۔ سویرا کچھ اور نادم ہوئی تھی۔

"بازل! میں تو صرف اتنا چاہتی...." وہ صفائی دینا چاہتی تھی۔ بازل نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔

"ان لوگوں سے تعلق رکھنا یا انہیں چھوڑنا تمہارا اپنا فیصلہ تھا سویرا! اور آج بھی میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن...." وہ سنجیدگی سے کہتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انداز مایوسی والا تھا۔

"خیر جیسے تم بہتر سمجھو، کیونکہ میں نے اس وقت بھی تمہاری ہی خوشی چاہی تھی اور آج بھی مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔" اس نے مزید کہا اور کمرے

سے باہر نکل گیا۔ جانتا تھا سویرا اب پھر زبان پہ یہ بات نہیں لائے گی۔ وہ طریقے سے اسے کنوینس کر چکا تھا۔

بیڈ پہ بیٹھی سویرا نے ایک نظر کلٹ میں سوئے سعد پہ ڈالی اور پھر پاس پڑے بیش قیمت ڈیزائنر نیکلس کو دیکھا جو کمرے کی فینسی لائٹوں میں جگمگا رہا تھا۔ اس کی چمک آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

چند دن پہلے سویرا کے گھر بیٹے کی پیدائش کی اطلاع کسی ملنے والے کی معرفت رضا حیدر تک پہنچی تھی۔ فاخرہ اس دن سے بات بے بات رو رہی تھیں۔ ثانیہ خاموش تھی، جانتی تھی، ماں کو کون سا غم نڈھال کر رہا ہے۔ گھر میں ٹینشن کا ماحول بنا ہوا تھا، ایسے میں یاور حیات اور فہمینہ کے اکلوتے بیٹے ارزق حیات کے رشتے کا پیغام ان کی مایوس زندگی میں امید کی کرن بن کر آیا تھا۔ حسینی شاہ اور رضا حیدر بزنس پارٹنر تھے۔ فہمینہ نے ان ہی کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا۔ گو وہ انہیں ثانیہ کی منگنی اور شادی کینسل ہونے کی مختصر بات بتا چکے تھے۔ (ظاہر ہے اصل بات کا انہیں بھی اندازہ نہیں تھا۔) پر فہمینہ اور یاور حیات کو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ (ارزق کی منگنی بھی تو ٹوٹی تھی، شادی کینسل ہوئی تھی۔) فاخرہ نے بلا تامل ہاں کہہ دی تھی۔ رضا حیدر سے حسینی شاہ نے اس فیملی کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ انکار کی گنجائش تھی ہی نہیں، پھر بھی وہ ثانیہ کی مرضی چاہتے تھے لیکن فاخرہ اس کی پابند نہیں تھیں۔ (ایک بار ثانیہ کی شادی ہو جائے تو سویرا بھی ملنے لگے گی۔) محض چند روز میں رشتہ طے ہوا تھا اور منگنی وغیرہ کا تردّد کیے بغیر ڈائریکٹ شادی کی تاریخ طے کر لی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"امی پلیز، ابھی میری شادی کی بات مت کریں۔ میں ذہنی طور پہ تیار نہیں ہوں۔" اس کا احتجاج فطری تھا اور فاخرہ ذہنی طور پہ تیار تھیں۔

"کتنا وقت لگے گا ثانیہ! تمہارا ذہن بننے میں۔ کب تک اس کے دیے زخموں پہ روتی رہو گی۔" وہ رکھائی سے بولی تھیں۔

"میرے پاس رونے کے لیے کوئی ایک وجہ تھوڑی ہے۔" انداز اتنا شکست خوردہ تھا کہ فاخرہ کا غصہ بھی نرمی میں بدل گیا۔

"سویرا کی آنکھوں پہ بازل نے جھوٹ کی پٹی باندھ رکھی ہے، وہ بس اتنا ہی سمجھ رہی ہے جو...." ان کے دل و دماغ میں تو بس سویرا ہی سمائی تھی۔

"کوئی کسی کی آنکھیں بند نہیں کرتا امی۔ چند ماہ کے تعلق سے خونی رشتے بدل نہیں جاتے۔ سچ تو یہ ہے آپی کے دل میں میرے لیے بدگمانی نئی نہیں۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنی خوشیوں کی راہ میں دیوار سمجھتی رہی ہیں۔ آپ نے بھی تو اسی وجہ سے مجھے سامنے نہیں آنے دیا تھا۔ آپ کو ڈر تھا ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ لوگ مجھے منتخب کر لیتے۔" ثانیہ نے ان کی بات کاٹی۔ یہ وہ حقائق تھے جن پہ پچھلے کئی مہینوں سے ثانیہ سوچتی چلی آئی تھی۔

"ایسی بات نہیں میری جان، میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ سویرا بار بار انکار کی اذیت سے گزرتے ہوئے احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائے۔" فاخرہ نے صفائی دینا چاہی۔

"ہو جائے نہیں امی، آپی احساس کمتری کا شکار ہو چکی تھیں۔ اپنی بے شمار خوبیوں کو نظر انداز کر کے وہ فقط صورت کو سوچتی رہیں اور ایک نادیدہ مقابلے اور حسد میں مبتلا ہو گئیں۔ کوئی کسی سے اس کا نصیب نہیں چھین سکتا امی! شادی بیاہ مقدر کے فیصلے ہوتے ہیں اور جلد یا بدیر یہ وقت ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے، لیکن آپ کی طرح آپی نے بھی اس تاخیر کا الزام میرے سر ڈال دیا۔" ثانیہ کو ان کی صفائی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھی ان کی ہی بیٹی تھی اور سویرا کی ذہنی حالت اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں ہی صبر کھو چکی تھی۔ ہر وقت کے میرے تذکرے نے سویرا کے دل میں یہ گرہ باندھ دی۔ میں ہی اگر مقدر سے لڑنے کے

بجائے توکل سے کام لیتی تو آج سویرا کے دل میں بھی یہ منفی سوچیں نہ آتیں کہ اس کی بہن اس کا گھر برباد کرنا چاہتی ہے۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

ماں کو شرمندہ دیکھ کر وہ سر جھکائے لب کاٹنے لگی۔ کچھ نہ بولی۔

"لیکن ثانیہ..." کچھ توقف سے فاخرہ نے سلسلہ کلام پھر شروع کیا۔

"جو ہوا وہ بھی تو قسمت میں لکھا تھا۔ اب اس کو میرے لیے مزید آزمائش مت بناؤ میری جان۔ مجھ پہ نہیں تو اپنے بابا پہ ترس کھاؤ، ہم زبان دے چکے ہیں۔"

اس بار انداز التجائیہ تھا۔ ثانیہ کو انکار کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک بار وہ اس کی وجہ سے پہلے بھی رسوا ہو چکے تھے۔ اب دوبارہ انہیں شرمندہ کیسے ہونے دے۔

"امی... کیا وہ لوگ سب جانتے ہیں؟" اس کی خاموشی نے فاخرہ کو تسلی دی تھی۔ مطمئن سے انداز میں اٹھ کر وہ جانے لگیں پر ثانیہ کی آواز پہ قدم رک گئے۔

"بس اتنا کہ کچھ اختلافات تھے... اور..." وہ الجھیں جیسے سوچ رہی ہوں بتائیں یا نہ بتائیں۔

"اور؟" ثانیہ نے دہرایا۔

"اور یہ کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا۔" ثانیہ نے لب بھینچ لیے۔

"آپ وہی غلطی پھر سے دہرا رہی ہیں امی۔" اسے فاخرہ سے یہ توقع نہ تھی۔

"جھوٹ بول کر کبھی کسی کا بھلا نہیں ہوتا۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"وہ تو سچ بولنے سے بھی نہیں ہوگا۔" فاخرہ کا لہجہ سرد تھا۔ ثانیہ کے پاس جواب نہیں تھا۔ وہ جا چکی تھیں، مگر ثانیہ کتنی ہی دیر اپنے کمرے کی تنہائی میں گھٹنوں پہ سر رکھے خاموش بیٹھی رہی، جہاں آج بھی ہر طرف ساحر کی یادیں... بکھری ہوئی تھیں اور بہت جلد یہ یادیں اس سے چھٹنے والی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رات ہو چکی، پر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ منتشر ذہن، ٹوٹا ہوا دل اور مضطرب اعصاب... اسے سکون سے سوئے تو جانے کتنے زمانے بیت چکے تھے اور اب تو یہی رت جگے اس کا مقدر تھے۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور وہی نمبر ملانے لگی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے رضا حیدر کی کانٹیکٹ لسٹ سے نکالا تھا۔ ایک، دو، تین... جب چار بیلوں پر بھی کسی نے کال ریسیو نہ کی تو اس نے مایوسی سے کال ڈسکنیکٹ کر کے فون سائیڈ ٹیبل پہ واپس رکھ دیا۔ ٹھیک دو منٹ بعد اس کے فون کی بیل بجنے سے کمرے کی اداس خاموشی میں خلل پڑا تھا۔ اسکرین پہ چمکتا وہی نمبر دیکھ کر اس نے دھڑکتے دل سے کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو..." دوسری طرف سے فوراً" کہا گیا۔ انداز اجنبی اور کچھ کچھ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ یقیناً" کوئی بھی شریف انسان رات کے اس پہر کال کیے جانے پہ پریشان ہی ہو سکتا ہے۔

"میں ثانیہ بول رہی ہوں۔" اس نے بے تحاشا ہمت اور حوصلے کے بعد کہنا شروع کیا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔

"مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی تھیں، میں جانتی ہوں یہ وقت مناسب نہیں ہے پر..." وہ لب کاٹتے ہوئے بولی۔

"کہیے..." ارزق کا لہجہ سرد تھا۔

☆ ☆ ☆

نفاست سے سجا وسیع بیڈ روم خوب صورت سرخ و سفید پھولوں سے آراستہ تھا۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکتا کمرہ جس کے وسط میں بچھے آبنوسی پلنگ پہ ثانیہ بیٹھی تھی۔ گولڈن اور میرون کے خوب صورت امتزاج سے سجا کام دار شرارہ، میچنگ ڈائمنڈ جیولری اور اسٹائلش میک اپ میں اس کا کھلا کھلا روپ آفاق لگ رہا تھا۔ وہ حسین تھی اور اس ساری سج دھج کے بعد اور بھی حسین دکھ رہی تھی پر آنکھوں میں چھپا کرب اس حسین روپ کو گہنا رہا تھا۔ نہ تو یہ رشتہ

اس کی مرضی سے ہوا تھا' نہ ہی یہ شادی اس کی خواہش تھی۔ وہ کوئی اور زمانہ تھا جب ثانیہ کے دل میں امنگیں روشن تھیں۔ فاخرہ نے تو اس کے رشتہ ٹوٹنے کی گول مول وجہ بتا کر بات کو سنبھال لیا تھا' پر ثانیہ کو اپنی زندگی جھوٹ کی بنیاد پہ کھڑی نہیں کرنی تھی۔ اس نے ارزق کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ساحر سے لے کر بازل تک سب کچھ' سویرا کی بدگمانی سے ساحر کی بے یقینی تک' ہر سچ وہ اس رات ارزق سے کہہ چکی تھی۔ اس نے دو ٹوک اور واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس سچ کو جان کر اگر ارزق اس رشتے کو ختم کرنا چاہے تو اسے قطعا" کوئی شکایت نہ ہوگی۔ ارزق خاموش رہا تھا۔ وہ اس کی خاموشی سے کوئی بھی نتیجہ نہیں نکال پائی تھی۔ اس خاموشی کو معنی ارزق ہی دے سکتا تھا' کیونکہ آخری فیصلہ اسی کا تھا۔ پچھلے دو ہفتے اسی کشمکش میں گزرے تھے کہ اب ان لوگوں کی طرف سے رشتہ ختم کرنے کی خبر آجائے۔

قیمتی سیاہ شیروانی میں ملبوس وہ بہت روایتی لگ رہا تھا۔ سب سے منفرد' سب میں نمایاں۔ فہمینہ کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی۔ نکاح کے وقت دلاور خان جیسا مضبوط انسان بھی نم آنکھوں سے مسکرا رہا تھا۔ ثانیہ کی رخصتی سادگی سے ہوئی تھی' پر ولیمے کا فنکشن شان دار ہونا تھا۔ دھڑکتے دل سے اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ ان سب باتوں کے بعد ارزق کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا تھا' پر جب اس نے خود سے سوال

.وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ بے حد نارمل اور کمپوز جبکہ ثانیہ اب پہلے جیسی نروس نہیں تھی۔

وہ سوال کر رہا تھا' ثانیہ اسے اپنی زندگی کا ہر سچ بتا رہی تھی۔

(ہم سب زندگی میں کبھی نہ کبھی اسی پرخار رستے سے گزرتے ہیں۔)

"میں نے فیصلہ آپ پہ چھوڑا تھا۔ آپ چاہتے تو مجھے اس دو دھاری تلوار پہ چلنے سے بچا سکتے تھے۔" اس نے شکوہ کیا۔ ارزق چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکلا۔

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔" اس نے لب بھینچے۔

"مگر کیوں؟ ایک رشتہ ہی تو توڑنا تھا۔" پہلی بار ثانیہ نے اس کے وحشت زدہ چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ جیسے اندر ہی اندر کسی بڑے کرب سے گزر رہا تھا۔ ثانیہ اپنا غم جانتی تھی' پر اس کے کرب سے ناآشنا تھی۔

"اس تعلق میں فقط ہم دو لوگ انوالو نہیں ہیں اور میں عین وقت پہ انکار کرکے دو خاندانوں کی امیدیں چکناچور نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری بات... مجرم یوں اعتراف جرم نہیں کرتے۔ میں جانتا تھا آپ اس سب میں بے قصور ہیں

تو کیسے آپ کو اور آپ کی فیملی کو سزا دیتا۔" وہ مزید بولا اور ثانیہ کو باعزت بری کر گیا' اس جرم سے جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ وہ خود پہ لگے الزام سے رہائی پا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

آخری تاریخ کا چاند اپنی اداسی سمیٹ کر غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں عجیب سا سناٹا تھا۔ شہر سے میلوں دور اس ویران علاقے میں کھڑی پرشکوہ عمارت کے برقی قمقموں سے نکلتی دھندلی پیلی روشنی بھی اس فسوں کو توڑنے کی کوشش میں ہلکان تھی۔ یہ اور اس جیسی کتنی ہی عمارات اس صنعتی علاقے میں بکھری ہوئی تھیں' جن کے اندر ایک جہان آباد تھا۔

یہ کوالٹی کنٹرول ایریا تھا۔ متانت سے چلتا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں چند کمپیوٹرز اور فائلوں کا انبار تھا۔ دن کے وقت یہاں بہت سے کیمسٹ اپنے کوالٹی کنٹرول مینیجر کی رہنمائی میں مصروف نظر آتے تھے' مگر اس وقت یہ کمرہ خالی تھا۔ دس بجنے میں ابھی

چند منٹ باقی تھے۔ دھیمے قدموں سے چلتا وہ کمرے کے اندر داخل ہوا اور میز پہ رکھی اپنی مطلوبہ فائل اٹھاکر پڑھنے لگا۔ خودکار مشینیں اب بھی چل رہی تھیں۔ پروڈکشن سائیکل چوبیس گھنٹے جاری رہتا تھا۔ ایک شفٹ ختم ہوتی تو دوسری شفٹ شروع ہوجاتی۔ اچانک اس نے سر اٹھاکر تنقیدی نظروں سے شیشے کی دیوار کے پار فلنگ روم کا جائزہ لیا۔ مین وسل سے نکلتا دھواں معمول کے مطابق تھا۔ کیمیکل کی مخصوص بو تھی جو سارے ایریا میں پھیلی ہوئی تھی اور چند منٹ بعد آپ اس کے عادی ہوجاتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی اس وقت اس کلوز ماحول میں کچھ تھا جسے اس کا ذہن اب تک سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک انہونی کا احساس... کچھ غلط ہونے کا سگنل۔ سر جھٹک کر اس نے اپنا دھیان فائل کی طرف مرکوز کیا۔

بوائلر سے نکلتی امونیا کی تیز بو پروڈکشن میں شامل کیمیکلز کی مخصوص بو میں شامل ہو رہی تھی۔ امونیا کی بڑھتی ہوئی مقدار پورے یونٹ میں پھیل رہی تھی۔ اس نے حیرت اور پریشانی سے سر اٹھاکر ایک نظر وسلز سے نکلتے دھویں کی طرف دیکھا اور اگلے ہی پل تمام گتھیاں سلجھ چکی تھیں۔ اچانک سرخ بتی جلنے لگی۔ فائر ایگزٹ آن ہوچکے تھے۔

☼ ☼ ☼
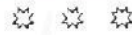
ایمسٹرڈیم جیسا رومانوی شہر محبت کرنے والوں کے لیے فردوس بریں ہے۔ پلوں پہ روشن برقی قمقموں کا عکس نہر کے پانیوں میں جگمگاتا پورے شہر کو سونے میں ڈھالتا، ہر شام سورج ڈھلنے کے بعد اس شہر کو جادوئی رنگ بخشتا ہے۔ آج شام بھی وہ فسوں بکھرا ہوا تھا، جب وہ دونوں نہر کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ نیلی جینز اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس وہ سنجیدہ اور پُروقار لگ رہا تھا۔ اس سے ایک قدم پیچھے سی گرین لباس پہ سیاہ لانگ کوٹ پہنے وہ اس کو نگاہوں میں رکھتی اس کے ساتھ ہوکر بھی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ دونوں ساتھ تھے پر اپنی اپنی سوچوں میں گم جس طرح ارزق نے یہ شادی فہمینہ کی خواہش اور بے حد اصرار پہ کرلی تھی بالکل اسی طرح وہ ان کے پلان کیے گئے ہنی مون ٹرپ پہ بھی ثانیہ کو ساتھ لے آیا تھا۔ شادی کے دو ہفتے بعد بھی ان کے درمیان ایک تکلف اور گریز قائم تھا۔ خاموشی کی دیوار تھی جسے گرانے کی سعی اگر ثانیہ نے نہیں کی تھی تو ارزق نے بھی اسے ٹوٹنے نہ دیا تھا۔

قدم قدم چلتے وہ دونوں پل تک جا پہنچے۔ اونچے آہنی جنگلے کا سہارا لے کر ثانیہ نہر میں جگمگاتی روشنیوں کا حسیں منظر دیکھنے لگی۔ اسے رکتا دیکھ کر وہ خود بھی وہیں رک گیا۔ ان سے نسبتاً" فاصلے پہ کھڑا ایک اطالوی جوڑا جنگلے سے ٹیک لگائے ان کی موجودگی سے یکسر انجان تھا۔ ان دونوں کی آواز خاموشی کی دیوار میں دراڑ ڈالتی تھی۔

"پتا نہیں لوگ محبت میں اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہیں۔" ارزق کا انداز خود کلامی والا تھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ثانیہ نے بنا پلٹے گردن گھماکر اس اطالوی جوڑے کی طرف دیکھا اور دوبارہ نظریں نہر کے سنہری پانی پہ مرکوز کرلیں۔

"اچھا خاصا دل کسی کے حوالے کرکے مفت میں دل کا درد لے لیتے ہیں۔" اس کی آواز میں کرچیاں تھیں۔ ثانیہ نے تائید کی، نہ تنقید۔ خاموشی ایک بار پھر طویل ہو رہی تھی۔ اطالوی جوڑا جا چکا تھا۔ وہ اب بھی نہر کی طرف نگاہ کیے کھڑی تھی اور ارزق اس کی پشت پہ جھولتے سیاہ بالوں کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ کیا ہے؟" ثانیہ کی آواز پہ چونک کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہیں اب بھی نہر کے طلسمی پانی پہ جمی تھیں۔ ارزق نے اس کی انگلی کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی۔ سطح آب پہ تیرتے روشنی کے کھٹولے دور بہت دور نظر آرہے تھے۔ ڈھلتی شام میں ان کی جھلملاہٹ ایک حسین سحر طاری کررہی تھی۔

"وہ..." ارزق بالکل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ثانیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔ خنک رات میں تاحد نگاہ پھیلے آسمان کی سیاہ چادر پہ بکھری ٹمٹماہٹ سے زیادہ روشن۔ ثانیہ کی مسکراہٹ پہلی بار آنکھوں تک پہنچنے کا وہ منظر اتنا دلکش تھا کہ

ارزق اگلی بات کہنا بھول کر ایک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی مسکراہٹ سمٹی اور اس نے چہرہ ایک بار پھر نہر کی طرف موڑ لیا۔

"وہ "کروز" ہیں۔" لب بھینچے وہ دھیمی آواز میں کہہ کر پلٹا۔ ثانیہ کی دبی دبی چیخ نکلی تھی۔

"کیا ہوا ثانیہ؟" اس کے چہرے پہ واضح گھبراہٹ تھی۔ ثانیہ اپنے بالوں کو مٹھی میں دبوچے کھڑی ارزق کی جیکٹ کو دیکھ رہی تھی۔ ارزق نے ناسمجھی سے اپنی جیکٹ کی طرف دیکھا اور پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

"اوہ۔۔۔ آئی ایم سو سوری۔" ثانیہ کے بال ارزق کے جیکٹ زپر کے سلائیڈر میں پھنسے تھے۔ وہ پلٹا تو بال بھی کھنچتے چلے گئے اور ثانیہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھی۔ اس کی آنکھ کا نم کونہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بالوں کو سلائیڈر سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ وہ مزید الجھ گئے تھے۔ وہ اس پل حواس باختہ اور نادم دکھائی دے رہا تھا۔ ثانیہ نے بنا کچھ کہے سلائیڈر میں پھنسی لٹوں کو الٹا گھمایا۔ وہ تردد کے بغیر الگ ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

لندن اور اس کے گردونواح میں رات اوس میں بھیگی حسین اور جوان تھی۔ خوب صورتی سے آراستہ اس جدید طرز کے چھوٹے سے فلیٹ کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ ایپھا نے ہر شے کی ترتیب اپنی پسند اور معیار کے مطابق کی تھی۔

"آج کے بعد یہ فضول کی ڈائٹنگ بالکل بند۔" وہ صوفہ پہ پاؤں سمیٹے بیٹھی تھی۔ ساحر اس کی مخالف سمت بیٹھا تھا۔ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو اندر کے موسم کا پتا دیتی تھی۔ ایپھا کو اس کا حق جتاتا انداز اچھا لگا تھا۔

"جو حکم سرکار۔" وہ شرارت سے بولی۔ وہ بدل رہا تھا یا پھر بدل چکا تھا۔ ثانیہ کی محبت و بے وفائی ماضی کا قصہ ہوئی تھی۔ ایپھا اس کا حال تھی اور ان کی ہونے والی اولاد اس کا مستقبل۔ ان کی زندگی میں ایک حسین اضافہ ہونے والا تھا' ایسے میں کون تمام عمر ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ ایپھا کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اس کے ماں بننے کی خبر زندگی میں بہار کے سب رنگ لے آئی تھی۔

"لیکن ہم ان چھٹیوں میں پاکستان جا رہے ہیں۔" اس نے یاددہانی کرائی۔ نو دس ماہ کا وقت بہت تھا' ساحر کو ثانیہ کے غم سے نکلنے کے لیے اور اب وہ سکون سے پاکستان جا سکتی تھی۔

"پہلے میں ڈاکٹر سے کنفرم کروں گا۔ ہمیں کوئی رسک نہیں لینا' اوکے۔" ساحر کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اسے رشدہ کی طرف سے ملنے والی خصوصی ہدایات اور پھر ایپھا کی مستقل مزاجی نے بدل دیا تھا۔ وہ ان دنوں اس کا پہلے سے بڑھ کر خیال رکھنے لگا تھا۔ اگلے چند سالوں میں ثانیہ کا ذکر تو کیا خیال بھی نہ ہو گا۔

ایپھا نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل دیا محسن!
وفا پر اب بھی قائم ہیں مگر' محبت چھوڑ دی ہم نے

رات پُراسرار اور دھیمی دھیمی وحی کی صورت اتر رہی تھی۔ پہلی تاریخ کا شرمایا لجایا چاند اپنی چھب دکھلا کر افق کی گود میں چھپ چکا تھا۔ آسمان کی شفاف اور سیاہ چادر پہ تاروں کا راج تھا۔ زمیں پہ روشن برقی قمقموں کی روشنیوں کا نہر کے پانی میں اترتا عکس روح پہ طلسم طاری کر رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ثانیہ نے ان قندیلوں کو سطح آب پہ تیرتا دیکھا تھا اور اس وقت وہ ارزق کے ساتھ اس چھوٹے سے روشن جہان کے اندر موجود تھی۔ یہ ایک پرائیویٹ لگژری ڈنر کروز تھا جو سبک رفتاری سے چلتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ کچھ دیر پہلے اسے دیکھ کر وہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ستاروں کو ماند کرتی تھی۔ وہ پہلی بار دل سے مسکرائی تھی اور اس کروز میں بورڈنگ کرتے وقت حیرت سے مسرت تک

کا حسین سفر اس نے منٹوں میں کیا تھا۔

"ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی بہت بڑی اور دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی ہے۔" ثانیہ کے لیے اپنی ایکسائٹمنٹ پہ قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"یہ تو چھوٹی سی تمنا تھی۔ بڑی خواہشات بڑے تاوان مانگتی ہیں۔" وہ شیشے کی کھڑکی سے پار کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے تحیر سے اس کی طرف دیکھا۔

"اینی وے، مجھے خوشی ہے کہ تم خوش ہو۔" ارزق نے خود پہ ثانیہ کی نگاہیں محسوس کیں تو نظروں کا زاویہ موڑا۔ وہ نا سمجھنے والے انداز میں اب بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ارزق نے سیاہ زیتون منہ میں ڈالا اور کروز کے شیشے سے نہر کے سنہری پانی کو دیکھنے لگا۔ ثانیہ اپنے فریش لائم کے گلاس سے گھونٹ بھرتے اب بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"ایسا کیوں لگتا ہے، میں آپ کو بالکل نہیں جانتی۔" وہ پوچھ بیٹھی تھی۔ ارزق کا چونکنا گواہ تھا، وہ اس وقت کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"اس لیے کہ دو ہفتے پہلے ہم اجنبی تھے۔" جواب سنجیدگی سے دیا گیا تھا۔

"کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ شادی کی رات کے بعد پہلی بار ان دونوں کے درمیان روزمرہ سے ہٹ کر کوئی گفتگو ہو رہی تھی۔ ورنہ پچھلے دن شادی کی گہما گہمی، دوستوں اور رشتے داروں کی دعوتوں کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اس رشتے میں اپنی اپنی رواداری نبھا رہے تھے۔ حقوق و فرائض ادا کر رہے تھے۔ وہ جانتا تھا، ثانیہ کے دل کا دروازہ بند ہے اور ارزق کے دل پہ لگا قفل وہ آج دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔" یک لفظی جواب آیا تھا۔

"چھوڑ کیوں دیا؟" وہ متجسس تھی۔

"اس نے مجھے چھوڑ دیا۔" ارزق نے لب بھینچے۔

"قصور۔۔۔ کس کا تھا؟"

"دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔" اس نے لائم جوس کا گھونٹ بھرا۔

"بہت خوب صورت تھی وہ؟" زیتون کو انگلیوں میں گھماتے ثانیہ نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"مجھے لگتی تھی۔" وہ نارمل تھا۔ ثانیہ خاموش ہو گئی۔

"میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ثانیہ! بہت برا اور بہت برا ایکسیڈنٹ۔ میری ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی، جس کی وجہ سے میں ایک دم اپاہج ہو گیا تھا۔ علاج ممکن تھا پر کنفرم نہیں تھا کہ میں دوبارہ بھی نارمل انسانوں کی طرح زندگی گزار پاؤں گا یا نہیں۔" اس کی خاموشی طویل تھی۔ ارزق نے کچھ سوچ کر تفصیل بتائی۔

"پھر۔۔۔؟"

"اسے سرپرائز پسند تھے۔ اس کی سالگرہ پہ ہر سال میں اسے سرپرائز دیتا تھا۔ میری سالگرہ پہ مجھے چھوڑ کر اس نے مجھے سرپرائز کر دیا۔" وہ ہنسا۔ اس ہنسی میں بے بسی تھی۔

"آپ اسے آج بھی یاد کرتے ہیں۔" ایک بیوی کے لیے شوہر کے ماضی میں جھانکنا آسان نہیں ہوتا، پھر چاہے وہ لاکھ اس پہ حق نہ جتائے لیکن یہ فطرت ہے، وہ اس کے دل میں کسی اور کی شبیہہ آسانی سے قبول نہیں کر پاتی۔ اسے احساس ہوا، یہی رقابت کا احساس شاید ارزق کو بھی ہوا ہو گا، جب ثانیہ نے اسے ساحر کے متعلق بتایا ہو گا۔

"نہیں۔۔۔" بڑا دو ٹوک جواب تھا۔ "دو سال اپنے ناکارہ وجود کو دیکھ کر کڑھتے ہوئے میں نے اپنی ہر سانس کے ساتھ اسے یاد کیا ہے۔ پر اب نہیں۔" وہ تلخ نہیں ہوا تھا، پر اس کا لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ دل میں زخم گہرے ہیں۔ بہت کچھ ٹوٹا ہے۔ دل، خواب، مان، بھروسا۔۔۔ ثانیہ کسی بت کی طرح بیٹھی تھی۔ اس نے اسے ہمیشہ ہی اتنا کمپوزڈ دیکھا تھا، یہاں تک کہ ثانیہ کی کی بات پہ اس نے کوئی ری ایکٹ نہیں کیا تھا۔

"اب میں اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ خوش رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے سے منسلک لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے وفا نہیں ملی تو کیا ہوا، وفا نبھا تو سکتا ہوں۔"

ارزق نے اسے مشکل سے نکال دیا تھا۔ اس نے گنجائش نکال لی تھی۔ ویٹر اب کھانا رکھ رہا تھا۔ اس دوران وہ دونوں ہی قصداً" خاموش رہے۔

"میرا سچ جاننے کے بعد بھی آپ نے مجھ سے شادی کی۔ ساحر نے میرا یقین نہیں کیا، لیکن آپ..." ثانیہ کی الجھن تمام ہوئی تھی، پر ایک سوال اب بھی باقی تھا۔ انگلیاں مروڑتے وہ نروس تھی۔ ثانیہ اس کے ہر لفظ کو جھیل چکی تھی۔

"کھانا ختم کرو، سب ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ اپنے پلیٹر کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"اس حسین شام کو یادگار بنانے کا شکریہ۔" ثانیہ کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں ستارے ایک بار پھر اتر آئے تھے۔ ارزق نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔

☆ ☆ ☆

سیاہ سلک کی قیمتی فینسی فارمل قمیص کے ساتھ تنگ ٹراؤزر پہنے وہ اپنی تیاری کو اب آخری ٹچ دے رہی تھی۔ ہیروں جڑے قیمتی آویزے کانوں میں سجے تو اس کا روپ دمک سا گیا تھا۔ خود پہ ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے اس کی نظر وال کلاک کی طرف گئی اور اسی پل ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا اس کا فون بجا۔ مسکراہٹ دباتے اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف کہے جانے والے الفاظ بجلی بن کر گرے تھے۔ فون کان سے لگائے وہ ثمینہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔

☆ ☆ ☆

جب بھی ملا ہے زخم کا تحفہ مجھے دیا
دشمن ضرور ہے وہ مگر بااصول ہے

محبت نہ سہی پر تعلق تو تھا۔ نکاح کے ان لفظوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ماضی کا ہر حوالہ بھلا دیتے ہیں، یاد رہتا ہے تو فقط ایک رشتہ۔ وہ بھی ایک مضبوط رشتے کی ڈور سے بندھے تھے۔ خوش نہیں پر مطمئن تھے۔ ثانیہ آج گھر آئی ہوئی تھی اور فاخرہ کی زبانی اسے ایبہا اور ساحر کی پاکستان آمد کی خبر ملی تھی۔ وہ امید سے تھی، یہ سن کر ثانیہ لمحہ بھر کو چپ سی ہو گئی تھی۔ فاخرہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں، پر ان باتوں کو بتانے کا مقصد یہی تھا کہ دیکھو، وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکا ہے تو اب تم بھی پلٹ کر مت دیکھنا اور ثانیہ بس ایک گہری سانس لے کر خاموش بیٹھی رہی تھی۔

شام کو ارزق کے ساتھ اس کی واپسی تھی۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا تھا جب ثانیہ کو مین ڈور سے نکلتے شناسا آواز نے رکنے پر مجبور کیا۔

"شادی مبارک ہو۔" ثانیہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"شکریہ...." چہرہ اور لہجہ دونوں ہی سنجیدہ تھے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی تھی، پر دوسری طرف ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"مجھے مبارک باد نہیں دو گی۔" مسٹرڈ اور زنک کلر کے لانگ کرتے میں اپنے اندر ایک نئی زندگی کو تخلیق دیتی ایبہا نے جتاتے ہوئے کہا۔ دیوار میں لگے دروازے پہ قفل پڑ چکا تھا، پر دروازے سے دروازہ ملتا تھا اور آج بھی اس بیڈ روم کی کھڑکی سے ثانیہ کے گھر کا پورچ دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً" وہ خصوصی طور پہ اسی سے ملنے کھڑی تھی۔

"کیا لٹیروں کو بھی مبارک باد دی جاتی ہے؟" اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا، پر یہ سوال ایبہا کو بہت کچھ جتا گیا تھا۔

"تم بالکل نہیں بدلیں ثانیہ۔" وہ مسکرائی۔

"اور تم بہت بدل گئی ہو ایبہا۔" جواب برجستہ آیا تھا۔

"یاد ہے میں نے کہا تھا، وہ مجنوں نہیں ہے۔" ایبہا کا طنزیہ وار ثانیہ کو ماضی کی بہت سی تلخیوں میں دھکیل گیا تھا، پر اس نے خود پہ قابو رکھا۔

"اور میں نے بھی کہا تھا کوئی دوسری ثانیہ رضا نہیں ہے۔" ایبہا نے ایک نظر اسے سر تا پا دیکھا۔ بے حد نفیس سلک شارٹ شرٹ کے ساتھ سیاہ امبرائیڈڈ ٹراؤزر، قیمتی ہیرے جڑی اسٹائلش جیولری، کھلے ہوئے سیاہ بال اور ہلکا سا میک اپ... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ایبہا کو یہ تسلیم کرنا پڑا، وہ حسین تر

ہو چکی تھی۔ ایہا کو اس کا اعتماد سلگا گیا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' وہ اب تک تمہارا غم سینے سے لگا کر بیٹھا ہے۔ بیوی ہوں میں اس کی' شوہر ہے وہ میرا' سمجھیں تم۔" وہ تقریباً" چلائی تھی۔ ثانیہ کے چہرے پہ اب بھی نارمل تاثر تھا۔ وہ اگر اسے اپنے سامنے ہارا ہوا' ٹوٹا' بکھرا یا آبدیدہ دیکھنے کی خواہش مند تھی تو ایسا نہیں ہوا تھا۔

"یہ تم مجھے بتا رہی ہو یا خود کو یقین دلا رہی ہو۔"

اس نے ابرو اٹھائے۔ ایہا کے پاس جواب نہیں تھا۔ پاؤں میں پہنی سیاہ سینڈل کی ایڑی پہ گھوم کر اس نے گاڑی میں بیٹھے ارتق کو دیکھا جو اس کا منتظر تھا اور مسکراتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے گاڑی چلائی تو ثانیہ نے بڑی دلکش مسکراہٹ سے ایہا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سن سی کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

سویرا اور ثمینہ نے گھر سے اسپتال کا سفر انگاروں پہ طے کیا تھا۔ بازل کے پلانٹ پہ ہونے والا دھماکا بریکنگ نیوز تھا۔ کروڑوں روپے کی مالیت سے بنا پلانٹ آتش فشاں کی طرح جلتا قیامتِ صغریٰ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ چند ورکر موقع پہ ہلاک ہو گئے تھے۔ بازل جو اس وقت کوالٹی کنٹرول میں موجود تھا۔ دھماکے کے وقت وہاں سے نکل چکا تھا لیکن اس افراتفری اور بھاگ دوڑ میں وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ جسم پہ جگہ جگہ جلنے کے نشانات کے ساتھ چہرے کا دایاں حصہ بھی اچھا خاصا جھلس گیا تھا۔ یہ حادثہ نہیں باقاعدہ سازش تھی جو اندر ہی موجود کسی بہت قریبی انسان کی کارستانی تھی' کیونکہ اس قدر حساس جگہ پہ اتنی فاش غلطی یونہی نہیں ہوتی۔ انویسٹی گیشن جاری تھی' پر اس وقت تو خسارہ گنا جا رہا تھا اور ایسے میں بازل کے اندر جنگ جاری تھی۔ شیطان کے بہکاوے میں آکر تکبر کر بیٹھا تھا' اسی تکبر نے ابلیس کو بھی تو اس کے مرتبے سے سر کے بل گرایا تھا۔ بازل بھی اونچائی سے نیچے آیا تھا۔ ثمینہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں اس کی متعدد چھوٹی چھوٹی سرجریاں ہوئی تھیں اور ابھی چہرے کی میجر سرجری ہونا باقی تھی۔ سویرا سب کچھ بھول کر بس اسی کی خدمت میں لگی تھی۔ اسپتال سے گھر تک کا سفر بازل نے سوچوں کے سراب میں طے کیا تھا۔

"مجھے لگتا تھا میں انتہائی سیلف کنٹرولڈ اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانے والا انسان ہوں۔" سویرا اس کی دوائیاں سائڈ ٹیبل پہ رکھ رہی تھی۔ بازل بیڈ کراؤن پہ سر ٹکائے پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ بائیں گال پہ جلنے کا نشان نمایاں تھا۔

"تمام عمر اپنی ذات سے جڑے لوگوں کی داد و تحسین وصول کرتے گزری تو ایک نادیدہ احساس برتری مجھ پہ قابض ہو گیا۔ میرے ٹارگٹ زمانے سے مختلف تھے اور میں ان ہی کی تکمیل میں الجھا ہوا تھا۔" اس کا انداز خود کلامی والا تھا۔

"اور پھر میری زندگی میں وہ آئی۔" دوائیاں رکھتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔

"وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ کسی دیو مالائی داستان کی شہزادی جیسی۔" وہ اس کی نظروں کو خود پہ محسوس کر چکا تھا' پر اس کی طرف دیکھا نہیں۔

"حسین تو بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں' پر وہ الگ تھی۔ منفرد تھی۔ بہت دلکش۔" بازل جیسے کوئی دلچسپ کہانی سنا رہا تھا۔

"پہلے پہل میری سوچ بھٹکی پر میں نے خود پہ قابو رکھا' لیکن کسی ساحرہ کی مانند اس نے میرے دل کو اپنے حسن کے جادو کے زیر اثر کر لیا تھا۔"

کمرے میں اس پل سناٹا تھا' ایسے میں بازل کی آواز گونج رہی تھی۔

"میں... میں وہ سب نہیں چاہتا تھا جو اس رات ہو گیا۔" اس بار سویرا کی طرف دیکھا۔ وہ اعتراف کر رہا تھا اپنے گناہ کا اور سویرا پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں کمزور نہیں تھا' پر اس کو پانے کی خواہش میرے اعصاب پہ سوار ہو چکی تھی۔ میں اسے چاہنے لگا تھا۔" ہاتھ بڑھا کر اس نے سویرا کا ہاتھ تھام لیا۔

"وہ چاہت نہیں ہوس تھی بازل۔" وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی۔ "آپ نے میری بہن کی زندگی برباد کردی۔" آنکھوں میں نمی اتر رہی تھی۔

"میں بس اسے چھونا چاہتا تھا۔ شیطان مجھ پہ حاوی تھا اور میں....." بازل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہے مجھ سے' اپنی ماں سے۔ امی اور بابا نے مجھے کتنا سمجھایا' لیکن میں نے آپ پہ بھروسا کرتے ہوئے اپنی بہن کو مورد الزام ٹھہرایا۔ میں نے اسے بے عزت کرکے اپنے گھر سے نکال دیا۔ کتنا روئی تھی وہ' کتنا تڑپی تھی میرے آگے۔" آج وہ سب یاد آرہا تھا سویرا کو۔ کس طرح اس نے ثانیہ کو ذلیل کرکے گھر سے نکالا تھا۔ اس کی شادی ٹوٹنے کا ذرا برابر بھی تو غم نہیں ہوا تھا اسے کہ یہ سب تو اس کی اپنی نیت کا پھل تھا جو اسے ملا۔

"میں ثانیہ سے معافی مانگ لوں گا' سب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کروں گا۔" وہ اپنے کیے پہ شرمندہ تھا۔

"اعتراف تو مجھے کرنا ہے۔ گناہ گار تو میں ہوں' بازل جس نے اپنی ہی بہن کی خوشیوں کو آگ لگادی۔ اسے میرے حسد نے تباہ کردیا۔" زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

"مجھے معاف کردو سویرا....." وہ اس وقت بازل کی کوئی بات نہیں سن رہی تھی۔ کچھ سننے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس کہے جارہی تھی۔ اپنے اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت نکال رہی تھی۔

"معافی تو مجھے چاہیے ان تمام غلطیوں کی جن کی وجہ سے ثانیہ کی زندگی ویران ہوگئی۔ میں گواہ تھی ان دونوں کی محبت کی' جانتی تھی' وہ کتنا چاہتی ہے ساحر کو' پھر بھی میں اتنی خود غرض کیسے ہوگئی۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ بازل لب بھینچے خاموش بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ضرورت تھی تمہیں ثانیہ کے منہ لگنے کی۔ بلاوجہ باتیں سنا گئی۔" تبسم کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا ایمہا کا ثانیہ کو روکنا۔ اور جو کچھ سنا انہیں اب ایمہا پہ ہی غصہ آرہا تھا کہ خواہ مخواہ اپنا آپ ہلکا کیا۔

"میں اسے ہارا ہوا دیکھنا چاہتی تھی امی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"دیکھ لیا پھر۔ اونچے گھر میں بیاہی گئی ہے' ساحر جیسوں کو تو نوکر رکھ لیں وہ۔ اس کے پاؤں زمین پہ تھوڑی ہوں گے اور پھر یہی تو چاہتی تھی وہ' اسی دولت کی خاطر تو بہنوئی پہ ڈورے ڈال رہی تھی۔ اس کے غم میں آنسو تھوڑی بہائے گی اب۔"

تبسم نے ایک ہی سانس میں اگلا پچھلا سب گنوادیا تھا' پر ایمہا جیسے اس وقت ان کی کوئی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں تو بس ثانیہ کا اعتماد سے اٹھا ہوا سر' چہرے کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اس کے لیے رحم گھوم رہا تھا۔ وہ ان دنوں یہیں رہ رہی تھی۔

"دولت سے متاثر ہونے والوں میں نہیں ہے وہ۔" بیڈ کے کراؤن پہ کمر ٹکائے وہ کھڑکی سے نظر آتے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم نے ہی تو بتایا تھا اس رات جب یہ بازل کے ساتھ بے حیائی کرتے پکڑی گئی تھی۔" ایمہا خاموش بیٹھی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"تو کیا وہ سب..... اُف میرے اللہ۔ اتنا بڑا جھوٹ بولا تم نے۔" تبسم کو شاک لگا تھا۔ یہ وہ حقیقت تھی جو ایمہا نے انہیں بھی نہیں بتائی تھی۔ وہ بھی سب کی طرح ثانیہ کو ہی قصوروار سمجھتی تھیں۔

"میں ساحر کو پانے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔" وہ درشتی سے بولی اور دروازے پہ کھڑے ساحر کے پیروں تلے کی زمین کھینچ لی گئی۔ آسمان اس کے سر پر آگرا۔ ایمہا کا انکشاف بجلی بن کر وجود کو بھسم کر گیا تھا۔

"کسی پر بہتان بھی لگا سکتی تھیں۔" ایمہا کے ساتھ تبسم نے بھی پلٹ کر دیکھا۔

"ساحر!" اس نے کچھ کہنا چاہا پر آواز حلق میں اٹک

گئی۔ وہ قدم قدم چلتا کمرے میں داخل ہوا۔

"اپنی بہن جیسی دوست کی کردار کشی بھی کر سکتی تھیں تم ایہا۔" اس کی آواز کوڑے برسا رہی تھی۔

"میری بات سنو۔" ایہا نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔

"کسی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اس کے اعتماد کا قتل بھی کر سکتی تھیں تم۔۔۔" وہ اب اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ تبسم تو خود شاک کی کیفیت میں تھیں، وہ ساحر کو کیا سمجھاتیں۔

"ساحر! میں نے یہ سب تمہاری خاطر کیا۔" وہ ہمت کر کے بولی۔

"میرے لیے؟ ایہا! یہ سب تم نے اپنی خاطر کیا۔ اپنی خود غرضی میں تم نے ہم دونوں کی زندگی آگ میں جھونک دی۔" دو انگلیاں سینے پہ مارتے وہ تقریباً" چلایا تھا۔

"میں تم سے شدید محبت کرتی تھی۔ تمہیں پانا چاہتی تھی۔" ایہا کا دل دہل گیا تھا۔ آنسو رخساروں کو تر کر رہے تھے۔

"پر یہ محبت نہیں قتل ہے۔ ایہا میں اب تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا کہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔" وہ پیر پٹختا کمرے سے چلا گیا تھا۔ تبسم بھی اس کے پیچھے بھاگی تھیں، پر ایہا جانتی تھی وہ رکنے کا نہیں۔ کمرے میں اب وہ تنہا تھی۔ اس نے اگر نفرت شدت سے کی تھی تو محبت ٹوٹ کر کی تھی۔ اپنی اندھی، بے لگام خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی چاہت میں اس نے اس پیاری ہستی کی خوشیاں اور زندگی داؤ پہ لگادی تھی جو اس پہ سب سے زیادہ بھروسا کرتی تھی۔ بظاہر وہ جیت گئی تھی، پر حقیقت میں ہار گئی تھی۔ اپنوں کا اعتماد، بھروسا اور۔۔۔ محبت بھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

"سالوں اس سے کم تر دکھنے کے کرب نے مجھے اندر ہی اندر اس سے بد ظن کیے رکھا۔ ہم مڈل کلاس لڑکیوں کی زندگی تمام عمر فقط ایک نقطے کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی ہمیں احساس دلایا جاتا ہے کہ شادی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لہجے میں کرب۔

"خاندان کا سب سے اہم موضوع لڑکیوں کے رشتے ہوتا ہے۔ ہمیں تعلیم اسی لیے دلائی جاتی ہے تاکہ ہمیں اچھا رشتہ مل جائے اور جب پہلی بار رشتے سے انکار ہوتا ہے تو ہمارے اندر پہلا خواب ٹوٹتا ہے۔"

فاخرہ سر جھکائے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

"ساحر میرا بہترین دوست تھا، پر اسے ثانیہ چاہیے تھی، کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ حسین تھی۔ ہر عام سوچ رکھنے والے مرد کو حسین بیوی چاہیے ہوتی ہے۔ ہر ماں کو اپنے بیٹے کے لیے چاند چہرے کی خواہش ہوتی ہے۔ ہر بار انکار اور ٹھکرائے جانے کی اذیت سے گزرتے ہوئے مجھے ثانیہ سے جلن ہوتی۔ وہ میری دل جوئی کرتی، کیونکہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ بے لوث محبت جو ایک بہن کو دوسری بہن سے ہوتی ہے۔ مجھے بھی تھی، کبھی اس سے ایسی ہی محبت پر سالہا سال خود کو اس کے سامنے کم تر سمجھنے کے خیال نے اس محبت میں بال ڈال دیا تھا۔"

وہ لمحہ بھر کو رکی۔ صوفے کی پشت پہ چہرہ ٹکائے وہ رخ موڑے بیٹھی تھی۔ شاید ان کی نظروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

"اسی لیے جب بازل نے اس پہ بہتان لگایا تو میں ایک پل کو بھی نہیں چونکی، ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ میری ماں جائی ہے۔ ہماری تربیت کا منبع ایک گھر ہے تو پھر کیسے وہ اتنا گر سکتی ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے گرہ تھی۔ میں اس سے حسد کرتی تھی، اسی لیے مجھے لگا وہ بھی مجھ سے جلتی ہے۔ میں غلط تھی، میں نے بازل کے جھوٹ پہ اعتبار اس لیے کیا کیونکہ میں اپنی بہن پہ اعتبار نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ میں اس سے جلتی تھی۔"

جب خود سے اعتراف کر چکی تھی تو ان کے سامنے قبول کرنے میں کیا قباحت تھی۔ بہت سنجیدہ سی سویرا

آج ان کے سامنے بیٹھی ان سے یہ اعتراف کر رہی تھی کہ وہ غلط تھی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ فاخرہ نے اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا پر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

☆ ☆ ☆

اب جو بچھڑے ہیں تو احساس ہوا ہے ہم کو
درد کیا ہوتا ہے تنہائی کسے کہتے ہیں

ابیہا کے انکشاف نے اسے پاگل کردیا تھا۔ سڑکوں پہ بے مقصد گاڑی دوڑاتے وہ کب اس کے دروازے پر پہنچا وہ نہیں جانتا' اس وقت اس سے ملنا' اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اور اس پہ اعتبار نہ کرنے کی معافی مانگنے کے سوا اس کے ذہن میں اور کچھ نہیں تھا۔ ثانیہ نے اسے لاؤنج میں دیکھا تو حیران ہوئی تھی' پر اس پہ کچھ بھی ظاہر کیے بنا وہ سنجیدگی سے وہاں آ بیٹھی تھی۔

"میں سب کچھ جان چکا ہوں ثانیہ۔" ثانیہ کے لیے یہ انکشاف نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں پہلی ہی آزمائش میں فیل ہوگیا ہوں' پر ابیہا نے مجھے مس گائیڈ کیا تھا۔" ثانیہ نے چبھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کسی کو اپنانا یا چھوڑ دینا' یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہوتا ہے' اسے کسی اور کے سر پہ نہیں رکھنا چاہیے۔ ابیہا سے شادی تم نے اپنے پورے ہوش و حواس میں کی تھی اور مجھے چھوڑنے کا فیصلہ بھی تم نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔ ابیہا غیر تھی ساحر' پر تم تو میرے اپنے تھے۔ میری خاموشیوں کا مطلب سمجھتے تھے تم' میرے رونے ہنسنے کے معنی سے واقف تھے' پھر بھی تم نے ابیہا پہ یقین کیا۔ کیسے سوچ لیا کہ جس کی صبح تمہارے نام سے ہوتی ہے جو ہر سانس کے ساتھ تمہیں یاد کرتی ہے وہ ثانیہ دولت کی خاطر تم سے بے وفائی کرے گی۔" اس نے کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا۔ ساحر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نادم اور شکستہ دل۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ثانیہ' میں مانتا ہوں ساری غلطی صرف میری ہے اور یہ بھی یقین ہے تم مجھے معاف کردوگی۔" لہجہ التجائیہ تھا۔

"میں تمہیں معاف کرچکی ہوں ساحر۔" ثانیہ کا جواب فوراً" آیا تھا۔

"میں جانتا تھا' تم مجھ سے خفا نہیں رہ سکتیں۔" یک دم ساحر کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مایوسی کی جگہ اب مسکراہٹ تھی۔

"تم نے ٹھیک سوچا تھا' میں واقعی تم سے خفا نہیں رہ سکتی۔" ثانیہ نے برجستہ کہا۔

"بس چلو میرے ساتھ۔ چھوڑ دو یہ ان چاہی زندگی۔ ہم شادی کرلیں گے۔" ثانیہ نے گہرا سانس لیا۔ ساحر اسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

"تم سے کس نے کہا میں ایک ان چاہی زندگی گزار رہی ہوں یا خوش نہیں ہوں۔" ساحر نے تحیر سے دیکھا۔

"تم سے محبت کرتی تھی' تم نے اعتبار نہیں کیا۔ اس سے زندگی بھر کا رشتہ باندھا ہے اس کے اعتبار کو کیسے توڑ دوں؟ میں اپنے شوہر کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔" ساحر کو شاک لگا تھا۔

"لوٹ جاؤ ساحر' ہم ایک منزل کے مسافر نہیں ہیں اور ہمارے راستے جدا ہیں۔" وہ جا چکی تھی۔ ساحر اب تنہا بیٹھا تھا۔ پژمردہ انداز میں اس نے میز پہ رکھا چابیوں کا گچھا اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم
ہو پیکرِ وفا تو کافی ہے ایک شخص

سورج کی کرنیں شفق پہ ست رنگی روشنی بکھیرتی رخصت کا عندیہ دے رہی تھیں۔ ٹیرس پہ کھڑا ارزق سینے پہ ہاتھ باندھے ڈوبتے سورج کے سنہری تھال کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی تو آنے

والے کی جانی پہچانی مہک سانسوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ دھیمے قدموں چلتی اس کے بالکل ساتھ آ کھڑی ہوئی۔

"تم جانا چاہو تو چلی جاؤ۔" ثانیہ نے گردن موڑ کر ارزق کی طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"یعنی میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" پتا نہیں کیوں اسے دکھ ہوا تھا۔

"زندگی اتنے نشیب و فراز سے گزری ہے ثانیہ! کہ اب میں اپنے ہر خسارے پہ صبر کرنا سیکھ چکا ہوں۔" سیاہ پولو شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں سینے پہ ہاتھ باندھے وہ پوری آن بان سے کھڑا تھا۔

"اور اگر نہ جانا چاہوں؟" اس نے گردن موڑ کر پہلو میں کھڑی ثانیہ کو دیکھا۔

"میں جانتا ہوں تم اس سے آج بھی بہت محبت کرتی ہو' اس کے ساتھ خوش رہو گی تم۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"میں تھک چکی ہوں ارزق' اپنا وجود بہت ارزاں لگنے لگا ہے' کیوں مجھے پل میں سر کا تاج بنا کر اگلے ہی پل پاتال میں اتار دیا جاتا ہے۔" وہ کرب سے بولی۔

ان دنوں ثانیہ کے سینے پہ دھرا بوجھ اتر گیا تھا۔ الزام لگانے والوں نے خود اس کا دامن دھویا تھا۔ اسے لگا دل کے کسی کونے میں ارزق بھی تو اسے شک کے دائرے میں رکھتا ہو گا' پر اب وہ اس سے نظریں ملانے میں ہچکچاتی نہ تھی لیکن آج اس کا یوں آسانی سے اسے چھوڑنے کی بات کرنا۔

"تم بہت انمول ہو ثانیہ' خود کو میری نظر سے پرکھو تو تمہیں احساس ہو گا کہ تم جیسے پرخلوص ہم سفر کی بدولت میرا زندگی اور محبت سے اعتبار دوبارہ جڑا ہے۔ عورت ذات پہ بھروسا لوٹا ہے تو اس کی وجہ تم ہو۔" اس نے پلٹ کر ثانیہ کو کندھوں سے تھام لیا۔

"پر آپ نے تو کہا' میں چلی جاؤں۔" وہ دونوں اب آمنے سامنے تھے۔

"تمہاری خوشی کی خاطر۔" ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"عزت ہر رشتے کی پہلی شرط ہے ارزق! محبت کی سیڑھی کا پہلا پائیدان عزت ہے۔ پھر بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی زندگی سے چلی جاؤں تو میں چلی جاتی ہوں' مگر میں ساحر کے پاس نہیں جاؤں گی۔" سیاہ آنکھوں نے انکشاف کیا تھا۔

"جانتی ہو ثانیہ! شادی سے چند روز پہلے جب تم نے مجھے کال کر کے اپنے متعلق بتایا تھا' میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ تم نے خود پہ لگے الزام کو جس دلیری سے میرے سامنے قبول کیا' جس حوصلے سے اپنی کردار کشی کو سہا' یہ سب کوئی بہت ہی خاص انسان کر سکتا ہے اور میں ایسے انسان کو ہر حال میں اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔" بھوری آنکھوں نے اعتراف کیا تھا۔

"پر آپ نے تو سب کی خوشی کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی۔" اسے ارزق کا جواب یاد تھا۔

"جھوٹ کہا تھا۔" ثانیہ نے نچلا لب کاٹا۔ ارزق نے ہاتھ بڑھایا اور انگوٹھے کی مدد سے ہونٹ کو دانتوں کی قید سے آزاد کراتے ہوئے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"تم فقیر کو بھی میسر ہو تو وہ شاہ بن جائے' جو کہا تمہاری خوشی کا سوچ کر کہا' ورنہ تم سے جدا ہونے کا سوچنا بھی مجھے اذیت میں ڈال دیتا ہے۔" ارزق کے اس انکشاف پر ثانیہ نے پلکیں گرا لیں۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔" وہ ارزق سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

"میں بھی تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔" ارزق نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ آسمان پہ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمکتا اس حسین پل کی گواہی دیتا مسکرا رہا تھا۔

آہستگی احتیاط اور بڑی چاہ سے وہ میرے دائیں ہاتھ کی کہنی تک چڑھے ہاتھ کے بنے دستانے کو یوں اتار رہا تھا جیسے۔ جیسے گھونگھٹ اٹھا رہا ہو۔۔۔ کتنی خوش نصیب ہوگی وہ، جس کا گھونگھٹ یہ اٹھائے گا۔ کس قدر نفیس ہے۔ سلیقہ مند۔۔۔ کیسا بنا سنورا سا انسان ہے، نہ صرف ظاہر بلکہ باطن بھی سجائے بنائے رکھتا ہے۔ ایسے انسان خوش نصیبوں کی قسمت میں آتے ہیں۔ یہاں تک سوچتے میں زیر لب مسکرا گئی۔ اس نے شاید میری ہتھیلی کو مصافحہ کی صورت پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ ٹیسوں کے باعث میرا پورا وجود لرز گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا جو میرے رد عمل پر اب انہماک سے میرے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں۔

"کیا چھونے سے بہت تکلیف ہوتی ہے؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔ میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر جھک کر اس کی گرفت میں اپنے ہاتھ پر چلی گئی۔ انگلیوں کی پوروں سے لے کر کہنی تک۔۔۔ کالا سیاہ۔۔۔ کئی جگہوں پر گوشت سے محروم جس کے باعث ہڈی صاف نظر آتی، مگر غور کرنے پر، کیونکہ ہڈی کا رنگ بھی سیاہ پڑ چکا تھا۔ ہتھیلی کی پشت پر سے گوشت مکمل طور پر جل گیا تھا جو کہ وقت کے ساتھ کسی بے جان کھال کی مانند جھڑ کر گر گیا تھا اور کچھ کالی ہو چکی شریانیں ہڈی سے چپکی ہوئی، خون کی فراہمی کا کام چھوڑ کر بس سجاوٹ کے طور پر موجود تھیں۔ فقط انگلیوں سے لے کر کہنی تک کے اس ہاتھ پر کئی بدصورت ترین نشانیاں موجود تھیں۔ میں اب اس ہاتھ کو کسی بھاری کام میں استعمال کرنے سے قاصر تھی، مگر تا نہنگ۔۔۔ کھانا کھانے۔۔۔ یا پھر تھوڑا بہت ڈرائیونگ کے دوران استعمال میں لا سکتی تھی۔ اتنا تو تھا کہ میں ایک ہاتھ سے مکمل طور پر محروم ہونے سے بچ گئی تھی۔

مگر مجھے اس کی بہت خدمت کرنا پڑتی تھی۔ دن میں دو سے تین بار اچھے طریقے سے پانی سے دھو کر خشک کر کے بچے کچھے گوشت کو سوکھنے سے بچانے والا مرہم لگانا پڑتا۔ مہینے میں ایک بار اسپتال جا کر معائنہ کرواتی اور میری تمام تر احتیاط کے باوجود اگر کہیں کسی ہڈی کے جوڑ یا جلے ہوئے گوشت کے درمیان پانی رہ جانے سے پس پڑ جاتا تو اسے صاف کرواتی جو کہ ایک بہت ہی تکلیف دہ اور مشکل مرحلہ ہوتا۔۔۔ مگر اس ہاتھ کو اپنے جسم پر باقی رکھنے کے لیے ان سب مشکلوں سے گزرنا میری مجبوری ــــــ تھی کیونکہ۔ بہرحال دستانے میں چھپا یہ ہاتھ میرے جسم کو ادھورا ہونے سے بچانے کے لیے موجود تھا اور شاید یہ بھی غنیمت

ہاجرہ ریحان

قربانی

تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ یہ ہاتھ ابھی تک میری کہنی سے نہ صرف جڑا ہوا تھا' بلکہ میں اس میں پڑنے والی پس اور کبھی کبھار غلطی سے بھاری سامان اٹھا لینے پر تکلیف کو محسوس بھی کرتی تھی۔ جبکہ اپنی قوت ارادی کے بل پر اس ہاتھ سے محدود کام لینا بھی ڈاکٹروں کو کافی حیران کر چکا تھا۔

میری ہتھیلی اس کی گود میں دھری ہوئی تھی۔ اور مجھے بار بار اس کی نفاست اور سلیقے سے استری شدہ پتلون کے گندے ہو جانے کا خیال آرہا تھا۔ کیونکہ دستانے میں چھپے رہنے سے اور مرہم لگے رہنے سے اس میں عجیب سی گندگی خود بخود پیدا ہو جاتی تھی جو دستانہ اتارے جانے پر جلی ہوئی سوکھ چکی کھال کی مانند جھڑنے لگتی۔ یوں تو میں نے اسے ہاتھ پکڑانے سے پہلے اس کی گود پر اپنا رومال بچھایا تھا' مگر وہ ایک ہی ہوا کے جھونکے سے دور جا گرا تھا اور اب۔۔۔ اب میں خود ہی اپنے آپ سے بے زار ہو کر۔۔۔ منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی۔۔۔ بالکل اس طرح جیسے ڈاکٹر کسی دوسرے مریض کا بھیانک سا زخم آپ کے سامنے کھول کر بیٹھ جائے۔ آپ نہ زخم کو دیکھ پائیں' نہ ہی نظریں چرا سکیں۔۔۔ مگر یہ کسی اور کا نہیں' یہ تو میرا اپنا زخم تھا۔ یہ میرا سیدھا ہاتھ بھی تو میرے جسم کا حصہ ہے۔۔۔ اور جب تک میرا جسم باقی ہے' یہ ہاتھ بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔۔۔ مگر میں اسے دیکھنے سے گھبراتی ہوں۔۔۔ دستانے میں چھپا کر رکھتی ہوں۔ کیونکہ اس کے وجود سے مجھے کراہیت آتی ہے۔

اکثر رات سوتے ہوئے اگر میں نیند میں دستانہ اتار بیٹھوں اور پھر کسی پہر ـــــ آنکھ کھلتے ہی اس پر میری نظر پڑے تو میں خود ہی بہت زیادہ ڈر جاتی ہوں۔۔۔ ایک سنسناتی ہوئی لہر میری گردن سے ہوتی ہوئی دونوں کندھوں تک کو ہلا دیتی ہے۔۔۔ ڈر کے بعد یاد دلاتی ہے۔۔۔ ہر اس بات' اس واقعے کی یاد جو مجھ پر گزر گئی' مگر اب لگتا ہے جیسے مجھ پر نہیں کسی اور پر گزر گئی۔۔۔ وہ ایک بھاری رات۔۔۔ وہ ایک قربانی جو میں نے دی' جس نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا۔

خاموش۔۔۔ کم گو اور آدم بے زار تو میں پہلے بھی تھی' مگر اب تو بدتمیز۔۔۔ بدمزاج اور بدلحاظ ہو چکی ہوں۔۔۔ میں یہ سب مانتی ہوں' مگر اس طرح میں کم از کم لوگوں کے۔۔۔ سامنے ہونے سے بچی رہتی ہوں۔۔۔ گھر والوں نے بھی تھوڑے عرصے بعد مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور مجھے اسی طرح اپنی زندگی پسند آنے لگی۔ میں خود میں مگن جیتی جا رہی تھی کہ اس سلیقہ مند۔۔۔ نفیس اور پُروقار انسان سے ملاقات ہو گئی۔۔۔ کیسا لگتا ہے جب آپ بہت ہی ادھورے۔۔۔ نامکمل اور بے کار ہوں اور اچانک آپ کے مدمقابل آپ سے بالکل الٹ۔۔۔ شخصیت آجائے۔ پھر آپ کہیں کے نہیں رہتے۔۔۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کو اپنی ناکامی۔۔۔ نااہلی اور نالائقی کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ آپ کو ایسی شخصیت ایک آنکھ نہیں بھاتی جو آپ کو آپ کے اندر کی بہت سی خامیوں پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دے۔ سو وہ بھی مجھے پہلی دوسری ملاقات میں یہی سب سمجھا گیا تھا اور میں نے اس کو اپنی بدمزاجی۔۔۔ بدلحاظی اور بہت ہی زیادہ سرد مہری سے خود سے کافی متنفر کر دیا تھا۔۔۔ مگر یہ میرا وہم تھا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس کے شروع کے دن تھے' جب اس نے مجھ سے دو چار بار قریب ہونے کی کوشش کی تھی اور میرے دو ٹوک جواب دینے پر بڑی حیرت سے مجھے دیکھا تھا' کیونکہ ایسے نفیس۔۔۔ پُروقار۔۔۔ ہر دل عزیز لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر سامنے والا ممکن ہی نہیں کہ ان کی کسی بھی طرح کی پکار پر لبیک کہنے کے بجائے پیچھے ہٹ جائے۔۔۔ سو وہ بے حد حیران ہوا تھا۔۔۔ پھر میری بدمزاجی اور بداخلاقی کے چرچے جب اس تک پہنچے تو وہ بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ کر آفس میں دوسرے کئی دوست بنا چکا

تھا۔ہاں یہ ان ہی میں چھپتا ہے۔۔۔ اس کے ہی جیسے خوش مزاج۔۔۔ کھلا کھلا تے۔۔۔ ہنستے کھیلتے آفس کے دوسرے کولیگز کے درمیان۔۔۔ مجھے معاف رکھو۔۔۔ برائے مہربانی مجھ سے کسی قسم کی کوئی امید نہ لگاؤ۔۔۔ میں ممکن حد تک اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی' مگر مری کیا نہ کرتی کہ اس کا اور میرا پروجیکٹ ایک ہی تھا۔ میں اس سے بہت پہلے سے اس ڈپارٹمنٹ میں کام کر رہی تھی۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اسے کئی بار بہت سی جگہوں پر کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سمجھانا۔۔۔ بتانا پڑتا۔۔۔ ہمیں کسی بھی میٹنگ میں ساتھ جانا پڑتا۔۔۔ کسی بھی کیس کے متعلق اپنی معلومات اور اپنا سروے مکمل کرنے کے لیے ساتھ ہی آفس سے باہر نکلنا پڑتا۔۔۔ جو کہ ہمارے کام کا حصہ تھا۔

برطانیہ کی حکومت سے منسلک اس آفس میں ہمارا ڈپارٹمنٹ پاکستان میں برطانیہ کے پاکستانی شہریوں کو پاکستان آنے پر کسی قسم کی مشکل پیش آنے پر مدد دینے پر مامور تھا۔ جب بھی کوئی پریشان برطانوی پاکستانی ہم سے رابطہ کرتا' ہم اس کو یا تو اپنے آفس بلا لیتے یا پھر اس کے پاس جاتے۔۔۔ اور ان ہی لوگوں میں ایسے برطانوی پاکستانی لڑکے' لڑکیاں بھی شامل تھے جو پاکستان شادی کرنے آتے اور یا تو سسرال یا پھر کسی رشتہ دار کے ہاتھوں پریشان ہو جاتے۔۔۔ جب کسی مرد کا معاملہ ہوتا تو میں صرف اسے روانہ کرتی ہم مسلسل ایک دوسرے سے فون پر رابطے میں رہتے۔۔۔ ہمارے آفس کی نمبر پلیٹ کی گاڑی۔۔۔ ڈرائیور اور ایک عدد گارڈ بھی ساتھ جاتا۔۔۔ مگر جب کسی عورت کا کیس آتا تو مجھے ساتھ جانا پڑتا تھا۔

شروع میں مجھے اسے سمجھانے اور طریقہ کار بتانے میں بڑی دقت ہوئی۔۔۔ ہم کسی کی بھی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دے سکتے۔ کسی بھی گھر میں بغیر اجازت اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ کسی سے بھی بدزبانی نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہمیں محسوس ہو کہ ایک برطانوی شہریت کے حامل کسی شخص کو جسمانی خطرہ لاحق ہے تو ہم پہلے علاقے کی پولیس اور پھر اپنے گارڈ کے ذریعے تمام طرح کی اخلاقی حدود توڑنے پر حق بجانب ہیں۔ اتنا سمجھنا کافی تھا کہ ہمارا کام مشکل میں پھنسے لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ جس کے لیے صرف اپنی چھٹی حس کو کام میں لا کر ہی سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کر کے بڑے بڑے قدم اٹھائے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ معاملہ بالکل برعکس نکلتا' جو مظلوم بننے کی کوشش کر رہا ہوتا' اصل میں وہی بدمعاشی کرتا اور صرف اپنی برطانوی شہریت اور حیثیت کو بروئے کار لا کر دوسروں کو تنگ کرتا۔۔۔ اسی لیے اس کام میں ہمارا غیر جذباتی اور غیر جانبدار ہونا ضروری تھا' مگر وہ اکثر ہی جذباتی ہو جاتا اور وہ کر گزرتا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتا۔ اس کی شکایت آجاتی اور پھر مجھے اسے اکیلے تمام تر ذمہ داری اٹھانے سے بچانے کے لیے اس کے ہر عمل کا حصہ دار بننا پڑتا۔ ہم ایک ساتھ حکام بالا کے سامنے مجرم بن کر جاتے اور ڈانٹ کھا کر واپس آجاتے۔ اس کے بعد میری باری آتی کہ میں اسے ڈھیروں ڈھیر سناؤں۔ میں اپنی بداخلاقی۔۔۔ بدزبانی اور بدمزاجی کا بھرپور مظاہرہ کرتی۔۔۔ وہ نظریں جھکائے خاموشی سے بیٹھا رہتا۔

ایک دن ایسی ہی کسی تنبیہی میٹنگ کے بعد میں یوں تو پوچھنا تلخ اس سے لینے اس کے آفس گئی تھی' مگر اس وہ ہنس ہنس کر فون پر بات کرتے دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی غصہ آگیا۔ میں نے اسے طنزاً" کہہ دیا۔

"تم سب مرد ایک جیسے ہوتے ہو۔ غصے میں پاگل دیوانے ہو جانے والے۔۔۔ کچھ پتا نہیں چلتا پھر تم لوگوں کو کہ کیا صحیح کر رہے ہو' کیا غلط۔۔۔ بس کر گزرتے ہو۔" وہ فون بند کر چکا تھا' میری بات پر اس نے پہلی بار مجھ سے نظریں ملائیں اور اطمینان سے گویا ہوا۔

"آپ اپنے ذاتی تجربات مجھ پر لاگو نہ کریں' پلیز۔"

یہ بہت بڑی بات تھی۔ اپنے سے ایک درجے کم حیثیت پر کام کرنے والے اپنے کولیگ سے یہ بات سننے کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ میں غصے سے بلبلا گئی اور سامنے رکھی تین چار موٹی بھاری بھرکم فائلز جذباتی انداز میں دائیں ہاتھ سے اٹھا کر تیزی سے

آفس سے باہر نکلنے لگی کہ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ساری فائلز لے لیں۔

"پلیز۔۔۔ ایسا نہ کریں۔۔۔ آپ کے ہاتھ میں تکلیف ہو جائے گی۔ آپ اپنے آفس جائیں میں یہ سب لے کر آرہا ہوں۔"

اس کی ہمدردی پر میں حیران رہ گئی۔۔۔ اس بات پر زیادہ حیران ہوئی کہ اس وقت وہ غصے میں تھا۔ میرے طنز پر بہت آسانی سے مجھے سزا دے سکتا تھا' میں یوں فائلز لے کر چلی تو جاتی' مگر پھر کئی روز تک اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے پھرتی رہتی۔۔۔ اس غصے میں بھی مجھے تکلیف دینا اسے گوارا نہ ہوا' پھر۔۔۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں اپنے اس ہاتھ سے کوئی بھی کام نہیں کر سکتی۔۔۔ کرلوں تو تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔۔۔ پھر اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ذاتی تجربے کی بھی بات کی تھی۔۔۔ تو کیا اسے ان چند دنوں میں ہی میرے بارے میں اس قدر معلومات مل چکی ہیں؟ یہ میرا وہم تھا کہ وہ مجھے نظر انداز کر کے دوسرے دوستوں میں مگن ہو چکا ہے' مگر ایسا نہیں تھا' وہ دوسروں میں بیٹھ کر مجھے ہی جاننے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ انف اب کیا کہوں۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ کیا ردعمل دکھاؤں؟

خود پر گزرنے والے کچھ واقعات جتنے بھی عام ہو جائیں جتنا بھی مشہور ہو جائیں' وہ جب بھی دہرائے جاتے ہیں' نئے سرے سے تکلیف دیتے ہیں۔۔۔ میں شاید یہ سب سے آخر میں چاہوں گی کہ کوئی مجھے میرے دستانے میں چھپے سیدھے ہاتھ کی کہانی یاد دلائے۔۔۔ یا یہ بتانے کی کوشش کرے کہ وہ جانتا ہے۔

اس بھیانک رات میں ہونے والے حادثے کو سمجھ چکا ہے۔ میری قربانی کے گواہوں میں ایک اور کا اضافہ ہے۔

میں خود پر قابو پاتی۔۔۔ لڑکھڑاتی اپنے کیبن میں آکر میز پر الٹا ہاتھ پھیلا کر اس پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔۔۔ یہ سب کچھ اتنا آسان تو نہیں۔۔۔ یاد تو آہی جاتا ہے مگر پھر بھی بہت تکلیف دہ ہے۔ سب کچھ دل میں ہی دہرا لینا بہت جان لیوا ہو جاتا ہے۔ میں پچھلے دس سال سے دوسروں کو بچانے اور ان کو ہر ممکن تکلیف میں پڑنے سے پہلے ہی یہ حفاظت اس ماحول سے نکالنے پر مامور تھی جبکہ اپنے کیس میں کتنی کمزور پڑ گئی تھی۔ کیونکہ میرے لیے میرے چاہنے والوں کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی نہیں بجائی تھی۔

☼ ☼ ☼

گو کہ میں اپنے گھر والوں کو کئی بار اپنے سابقہ شوہر کی بدتمیزیوں اور بے جا لڑائی جھگڑوں کے بارے میں بتا چکی تھی' مگر کسی کو بھی اس طرح اس کے آپے سے باہر ہو جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ وہ سب مجھ سے میرے اندیشوں کے ثبوت مانگتے۔ مجھے بہلا کر واپس بھیج دیتے۔ کبھی وہ خود اپنے کسی رشتہ دار یا بڑے کے ہمراہ آکر مجھے منا کر لے جاتا۔ کوئی بھی اس کو بدتمیزی کرتے ہوئے۔۔۔ مجھ پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالتے ہوئے یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ایک دن وہ رات کے کسی پہر مجھے نیند سے جگا کر میرے سیدھے ہاتھ پر پیٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگا دے گا۔ یا شاید وہ خود بھی نہیں جان پایا تھا کہ اس کے غصے کی وہ کون سی حد تھی' جس کو پار کر کے اسے صرف اتنا یاد رہا تھا کہ اسے مجھے ایسی تکلیف دینی ہے جو میرے لیے اذیت ناک سزا بن جائے۔

مگر مجھے کمرے میں بند کر کے میرے ہاتھ کے باقاعدہ پورے جلنے تک مجھے قابو کرنا اسے بخوبی یاد تھا۔ اس جان لیوا' اذیت ناک' تکلیف دہ صورت حال کو سہنے پر۔۔۔ اپنا ہاتھ بری طرح جلوا بیٹھنے کے بعد ہی میرے چاہنے والوں کی چھٹی حس نے کام کرنا شروع کیا تھا۔ میرے خاندان برادری کو اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اس شخص کے ساتھ نہیں رہا جا سکتا۔۔۔ اس کو چھوڑ دینے میں عافیت ہے۔۔۔ اس سے علیحدگی میں ہی زندگی ہے۔۔۔ سو ایک ہاتھ کی قربانی کے بعد میری جان بخشی ہو گئی۔ میری اس قربانی کے بعد میرے ہر اندیشے کو ثبوت مل گیا۔ میں نے چند مہینے اسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد آفس جوائن کر لیا' مگر میری شخصیت میں جو شگفتگی' اپنائیت اور خوش اخلاقی تھی'

وہ سب ہوا ہو چکی تھی۔ میں ان چھ مہینوں میں بہت
بدل گئی تھی اور آفس میں سب جانتے ہوئے بھی مجھ
سے اس بارے میں کبھی بھی کوئی بات اشارتاً" کہنے
سے بھی کتراتے تھے۔ مگر اس نے موت نہیں دکھائی
تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس واقعے کے بارے میں بات
کرکے مجھ سے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا
رہی تھی۔۔۔ اور سمجھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ
بات کہہ سن لینے کے بعد انسان آگے بڑھ جاتا ہے اور
میں اب کسی بھی صورت۔۔۔ کسی کے لیے بھی آگے
بڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اب یہیں اسی وقت میں
ساری عمر کے لیے منجمد ہو جانا چاہتی تھی۔

شیشے کی دیوار والے کیبن تھے' وہ دور سے آتا نظر
آیا تو میں مصروف ہو گئی۔ ابھی ابھی اطلاع ملی تھی کہ
ایک برطانوی لڑکی کے نکاح کے دوران خاندان کے
رشتہ دار لڑ رہے ہیں اور دلہن بنی لڑکی اپنے آپ کو غیر
محفوظ سمجھ کر باتھ روم میں چھپ کر کسی کزن سے
لیے گئے موبائل سے ہمارے آفس میں کمپلین لکھوا
چکی تھی۔ یہ ہنگامی صورت حال تھی۔ وہ آہستہ سے
فائلز لیے داخل ہوا۔

"آئی ایم ویری سوری۔۔۔ آپ پلیز دکھی نہ ہوں۔۔۔
میرا مقصد یہ نہیں تھا۔"

وہ بہت احتیاط سے بات کر رہا تھا' جیسے اسے مجھے
دلاسا دینے کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ مگر میں
نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اطلاع
کے بارے میں بتایا اور پھر جلد از جلد ڈرائیور کو گاڑی
لے کر گارڈ کے ہمراہ گیٹ پر آنے کا کہا۔ وہ مختلف
مواقع کی نزاکتوں کو اب تک سمجھ چکا تھا۔ میری
ہدایات پر تیزی سے عمل کرنے دوڑ پڑا تھا۔ میں تمام تر
کاغذات مکمل کرکے فون کی ریکارڈنگ لے کر اپنے
افسر کے پاس جا پہنچی اور فوراً" ہی مجھے اوکے کا سگنل
مل گیا تھا۔ میں جب تمام تر کاغذی کارروائی مکمل
کرکے کاغذات سنبھال کر باہر آئی' وہ گاڑی میں
ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لینڈ کروزر گاڑی
تھی۔ پچھلا حصہ کھلا ہوا تھا' جس میں دو گن لیے
مستعد گارڈ بیٹھے تھے۔ ہم بتائے گئے پتے پر چل پڑے
اور آدھے گھنٹے ادھر ادھر پوچھ کر مطلوبہ گھر پر پہنچ گئے
تھے۔ یہ متوسط طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔

گھر سے شادی ہونے کے تمام آثار نمایاں تھے۔
شام کا وقت تھا اور تھوڑی بہت روشنی ابھی باقی تھی'
پھر بھی سجاوٹ کے لیے کی گئی لائٹنگ اپنے مخصوص
انداز میں جل بجھ رہی تھی۔ مگر ایک عجیب سی خاموشی
کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے گھر اندر سے خالی ہو۔ پہلے
ایک گارڈ اتر کر گیا اور دروازے پر آنے والے ایک
نوعمر لڑکے کو ہماری اطلاع دی۔۔۔ لڑکا کسی بڑے کو
بلانے چلا گیا جبکہ ہم دونوں گاڑی سے باہر آکر اب
دروازے پر کھڑے تھے۔ بغیر اجازت ہم اندر نہیں
جاسکتے تھے۔ میں نے اپنے موبائل سے لڑکی کے
موبائل پر فون کیا جو کہ بند ہونے کا میسج دے رہا
تھا۔ اب مجھے بے چینی ہونے لگی۔ لڑکا اندر جاکر ابھی
تک واپس نہیں آیا تھا اور پتا نہیں اندر لڑکی پر کیا بیت
رہی تھی۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ سب اپنی حفاظت یا حفظ
ماتقدم کے طور پر کوئی لائحہ عمل تیار کر رہے ہوں۔۔۔ پتا
نہیں لڑکی کو کس حال میں اور کس طرح قابو میں کرکے
بیٹھے ہوں۔ میں نے اپنے خدشات اسے بتائے تو وہ
آناً"فاناً" مین گیٹ سے اندر داخل ہو گیا کہ اس سے
پہلے کہ میں یا گارڈ اس کے ساتھ جاتا' وہ جلدی سے
احاطے کو عبور کرکے نسبتاً" ایک اور چھوٹے لکڑی
کے دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ میں ایک بار
پھر غصے سے بلبلا گئی۔ میں نے صرف خدشہ ظاہر کیا تھا
یہ تو نہیں کہا تھا کہ گھر میں بغیر اجازت ہی گھس
جائے۔ اب میرے لیے بھی باہر رکنا مناسب نہیں تھا'
میں بھی اس کی تقلید میں گھر میں چلی گئی' جبکہ گارڈ کو
میں نے باہر ہی روک دیا تھا۔ اندر منظر ہی کچھ اور تھا۔
یہ ایک وسیع لاؤنج جیسا کمرہ تھا۔۔۔ ٹی وی۔۔۔ کھانے کی
میز اور کچھ صوفے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ ایک
کونے میں سجی بنی دلہن کرسی پر رسیوں سے بندھی بیٹھی
زار و قطار رو رہی تھی۔ دوسرے سرے پر کچھ مختلف
عمروں کے مرد و عورت بڑے اطمینان اور لاتعلقی سے

کھڑے تھے۔ جیسے وہاں کوئی غیر معمولی بات ہی نہ ہو رہی ہو۔۔۔ جبکہ وہ ایک فربہ جسم آدمی سے سوال جواب کر رہا تھا جس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکی کا باپ ہے اور خود بھی برطانوی شہریت رکھتا ہے۔ آدمی اسے دھمکی دے رہا تھا کہ اس طرح ہم اس کے ذاتی معاملے میں دخل نہیں دے سکتے۔ وہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کی شادی کرنے کا حق رکھتا ہے اور پاکستان میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہماری بے جا مداخلت پر وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہے۔ ہم پر ہمارے آفس پر ہماری گورنمنٹ پر کیس کر سکتا ہے۔ میں نے جھٹ آگے بڑھ کر لڑکی کو کھولنے کی تگ و دو کرنی چاہی اور ساتھ ہی چیخ کر گارڈز کو بھی اندر آنے کا کہہ دیا تھا۔ یہ سنتے کے ساتھ ہی فربہ جسم آدمی اس سے بات کرنا چھوڑ کر میری طرف تیزی سے لپکا اور اس سے پہلے کہ میں سمجھتی اس نے میرا دستانے والا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں درد سے دہری ہو گئی۔ اور اسی اثنا میں ایک زوردار مکا آدمی کے چہرے پر پڑا تھا جس کے باعث وہ ناک پر ہاتھ رکھے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ یہ مکا اس نے فربہ جسم آدمی کو میرے ہاتھ پکڑتے ہی مارا تھا۔ فربہ جسم آدمی کی گرفت میرے ہاتھ پر اتنی مضبوط تھی کہ وہ گرتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لیے جا رہا تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر مجھے میری کمر کے گرد ایک ہاتھ پھیلا کر جیسے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گرتے آدمی کے اس ہاتھ پر وار کیا تھا جو میرے ہاتھ کو پکڑے ہوئے تھا۔ آدمی ایک کراہ کے ساتھ مجھے چھوڑ کر دھم سے زمین بوس ہو گیا۔ اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ دونوں گارڈ اندر آچکے تھے اور آدمی کو قابو میں کر چکے تھے۔ میں لڑکی کو آزاد کروا کے فوراً گاڑی سے آفس کے لیے نکل گئی جبکہ وہ پولیس کیس اور دوسری کارروائیوں کے لیے وہیں رک گیا تھا۔

آفس پہنچ کر لڑکی کو اس کے کیس پر آگے کام کرنے والوں کے حوالے کر کے میں دوبارہ جائے وقوعہ پر پہنچ گئی۔ اب تک پولیس آچکی تھی۔ فربہ جسم آدمی اور کچھ اور لوگ پولیس کی تحویل میں تھے۔ ہم پولیس کے ہمراہ تھانے چلے گئے جہاں میرے اور اس کے بیان لیے گئے۔ ہمارے کارڈ اور کیس کے تمام کاغذات چیک کیے گئے۔ ہمارے آفس میں ہمارے حکام بالا سے بات کی گئی۔ لڑکی سے ملنے اور اس کا بیان حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا اور رات گئے تک کارروائی کے مکمل ہونے پر ہم تھکے ہارے آفس کے لیے نکل پڑے تھے۔

یہ ایک ایمرجنسی صورت حال تھی جس کے لیے آفس کے اوقات اور رات دن نہیں دیکھے جاتے تھے' ابھی ہمیں آفس میں بھی کئی کارروائیوں سے گزرنا تھا۔ کئی طرح کے فارمز کو بھر کر اس صورت حال میں اپنے اٹھائے گئے اقدام کو صحیح ثابت کرنا تھا۔ میں اسے تمام کارروائی کے بارے میں سمجھا رہی تھی کہ کس طرح اسے اور مجھے صورت حال کو اچھی طرح سے بیان کرنا ہے۔ ہم ابھی آدھے راستے میں ہی تھے کہ وہ چونک اٹھا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کچھ کھا لیتے ہیں پھر آفس چلیں گے۔ آفس میں اس وقت تک تو کینٹین بند ہو جاتی ہے اور اب میں ایک منٹ بھی بھوکا۔۔۔ نہیں رہ سکتا۔"

بات تو ٹھیک ہی تھی۔ بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی۔ چائے کی بھی شدت سے طلب تھی۔ لہٰذا میں نے ڈرائیور سے کسی ریسٹورنٹ تک لے جانے کا کہا۔ میرے ہاتھ میں شدید تکلیف تھی' کھانے کے لیے میں سیدھا ہاتھ ہی استعمال کرتی تھی مگر اس وقت ایسی تکلیف تھی کہ باوجود کوشش کے بھی مجھے الٹے ہاتھ سے ہی کھانا کھانا پڑ رہا تھا۔۔۔ اور تھوڑا سا کھا کر ہی میں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا۔ اس نے مجھے ہمدردی سے مشورہ دیا۔

"آپ اپنے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا دیتیں؟ ابھی یہیں سے چلتے ہیں؟" میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ دنیا کا یہ آخری موضوع تھا جو میں کبھی بھی کسی کے ساتھ بھی بات کرنے کے لیے انتخاب کرتی۔۔۔ اور اس کا شاید محبوب ترین موضوع۔

"ڈاکٹر کا کام نہیں ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آرام چاہیے۔۔۔ چائے پی کر میں پین کلر کھا لوں گی۔"

میں ہر ممکن خود کو مطمئن دکھانے میں مصروف تھی۔ جبکہ دل میں حد سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ فربہ جسم آدمی کا مجھ پر لپکنا اور پھر اس کا بروقت مجھے بچاتے ہوئے گھونسا مارنا یاد کر کے میں نے بے اختیار ایک جھرجھری لی۔ اور دل ہی دل میں اس کی احسان مند بھی ہوئی۔ وہ عین وقت پر آگے نہ بڑھتا تو شاید وہ فربہ جسم آدمی کچھ یوں میرا ہاتھ کھینچتا کہ یہ، جو اتنے دنوں سے نام کو ہی سہی میری کہنی سے جڑا ہوا ہے، مکمل ہی الگ ہو جاتا۔۔۔ ہم چائے کے انتظار میں بیٹھے تھے میں غیر ارادی طور پر اپنا سیدھا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑے وقت گزارنے کی کوشش میں سامنے لگے ٹی وی پر آتے ٹینس میچ کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک میرے دائیں کندھے سے ایک تیز زنانے دار ٹیس اٹھی جو تیر کی طرح سفر کرتی میری انگلیوں تک چلی گئی۔۔۔ اور میرے منہ سے سسکی نکل گئی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔ میں شرمندہ ہو کر مسکرا گئی۔ اس نے بڑی آہستگی سے میرا ہاتھ اپنی گود پر رکھ لیا۔

"کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔۔۔ پلیز؟" میں نے گھبرا کر اپنے ارد گرد دیکھا۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اب اس قدر قریب آچکا تھا کہ اسے اس موضوع سے ہٹانے کا کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا بلکہ میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا کہ میں جلد از جلد اپنے ہاتھ سے دستانہ اتار کر اس حالیہ بیتنے والے سانحے کے نتائج دیکھ سکوں۔

"کسی نے دیکھ لیا تو بلاوجہ اس کا کھایا پیا باہر نہ آجائے۔۔۔ تم بھی سوچ لو۔۔۔" میں نے مسکرا کر اسے تنبیہہ کی۔۔۔ اور اس کے دستانے پر ہاتھ پھیرنے پر ٹیبل نیپکن کھول کر اس کی گود پر پھیلا دیا تھا۔۔۔ وہ جواباً" ہونٹ بھینچ کر آہستہ آہستہ دستانہ اتارنے لگا۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ کسی بھی قسم کی گھن یا گھبراہٹ نہیں دکھا رہا تھا بلکہ اس نے بڑے اطمینان سے دستانے میں چھپی میری ہتھیلی کو مصافحہ کے انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ کی گرمائش اچھی لگنے لگی اور میری گوشت سے محروم کالی سیاہ ہتھیلی میں جیسے نئے سرے سے جان پڑنے لگی۔ میں نے ہلکے سے اپنی گرفت کو مضبوط کیا، پھر ڈھیلا چھوڑا۔۔۔ پھر مضبوط کیا۔۔۔ اس طرح کی ورزش میرے لیے بہت ضروری تھی۔ مجھے یقین کرنا تھا کہ میرا یہ ہاتھ ابھی بھی میری قوت ارادی پر حرکت کرتا ہے۔ ابھی بھی یہ میرے بس میں ہے۔ وہ بہت اطمینان سے مجھے اپنی ورزش میں مصروف دیکھ کر میری ہتھیلی کو ویسے ہی بہت احتیاط سے پکڑے بیٹھا تھا۔

"تمہیں گھن نہیں آرہی؟" میں نے اس کی خاموشی اور اطمینان پر اس سے پوچھا۔۔۔ وہ پھر مسکرایا۔۔۔ بُردبار مسکراہٹ کے ساتھ میرے ہاتھ کا ایک بار پھر سے جائزہ لیا۔

"میری ماں۔۔۔ وہ جب بھی مجھے گود میں بٹھاتی تھیں تو ان کے کپڑوں سے جھانکتے، کچھ نظر آتے، کچھ صرف کپڑوں کے اوپر سے چھوئے جانے پر محسوس ہوتے ان کے جسم پر پڑے ایسے ہی کئی زخم میں گن گن کر بڑا ہوا ہوں۔۔۔ وہ تکلیف سے رات بھر سو نہیں پاتی تھیں۔۔۔ پھر بھی وہ میری خاطر جب تک بن پڑا جیتی رہیں۔ میری خاطر خود کو زخم زخم قربان کرتی گئیں۔ مجھے یہ زخم کچھ نہیں کہتے۔ میں زخموں سے گھن نہیں کھاتا۔ ایسے مردوں سے گھن کھاتا ہوں جو ان زخموں کا باعث ہوتے ہیں۔"

میں دم بخود رہ گئی۔ وہ چند ایک جملوں میں اپنی پوری زندگی کا حاصل بتا چکا تھا۔ چائے آچکی تھی ہم چائے پی کر فارغ ہوئے تو میں نے دستانہ واپس چڑھا لیا۔۔۔ درد میں تھوڑی بہت کمی آگئی تھی، پھر۔۔۔ کھا پی کر چائے بھی پی لی تھی تو ایک دم سے مجھے اپنی طبیعت ہشاش بشاش لگنے لگی تھی۔

میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اس سے ہنس کر پوچھا "اب یہ جو تم نے اس موٹے کو گھونسا مارا ہے، اس کا اپنی رپورٹ میں کیا جواز دو گے؟" وہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے بغور دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔

"یہی کہوں گا کہ ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا۔"

☼

عبیر ایک کم رو لڑکی ہے۔ جس کی ماں مرچکی ہے۔ اس کا باپ سلطان اور سوتیلی ماں فارہ۔ دونوں بے حد حسین ہیں، جس کی وجہ سے وہ احساس کم تری کا شکار ہے۔ فارہ بظاہر بہت اچھی ہے، لیکن اس نے اپنے رویے سے عبیر کی شخصیت کو کچل دیا ہے۔

سلطان پر پندرہ کروڑ غبن کا جھوٹا الزام لگ جاتا ہے۔ وہ نوکری چھوڑ کر کینیڈا جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ عبیر کی دوست رکزی اس کی ہمدرد ہے۔ ایک روز عبیر اور رکزی کی باتیں نبیل، جو عبیر کا کزن ہے، سن لیتا ہے۔ نبیل اس کو احساس کمتری سے نکالنا چاہتا ہے۔

چوہدری راحت اکبر نے اپنی بیوہ بھابھی پروین اور بھتیجے حذیفہ کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ جہاں ان کی حیثیت ملازمین سے بد تر ہے۔ راحت اکبر کی بیٹی نیلم ایک بگڑے مزاج کی خود سر لڑکی ہے۔ جسے اس کی ماں چاندنی بیگم کی شہ حاصل ہے۔ نیلم کا دوست ٹیپو ایک روز اس سے خفیہ طور پر ملنے آتا ہے۔ لیکن حذیفہ اسے دیکھ لیتا ہے۔ حذیفہ کی بات پر یقین کرنے کے بجائے نیلم اور اس کی ماں اسے ہی مورد الزام ٹھہراتی ہیں۔ چوہدری راحت، حذیفہ سے خطرہ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ اس کے باپ کی جائیداد پر انہوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔

زویا وقار اپنے آفس کولیگ ہینڈسم کو پسند کرتی ہے۔ مگر ہینڈسم راہ و رسم کے علاوہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔
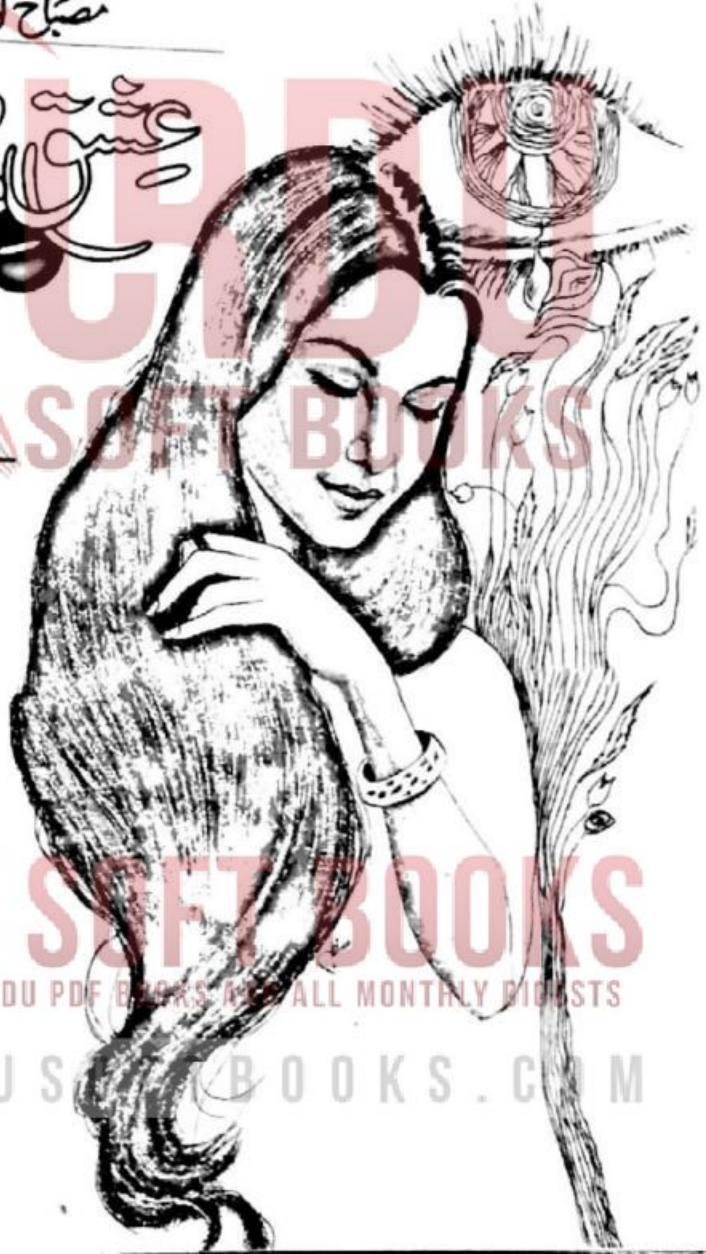
نبیل' عبیر کو کتابیں اور ایڈمیشن فارم دینے آتا ہے۔ فارہ دیکھ لیتی ہے اور بات کو غلط رنگ دے کر عبیر کو اس کے والد کی نظروں سے گرا دیتی ہے۔ عبیر اپنی صفائی دینا چاہتی ہے' مگر سلطان اس کی بات نہیں سنتے۔ عبیر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ نبیل امتحانات سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ عبیر اسے فون کرتی ہے کہ اس سے شادی کرلے یا سلطان کو آکر سچ بتادے کہ ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں' مگر نبیل دونوں کاموں سے انکار کردیتا ہے اور نہایت رکھائی سے پیش آتا ہے۔

رکزی اور نبیل کی حوصلہ افزائی سے عبیر کی سوچ تک تو بدل گئی ہے' مگر ابھی اس میں حوصلہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنے والدین اور اپنے مسئلے کا حل اپنی شادی میں تلاش کرتی ہے' مگر ہر بار رشتے کے لیے آنے والے اسے ٹھکرا کر چلے جاتے ہیں۔

راحت اکبر کے الیکشن جیتنے کی خوشی میں جشن ہوتا ہے جس میں نیلم کے والدین اس کی منگنی آصف سے' جو اس کا خالہ زاد اور انتہائی امیر ہے' کردیتے ہیں۔ نیلم حواس باختہ ہو کر ٹیپو کو بتاتی ہے۔ ٹیپو اسے ایک منصوبہ سمجھاتا ہے۔ نیلم اپنی چاچی اور حذیفہ سے انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے۔ نیلم کی طبیعت کی خرابی سے چاندنی بیگم کو تشویش ہوتی ہے تو نیلم انہیں ٹیپو کے بارے میں بتاتی ہے تو چاندنی بیگم اسے ڈانٹ دیتی ہیں وہ ہر صورت اس کی شادی آصف سے ہی کریں گی۔

حذیفہ' راحت اکبر سے اپنے حصے کا مطالبہ کرتا ہے اور باتوں باتوں میں انہیں جتا دیتا ہے کہ وہ جائیداد کا اصل وارث ہے اور باپ کے قاتل کو جان گیا ہے۔ راحت اکبر اور حذیفہ کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔

حذیفہ راحت اکبر کی چال بازیوں اور باپ کے قتل کا پتا چلا لیتا ہے اور اپنے حصے کی جائیداد لینے کا عزم کرتا ہے۔ چاندنی بیگم' نیلم کو فون پر باتیں کرتے سنتی ہیں تو اس کے گناہ کے بارے میں جان جاتی ہیں۔ نیلم اس گناہ کا الزام حذیفہ پر لگا دیتی ہے۔

راحت اکبر اپنے تمام خاندان والوں کے سامنے نیلم اور حذیفہ کے نکاح کا اعلان کرتے ہیں۔ مگر پروین بیگم نکاح سے ایک روز پہلے حذیفہ کو گھر سے جانے پر مجبور کردیتی ہیں۔ اسی رات نیلم بھی گھر سے بھاگنے کی تیاری کرتی ہے' مگر ٹیپو اسے لینے نہیں آتا۔

فارہ' عبیر کا رشتہ محلے کے ایک نکمے اور اوباش شخص یاسر سے طے کردیتی ہے۔ یاسر ان کے گھر آتا ہے تو فارہ کے حسن سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ فارہ اس سے بے حد اپنائیت سے ملتی ہے۔ یاسر کی عمر کا گھاگ آدمی ہے۔ اسے عبیر بالکل پسند نہیں آتی۔

چوتھی قسط

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟"

زویا اس کے کمرے سے نکلی تو وہ لاؤنج میں ہی موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کے حیران ہوئی لیکن پوچھا نہیں کہ وہ ابھی تک گیا کیوں نہیں۔ اسے یاد آگیا تھا کہ جب ایک چھوٹا سا بچہ سڑک پار کرتے ہوئے گاڑی کے نیچے آیا تھا تو یہ تب تک اسپتال جاتا رہا تھا جب تک کہ وہ بچہ ڈسچارج ہو کے وہاں سے اپنے گھر چلا نہیں گیا۔ وہ اتنا ہی نرم خو اور خیال رکھنے والا تھا۔ وہ جانتی تھی اور اس کی اسی خاموشی کی وجہ سے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن بہت رو رہی ہے۔" زویا نے اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے بتایا تھا وہ اس کے لیے ایسے پریشان ہو رہا تھا جیسے اسے برسوں سے جانتا ہو۔

"چائے پیو گے؟"

زویا جانتی تھی وہ اس کے ساتھ رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ جو لڑکی ان کی گاڑی سے ٹکرا کے بے ہوش ہوئی

تھی۔ وہ اسے اسپتال لے جانے کے بعد زویا کے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ ظاہر ہے لڑکی زخمی اور بے ہوش تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا اور زویا بھی اس معاملے میں اسی کی طرح فراخدل ثابت ہوئی تھی۔ اس نے خود ہی اس لڑکی کو اپنے ساتھ اپنے گھر رکھنے پہ آمادگی ظاہر کی تھی جس پہ ہینڈسم اس کا کافی ممنون بھی تھا۔

''نہیں، ہو سکے تو ناشتہ کروا دو۔۔۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں۔۔۔ مل کے بناتے ہیں۔ عبیر کو بھی کروادیں گے۔'' وہ اگلے ہی لمحے کہتے ہوئے اس کے ساتھ کچن میں کھڑا تھا۔ زویا نے اسے مسکرا کے دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ کچن میں کھڑا کتنا خوب صورت لگ رہا تھا۔

''تم بیٹھو وہاں جا کر میں بنا لیتی ہوں۔'' زویا نے چند لمحے بعد اسے دیکھ کے کہا تو اس نے جواباً حیرت سے دیکھا تھا۔

''کیوں بھئی۔۔۔ میں ہیلپ کروا دیتا ہوں ناں۔'' زویا نے مسکراہٹ دبائی۔ اب وہ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اسے اپنے سامنے بیٹھا دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس سے اس تصور میں کھونا چاہتی ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے اور وہ اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہی ہے جبکہ اسے آفس کے لیے نکلنا ہے۔

''کیا ہوا ہے ہنس کیوں رہی ہو تم؟ وہ شاکی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ زویا نے اسی طرح مسکراتے ہوئے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''کچھ نہیں اور وہاں چل کے بیٹھو۔۔۔ مجھے اپنے کچن میں کسی اور کی مداخلت پسند نہیں ہے۔'' زویا نے اس بار تحکم سے کہا تو ہینڈسم بغیر کچھ کہے لاؤنج میں سامنے والے صوفے پہ جا کے بیٹھ گیا تھا جہاں سے وہ زویا کو بہ آسانی دکھائی دے رہا تھا۔ اس دن زویا نے اپنے تخیل کو مضبوطی سے تھام کے ناشتہ تیار کیا۔ بس فرق اتنا تھا کہ اسے آفس جانا تھا لیکن وہ تیار نہیں تھا اور زویا اس کی منگیتر تھی بیوی نہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ منظر اتنا بھرپور اور خواب آگیں تھا کہ زویا نے خود پہ رشک کرتے ہوئے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔

ناشتہ بنا کے اس نے پہلے اس کے سامنے رکھا اور اس کے بعد وہ عبیر کے کمرے میں آئی جو جب سے ہوش میں آئی تھی بس روئے چلی جا رہی تھی۔

''تم ابھی تک رو رہی ہو؟ زویا نے اسے حیرت اور کچھ افسوس سے دیکھا۔ عبیر یہ سن کے بھی روتی رہی۔

''کب تک روؤ گی اس طرح۔۔۔ آخر تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دیکھو میرا یقین کرو۔ میں یقین کروں گی تمہارا۔'' زویا نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا۔۔۔ عبیر کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جھلملائے۔

''میرا یقین میرے بابا نے بھی نہیں کیا۔ میں تو ان کی بیٹی ہوں ناں پھر آپ تو مجھے جانتی بھی نہیں۔''
عبیر نے روتے ہوئے زویا کو دیکھا۔ رات کے آخری پہر وہ لڑکی اس کے لیے ایک فرشتے سے کم نہیں تھی۔ اس نے اسے سہارا دیا تھا۔ وہ اسے اگر وہ سب بتا دیتی اور اگر وہ اس کا یقین نہ کرتی تو وہ پھر وہ کہاں جاتی۔

''کیا ہوا ہے ایسا جو تم اتنا بے یقین ہو رہی ہو؟''
زویا نے اس کے ہاتھ پہ اپنا سپید ہاتھ رکھتے دبایا۔ وہ ایک عام سی شکل صورت کی سانولی سی لڑکی تھی جس کی آنکھیں بہت چمکدار اور روشن تھیں لیکن وہ اس کے سانولے چہرے پہ کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں ناکام تھیں۔

''میں اگر سب بتا دوں تو آپ میرا یقین کریں گی۔''
عبیر نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے آس سے پوچھا۔
زویا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔
وہ عبیر کو روتے ہوئے دیکھ کر اپنی جگہ اسی دروازے کے پاس ساکت ہو گیا تھا۔ وہ اپنے قدم آگے نہیں بڑھا پایا تھا۔

''معصوم سے چہرے پہ روئی روئی متورم آنکھیں
۔۔۔''

یہ آنکھیں اس نے بار بار دیکھی تھیں۔ نجانے کتنی ہی بار خواب میں۔ وہ سوچ میں پڑ جاتا کہ یہ آنکھیں آخر اسے خواب میں اتنا تنگ کیوں کرتی ہیں۔ اس کا ان آنکھوں کے ساتھ ایسا کیا تعلق ہے.... وہیں کھڑے کھڑے اس نے جیسے اس تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"تو کیا اس کا رب اس سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے۔"

ساری کہانی سنانے کے بعد عبیر نے زویا کو دیکھا اور رو دی۔

"بابا نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ فارہ کا کیا، میرا کوئی یقین نہیں کرے گا اب۔" عبیر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے نزدیک آیا تھا۔ اس نے عبیر کو دیکھا تھا۔

"عبیر! مجھے سب سچ سچ بتا دو لیکن اس سے پہلے تم اس بات کا یقین کر لو کہ اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ تمہارا یقین کوئی نہیں کرے گا تو میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دینے کو تیار ہوں کہ میں تمہارا یقین کروں گا۔" زویا نے اس لمحے چونک کے اسے دیکھا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ خدا کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ روتے روتے ایک بار پھر وہ سارا واقعہ دہرا گئی تھی... جب وہ خاموش ہوئی تو کتنی ہی دیر سے خاموش بیٹھے ہینڈسم نے اس کے سر پہ دوپٹہ اوڑھایا اور اسے تسلی دیتے ہوئے وہ چند الفاظ کہے جنہیں سن کے زویا جی جان سے لرز گئی تھی۔

"میں حذیفہ علی ولد ذوالفقار علی بقائمی ہوش و حواس اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ تمہارے ان آنسوؤں کی لاج رکھتے ہوئے میں ہمیشہ تمہارا یقین کروں گا اور تمہیں انصاف دلاؤں گا۔" یہ سن کر عبیر تو عبیر، زویا بھی چونک گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے یقین ہے کہ تم صرف اپنے باپ کی لاج اور عزت کے خیال سے خاموش تھیں۔ ورنہ تمہارا خون کھولتا تھا۔ میں جانتا ہوں۔ میں سب جانتا ہوں۔" حذیفہ علی کے لہجے میں کرب گھلنے لگا۔ اس کے ماضی کا عفریت اس کی ذات کو جکڑنے لگا... اور بہت کچھ پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح سے چلنے لگا تھا۔ اس کا رواں رواں درد کی پکار بن گیا۔

وہ اپنا درد چھپانے باہر آیا۔ زویا بھی اسی کے قدموں پہ قدم رکھتی باہر اس کی جانب لپکی۔ اس نے جو روپ اس کا آج دیکھا تھا اس حذیفہ سے تو وہ ناواقف تھی۔ اور آخر ایسا بھی کیا ہوا تھا اس کی زندگی میں کہ اس نے زویا کو آج تک وہ راز نہیں بتایا تھا لیکن اس انجان لڑکی پہ لمحے بھر میں آشکار کر دیا تھا۔

"تم نے اس لڑکی کا یقین کیسے کر لیا ہینڈسم... یہ بھی ہو تو سکتا ہے کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہو؟ وہ حیران تھی اور کم عقل بھی۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے..." حذیفہ بولا تو لہجہ ٹوٹا بکھرا ہوا سا تھا۔

"تم اتنا یقین کیسے کر سکتے ہو کسی غیر پہ۔" زویا کی آواز بلند ہوئی۔

"اس لیے کیونکہ میرا یقین بھی کسی نے نہیں کیا تھا... میں چچا جان سے کہتا رہا تھا کہ میں غاصب نہیں ہوں۔ میں نے گھر میں نقب نہیں لگائی لیکن میرا یقین کسی نے نہیں کیا... میں اس لڑکی کا کیا... میں ہر لڑکی اور لڑکے کا یقین کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بے یقینی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ اپنوں سے دوری کیا ہوتی ہے۔ چھ سال سے میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا زویا....! میں نہیں جانتا وہ زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ میں صرف ان کی قسم اور حکم سے مجبور ہو کے یہاں تنہائی کی زندگی جی رہا ہوں۔ تم نہیں سمجھو گی زویا.... تم نہیں سمجھو گی۔" وہ رو دیا تو زویا بھی رو دی۔

"اس رات میں بابا کے دوست کے گھر پہ گیا لیکن مجھے پتا چلا کہ ان کی تو ڈیتھ ہو چکی ہے اور ان کے بیٹے

سب بیچ باچ کے باہر جاچکے ہیں۔ رات کے آخری پہر میں اسلام آباد کی ٹھنڈ میں سڑک پہ بے آسرا کھڑا تھا۔ میری جیب میں پیسے تھے لیکن کسی اپنے کی محبت کا ساتھ نہیں تھا۔ میں بھری دنیا میں اکیلا ہو گیا تھا۔ میری ماں نہیں چاہتی تھی کہ مری جان جائے۔ اسی لیے اس کے مجبور کرنے پہ میں گھر سے بھاگا تھا ورنہ میں اتنا کمزور اور کم ہمت نہیں تھا کہ اپنے حق اور سچائی کے لیے آواز بلند نہ کر سکتا۔۔۔ اس ایک رات کی تنہائی اور خوف نے مجھے وہ سب اسباق پڑھائے جو میں شاید اس حویلی میں رہتا تو کبھی نہ سیکھ پاتا۔ میں جذباتی تھا۔ جو بھی منہ میں آتا تھا بول جایا کرتا تھا لیکن میں نے طے کیا کہ اگر مجھے زندگی میں کامیاب ہونا ہے تو پھر مجھے اس جذباتیت کو چھوڑنا ہو گا۔"

اس رات اسلام آباد سے کراچی والی بس میں میں بلا سوچے سمجھے بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا محاسبہ کرتے ہوئے قسمت کو اپنے پڑاؤ کا تعین کرنے دیا تھا۔ میں نے اس سارے راستے اپنے اندر سے پہلے والے جذباتی کم عقل حذیفہ کی ایک ایک بری عادت کو نوچ کے باہر نکالا تھا اور ہر ایک بات پہ خود سے عہد لیا تھا کہ ماضی کی کوئی غلطی نہیں دہراؤں گا۔

چھ سال کے بعد میں نے لاہور آفس کے لیے اپلائی اس لیے کیا کیونکہ اب میں بھی بھاگتے بھاگتے تھک چکا ہوں۔ میں اب سکون کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں واپس اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں میں اپنے اوپر لگے اس لیبل کو مٹانا چاہتا ہوں۔۔۔ جو اس رات میرے گھر چھوڑنے پہ مجھ پہ لگایا جا چکا ہو گا۔

میں نیلم کو معاف کر دینا چاہتا ہوں لیکن اس سے بھی پہلے میں اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں تاکہ میں جب یہاں واپس اپنی ماں کے ساتھ آؤں تو وہ مجھے ویسا ہی کامیاب اور خوش دیکھیں جس کے لیے انہوں نے اتنی صعوبتیں جھیلی ہیں۔"

"تم اتنے درد پالے ہوئے تھے اپنے اندر۔۔۔" زویا اس کی کہانی سننے کے بعد اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"آئی ایم پراؤڈ آف یو حذیفہ!" اس نے روتے ہوئے اسے دیکھا تھا، کہا تھا جو خود بھی رو رہا تھا۔ ماضی کا درد ایک بار پھر اس کے لہجے سے ہوتا ہوا اس کے پورے وجود کو توڑ پھوڑ گیا تھا۔ اس کے چہرے کی کرچیاں ٹکڑوں میں بٹ چکی تھیں اور زویا جانتی تھی کہ اس چہرے پہ اتنی خراشیں شروع سے تھیں۔ بس حذیفہ انہیں چھپائے اس لیے رکھتا ہے کیونکہ وہ اپنا بھرم گنوانا نہیں چاہتا۔

☆ ☆ ☆

وہ پوری رات اور پورا دن یاسر نے اپنے گھر میں کھولتے ہوئے گزارا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ فارہ اس کے ساتھ اتنا گھناؤنا کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔۔۔ یہ سچ تھا کہ وہ اس کے سحر میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اسے اس سحر میں گرفتار

کرنے والی فارہ ہی تھی لیکن عبیر اس سارے معاملے میں بے قصور بھی تھی اور انجان بھی۔

اس نے پہلے ہی دن سے عبیر کے لیے فارہ کے لہجے میں نظر آنے والی حقارت محسوس کرلی تھی۔ بعد ازاں وہ اس نفرت سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ فارہ عبیر کو سخت ناپسند کرتی ہے اور وہ جلد از جلد اسے اپنے گھر سے نکالنا چاہتی ہے۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا جب اس نے فارہ سے کہا تھا کہ وہ شادی کے بعد عبیر کے ساتھ روز شام کو یہاں آیا کرے گا تاکہ پہلے کی طرح یہاں ان سب کے ساتھ وقت گزار سکے تو فارہ نے چونک کے قدرے نفرت سے کہا تھا' شاید وہ اس وقت اپنے لہجے کے کھردرے پن کو چھپانا بھول گئی تھی جب ہی تو اتنی بے دردی سے بولی تھی۔

"ہرگز نہیں... عبیر شادی کے بعد اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی... میں پہلے ہی اسے اس گھر سے نکالنے کے درپے ہوں۔ اس لیے تو نہیں کہ شادی کے بعد بھی وہ میرے سر پہ منڈلاتی رہے... دیکھو۔" اس نے جوش جذبات میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"ایک احسان مجھ پہ کرنا' جب تک ہم کینیڈا نہ چلے جائیں۔ تم عبیر کو یہاں مت لانا۔ ہاں تم خود بے شک روز آیا کرنا تمہارا اپنا گھر ہے یہ۔" اس نے آخر میں نرمی سے کہا تھا۔ تو کیا وہ گھر عبیر کا نہیں تھا؟

"آپ کو اتنی بری لگتی ہے کیا وہ؟" اس نے جانے کس جذبے کے تحت پوچھ لیا تھا۔ شاید اس ہمدردی کے تحت جو اسے عبیر کی خاموش بے ضرر ذات سے ہو گئی تھی۔

"بری؟..." فارہ نے حیرت سے دہرایا تھا۔ "میں نفرت کرتی ہوں اس سے... اتنی شدید کہ اگر تمہیں اندازہ ہو جائے تو تم سنتے سنتے بہرے ہو جاؤ اور اگر کبھی میں اس نفرت کا زہر اس زمین پہ انڈیلوں تو زمین کا سینہ شق ہو جائے... آسمان لرز جائے۔

یہ وہ لڑکی ہے جو میری زندگی کھا گئی۔ سلطان احمد کبھی مکمل میرا ہو ہی نہیں سکا صرف اس کی وجہ سے... یہ وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے میں ہمیشہ ہی شرمندہ ہوتی رہی ہوں۔

مجھے رونمائی میں سلطان احمد نے اپنی بدصورت بیٹی کا تحفہ دیا جس کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے کھانا بنانا پڑتا اور سلطان احمد کو دکھانے کے لیے اسے اپنے ہاتھوں سے کھلانا بھی پڑتا۔ سلطان احمد کو میری فکر نہیں تھی اس کی تھی... میں سلطان احمد کی زندگی میں اس لیے تو نہیں آئی تھی کہ مجھے اس بدصورتی کے ساتھ گزارہ کرنا پڑے... میں کبھی سلطان کے ساتھ کہیں باہر نہیں جا سکی کہ اگر گئی تو یہ منحوس ساتھ جائے گی۔ مجھے کبھی بھی اس نے یہ اعزاز کیوں نہیں لینے دیا کہ ہم دونوں دنیا کے خوب صورت ترین کپلز میں سے ایک ہیں؟ یہ ہمیشہ ہمارے درمیان رہی... جب ہم کسی فنکشن میں ساتھ جاتے تو جانتے ہو ابھی ہم ایک دوسرے کی تعریف سے صحیح طرح خوش بھی نہیں ہوتے تھے کہ لوگ عبیر کے متعلق سوال کرنے لگتے... میری خوب صورتی اس کی بدصورتی کے سامنے بے معنی ہو کے رہ جاتی۔ اس وقت مجھے اس سے اتنی نفرت محسوس ہوتی کہ میرا جی چاہتا کہ یا تو میں اس کے وجود کو زندہ جلا دوں یا کہیں اسے کاٹ کے دور پھینک آؤں۔ آخر یہ لڑکی میری زندگی سے جاتی کیوں نہیں... پھر مجھے موقع مل گیا۔"

وہ مسکرا کے خاموش ہوئی تو یاسر چونکا۔

"کیسا موقع؟" لیکن وہ اتنی پاگل نہیں تھی کہ سب اگل دیتی۔ فارہ نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تم مل گئے نا۔ میں جانتی ہوں کہ تم عبیر کے ساتھ شادی کرلو گے تو میری زندگی اچھی گزر سکتی ہے۔ میں اپنی باقی کی زندگی سلطان احمد کے ساتھ گزاروں گی جب ہمارے درمیان کوئی نہیں ہو گا۔ عبیر کی نحوست تو بالکل بھی نہیں۔" وہ مسکرا کے یاسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بتا رہی تھی اور یاسر اس کی جانب بس دیکھ کے رہ گیا تھا۔

اسے اس وقت فارہ سے ہمدردی سی ہوئی تھی اور عبیر سے کوفت... وہ عبیر کی سنگت میں اپنی زندگی کیسے گزارے گا۔ لیکن اب اس پہ سب واضح ہو گیا تھا

۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ فارہ اپنی نفرت میں اتنی اندھی ہو چکی ہے کہ وہ عبیر کو اس حد تک پھنسا دے گی اور اندازہ تو اسے بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کرے گی اتنا گھناؤنا الزام۔ وہ اپنی ذات میں چاہے جتنا بھی برا سہی لیکن وہ عبیر کو اس طرح سے پھنسا کے خوش نہیں تھا اور شاید فارہ کی خوشی اسی میں تھی کہ عبیر سلطان کی نظروں میں جائے اور فارہ کو جان لینے کے بعد وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے آگے کا کیا سوچا ہے۔" اس روز وہ بہت دنوں کے بعد زویا کے گھر آیا تھا۔ عبیر کے سارے حالات جاننے کے بعد وہ دونوں اسی فیصلے پہ پہنچے تھے کہ عبیر فی الحال زویا کے ساتھ اسی کے اپارٹمنٹ میں رہے گی۔۔۔ کیونکہ عبیر پہ واپسی کے دروازے بند ہو چکے تھے اور حذیفہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ عبیر کے گھر والوں کو کچھ وقت دیا جائے تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔

عبیر نے آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا تھا۔ وہ زویا کا خیال ایسے ہی رکھنے لگی تھی جیسے کوئی بھی اپنی بڑی بہن کا رکھتا ہو وہ محبتوں کو ترسی ہوئی لڑکی تھی۔ جب یہاں اس نے خود کے ساتھ نرم اور محبت بھرا رویہ دیکھا تو کیسے نہ پگھلتی۔۔۔ اسے وہ دونوں کسی فرشتے سے کم نہیں لگتے تھے۔ کم از کم یہ دونوں انسان اس کی زندگی میں ایسے تھے جنہوں نے کبھی اس کی کم صورتی کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ جن کے لیے عبیر کی ذات اہم تھی۔ اس کی شکل کی اہمیت نہیں تھی۔

عبیر 'زویا کے لیے اس کے بن کہے ناشتہ تیار کر دیتی اور اس کے کپڑے بھی۔۔۔ زویا اس کی ایک ایک بات پر ممنون رہتی۔ جب بھی اس کے لیے چائے بنا کے لاتی تو اس کا ایسے شکریہ ادا کرتی جیسے اس نے کوئی بہت بڑا کام کر دیا ہو۔ عبیر شرمندہ ہونے لگتی۔

"آپ نے مجھ پہ اعتبار کر کے جو مجھے پناہ دی ہے، اس کے لیے میں تو شکریہ بھی ڈھنگ سے ادا نہیں کر

شام کو سلطان آئے تو فارہ نے عبیر کی ساس کا مطالبہ ان کے سامنے رکھا۔ وہ جو پہلے ہی اس رشتے پہ دل سے راضی نہیں تھے اب اور بھی جی مکدر کر بیٹھے۔ فارہ نے ان کی خاموشی دیکھی تو پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔

"کیا بات ہے سلطان۔۔۔ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"فارہ! تمہیں نہیں لگتا کہ یاسر ہماری عبیر کے لیے کچھ نامناسب سا ہے؟" بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے فارہ کی جانب دیکھا جو ان کی بات کا حوالہ اور متن سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں تو میں تو شکر کرتی ہوں کہ یاسر جیسا ہی سہی لیکن کوئی ملا تو سہی ہماری بیٹی کے لیے۔ اب اگر آپ اس کے مطالبات سن کر پریشان ہیں تو اندازہ کریں کہ کسی اچھے خاندان میں عبیر کو بیاہنا کس قدر مشکل کام تھا۔" سلطان فارہ کی بات سن کے خاموش ہو جاتے تھے۔ ویسے بھی وہ ان کے سامنے حالات پیش ہی اس انداز میں کرتی تھی کہ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہتے تھے۔

"مگر پھر بھی فارہ۔۔۔ ہماری عبیر اور یاسر میں بہت فرق ہے۔" آج وہ پہلے کی طرح خاموش نہیں رہ سکے تھے۔ فارہ نے انہیں چونک کے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے۔۔۔ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں نے آج یاسر کو چوک میں کسی سے بائیک، موبائل اور پیسے چھینتے دیکھا ہے۔"

سلطان احمد کہہ کے خاموش ہوئے اور فارہ تو کتنی ہی دیر اپنی جگہ سے ہل ہی نہ سکی۔ جو بھی تھا وہ سلطان کو یاسر کا یہ روپ شادی سے پہلے نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ سلطان کی پدرانہ شفقت بیدار ہو اور وہ عبیر کے رشتے سے انکار کر دیں۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" فارہ نے اپنے لہجے کو مضبوط بنایا۔

"میرا دل بہت خراب ہوا دیکھ کے۔ نجانے کیوں

مگر مجھے ایسا لگا' جیسے میں عبیر کے ساتھ کوئی زیادتی کر رہا ہوں۔" سلطان احمد نے آزردگی سے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ... ہماری بیٹی ہے وہ۔ ہم اس کی خوشی اور بھلائی کے لیے ہی تو یہ سب کر رہے ہیں نا اور میرا نہیں خیال کہ وہ باسر ہوگا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" فارہ نے بات کو یوں چٹکی میں اڑایا گویا یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں۔

"میں دھوکا کیسے کھا سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اس کی شہرت اور ویسے بھی میں نے ان کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی باتیں سنی ہیں۔" سلطان احمد کی سوئی ابھی بھی اسی بات پہ اٹکی ہوئی تھی۔

"اچھا' آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں پوچھ لوں گی یاسر سے۔"

یہ کہہ کے وہ اٹھ گئی تھی لیکن واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ سلطان کے لیے وہ کھانے پہ خاص اہتمام کیا کرتی جس میں سلاد چٹنی' رائتے کے ساتھ کوئی بھی ایک سالن کی ڈش اور میٹھا ہوا کرتا تھا۔

"عبیر کہاں ہے....؟"

سلطان احمد نے لقمہ توڑتے ہی پوچھا فارہ کا گلاس میں پانی ڈالتا ہاتھ تھم سا گیا۔ یہ آج سلطان کو کیا ہو گیا تھا؟ انہوں نے تو اس واقعے کے بعد اب تک عبیر کا نام تک نہیں لیا تھا۔ یہاں تک کہ فارہ کو لگتا تھا کہ سلطان بھول چکے ہیں کہ عبیر نامی ان کی کوئی بیٹی بھی ہے۔

"وہ اپنے کمرے میں ہوگی۔" اس نے اپنے لہجے کو سرسری بنانے کی کوشش کی۔

"اسے بلا کے لاؤ کہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے۔"

سلطان احمد نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب فارہ کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کوئی خاص بات ہوئی ہے۔

"سلطان! وہ کھانا کھا چکی ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم اس سے کہو کہ آ کے ہمارا ساتھ دینے کو ہی بیٹھ جائے۔ میرے آنے پہ وہ کیوں کمرہ نشین ہو جاتی ہے۔"

سلطان یہ کہتے ہوئے بھول گئے تھے کہ ایسا ان کے اپنے رویے کی وجہ سے ہے۔ فارہ کی جان پہ بن آئی۔ وہ بنا بنایا کھیل اتنی آسانی سے ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتی تھی۔

"وہ نہیں آئے گی سلطان! تم کھانا شروع کرو۔" فارہ نے بات کے اثر کو زائل کرنے کی خاطر خود پہلا نوالہ توڑ کے منہ میں ڈالا لیکن اگلے ہی لمحے سلطان اٹھ کے چپل پہن رہے تھے۔

"ٹھیک ہے میں اسے خود بلا کے لاتا ہوں۔"

فارہ چیل کی سی تیزی سے سلطان تک پہنچی تھی۔

"آپ کیوں جاتے ہیں؟ میں جاتی ہوں ناں' آپ بیٹھیں یہاں۔"

فارہ بے وقوف نہیں تھی جو سلطان کو جانے دیتی۔ اگر سلطان خود بیٹی کے پاس چلے جاتے تو باپ بیٹی کی ساری غلط فہمیاں ختم ہو جاتیں اور وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ فارہ عبیر کو بلانے گئی وہ جو سر شام ہی باپ کے آنے پر کمرہ میں محصور کر دی جاتی تھی۔

"سنو! تمہیں سلطان بلا رہے ہیں اور یہ مت سمجھنا کہ وہ تمہیں معاف کر چکے ہیں بلکہ ہم تمہاری شادی کر رہے ہیں تو سلطان نے سوچا کہ تم سے بھی تمہاری رائے پوچھ لی جائے۔ اب ندیدوں کی طرح منہ پھاڑ کے فرمائشیں نہ کرنے لگ جانا.... بس بول دینا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

سلطان احمد کے پاس لانے سے پہلے وہ اسے سارے اسباق رٹا چکی تھی۔ عبیر کچھ نہیں بولی حتیٰ کہ جب سلطان احمد نے اسے اپنے گلے سے لگا کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا تھا تب بھی.... عبیر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ وہ اپنے بابا کو بتائے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ ان سے شکوہ کرے کہ بابا اتنے دن گزر گئے' آپ کو عبیر کا خیال کیوں نہیں آیا لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

"کیوں ہر وقت اندر ہی گھسی رہتی ہو عبیر!" وہ

اس کے بالوں کو ماتھے پہ سنوارتے بولے تو عبیر کی روح کرلانے لگی۔
"مجھے فارہ باجی آپ کے پاس نہیں آنے دیتیں بابا۔" وہ رو دی۔
"کتنی جلدی بڑی ہوگئیں تم عبیر، دیکھو کہ آج ہم تمہاری شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔" وہ اس سے بہت محبت سے کہہ رہے تھے۔
"نہیں۔۔۔ میں ایک دن میں بڑی نہیں ہوئی۔ مجھ سے پوچھیں ان دن راتوں کی اذیت۔۔۔ جو تنہائی کے عفریت کے شکنجے میں پھنس کے میں نے کاٹی ہیں۔" بین جاری ہوگئے تھے لیکن عبیر کے لب خاموش رہے۔
"تمہیں جو بھی چاہیے ہو' بتادو۔ تمہارا باپ اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے کہ تمہیں اچھا جہیز نہ دے سکے۔" وہ اب اس کا چہرہ اپنی جانب موڑ کے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔
"ہاں مجھے بہت کچھ چاہیے بابا۔۔۔ مجھے جہیز میں آپ کی محبت اور آپ کا اعتبار چاہیے۔۔۔ مجھے ایسا یقین دے دیں بابا کہ پھر اس کے بعد آپ کبھی مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔۔۔ مجھے کچھ نہ دیں لیکن مجھے یہ یقین ضرور دے دیں بابا۔"
"بھلا اسے کیا چاہیے ہوگا سلطان! ہم خود کوئی کمی چھوڑیں گے تو یہ کسی اور چیز کی فرمائش کرے گی نا۔" فارہ کو فوراً ہی خدشہ ہوا تھا کہ وہ کہیں واقعی میں کوئی مہنگی فرمائش کر ہی نہ دے اسی لیے کہہ گئی تھی۔ عبیر اس کی بات سن کر استہزائیہ ہنسی ہنسی تھی' فارہ کتنا خوفزدہ تھی۔
"کچھ تو کہو عبیر بیٹا۔ اتنی خاموش کیوں ہو؟"
"اوہو سلطان! اب کیا وہ اپنی شادی کی بات پہ بھنگڑا ڈالے گی۔ لڑکیاں ایسے موقعوں پہ خاموش ہی رہا کرتی ہیں۔" جواب اب کی بار بھی فارہ نے ہی دیا تھا۔ سلطان اس بار کچھ خاموش ہوگئے۔
"فارہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں بابا۔۔۔ مجھے واقعی میں کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کوئی کمی رہنے ہی نہیں دیں گے۔" یہ کہہ کے وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی اور اپنے کمرے میں آکے پھوٹ پھوٹ کے رودی تھی۔ اس کے بابا کو اب کیوں یاد آیا تھا کہ عبیر کی مرضی اور خوشی بھی پوچھنی ہے۔ کاش کہ وہ اس سے اب بھی نہ پوچھتے۔

"تم پوری پاگل ہو عبیر! نجانے تم ہر بار ہی فارہ کے ہاتھوں کیوں بے وقوف بن جاتی ہو۔"
وہ اس روز بہت دنوں کے بعد چھت پہ آئی تو رکزی بھی موجود تھی۔ اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد وہ اس سے کہہ رہی تھی حالانکہ رکزیٰ اب ان کے گھر آتی تھی نہ ہی عبیر۔ اس واقعے کے بعد سے فارہ نے خود ہی رکزی کو اپنے گھر آنے سے منع کردیا تھا۔ رکزیٰ اور فارہ کی تو ویسے ہی نہیں بنتی تھی۔ دونوں میں خوب زبردست معرکہ ہونے کے بعد رکزی اور فارہ نے ایک دوسرے پہ تین حرف بھیجے اور ایک دوسرے کا کبھی دوبارہ آمنا سامنا کرنے کا عہد کرلیا۔ لیکن جب بھی عبیر کا چھت پہ چکر لگتا اور اگر وہاں پہ رکزیٰ پڑھنے کے لیے موجود ہوتی تو اس سے بات کیے بغیر رہتی نہیں تھی۔
عبیر بھی اسے اپنا حال احوال لازمی سنادیا کرتی تھی جو بھی تھا' رکزیٰ نے ہمیشہ اس کے ساتھ دوستی نبھائی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کا سہارا بنی تھی۔
"میرے بے وقوف بننے سے اگر بابا کو خوشی ملتی ہے تو میں بخوشی بن جاؤں گی۔" عبیر نے سادہ لہجے میں کہا تھا۔
"کیوں کروگی تم ایسا۔۔۔ تم قربانی کا بکرا بن کے خود کو ہر جگہ کیوں پیش کردیتی ہو عبیر؟" رکزی کو تاسف ہوا۔ عبیر پہلے سے زیادہ ٹوٹ چکی تھی۔
"تو اور کیا کروں میں رکزی۔۔۔ میرے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ ہے نہ ہی کوئی اور راستہ۔۔۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اس دنیا میں آنے کا مقصد باوجود کوشش کے بھی سمجھ میں نہیں آتا لیکن میں خوش

نصیب ہوں کہ مجھے یہ بات جلدی سمجھ میں آگئی۔ کچھ لوگوں کو اللہ محکوم بنا کے بھیجتا ہے ان لوگوں کو لیے جو حکمرانی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ میں بھی اسی محکوم مخلوق میں سے ہوں جیسے صرف فارہ کے لیے پیدا کیا گیا ہے.... جب میرے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو میرے ساتھ کچھ بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے یار ...." عبیر نے حد درجہ منافقیت سے کہا تو رکزی نے اسے بہت افسوس سے دیکھتے فارہ سے اور بھی نفرت محسوس کی۔

"میری شادی میں ضرور آنا۔ اگر تم آؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔" یہ کہہ کے وہ چلی گئی لیکن رکزی اس کے جانے کے بعد بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی .... کتنے ہی انمول رتن وقت کی سفاکی کے ہاتھوں بے مول ہو چکے تھے۔ عبیر سلطان ان ہی میں سے ایک تھی۔

☆ ☆ ☆

"توبہ توبہ فارہ جی .... میں کیوں کسی کی جیب کاٹنے لگا بھلا .... آپ کو اپنا یاسر ایسا لگتا ہے کیا؟" فارہ کے استفسار پہ یاسر نے فارہ کو شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم داماد ہو ہمارے .... میرے یاسر نہیں۔" فارہ کو اس کا آپ کا یاسر کہنا بڑا ہی ناگوار گزرا تھا اسی لیے فوراً "ٹوک دیا۔

"اب داماد ہونے کے ناتے اتنا حق تو بنتا ہی ہے ناں میرا کہ اپنی ساس کو اپنا کہہ سکوں۔" وہ پکی عمر کا نشانے باز مرد تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ چوک جاتا .... اور پھر حوصلہ دینے والی بھی تو فارہ خود ہی تھی۔

"دیکھو، میں تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں کہ اپنی سرگرمیاں بند کر دو .... جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔ سلطان پہلے ہی کافی پریشان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس شادی سے انکار ہی کر دیں۔" فارہ نے دو ٹوک انداز میں اس سے کہا تو یاسر فوراً "ہی سنبھل گیا۔ ایسا تو وہ بھی نہیں چاہتا تھا۔

"جو حکم سرکاری وہی بنے گی ترکاری۔" یاسر نے لہک کے ندیدے انداز میں اپنے ڈیلے پھاڑتے ہوئے فارہ کو دیکھ کر کہا تو اسے جی بھر کے غصہ آیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بس اس طرح کے ڈرامے اب بند کرو اور کوشش کرو کہ کہیں جاب ڈھونڈ لو.... شادی کے بعد تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا یا نہیں؟"

"لو.... شادی کے بعد کیوں.... میں تو شادی سے پہلے ہی جاب تلاش کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ جب کینیڈا آؤں تو کوئی ہنر تو ہاتھ میں ہونا چاہیے کہ نہیں۔ اب ساری زندگی اپنے سسر جی پہ بوجھ تھوڑی نہ بنوں گا میں۔" وہ پکی عمر کا موٹا تازہ مرد لاڈ سے نرم و نازک سی فارہ کے سامنے ایسے کہہ رہا تھا جیسے وہ کوئی دس سال کا بچہ ہو فارہ کو وہ اس سے پہلے اتنا برا کبھی نہیں لگا تھا۔

"تم سے کس نے یہ کہہ دیا کہ تم کینیڈا جاؤ گے یا ہم تمہیں بلائیں گے؟" فارہ نے سوچ لیا تھا کہ آج اس کی خوش فہمی کو ختم کر کے ہی رہے گی۔ ویسے بھی رات سے اس کا موڈ خراب تھا۔ سلطان اور عبیر کی صلح نے اسے ایک بار پھر خدشے میں ڈال دیا تھا۔

"میری اماں نے بتایا تھا۔" یاسر کے لہجے میں بلا کی سادگی تھی۔ فارہ کو سکینہ بوا پہ خوب تاؤ چڑھا۔

"دیکھو ہم بہت اچھے ہو یاسر اور بہت غیرت مند بھی.... اور میں جانتی ہوں کہ تمہارے جیسا خاندانی شخص اس بات کو قطعی پسند نہیں کرے گا کہ وہ اپنی سسرال والوں سے لے کے کھائے یا ان کے ساتھ رہے۔"

"ہاں جی میں تو ایسا نہیں چاہتا۔" یاسر نے اگلے ہی لمحے سینہ پھلایا تھا۔ "لیکن اماں کہتی ہیں کہ آپ لوگ یہ سب کچھ مجھے تھوڑی نہ دو گے۔ اپنی بیٹی کو دو گے.... وہ ہے بھی تو اکلوتی۔" یاسر نے کچھ اس انداز میں شرما کے کہا کہ فارہ کتنی ہی دیر کھڑی اس کی ڈھٹائی پہ کھولتی رہی۔

"ہاں بیٹی کو تو دیں گے لیکن عبیر خود نہیں چاہتی

کہ وہ ہم سے کوئی فیور لے۔" فارہ کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں میں عبیر کو سمجھالوں گا لیکن آپ سے دور کسی قیمت پہ نہیں رہوں گا ہاں میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں فارہ جی! سچ تو یہ ہے کہ آپ کو ایک دن نہ دیکھوں تو لگتا ہے کہ آج سورج طلوع ہی نہیں ہوا عجیب بے چینی سی پورے وجود میں پھیلی رہتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے کہ جیسے میں مرجاؤں گا اگر ایک بھی دن آپ کو دیکھے بغیر گزار دیا تو۔"

جوش جذبات میں یاسر نے فارہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے ساختہ کہہ کے اپنے لبوں اور پھر آنکھوں سے لگا لیا تھا۔ فارہ نے اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔ اور اگلے ہی لمحے زور سے اس کے منہ پہ تھپڑ مار دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یاسر اس کے بارے میں ایسی باتیں سوچنے لگے گا۔

"بے شرم۔۔۔ نیچ ذات۔۔۔ تیری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟"

فارہ غصے سے کھولتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ غم و غصے سے اس کا تنفس پھول رہا تھا اور وہ شعلہ بار نگاہوں سے یاسر کا سانولا چہرہ گھور رہی تھی جو ہتک کے مارے سرخی مائل ہو رہا تھا۔ اس کا لحاظ بھی نجانے کہاں جا سویا تھا اسی لیے وہ بھی جب بولا تو لہجے میں انگارے دہک رہے تھے۔

"کیوں کیا میں تجھ پہ کوئی حق نہیں رکھتا۔۔۔ سارے حقوق کیا صرف سلطان کے لیے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے وہ شرافت اور اس گھر کا داماد ہونے کا احساس بھلائے بس ایک مرد بنا اس سے سوال کر رہا تھا۔۔۔ فارہ نے قہر آلود نگاہیں اس پہ جمادیں۔

"اپنی بکواس بند کرو، کمینے تم۔۔۔ تمہیں شرم آنی چاہیے مجھ سے ایسی بات کرتے ہوئے میں رشتے میں تمہاری ساس لگتی ہوں۔"

یکایک فارہ کو احساس ہوا کہ یاسر اس کے اور اپنے رشتے کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ہے اسی لیے اس نے بتانا ضروری سمجھا تھا۔

"ساس ہوتیں تو مجھ سے فاصلہ رکھ کے ملتیں۔ مجھے اس طرح سے روز روز بلا کے اپنے حسن کے قصیدے نہ سنتیں۔ میرے لیے روز اتنا سجتی سنورتی نہیں۔ میرے لائے تحائف نہ استعمال کرتیں۔۔۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں کیا اتنا پاگل ہوں جو یہ نہ سمجھ سکوں کہ تم اپنی بدصورت بیٹی کو میرے گلے کیوں باندھ رہی ہو اور کیسے۔۔۔ تم نے جان بوجھ کے مجھے اپنا اسیر کیا تاکہ میں تمہارے حسن کے جال میں قید ہو کے تمہاری بیٹی سے شادی کرلوں۔۔۔ بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

فارہ کا جی چاہا وہ کوئی چیز اٹھا کے اس کے سر پہ دے مارے یا اس کے منہ میں کوئی سخت سی چیز ٹھونس دے تاکہ وہ یہ سچ اگلنا بند کردے جو آئینہ اسے یاسر دکھا رہا تھا اس میں فارہ کی شکل بہت کریہہ تھی۔

"دیکھو یاسر۔۔۔ مجھے لگتا ہے، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہے ہو۔" فارہ نے سر جھکاتے ہوئے بھی اپنے لہجے کو ہموار کیا۔

"یاسر نے دنیا دیکھی ہے۔۔۔ کچھ غلط نہیں سمجھا میں۔۔۔ اس لیے اب زیادہ میرے ساتھ آنا کانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مطلب کی بات کرتے ہیں۔" وہ بدلحاظ تھا اور بے دید بھی، فارہ کو اس سے احساس ہوا تھا۔ فارہ نے بے ساختہ پوچھا۔

"کون سے مطلب کی بات۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جس طرح تم اپنی سوتیلی بیٹی کو میرے سر تھوپنے کی کوشش میں ہو۔ اسی طرح میری بھی ایک ڈیمانڈ ہے جو تمہیں پوری کرنی ہوگی ہاں۔۔۔ ورنہ میں تمہاری بیٹی سے شادی نہیں کروں گا۔" یاسر کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ فارہ چند لمحے تو کچھ بول ہی نہ سکی۔

"کہنا کیا چاہتے ہو تم؟" فارہ نے ایک خوف کی لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس کی۔ کچھ تھا جو بہت غلط ہوا تھا۔

"ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو کے اصول پہ ہی اس

کائنات کا نظام چالو ہے ۔۔۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری بیٹی کو عزت سے بیاہ کر اپنے گھر لے جاؤں تو کل رات دس بجے اپنی چھت پہ آجانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا اور اگر تم نہ آئیں تو یہ بھی یاد رکھنا کہ صبح کو سورج طلوع ضرور ہو گا لیکن تمہارے لیے نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ فارہ کتنی ہی دیر اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

اپنے بچھائے جال میں وہ خود ہی پھنس چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سوتے سے یکدم اٹھ بیٹھا۔

معصوم سے چہرے پہ دو روئی روئی آنکھیں تھیں جن میں گلابی ڈورے تیرتے ۔۔۔ تھے۔ اس نے خود کو ان آنکھوں کی سرخی میں ڈوبتے دیکھا۔ اس کے پورے وجود میں ایک بے بسی و بے چینی بھرتی جارہی تھی۔ اس کا جی چاہا یا وہ ان آنکھوں کے ۔۔۔ سیل رواں کو ختم کردے یا پھر اپنی آنکھیں نوچ ڈالے۔

اس نے بیدار ہو کے ٹھنڈی گہری سانس بھری۔۔۔ یہ خواب اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے تھے۔ اس نے ان آنکھوں کو کوئی تیسری مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے ایک سال پہلے ایسا ہی ایک خواب دیکھا تھا لیکن اس کے بعد یہاں آنے کے بعد یہ تین ہفتوں میں دوسری بار تھا جب وہ اس معصوم سے چہرے پہ سجی دو آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔۔۔ وہ ایک لڑکی کا چہرہ تھا جو اس قدر واضح تھا کہ اسے لگتا تھا اگر کبھی زندگی میں اس کا سامنا اس لڑکی سے ہوا تو وہ اسے پہچان لے گا۔ مگر اسے اس بات کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اسے اس چہرے سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اسے وہ آنکھیں ایسے عفریت کی مانند لگتیں جیسے وہ اگر ان کی طرف دیکھے گا تو وہ اسے جکڑ لیں گی تمام عمر کے لیے اور وہ اسی بات سے ڈرتا تھا۔

وہ عورت ذات سے ڈرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے فارہ۔۔۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" سلطان احمد نے اسے کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھے دیکھا تو پوچھے بنا رہ نہیں سکے۔ فارہ پہلے تو چونکی لیکن پھر سنبھل گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بس یہ سوچ رہی تھی کہ عبیر کی شادی کے لیے ہال بک کروا لیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پہ کوئی جگہ خالی ہی نہ ملے۔"

فارہ نے اپنی شاطرانہ فطرت کے تحت بات بنائی۔

"ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا انشاءاللہ!" وہ مسکرائے تھے۔

"پھر بھی اگر وقت پہ انتظام نہ ہو سکا تو اچھا۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" فارہ یہ کہہ کے اٹھ گئی تھی۔ کچن میں آ کے اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یاسر والے معاملے کو وہ کس طرح سے سنبھالے ۔۔۔ یاسر نے اسی پہ بس نہیں کیا تھی بلکہ یہاں سے جانے کے بعد بھی اسے میسج کر کے یاددہانی کرواتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ یک لخت ہی بدلا تھا۔ وہ جو اسے فارہ جی کہتے نہ تھکتا تھا اب اس کا نام لیتے دھمکیاں دینے پہ اتر آیا تھا۔ وہ شام سے اسے میسج پہ میسج کر کے دھمکا رہا تھا کہ اگر وہ اس سے ملنے چھت پہ نہ آئی تو وہ اس کے ساتھ کچھ ایسا کرے گا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہے گی۔

فارہ کو اب اپنی غلطی پہ پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ کیسے اس دو ٹکے کے آدمی کے ہاتھوں خوار ہو رہی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اسے اپنی تعریف اچھی لگتی تھی لیکن وہ کوئی بدکردار عورت تھی نہ ہی یاسر ایسا ہیرو ٹائپ ۔۔۔ ہاں فارہ نے اسے اپنی مٹھی میں کرنے کی سازش ضرور کی تھی ــــــــ کہ وہ عبیر کے لیے گڑھا کھودنے جا رہی تھی اور اب وہ اس میں خود گرنے والی تھی۔

"میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔۔۔ میں ہمیشہ سلطان کی وفادار رہی ہوں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اب کسی کو اپنی جانب نگاہ غلط ڈالنے کی اجازت دے دوں۔۔۔ یہ یاسر بھی صرف مجھے دھمکا رہا ہے یا جان بوجھ

کے اوور ایکٹنگ ... اسے عادت بھی تو بہت ہے ڈرامے کرنے کی۔ میرا نام بھی فارہ ہے۔ اتنی آسانی سے میں بھی اس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ بس ایک بار شادی ہو جائے ایسی جگہ پھینکوں گی ان دونوں کو۔ دوبارہ بھی منہ نہیں لگاؤں گی۔"

فارہ نے طے کرلیا تھا۔ چائے ابل کے آدھی رہ گئی تھی اور شاید سلطان احمد بھی اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے۔

"آبھی جاؤ فارہ... اور کتنی دیر لگاؤ گی... میں نے مہمانوں کی لسٹ فائنل کرنی ہے۔ ابھی تو بہت سے کام ہیں۔ جلدی سے چائے لے آؤ۔"

وہ اسے اپنی ہی دھن میں بلا رہے تھے اور وہ فارہ اپنی پریشانیوں میں گھری جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

چاندنی بیگم نے زمین پہ بیٹھ کے بین ڈالنا شروع کیے تھے۔ آن واحد میں ان کی کراہٹیں پورے گاؤں میں کسی وحشت زدہ بھٹکتی ہوئی بدروح کی مانند چکرانے لگی تھیں۔

معمول کے مطابق وہ صبح نیلی کے کمرے میں گئی تھیں لیکن نیلی وہاں نہیں تھی۔ انہیں لگا جیسے اب وہ کسی کو منہ نہیں دکھا سکیں گی لیکن وہ یہ نہیں جان سکیں کہ وہ زندہ درگور ہونے والی ہیں... ان کی نگاہ بے ساختہ چھت سے لٹکتے ہوئے پنکھے پہ پڑی تھی اور اس سے ہوتی ہوئی پنکھے سے جھولتے نیلم کے وجود پر... ان کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی تھی... نیلم نے خودکشی کرلی تھی۔

آن واحد میں ان کی دل دوز چیخوں کے باعث پورا گھر اکٹھا ہو گیا تھا۔ راحت اکبر بھی مردان خانے سے اسی وقت آئے تھے۔ انہوں نے اچانک اپنی کمر کو جھکتا محسوس کیا اور وہ ایسے جھکے تھے کہ دوبارہ کبھی اپنی کمر سیدھی نہیں کرسکے تھے۔

نیلم نے اپنی جان دے دی تھی۔ شاید وہ اپنی ہار برداشت نہیں کرپائی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ٹیپو اس کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ اس نے تو اس سے محبت کی تھی اور جو اس نے کہا تھا اس پہ آنکھیں بند کرکے عمل کیا تھا لیکن وہ یہ کیوں نہ جان سکی کہ ٹیپو اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ وہ کیسے جی پاتی بھلا اس نے تو ٹیپو کی خاطر اپنی آبرو اپنے باپ کی عزت تک... کی پروا نہیں کی تھی۔

راحت اکبر کا خاندان پوری طرح سے تباہ ہو چکا تھا۔ ببول بو کے کوئی گلاب نہیں اگا سکتا۔ اگر چاندنی بیگم اور راحت اکبر نے اپنے سگے بھائی کی بیوی اور بھتیجے کے ساتھ زیادتی کی تھی تو انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ ان کے ساتھ اچھا ہو گا۔

بات کھل کے پوری طرح سے سامنے آچکی تھی۔ پورے گاؤں سیاسی حلقوں میں ان کی بری طرح سے بدنامی ہو رہی تھی۔ سب ہی کہہ رہے تھے کہ راحت اکبر کی بیٹی ان کے بھتیجے کے ساتھ ناجائز تعلقات کے بعد اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور وہ عین وقت پہ اسے چھوڑ کے کہیں بھاگ گیا تھا۔ کچھ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ حذیفہ نے راحت اکبر سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیا ہے۔ لیکن وہ راحت اکبر ہی تھے جو خود اصل بات سب کو بتا رہے تھے۔ پروین بیگم کو لگ رہا تھا کہ ان کا دماغ الٹ گیا ہے۔ وہ جب نیلم کا جنازہ اٹھنے کے بعد پروین بیگم کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ان کے سامنے زمین پر ان کے قدموں میں جھک گئے تھے۔

پروین بیگم نے اس فرعون صفت شخص کی بے بسی کو نم آلود نگاہوں سے دیکھا۔ جو بھی تھا انہیں دکھ تھا کہ وہ اس حال تک پہنچ گئے تھے اور پچھتانے والی ان کی اپنی اولاد تھی۔

"اپنے بیٹے کو بلاؤ پروین بیگم... اسے بلاؤ۔ میں اسے اس کی ساری جائیداد کا پائی پائی کا حساب دینا چاہتا ہوں۔ شاید مجھے سکون آجائے۔ شاید میری نیلی کی سزا میں کمی ہو جائے۔ اسے بلاؤ۔" وہ وہیں زمین پہ گر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے۔ پورے گاؤں نے دیکھا تھا کہ اللہ کا انصاف کیسے نازل ہوتا ہے۔

"مجھے معاف کر دو پروین بیگم! مجھے معاف کر دو میں نے ہمیشہ ظلم کیا۔" وہ ان کے قدموں میں گرے روتے ہوئے ان سے کہہ رہے تھے۔
ان کے کانپتے ہاتھوں میں وہ کاغذ لرز رہا تھا جو نیلم نے اپنے مرنے سے پہلے اپنے والدین کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے اپنی تمام غلطیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ حذیفہ کی بے گناہی کا بھی اعتراف کیا تھا۔ اس نے سب سچ لکھ دیا تھا کہ کس طرح اس نے ٹیپو کے کہنے میں آ کے خود کو بدنامی اور رسوائی کے گڑھے میں اتارا تھا۔ اسے دکھ تھا کہ وہ کیوں اتنی اندھی ہو گئی تھی۔ پروین بیگم نے بے بسی سے انہیں دیکھا اور خود سہارا دے کے انہیں کھڑا کیا۔
"اٹھیے بھائی صاحب... میں نے آپ کو اپنے شوہر کا خون معاف کیا۔ میرا اللہ بھی آپ کو معاف کرے لیکن میں حذیفہ کو اب کبھی واپس نہیں بلاؤں گی کیونکہ میں اپنے بیٹے کو اس ماحول میں دوبارہ واپس نہیں لانا چاہتی۔"
"یہ سب کچھ اسی کا تو ہے۔ اسے بلاؤ۔ تاکہ میں جیتے جی اس کے ہاتھ میں سب دے سکوں۔" راحت اکبر نے کہا لیکن پروین بیگم اتنی بے وقوف نہیں تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی بابا جان کہ میں سمجھ ہی نہیں سکی کہ میں اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنی عزت و آبرو کا سودا کر رہی ہوں۔ محبت کرنے والے تو عزتوں کے محافظ ہوا کرتے ہیں۔ میں نے بھی کیسے شخص سے دل لگا لیا تھا جو مجھے خود ہی ایسے اسباق پڑھا رہا تھا... میں کبھی آپ سے معافی نہیں مانگوں گی بابا جان! نہ ہی آپ کبھی مجھے معاف کیجئے گا کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھے معاف کریں اور میری سزا میں کمی ہو... میں چاہتی ہوں میری طرح وہ سب لڑکیاں جو اپنے والدین کی عزت کی پروا نہ کرتے ہوئے محبت کے حصول کے لیے اندھی ہو جاتی ہیں وہ کسی بڑے نقصان سے پہلے ہی سنبھل جائیں۔"
راحت اکبر نے نجانے کتنی ہی مرتبہ اس کے خط کو پڑھا تھا۔ وہ روز ہی نہ جانے کتنی مرتبہ اس خط کو پڑھا کرتے تھے۔
"چائے لیں گے چودھری صاحب؟" چاندنی بیگم نے ان کے پاس آ کے آہستگی سے پوچھا۔ نیلی کی موت نے ان کا سارا طنطنہ نکال دیا تھا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" راحت اکبر نے آنکھیں موندتے ہوئے نیلی کی لکھی تحریر کو اپنے ہاتھوں میں بند کیا۔ چاندنی بیگم نے ان کے بوڑھے ہاتھوں میں لرزتے اس کاغذ کو دیکھا۔
"کب تک آپ اس خط کو پڑھتے رہیں گے؟"
"جب تک میں اپنی نیلی کے قتل کا بدلہ نہیں لے لیتا۔" راحت اکبر اسی انداز میں جواب دیا۔
"کہاں سے ڈھونڈیں گے آپ اسے... اور نیلم کا قاتل صرف وہ لڑکا ہی تو نہیں حذیفہ بھی تو ہے۔ اگر وہ اس وقت ہماری نیلی سے شادی کر لیتا تو وہ کبھی اس لڑکے کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کے اپنی جان نہیں لیتی۔"
"خدا کا خوف کرو چاندنی بیگم... کچھ تو اللہ خوف کرو۔ تمہیں ابھی بھی اس بچے پہ ترس نہیں آتا۔ اتنا بڑا دکھ سمیٹنے کے بعد بھی... ہمیں سزا دی ہے ہمارے رب نے۔ ہمارے کریہہ افعال کی اور تم کیسی ناعاقبت اندیش عورت ہو جو ابھی تک بجائے توبہ کرنے کے..." غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ بے ساختہ خاموش ہوئے اور قہر آلود نگاہوں سے چاندنی بیگم کو دیکھا۔
"میں کون سا غلط کہہ رہی ہوں۔ آپ ہی ہیں جو ہر وقت اپنی بھابھی کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ ہونہہ! اسے تو آپ نے بیٹھے بٹھائے ملکہ بنا دیا۔ ایسے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے رہتے ہیں جیسے اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی تو نجانے کون سا طوفان آ جائے گا۔
چاندنی بیگم کی بات پہ راحت اکبر نے انہیں بے حد

افسوس سے دیکھا۔

"کس قدر سنگدل عورت ہو تم... تمہیں تو بیٹی کی اتنی رسوائی بھری موت بھی عقل نہیں دے سکی... کاش میں وقت واپس لا کے سب ٹھیک کر سکتا۔ وہ سب جو میں نے تمہارے بہکاوے میں آ کے کیا۔"

"میرے..." وہ بد کیں۔ "میں نے کیا کیا؟ آپ نے کچھ نہیں کیا کیا؟"

"تم نے مجھے کبھی بھی میری ذمہ داریاں نبھانے کہاں دی ہیں لیکن غلطی تمہاری نہیں میری ہے میں ہی آنکھیں بند کر کے تم پہ اعتبار کرتا رہا۔ جو تم نے بتایا۔ اسی کو سچ سمجھا، جو تم نے کہا، وہی کیا... میں اپنی عقل رکھنے کے باوجود بھی بے وقوف بن گیا... اور تم خود کو کیسے بری الذمہ ٹھہرا سکتی ہو۔ سارا سارا دن تم گھر پہ رہتی تھیں ایک بیٹی پہ نظر نہیں رکھ سکیں۔ بیٹی کے جوان ہوتے ہی ماؤں کی تو نیندیں اڑ جاتی ہیں پھر تمہیں خبر کیوں نہیں ہو سکی... بولو... جواب دو؟"

یہ کوئی پہلی دفعہ ہونے والی جرح نہیں تھی۔ نیلم کی موت کے بعد سے یہ تقریباً" روز ہی کی جانے والی باتیں تھیں۔ راحت اکبر اپنی غلطی کو مان چکے تھے مگر چاندنی بیگم ابھی تک ماش کی دال کی طرح سے اینٹھ رہی تھیں۔ وہ اتنی بڑے واقعے کے بعد بھی سبق نہیں سیکھ سکی تھیں۔ ہوتے ہیں ایسے کچھ لوگ جن کے دلوں پہ مہریں اور کانوں پہ پردے ڈال دیے جاتے ہیں۔ جو نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں نہ ہی انہیں توبہ کا موقع دیا جاتا ہے۔ چاندنی بیگم کا شمار بھی شاید ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا اور راحت اکبر ڈرتے تھے اس وقت سے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس گمراہی کے گڑھے میں دھنس جائیں جس میں وہ گھٹنوں تک دبے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس نے جیسے ہی اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ اسے کبھی اپنے سامنے بھی کھڑا دیکھے گا اور وہ بھی اتنی جلدی یعنی محض ایک ماہ بعد ہی۔

"تم یہاں کب آئیں!!" وہ حیران ہوا۔

"کیوں؟ تمہیں کیا لگا تھا کہ مجھ سے اتنی جلدی جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔" بابا کی لاڈلی نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسا۔

"اندر آؤ۔" وہ دروازے سے ہٹ گیا۔

"بتاؤ نا۔ کیا تمہیں واقعی میں یہی لگتا تھا کہ میں اب تمہارے پیچھے نہیں آؤں گی۔ دیکھو۔ اگر میرا یہاں آنا برا لگ رہا ہے تو میں ابھی واپس چلی جاتی ہوں... ہاں۔" اس نے منہ بنا کے لاڈ سے کہا ہینڈسم ہنس دیا۔ وہ خود ہی جیسے سب فرض کر لیا کرتی تھی۔

"پاگل ہو تم پوری کی پوری۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اسے واقعی میں بہت اچھا لگا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے آئی ہے۔

"مجھے اچھا لگا تمہارا یہاں آنا... یہ بتاؤ کہ کب پہنچیں۔ مجھے بتا دیتیں تو میں تمہیں ریسیو کر لیتا۔"

"اگر میں تمہیں اپنے آنے کا بتا دیتی تو تمہارے چہرے کے یہ ایکسپریشن کیسے دیکھ پاتی... ویسے بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا مجھے دیکھ کے تمہیں خوشی ہوئی ہے یا صدمہ...؟" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ ہنستے ہوئے اٹھا اور فریج کھول کے دیکھا کہ اس میں کھانے کو کیا کیا ہے کیونکہ اگر کچھ نہ ہوتا تو وہ کھانا باہر سے آرڈر کر لیتا یا اسے لاہور گھمانے کے لیے باہر لے جاتا۔

"نہیں، تم بتاؤ... مجھے تو تمہارے چہرے کے سارے ایکسپریشنز سیم سیم لگتے ہیں۔" اس نے شرارت اپنے لبوں میں دباتے ہوئے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تھا۔

"اب میں اتنا بھی کھڑوس نہیں ہوں یار... اب اتنی زیادتی تو مت کرو میرے ساتھ..." اس نے فریج سے دو فریش جوس کے ڈبے نکال کے ایک اس کے سامنے رکھا اور ایک خود پینے لگا۔

"اور کیا... جب سے آئے ہو، کوئی میسج نہیں

کوئی کال نہیں۔ کروں تو میں ہی کروں۔ تمہارے پاس تو وقت ہی نہیں نا۔"

"بس شکووں کی پٹاری کھل گئی بابا کی لاڈلی کی۔" وہ ہنسا تھا۔

"تو اور کیا۔۔۔ خود سے تو تمہیں کسی بات کا احساس ہوتا نہیں اور مجھے ہو کہ ہر وقت ڈانٹ دیتے ہو ویسے سچ بتاؤ۔ کیا تم نے مجھے ایک بار بھی مس نہیں کیا۔ اگر نہیں کیا تو کھاؤ میری قسم' میں ریٹرن فلائیٹ لے کے آئی تھی۔" زویا نے شاید واقعی میں اس کی کمی بے حد محسوس کی تھی اسی لیے اتنا جذباتی ہو رہی تھی۔۔۔ ہینڈسم بے ساختہ سنجیدہ ہوا۔

"زیادہ پریشان مت ہو۔۔۔ مذاق کر رہی ہوں۔۔۔ سچے اور مخلص دوست کبھی اپنے دوستوں کو مشکل میں نہیں ڈالا کرتے۔۔۔ میں جانتی تھی کہ تم نے مجھے مس بھی کیا تو اس کا کبھی بھی اظہار نہیں کرو گے۔ اسی لیے میں خود آگئی اور ویسے بھی میرا ماننا ہے کہ دوستوں کے دل کی بات بن کہے مان لینے میں ہی مزہ ہوتا ہے اور یہی دوستی کی خوب صورتی بھی ہے۔ اسی لیے تو میں نے پہلی فرصت میں ریزائن کر کے یہاں آفس میں اپلائی کر دیا۔"

اس نے مزے سے جوس پیتے ہوئے ہینڈسم کو حیران در حیران کیا تھا۔ وہ جو مطمئن سا صوفے پہ نیم دراز تھا یکدم سیدھا ہو بیٹھا۔ چند لمحے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر بے ساختہ دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ بات بھلا کیسے بھول سکتا تھا کہ زویا اس کے بغیر بھلا اس آفس میں رہ سکتی ہے۔۔۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

اسے اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ زویا کو اس کا ساتھ خوشی دیتا ہے لیکن اسے بھی زویا کا ساتھ خوشی دیتا تھا۔ اسے بھی اس کا یہاں اچانک سے چلے آنا اور اسے حیران کر دینا بے حد اچھا لگا ہے۔ یہ ایک خوشگوار احساس تھا جو اس نے پچھلے پانچ سالوں میں پہلی بار محسوس کیا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو ہینڈسم۔۔۔ کیا مجھ سے پہلے خوب صورت اور حسین لڑکی نہیں دیکھی تم نے؟" زویا اس کو اپنی طرف والہانہ پن سے دیکھنے پہ شرارت سے گویا ہوئی تھی۔ ہینڈسم جھینپ گیا تھا۔ زویا ہنس پڑی تھی۔

"اف ہینڈسم۔۔۔ تم شرماتے ہوئے کتنے کیوٹ لگتے ہو۔" زویا اس کی شکل دیکھ کے اتنا ہنسی تھی کہ ہینڈسم روہانسا ہو گیا تھا۔

"اب اتنا گھونچو بھی نہیں لگتا میں۔" وہ برا مانے بغیر بولا۔

"بالکل بھی نہیں۔۔۔ تم اس دنیا کے سب سے اچھے انسان ہو۔ بس ایسے ہی رہنا۔ بالکل پیور۔ کسی بھی ملاوٹ سے پاک۔۔۔ شاید میں تمہاری طرف اسی وجہ سے اٹریکٹ ہوئی تھی کہ تم میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ تم جذبوں کے ساتھ ساتھ رشتوں میں بھی کھوٹ کے قائل نہیں ہو۔"

"میں بدلوں گا تو تب جب میری زندگی میں ایسی کوئی نوبت آئے گی۔۔۔ میں نے زندگی میں ایسا کوئی رشتہ نہیں دیکھا۔ مجھے زندگی اور رشتوں کو برتنے کا کوئی پتا نہیں ہے لیکن میں خود جو ہوں اس میں تبدیلی نہیں چاہتا۔"

زویا اس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی اسے اپنی بات کہنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی اپنی بات کہنے میں ناکام ہو جایا کرتا تھا لیکن وہ خوش قسمت تھا کہ اس کی زندگی میں زویا جیسا ساتھی تھا جو بن کہے ہی سب جان لیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔۔۔ کیا مصیبت ہے۔ کیوں بار بار تنگ کر رہے ہو مجھے؟" اس نے تیسری گھنٹی پہ فون ریسیو کر کے چلا کے کہا تھا۔ دوسری جانب یاسر کا جواب کھلم کھلا عاشقی اور بدمعاشی پہ اترا ہوا تھا۔

"رات دس بجے کے بعد تم چھت پہ آؤ گی مجھ سے ملنے اگر تم نہ آئیں تو پھر مجھ سے کوئی گلہ مت کرنا۔"

یاسر کے لہجے کی ساری شرافت بھاپ بن کے اڑ چکی

تھی اور اس کی جگہ اس کا ہٹ دھرمی بھرا غصیلا لہجہ تھا۔ فارہ کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ ڈالے۔ عبیو ہمیشہ ہی اس کے گلے میں کانٹا بن کے پھنسی تھی۔ اب بھی اس مصیبت کو گلے سے اتارنے کے چکر میں وہ اپنی جان عذاب میں ڈال چکی تھی۔

"دیکھو یاسر! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تم سے کسی بھی قسم کی دوستی نہیں کر سکتی۔ میں سلطان سے بہت محبت کرتی ہوں اور ٹھیک ہے کہ میں تم سے فرینک تھی لیکن ایک دالملو کی حیثیت سے... اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔" فارہ نے اپنے لہجے کو نرم بنا کے اسے سمجھانے کے لیے کہا تھا۔

"میں آپ کی بات کیسے مان لوں فارہ جی! جب کہ میری تو آپ ساس کہیں سے لگتی ہی نہیں ہیں۔ میرے آئیڈیل کے کتنے قریب ہو آپ کاش کہ میں آپ کو بتا سکتا... بس ایک بار مجھ سے ملنے چھت پہ آجائیں۔ میں اس کے بعد وہی کروں گا جیسے آپ چاہیں گی۔" جواباً اتنی ہی لجاجت سے یاسر نے کہہ کے اپنی بے چارگی ظاہر کی تھی۔ فارہ نے بے ساختہ اپنا سر تھاما۔

"دیکھو یاسر! یہ ممکن نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی جیسے وہ یاسر پہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ وہ کس قدر مجبور ہے۔

"کیسے ممکن نہیں ہے۔ سلطان احمد گھر پہ نہیں ہے، آپ بس تھوڑی دیر کے لیے آجائیں ناں۔ میں آپ کی چھت پہ ہی ہوں۔" اس کے جواب پہ بے ساختہ فارہ کے ہاتھوں کے توتے اڑے تھے۔

"تم چھت پہ کیا کر رہے ہو؟" وہ سراسیمگی سے چلائی۔

"میں گھر کے اندر بھی داخل ہو سکتا ہوں۔ یہ میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔" یاسر بلا خوف و خطر بولا۔

"نہیں نہیں۔ تم گھر کے اندر نہیں آؤ گے۔ سلطان آگئے تو کیا سوچیں گے۔" فارہ گھبرا گئی۔ سلطان کے آنے کا وقت بھی قریب ہی تھا۔

"ابھی ان کے آنے میں کچھ وقت ہے۔ آپ اگر چاہتی ہیں کہ سب ٹھیک رہے تو بس پانچ منٹ کے لیے اوپر آجائیں۔ میں ویٹ کر رہا ہوں۔"

یہ کہہ کے یاسر نے فون بند کر دیا۔ فارہ کی جان پہ بن آئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے اس پاگل آدمی سے جان چھڑائے۔

اس نے جا کے عبیو کے کمرے کا دروازہ کھول کے چیک کیا۔ عبیو گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے کل شام سے بخار تھا اور وہ دوا کھاتے ہی سو جایا کرتی تھی۔ فارہ بھی اسے سونے دیا کرتی کیونکہ اسے تبھی سلطان احمد کی جانب سے سکون رہتا تھا کہ اب وہ کم از کم سوئی ہوئی عبیو کو نہیں جگائیں گے۔ اس نے اس کے کمرے کے دروازے پہ کھڑے کھڑے چند لمحے سوچا اور پھر سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھانے لگی۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب اس کا اپنے گھر داخلہ ممنوع کر دے گی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر گئی تو سامنے ہی دیوار سے ٹیک لگائے یاسر کھڑا تھا۔ اس نے حسب معمول عادت گہرے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسے پان کھانے کی عادت تھی اور کثرت سے پان کھانے کی وجہ سے اس کے دانت سارے کے سارے خراب ہو چکے تھے۔ فارہ نے اسے ناپسندیدگی سے دیکھا ویسے بھی وہ غصے سے بھری ہوئی ہی چھت پہ پہنچی تھی۔

"جلدی کہو کیا کہنا ہے۔" فارہ نے قریب آتے ہی لٹھ مار انداز اپنایا۔

"بس دل جل رہا تھا آپ کو ایک نظر دیکھنے کی چاہ میں... میں اپنی یہ خواہش قریب سے دیکھ کے پوری کرنا چاہتا تھا۔ آپ کو چھو کے۔" یاسر نے وارفتگی سے کہہ کے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ فارہ بدک کے پیچھے ہٹی۔

"تمہاری یہ ہمت کہ مجھ سے ایسی بات کرو... کبھی

آئینہ بھی دیکھا ہے؟ منہ نہ متھا، تم مجھے چھونے کی خواہش کر رہے ہو، فارہ سلطان احمد کو.... ارے کبھی غور سے اپنی شکل بھی دیکھی ہے۔ تمہارے جیسا تو میں نوکر بھی نہ رکھوں اور کبھی میرے سلطان کو دیکھا ہے۔ وہ کس قدر وجیہہ اور ہینڈسم ہے.... میں تو تم جیسے مرد پہ تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی اور تم آئے ہو مجھے چھونے کی خواہش کرنے والے.... ہونہہ۔"

جو لاوا دو دن سے فارہ کے ذہن میں پک رہا تھا، وہ ابل پڑا تھا اور یاسر کے وجود کو خاکستر کر رہا تھا۔

"میں بھی تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں۔" اس نے ہمت نہیں ہاری۔

"اپنی زبان کو لگام دو ورنہ ـــ" اسی وقت اس کے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ فارہ کی بے ساختہ رنگت اڑی۔

"تم جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں جاؤں گا جب تک آپ سے وعدہ نہیں لے لوں۔" وہ ضدی ہوا۔

"میں نے کہا، جاؤ۔" فارہ نے یاسر کو بے ساختہ ہلکا سا دھکا دیا لیکن یاسر اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں بلکہ اس نے فارہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ فارہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔"

"نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک آپ مجھ سے یہ وعدہ نہیں کرتیں کہ ملنے آیا کریں گی۔" وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامے فارہ کی مزاحمت کو نظر انداز کیے سوال کر رہا تھا۔ فارہ کو احساس تھا کہ سلطان احمد دروازے پہ کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر اس نے دروازہ نہ کھولا تو وہ پریشان ہو جائیں گے۔

"میں نے کہا ناں کہ چھوڑو مجھے ذلیل انسان۔"

فارہ کو ایک دم ہی طیش آیا اور وہ اس کے بازو پہ دانت گاڑ کے ہاتھ چھڑا کے نیچے کی جانب بھاگی۔

"سالی.... یاسر کے ساتھ پنگا لیتی ہے۔" یاسر نے غصے سے زمین پہ تھوکا اور اس کے پیچھے لپکا۔

دوسری جانب جب دس منٹ انتظار کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو سلطان نے اپنی جیب کو ٹٹولا جس میں اس گھر کی ایکسٹرا چابی پڑی ہوتی تھی۔ انہوں نے اسے کی ہول میں لگایا ہی تھا کہ انہیں اپنی چھت کی سیڑھیوں سے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی وہ پریشان ہو گئے۔

فارہ نے اپنے کمرے میں جاتے ہی کنڈی لگالی تھی۔ یاسر بھی اس کے پیچھے ہی آیا تھا لیکن وہ عبیر کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ عبیر کے کمرے سے ہی ایک دروازہ فارہ اور سلطان کے کمرے کو بھی جاتا تھا۔ فارہ نیچے بھاگ کے آئی اور عبیر کے کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی کہ عبیر نے بے ساختہ نیند سے اٹھ کر اسے حیرت سے دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ بھاگ کے اپنے کمرے کی جانب جا چکی تھی اور ٹھیک اسی سمے یاسر اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ عبیر اچھل کے سراسیمہ سی بیڈ سے اتری۔ وہ اسے اپنے کمرے میں ـــــــ دیکھ کے حیران رہ گئی تھی.... عبیر نے چلانا شروع کر دیا تھا۔

"شش.... چلانا بند کرو.... میں ابھی چلا جاؤں گا۔" یاسر نے اسے تسلی دی۔

"تم کیوں آئے ہو یہاں پہ۔ نکلو ابھی کہ ابھی میرے کمرے سے۔" نجانے اتنی طاقت عبیر نے اپنے اندر کہاں سے اکٹھی کر لی تھی کہ وہ اسے دھکا دینے کی جرات کر بیٹھی۔

"کہا ناں، میں چلا جاؤں گا۔ مجھے بس فارہ سے بات کرنی ہے۔" لیکن عبیر نے اس کی ایک بھی نہیں سنی اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ حیرت سے سن رہ گئی۔ اس کا دروازہ باہر سے لاکڈ تھا۔

☼ ☼ ☼

فارہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے صحن میں کھڑے سلطان احمد کو دیکھا اور پھر دھڑ دھڑاتے ہوئے دروازے کو۔ سلطان احمد گنگ کھڑے تھے۔ ان کے قدم جیسے زمین نے ہی جکڑ لیے تھے اور قدم تو فارہ کے

بھی جکڑے گئے تھے۔
اس نے بے ساختہ اپنے اور سلطان کے درمیان کا فاصلہ طے کرتے ہوئے خود کو مضبوط ظاہر کیا اور سلطان کے کاندھے پہ سر ٹکا دیا۔
"آئم سوری سلطان! میں نے ان دونوں کو بہت منع کیا لیکن میری کسی نے ایک بھی نہیں سنی...."
سلطان احمد کے بے حس و حرکت وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ کاش.... وہ اس وقت کھڑے کھڑے مر جاتے لیکن انہیں موت نہیں آئی تھی بلکہ جب وہ بولے تو ان کا لہجہ بے حد سرد تھا۔
"جا کے دروازہ کھولو۔"
"نہیں سلطان! جانے دیں ناں، بچے ہیں دونوں۔" فارہ نے روتے ہوئے کہا۔
"میں نے کہا ناں، جا کے دروازہ کھولو۔" وہ دھاڑے۔
سلطان احمد نے کھڑے کھڑے فارہ کو حکم دیا۔ فارہ نے سلطان احمد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جا کے دروازہ کھول دیا تھا۔
دروازہ کھل جانے پہ عبیر نے شکر کا سانس لیا تھا لیکن وہی سانس اس کی زندگی کا آخری سانس ثابت ہوا تھا۔ دروازے میں سلطان احمد ایستادہ تھے اور ان کے ساتھ ہی فارہ کھڑی تھی۔
"میں تو کب سے ان کے ایسے کرتوت دیکھ رہی تھی لیکن مجبور تھی کہ کیسے، کس منہ سے آپ کو بتاؤں
.... یاسر اس گھر کا ہونے والا داماد ہے لیکن شاید یہ دونوں ہی اپنے رشتے کا لحاظ نہیں کر سکے اور آج تو دونوں کی اتنی جرات بڑھ گئی کہ .... عبیر نے یاسر کو کمرے میں ہی بلا لیا۔" فارہ نے یاسر اور عبیر کو دیکھتے ہوئے بے چارگی سے کہا تو عبیر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ یہ فارہ کیا کہانی سنا رہی تھی۔
اور حیران تو یاسر بھی ہوا تھا۔ فارہ چالاک تھی مگر اتنی شاطر بھی ہو سکتی ہے؟ اس کا اندازہ اسے بہرحال نہیں تھا۔
"شاید آپ نے قدموں کی چاپ سنی ہو.... یہ اسی یاسر کی تھی۔ یہی سیڑھیاں اتر کے عبیر کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اسی لیے میں نے باہر سے...."
"یہ جھوٹ ہے.... یہ جھوٹ ہے بابا! میں نے اسے نہیں بلایا۔" عبیر کو احساس ہوا جیسے نہیں بہت دور اسے ذبح کیے جانے کے لیے چھری تیز کی جا رہی ہے۔
اسے اپنی جان بچانی تھی۔ اگر وہ آج نہ بولی تو شاید کبھی نہیں بول پائے گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے معتوب ٹھہرا دی جائے گی اور اس بار وہ سلطان احمد کی نظروں میں شرمندہ نہیں بلکہ سرخ رو ہونا چاہتی تھی۔
"بس خاموش!" سلطان احمد نے ہاتھ اٹھاتے قہربار نظروں سے عبیر کو دیکھا تھا جو سوئی جاگی سی کیفیت میں تھی لیکن اپنے دفاع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"یہ عورت جھوٹ کہہ رہی ہے سلطان انکل! میں تو یہاں...." یاسر نے بھی بولنا چاہا تاکہ فارہ کی اصلیت بیان کرنا چاہی لیکن سلطان احمد فارہ کی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے عادی تھے۔ انہیں تو عام حالات میں کوئی بات سمجھانا مشکل ہو جاتی لیکن اس وقت تو وہ سب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یاسر اور عبیر ایک ہی کمرے میں تھے اور دروازہ باہر سے فارہ نے لاک کر دیا تھا تاکہ روز روز کا ہونے والا یہ تماشا سلطان احمد بھی دیکھ سکیں۔
"بس ابھی کے ابھی اس سے پہلے کہ میں تمہارا خون کر دوں، یہاں سے چلے جاؤ بلکہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔" سلطان احمد نے عبیر کی جانب اشارہ کیا جو سزا سنائے جانے پہ ابھی تک گم صم کھڑی تھی۔ اس کے وجود نے حرکت کرنا بند کر دی تھی۔
"یہ عورت مجھ پہ جھوٹا الزام لگا رہی ہے.... میں آپ کی بیٹی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا کسی بھی قیمت پہ۔" یہ کہہ کے وہ وہاں سے چلا گیا تھا لیکن جاتے جاتے فارہ پہ ایک قہر آلود نگاہ ڈالنا نہیں بھولا تھا

لیکن فارہ کو اس کی ایسی نظروں کی پروا نہیں تھی۔ فارہ نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں واضح چیلنج تھا جو یا سر کو طیش دلانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن عبیر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ وہ ہر بار کی طرح اپنے باپ کی نظروں میں پھر ذلیل ہو گئی تھی۔

"کاش تم اپنی ماں کے ساتھ ہی مر جاتیں عبیر۔ کس چیز کی کمی رہنے دی میں نے تمہیں عبیر۔۔۔؟" سلطان احمد اس کے سامنے کھڑے تھے لیکن وہ حقیقتاً" اس سے صدیوں کے فاصلے پہ کھڑے اس سے شکوہ کر رہے تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا بابا۔ پلیز! میرا یقین کریں۔" عبیر کرلائی۔

"کیوں یقین کروں میں تمہارا۔۔۔ کب تک کرتا جاؤں میں تمہارا یقین۔۔۔ میرا کیا قصور ہے، مجھے بتاؤ عبیر۔۔۔ کس چیز کی کمی دی ہے میں نے تمہیں، تمہاری اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تمہارے کہنے پہ میں تمہاری جلدی شادی کر رہا تھا تو کیا اس لیے کہ تم مجھے یہ دن دکھاؤ۔" سلطان احمد دھاڑے اور اگلے ہی لمحے انہوں نے اس کے چہرے پہ تھپڑ مارا۔

"چلی جاؤ اس گھر سے۔ چلی جاؤ عبیر۔۔۔ میں تمہیں اس گھر میں آج کے بعد نہ دیکھوں تم مر چکی ہو میرے لیے۔" سلطان احمد غصے و قہر سے روتے دھاڑتے ہوئے اسے گھسیٹ کے دروازے تک لے کے جا رہے تھے۔

"بابا! میری بات سنیں ایک بار۔۔۔ پلیز بابا۔۔۔ میرا یقین کریں۔۔۔ میں کہاں جاؤں گی بابا۔" عبیر روتے ہوئے منت کر رہی تھی۔ "فارہ باجی! آپ تو جانتی ہیں ناں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پلیز بتائیں بابا جان کو۔ میرے ساتھ یہ سب نہ کریں فارہ باجی۔۔۔ بابا کو سب سچ بتا دیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ روتے ہوئے کرلاتے ہوئے منت سماجت کرتی جا رہی تھی لیکن سلطان احمد آج کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انہیں حالات نے ہی اس قدر تھکا دیا تھا کہ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ عبیر کے حوالے سے کوئی نیا مسئلہ سہہ سکیں۔ ہر تیسرے دن تو وہ کوئی نہ کوئی کارنامہ سرانجام دیے رکھتی تھی۔۔۔ انہوں نے عبیر کو نکال کے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ اس سارے ڈرامے کی خاموش تماشائی فارہ سلطان احمد دروازہ بند ہو جانے پہ کھل کے مسکرائی تھی۔

عبیر دروازہ بند ہو جانے کے بعد وہیں دروازے پہ بیٹھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ اور وہاں بیٹھی ساری رات روتی رہی تھی۔

"بابا پلیز۔۔۔ دروازہ کھول دیں بابا۔ آپ کی عبیر ایسی نہیں ہے بابا۔۔۔ میری ایک بار بات تو سن لیں بابا۔۔۔" دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ کہے جا رہی تھی۔ کسی اور کے کیے کی سزا ایک بار پھر عبیر سلطان کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ وہ صرف رنگ کی کالی نہیں تھی نصیب بھی سیاہ رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اندر آنے کے بعد سلطان احمد پھوٹ پھوٹ کے روئے تھے۔

"کیوں ہوتا ہے میرے ساتھ ہر بار ایسا۔۔۔ کتنا یقین کتنا پیار کرتا تھا میں اپنی بیٹی سے۔ کیوں کیا اس نے یہ سب فارہ۔۔۔ میں تو پہلے ہی مصیبتوں کا مارا ہوا ہوں۔ زندگی کے مشکل ترین دن میں کیسے گزار رہا ہوں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں لیکن عبیر کیسی بیٹی تھی جو باپ کی محبت سمجھ سکی نہ مسائل۔۔۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔" وہ اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھامے روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"سلطان! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ خود کو سنبھالیں۔ میں اسی لیے یہ سب آپ سے چھپائے ہوئے تھی۔۔۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ کس حد تک جا چکی تھی۔

اسی لیے میں چاہتی تھی کہ اس کی جلد از جلد شادی ہو جائے اور جانتے ہیں... اسی لیے میں یہاں سے جانے کی بات کرتی تھی تاکہ وہاں آپ عبیر کی حرکتوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ میں شرمندہ ہوں سلطان کہ میں عبیر کی ٹھیک طرح سے پرورش نہیں کر سکی۔" فارہ سسکنے لگی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میرے اس گھر کو سنبھالنے والا کوئی نہ ہوتا... مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ تمہارا کیا قصور جو سب ہوا' وہ عبیر کی وجہ سے ہوا ہے اور میرے نصیب کی بدبختی کہ عبیر میری بیٹی ہے۔" یہ کہہ کے وہ ایک بار پھر رونے لگے تھے۔

"بس کریں سلطان! اور کتنا روئیں گے۔" فارہ نے سلطان احمد کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا' ساتھ ہی نیند کی ٹیبلٹ بھی۔ سلطان احمد آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹے ہوئے تھے۔ فارہ ان کے قریب آئی۔ ہلکے سے ان کے گھٹنے کو اپنے انگلیوں سے چھونے کے بعد اس نے آہستگی سے انہیں پکارا۔

"سلطان!" سلطان نے بازو آنکھوں سے ہٹائے بغیر ہوں کہہ کے جواب دیا تھا۔

"اٹھیں' یہ دودھ پی لیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز اسے واپس لے جاؤ۔"

"سلطان' آپ نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اب کم از کم دودھ ہی پی لیں۔ آپ کے لیے سکون کی نیند بہت ضروری ہے۔ پلیز سلطان اگر آپ نے دودھ نہیں پیا تو مجھے لگے گا جیسے اس سارے قصے میں آپ مجھے بھی قصوروار سمجھتے ہیں۔" فارہ نے سر جھکاتے ہوئے خود کو معصوم ظاہر کرنے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ سلطان احمد نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تھا۔

"تم اگر نہ ہوتیں تو میں بھی نہ ہوتا فارہ... آج کے بعد یہ بات کبھی نہیں کہنا۔ انہوں نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا۔ فارہ نے اپنی ہتھیلی پہ رکھی گلابی رنگ کی چھوٹی سی گولی بھی ان کے سامنے کر دی۔ سلطان احمد نے اسے فوراً" ہی اٹھا کے منہ میں رکھ لیا اور دودھ کا گلاس ختم کر کے فارہ کو دیتے ہی ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔ اسی وقت باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور لگاتار ہوئی تھی۔ عبیر روتے ہوئے بار بار سلطان کو دروازہ کھولنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ سلطان احمد نے بے بسی سے فارہ کو دیکھا اور فارہ بھلا یہ موقع کیسے جانے دے سکتی تھی۔

"آپ کہیں تو دروازہ کھول دوں جا کے؟"

"نہیں' ہرگز نہیں۔ اس سے کہو کہ جو بچی کھچی ہماری عزت ہے اسے ہمارے پاس رہنے دے اور چلی جائے یہاں سے..." سلطان احمد ایک بار پھر غصے سے بولے تو فارہ ان کا موڈ دیکھ کے جلدی سے باہر نکل گئی۔ دستک کی آواز آنا اب بند ہو چکی تھی۔

فارہ کے اندر کی ملکہ ایک دم سے ہی بیدار ہوئی تھی۔ وہ صحن کے وسط میں کھڑی تھی۔

"آج میں کامیاب ہو گئی۔ میں فاتح ہوں' فارہ سلطان احمد کی زندگی کا آخری کانٹا بھی نکل گیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور وہ یاسر (قہقہہ) کیسا سبق سکھایا میں نے اسے... ہونہہ 'میرا عاشق بننے چلا تھا۔ فارہ سلطان احمد کا... کیا وہ یہ بھول گیا تھا کہ فارہ سلطان احمد ایک ملکہ ہے اور وہ صرف سلطنت پہ راج کرتی ہے۔ حکومت کرتی ہے۔" فارہ کی گردن کسی راج ہنس کی طرح تن گئی تھی۔

"ایسا کیسا ہو سکتا تھا کہ فارہ سلطان احمد اس بار ہار جاتی... بے چارہ یاسر اور بے چاری عبیر۔ وہ تو مفت میں ہی ماری گئی ہاہاہا۔" وہ خود سے باتیں کرتی تنہائی میں اپنی جیت کا جشن مناتے ہوئے صحن کے وسط میں کھڑی ہنسے جا رہی تھی پھر وہ اسی صحن میں کھڑے ہوئے گول گول گھومنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

عبیر آدھی رات تک وہاں بیٹھ کے روتی رہی تھی دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگتے ہوئے بھی وہ پر امید تھی کہ سلطان احمد دروازہ کھول دیں گے لیکن اس کا مان ٹوٹ چکا تھا۔

دروازہ کھلا نہ ہی اس کی بات سنی گئی۔ اسے خود سے بے تحاشا نفرت ہوئی۔ وہ کیا کرنے کے لیے آئی تھی اس دنیا میں۔۔۔ کیا اس کا مقصد صرف اس دنیا میں فارہ کے ہاتھوں ہر بار ذلیل ہونا ہی تھا۔

ہاں شاید وہ اس دنیا میں صرف ذلیل ہونے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ وہ صرف فارہ کی محکوم رہنے کے لیے بھیجی گئی تھی لیکن وہ تو اس سب میں بھی خوش تھی۔ کم از کم وہ ایک چھت کے نیچے اپنے باپ کے سایۂ شفقت میں تو تھی۔ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی کہ فارہ کو وہ اتنی بری کیوں لگتی ہے اور کیا فارہ کی نفرت اتنی شدید تھی کہ گزرے وقت سے کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔

بہت دیر گزر گئی۔ اسے جب یقین ہو گیا کہ دروازہ نہیں کھلے گا تو وہ رکزیٰ کے دروازے پہ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بھری دنیا میں کم از کم ایک وہ ہے جو اس پر یقین رکھتی ہے۔ جو فارہ کی سازشوں کو سمجھتی ہے لیکن اس کی آخری امید اس وقت دم توڑ گئی جب اس نے رکزیٰ کے گھر پہ تالا پڑے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں سے جان نکل گئی۔ کاش پورے جسم سے نکل جاتی۔ وہ اس ذلت بھری زندگی سے چھٹکارا پا جاتی۔

"یا اللہ مجھے موت دے دے۔" اس نے رکزی کے تالا لگے گیٹ کے سامنے اپنی آخری امید کو دم توڑتے دیکھ کر التجا کی لیکن اس کی آزمائش ابھی ختم نہیں کی گئی تھی۔

"اللہ جی۔۔۔" عبیر نے آسمان پہ اپنی ڈبڈبائی آنکھیں جمادیں۔ "میں نے اپنا انصاف تجھ پہ چھوڑا۔" عبیر نے اپنے سارے گلے شکوے اپنے اندر اتارتے ہوئے صبر سے کہا۔ ایسا صبر جو بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی تھا۔

اس نے اللہ کی زمیں پہ صبر کا پہلا قدم اٹھایا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم اتنی بے وقوف بھی ہو سکتی ہو۔" وہ آئس کریم کا چمچ ہاتھ میں لیے اسے منہ میں ڈالنا بھول گیا تھا۔ اس نے زویا کی جانب دیکھا جو مزے سے بات کرنے کے بعد اپنی آئس کریم کھانے میں مگن تھی۔

"ویسے ایک بات تو بالکل سچ ہے۔ یہ چمن والوں کی آئس کریم ہے بہت مزے کی۔ اسی لیے تو میں یہاں آ گئی تاکہ ہر ہفتے آئس کریم کھانے کو ملے۔" زویا مزے سے چمچ بھر بھر کے منہ میں ڈال رہی تھی۔

"کیا تم نے واقعی جاب سے ریزائن کر دیا؟" وہ اس کی بات کو نظر انداز کیے اپنی بات کر رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ تمہیں کوئی شک ہے کیا۔" زویا نے ایسے کاندھے اچکائے گویا یہ بہت عام سی بات ہو۔

"مجھ سے اچھی پوسٹ پہ تھیں تم پھر یہ بے وقوفی کیوں کی تم نے۔۔۔ کمپنی چھ ماہ میں تمہیں لندن آفس میں بھجوا دیتی۔" وہ اس پہ برس رہا تھا جب کہ وہ اس سب سے بے نیاز گاڑی کی ڈگی سے ٹیک لگائے مزے سے آئس کریم کھانے میں مگن تھی اور آتے جاتے لوگوں کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس سے زیادہ ضروری کام اور کوئی ہے ہی نہیں۔

"زویا۔۔۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" اسے برا لگا تھا اسی لیے اس نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

"سن رہی ہوں ناں۔ وہ ابھی متوجہ نہیں تھی اور وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اس بات کا جواب نہیں دینا چاہتی۔

"تم کل واپس چلی جاؤ۔" اس نے بھی دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زویا چونکی۔

"واٹ۔۔۔ تم مجھے واپس جانے کو کہہ رہے ہو۔۔۔ مجھے زویا کو۔۔۔؟" وہ حیرت زدہ تھی مگر وہ اتنا ہی پرسکون تھا۔

"ہاں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہی

بہتر ہے۔" اس نے گہری سانس بھر کے کہا تھا۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے یہ کہنے والے، میں تمہاری باس ہوں، سمجھے۔" زویا نے اسے اپنی پوسٹ کے حوالے سے جتلایا تو وہ مسکرایا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ واپس چلی جاؤ۔"

"میں نہیں جاؤں گی واپس، میں یہاں جانے کے لیے نہیں آئی۔" اس نے ایک بار پھر چمچ بھر کے آئس کریم منہ میں ڈالی تھی اور ویسے ہی لوگوں کو دیکھنے لگی تھی۔

"تم رہوگی کہاں پہ....؟"

"رہ لوں گی۔ میں نے آفس والوں سے کہہ دیا ہے کہ ارینج کروا دیں۔ تم فکر نہیں کرو۔ تمہارے پاس نہیں آؤں گی ہاں۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"جب تک گھر کا انتظام نہیں ہو جاتا تب تک کہاں رہوگی؟"

"ظاہر ہے اپنے گھر میں ہی رہوں گی اور میں اپنے گھر سے ہی صبح تم سے ملنے آئی تھی، سمجھے.... آفس والوں نے میرے لیے فلیٹ بک کروا دیا تھا میرے آنے سے پہلے.... تم ٹینشن مت لو۔ تمہارے گھر نہیں آؤں گی۔" اس نے منہ بنایا تھا تو وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا یہ سب؟" وہ اب ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اس لیے کیونکہ میرا ارادہ تمہیں تھوڑی دیر ستانے کا تھا لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ میں نے اتنے کھڑوس بندے سے دل لگایا ہے۔" زویا اچھی خاصی تپ چکی تھی۔

"میں صرف تمہاری وجہ سے پریشان ہو رہا تھا یار۔" ہینڈسم نے یہ کہہ کے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

"شادی کروگے مجھ سے؟ زویا نے ایک دم ہی اس کے سامنے آ کے کہا تھا۔ ہینڈسم حیران ہوا۔ وہ کس قدر پاگل سی تھی۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ موقع کی نزاکت کو جانے بنا کچھ بھی کہہ دیا کرتی تھی۔

"بتاؤ ناں علی! تم مجھ سے شادی کروگے۔ اگر تمہارا جواب ناں میں ہے تو میں ابھی اسی وقت یہاں سے چلی جاؤں گی۔" وہ ایک دم ہی سنجیدہ سی ہو کے کہہ گئی تھی۔ ہینڈسم علی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں صاف کہتی نظر آ رہی تھیں۔

"دیکھو مسٹر ہینڈسم! اگر تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو میں اپنی جان تو لوں گی ہی، ساتھ ہی تم بھی اپنی جان سے جاؤ گے۔" اور کم از کم وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا مجھے تم سے ابھی شادی کرنی ہوگی، یہیں پہ؟" اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں ماحول کو دیکھا۔

"یہاں کرنے میں مضائقہ تو کوئی نہیں ہے لیکن .... میں اپنی شادی ذرا دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے ابھی صرف ہم منگنی کریں گے۔" زویا کو جیسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"دیکھو۔ مجھے تم سے شادی پہ تو کوئی اعتراض نہیں لیکن....." اس نے بات ادھوری چھوڑی اور بابا کی لاڈلی اسے کھا جانے کو دوڑی تھی۔

"خبردار.... خبردار اگر تم نے اب انکار کرنے کی کوشش کی.... پچھلے تین سال سے تم مجھے گفٹ دینے کی کوشش کر رہے ہو لیکن ہر بار ہی تمہارے ساتھ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے میں خاموش ہو جاتی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں کہ میں ہر بار چپ کر جاؤں گی۔ تم ابھی اسی وقت مجھ سے منگنی کر رہے ہو اور ہم اگلے پانچ منٹ میں منگنی کی انگوٹھی خریدنے کے لیے جا رہے ہیں۔"

"دلہنیں اپنے منہ سے اپنی شادی کی بات نہیں کرتیں.... کیا بابا کی لاڈلی کو اتنا بھی نہیں پتا۔" وہ بے تحاشا ہنسی کو بمشکل روکتے ہوئے بظاہر بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"لڑکے لڑکی کو پرپوز کرتے ہیں۔ کیا تمہیں اتنا بھی

نہیں پتا۔ سارے کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں جیسے تمہاری تو کوئی ذمہ داری ہی نہیں نا ہے۔" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے لڑاکا بیویوں کی طرح اس پہ چڑھ دوڑی تھی۔
آج بابا کی لاڈلی لحاظ کے موڈ میں نہیں تھی۔
"اچھا اچھا۔ غصہ تو مت کرو۔ میری ذمہ داری یہ ہے کہ تم جیسے کہو میں ویسا ہی کروں۔ اب دیکھو نا تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ چل کے ابھی منگنی کی انگوٹھی خریدوں تو میرے جیب میں اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں تمہیں ڈائمنڈ کی رنگ گفٹ کر سکوں لیکن میں انکار کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے ابھی تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔" اس نے شرارت بھری بات کو سنجیدگی سے کہا تو زویا جو اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی بے ساختہ اس کی بات مکمل ہونے پہ ہنسی۔
"کیا واقعی تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟"
اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مان جائے گا۔
"میں نہ صرف تیار ہوں بلکہ ابھی تمہارے ساتھ منگنی کی انگوٹھی بھی خریدنے جا رہا ہوں۔" اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔
"او مائی گاڈ' ہینڈسم... کیا واقعی؟" وہ جیسے خوشی سے پاگل ہو جانے کے قریب تھی۔
"اب خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ شادی کرتے ہیں اور اب خود ہی ماننے سے انکاری ہو۔ کیا گجنی فلم کے عامر خان کی طرح تمہاری یادداشت بھی ہر پندرہ منٹ کے بعد یوں ہی ختم ہو جاتی ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔ زویا کی آنکھوں میں نمی کے ڈورے تیرنے لگے۔
"تھینک یو ہینڈسم... میرا مان رکھنے کا شکریہ...
میری [illegible] ضرورت نہ بھی ہو لیکن مجھے تمہاری [illegible]

اسے وہاں سے قریب ہی ایم ایم عالم روڈ پر ڈی دیماس کی ڈائمنڈ شاپ پہ لے آیا تھا۔ اس نے زویا کو اس کی پسند کی ہیرے کی انگوٹھی خرید کر دی تھی۔ اور وہ پیسے اس نے زویا سے ادھار لیے تھے کیونکہ وہ گھر میں ہی اپنا اے ٹی ایم اور کریڈٹ کارڈ بھول گیا تھا۔
زویا کو ہیرے بہت پسند تھے۔ اسی لیے اس نے ہمیشہ ہی اس کے لیے الگ سے پیسے جمع کیے تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ جب بھی اس کے لیے کچھ خریدنا چاہتا اس کے وہ پیسے کسی اور کام میں لگ جاتے ہیں۔ آج بھی ضرورت کے وقت اس کی جیب خالی تھی لیکن زویا کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے انگوٹھی خود خریدنے کا فیصلہ کر کے جیسے ان خوب صورت لمحوں کو قید کرنے کی کوشش کی تھی۔
"منگنی مبارک ہو۔" ہینڈسم نے اس کے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا کے اسے مبارک باد دی۔
زویا کی آنکھیں جھلملا گئیں۔
"تھینک یو سو مچ ہینڈسم... مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا بہت شکریہ..." وہ بھیگی آنکھوں سے مسکراتے تشکر سے کہہ رہی تھی۔
"تمہارا بھی بہت شکریہ... بس ہمیشہ مجھے برداشت کرنا' میری خوبیوں اور خامیوں سمیت... پلیز۔" وہ خوش تھا' بہت خوش لیکن کہیں نہ کہیں کسی اپنے کے نہ ہونے کی کسک اس کے دل میں پنہاں تھی۔ شاید خوشی کے موقعوں پہ اپنوں کا ساتھ ضروری ہوتا ہے۔
"میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں... کل آفس سے واپسی کے بعد ملتے ہیں۔" وہ کل کا لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"[illegible] وارننگ دے رہی ہوں۔" زویا
[illegible] چار دن پھر
[illegible]

کولیگس سے میرا تعارف اپنی فیانسی کہہ کے کرواؤ۔" زویا نے بے ضرر سی خواہش کی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ اسی وقت سگنل پہ گاڑی آگے بڑھنے کو تیار تھی اور وہ اپنے دھیان میں تھا اور زویا کی جانب ہی متوجہ تھا۔

"تم کہو گی تو میں روز یوں ہی سگنل پہ کھڑے ہو کے بھی ہر ایک کو بتانے کو تیار رہوں کہ تم مری فیانسی ہو۔"

وہ ہنسا تھا اور ویسے ہی ہنستے ہوئے گاڑی زویا کی جانب دیکھتے ہی بڑھا لے گیا تھا۔۔۔ اور ٹھیک اسی لمحے کوئی اس کی گاڑی کے سامنے آ کے گرا تھا۔۔۔ ہینڈسم نے بریک پہ فوراً" ہی پاؤں دبایا تھا لیکن بدشگونی نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

"کیا ناشتہ بھی نہیں کریں گے؟" فارہ ان کے سامنے ناشتے کی ٹرے اٹھائے کھڑی ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا وہ ابھی بھی دروازے پہ موجود ہے؟" ساری رات وہ نیند کی گولی کھا لینے کے باوجود بھی بے چین رہے تھے۔ اس رات کتنے ہی عرصے کے بعد ان کے خواب میں عبیر کی ماں آئی تھی۔ انہوں نے اس کی آنکھ میں شکوہ دیکھا تھا ایسا شکوہ کہ ان کا دل کٹ کے گرنے والا ہو گیا تھا۔

"وہ جا چکی ہے۔" فارہ کا اپنی بات کے جواب میں سوال سننے پہ موڈ خراب ہو گیا تھا۔ سلطان احمد فوراً" ہی بستر سے اترے اور فارہ کو ایک طرف کرتے ہوئے

وہ بہت تیزی سے دروازے تک گئے تھے۔ فارہ بھی ان کے پیچھے گئی تھی۔

"میں نے کہا تو ہے کہ وہ چلی گئی ہے۔۔۔ اگر یہی سب کرنا تھا تو رات اسے گھر سے نکالا ہی کیوں تھا۔" فارہ کو غصہ آیا۔ اسے سلطان کی بے قراری غصہ دلا رہی تھی۔

"میں غصے میں تھا لیکن تم ہی مجھے روک لیتیں۔ لڑکی ذات ہے' اس دنیا میں کتنے درندے ہیں ہم سے معلوم نہیں تھا لیکن تمہیں تو تھا۔" وہ بے بسی سے ہاتھوں میں سر دیے چلائے اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ فارہ پہ اس طرح سے غصہ ہوئے تھے۔

"میں کیوں روک لیتی۔۔۔ جو گل وہ یہاں بیٹھی کھلا رہی تھی۔۔۔ اس کے بعد تو آپ کو اسے جان سے مار دینا چاہیے تھا۔ اس نے آپ کی عزت کو بٹہ لگا دیا اور آپ کو ابھی بھی اسی کی فکر ہو رہی ہے۔۔۔ اور بالکل بھی فکر مت کریں اس کی۔ وہ جہاں کہیں ہو گی بالکل ٹھیک ہو گی۔" فارہ سلطان کے کاندھے کو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے دباتے ہوئے انہیں مطمئن کر رہی تھی۔

"کیسے فکر نہیں کروں۔۔۔ جوان بیٹی ہے۔۔۔" وہ بے بسی سے کہتے ہلکا سا چلائے۔

"تو یہ سب اس وقت سوچنا چاہیے تھا ناں۔ کس نے کہا تھا آپ سے کہ آپ وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی غصہ کریں۔ جوان اور اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی خطا معاف بھی تو کی جا سکتی تھی۔" فارہ نے اپنے ہاتھ اسی تیزی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے طنز کیا

"بند کرو اپنے طنز اور جا کے ساتھ والے گھر میں پتا کرو کہیں وہ ان کے گھر تو نہیں چلی گئی۔"

"میں کیوں جا کے اپنا ڈرامہ بنانے لگی۔۔۔ جو بات کسی کو نہیں معلوم' وہ اپنے ہی منہ سے خود بتا دوں کیا؟" فارہ بدک کے پیچھے ہٹی۔ اسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ ابھی تو ڈھنگ سے اس نے اپنی جیت کا جشن بھی نہیں منایا تھا کہ سلطان احمد کی پدرانہ شفقت ایک بار پھر سے بیدار ہو گئی تھی۔ اور اگر وہ سچ میں عبیر کو واپس گھر ڈھونڈ لاتے تو پھر تو فارہ کی سچائی کو کھل کے سب کے سامنے آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

شاید فارہ کی بات سلطان احمد کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اسی لیے انھوں نے دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی اور خود ہی اٹھ کے باہر چلے گئے تھے۔ فارہ کو جی بھر کے تاؤ آیا۔ یہ عبیر جاتے جاتے بھی اس کے لیے ایک نئی مصیبت کھڑی کر کے ہی گئی تھی۔

"لعنت ہو تم پر عبیر۔۔۔ جاتے جاتے بھی میرے لیے عذاب چھوڑ گئیں۔"

یہ کہہ کے وہ ناشتے کی ٹرے اٹھا کے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شا اللہ)

آسیہ مظہر چوہدری

"اس دفعہ تو آپا نے ہمارے ہاں بہت دنوں سے چکر نہیں لگایا۔" شائستہ' ساس کو چائے دینے آئی تو اچانک پوچھ بیٹھی۔

"ہاں' بہت دن ہو گئے ورنہ تو ہفتے میں ایک چکر لگا ہی لیتی تھی۔" فریدہ بیگم نے بھی اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

"آپ فون کر کے معلوم کرلیں' شاید طبیعت ناساز ہو ان کی۔" شائستہ نے انہیں مشورہ دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے' ابھی معلوم کرتی ہوں۔" فریدہ بیگم نے اسی وقت فون اپنی بڑی بیٹی کو ملایا تھا۔

"السلام علیکم امی۔" پانچویں گھنٹی پر فون اٹھالیا گیا۔

"زرین! کہاں ہو۔ ہفتہ سے اوپر ہو گیا' تمہیں ماں سے ملے' سسرال جاکر ماں کو بھی بھول گئی کیا؟" فریدہ بیگم نے اس کے فون اٹھاتے ہی شکوہ کیا تھا۔ وہ جواباً" چند منٹ خاموش رہی اور پھر بولی۔

"امی' آذر جاب کی وجہ سے باہر چلے گئے ہیں' پیچھے بچے ہیں' اب ان کو اکیلا چھوڑ کر کہاں آسکتی ہوں۔" وہ حسب عادت دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"کہاں گیا ہے آذر؟" فریدہ بیگم نے پوچھا۔

"دبئی گئے ہیں' چند ہفتوں کے لیے۔" اس نے بتایا۔

"تو تمہیں اور بچوں کو یہاں چھوڑ جاتا۔" فریدہ بیگم نے جواباً" کہا تھا۔

"امی آپ کو پتا تو ہے ان کا۔" اب کی بار فریدہ بیگم یک دم خاموش سی ہو گئی تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں فون رکھتی ہوں۔" کہہ کر فریدہ بیگم نے فون بند کردیا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپا۔" بات ختم ہوتے ہی شائستہ نے فوراً" پوچھا۔

"ہوں' ٹھیک ہے۔ کہہ رہی تھی آذر چند ہفتوں کے لیے دبئی گیا ہے تو وہ گھر میں مصروف ہے۔"

"تو آپا یہاں آجائیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ بھول گئی تھی جسے فریدہ بیگم کے چہرے نے یک دم یاد دلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زرین نواز' فریدہ بیگم اور نواز علی کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ دو بھائی اور تین بہنیں اس سے چھوٹے تھے۔ سلیقہ اور اخلاق تو زرین پر ختم تھا۔ ان دو تین خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ ہی وہ پورے خاندان کا مرکز بنی رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی زندگی' ہمیں ایسے موڑ پہ لے آتی ہے کہ ہمارے "پلس پوائنٹ" بھی مات کھا جاتے ہیں۔ اور یہی زرین نواز کے ساتھ ہوا تھا۔ پورا خاندان جو اس کے کھانے پکانے کی سلیقے کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا۔ جب زرین کو بیاہنے کا وقت آیا تو خاندان کا ہر بندہ منہ چھپانے لگا۔ خاندان کی جو خواتین اسے تقریبات میں دیکھ کر صدقے واری جاتی تھیں۔ وہ زرین کو دیکھ کر ایسے بھاگنے لگیں جیسے زرین نہ ہو کوئی چھوت کی بیماری ہو۔ زرین کے سلیقے سے تو سب کو محبت تھی۔ لیکن زرین سے کسی کو نہ تھی۔ سلیقے طریقے والی زرین کا فقط ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا۔ صرف ایک چھوٹا سا۔

☼ ☼ ☼

زرین نواز دو سال قبل ہونے والے ایک ایکسیڈنٹ میں اپنا ایک پاؤں گنوا بیٹھی تھی۔ اور اس کی یہی ایک خامی اس کی ساری خوبیوں کو لے ڈوبی تھی۔ خوش شکل، خوش اخلاق زرین نواز کو خاندان میں لنگڑی کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ اب اگر کوئی رشتہ آبھی جاتا تو خاندان کی پیش گوئیوں سے ڈر کے مارے بھاگ جاتا۔ زرین نواز کو غیروں سے زیادہ اپنوں نے کانٹوں پر روندا تھا۔ فریدہ بیگم الگ پریشان تھیں کہ زرین انیس کی ہو چکی تھی۔ فریدہ بیگم نے اس دفعہ بغیر خاندان کو کچھ بتائے رشتہ کی ایک اور خالہ کو ڈھونڈا اور اس کے سامنے سارا معاملہ رکھا۔ بوا نے تسلی دی اور چند دن انتظار کا کہہ کر چلی گئی۔ فریدہ بیگم کی نمازیں اور وظیفے لمبے ہوتے چلے گئے تھے۔ اس سے چھوٹی شادی شدہ بہنیں، جو اپنے خاندان میں ہی بیاہی گئی تھیں۔ روز آتیں۔ تسلی دیتی اور چلی جاتیں۔ یہ بھی زرین کی کوشش تھی کہ اس نے اپنی چھوٹی بہنوں کا مستقبل خراب نہیں ہونے دیا کیونکہ فریدہ بیگم مر کر بھی اب اپنے خاندان میں رشتہ جوڑنے کی روادار نہ تھیں۔ لیکن زرین نے انہیں سمجھایا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے خاندان کو نہ چھوڑیں۔ فریدہ بیگم کو اس کی اس قربانی پر جی بھر کر رونا بھی آیا تھا اور ہنسی بھی کہ یہ دنیا کتنی عجیب ہے کہ انسان کے ایک عیب کے بدلے اس کی باقی اچھائیوں کو بھی رد کر دیتی ہے۔ ایک اچھا انسان گنوا دیتی ہے۔

☼ ☼ ☼
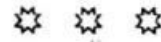
اور پھر رشتے والی بوا آذر کا رشتہ لے آئیں۔ آذر پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اس لیے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے شادی کا خواہشمند تھا۔ فریدہ بیگم نے یہ سب سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔

"بوا! میری زرین اب اتنی گئی گزری بھی نہیں ہے کہ اسے رنڈوے سے بیاہ دیا جائے۔" یہ کہتے ہوئے

فریدہ بیگم کی آواز بھرا آئی تھی۔
"اے بی بی! اتنی گئی گزری نہیں تھی تو خاندان والوں نے کیوں نہ قبول کی۔ وہ محاورہ تو سنا ہوگا نا اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں تو بتاؤ کہاں گئے۔ اپنے ارے صرف ایک پاؤں کا مسئلہ ہوا ہے نا باقی تو لاکھوں میں ایک ہے۔ سلیقہ طریقہ میں اول نمبر ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر تمہارا خاندان تمہاری بیٹیوں کے رکھ رکھاؤ کو جانتا ہے۔ اس سب کے باوجود بھی کسی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مان لو بی بی! یہاں ہر بندہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتا ہے۔ چاہے اپنا ہو یا غیر۔ جب تک یہ مسئلہ نہیں تھا۔ تو ہر بندہ میری زرین' میری زرین کے گن گاتا تھا اب بتاؤ کہاں گئی زرین۔ زرین وہی ہے لیکن اب وہ عیب دار ہو چکی ہے اور یہ دنیا عیبوں کو معاف نہیں کرتی۔" وہ یہ کہہ کر رکی نہیں تھیں۔ جبکہ فریدہ بیگم کی آنکھیں چھم چھم برستے آنسوں سے تر تھیں۔ اس تلخ سچائی نے انہیں غم زدہ کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر فریدہ بیگم نے ہر فیصلہ زرین کے اوپر چھوڑ دیا کہ وہ جو چاہے گی وہی ہوگا۔ اگر اسے یہ رشتہ منظور ہوا تو ٹھیک ورنہ وہ اپنی زندگی جینے کی حق دار ہے۔ زرین نے انہیں ہاں کہہ دی تھی۔ اسے یہ رشتہ قبول تھا۔ اس نے بغیر کسی دباؤ کے پوری رضامندی کے ساتھ آذر کو قبول کیا تھا۔
شادی کی پہلی رات ہی اس نے آذر کو اپنی زندگی کا ہر تلخ سچ کھل کر بتا دیا تھا۔ پر وہ شاید ایک بات بھول بیٹھی تھی کہ شوہر چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو' اپنی پچھلی گزری زندگی کا ایک لفظ بھی اسے نہیں بتانا چاہیے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ زرین تو ایک اور بھول کر بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم آئندہ کے بعد اپنے میکے نہیں جاؤگی۔" اس کی شادی کا تیسرا دن تھا جب فریدہ بیگم نے ان دونوں کی بمعہ بچوں کے دعوت کی تھی۔ ایسے موقع پر آذر کی یہ بات در حقیقت اسے عجیب لگی تھی۔
"کیا مطلب آذر؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔
"میں نے کہا تم اپنے میکے اور میکے سے تعلق رکھنے والوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھوگی۔"
"مم۔۔۔ مگر کیوں کیا ہوا آذر۔" یک دم اس کا لہجہ لڑکھڑایا تھا۔
"میں ایسے لوگوں سے قطعی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ جہاں انسانیت کی کوئی قدر نہ ہو۔ زرین تمہارا کیا قصور تھا اس سب میں' جو تمہیں یوں نیلام کیا گیا۔ تمہاری ذات کو روندا گیا۔ بس تمہیں اپنا ہر تعلق ختم کرنا ہوگا۔" آذر کا لہجہ دو ٹوک تھا وہ کھڑے قد سے لڑکھڑائی تھی۔
"آذر! ایسی کوئی بات نہیں تھی وہ سب۔۔۔" آذر نے اس کی بات کاٹ دی۔
"بس میں کچھ نہیں جانتا۔" یہ کہہ وہ رکا نہیں تھا۔ باہر نکل گیا تھا جب کہ وہ پیچھے بھر بھری دیوار کی طرح نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی اس قربانی پر اسے نہ فریدہ بیگم کی طرح رونا آیا تھا نہ ہنسنا۔

☆ ☆ ☆

سلیقے طریقے والی زرین کو دنیا کا نہ سلیقہ آیا تھا نہ طریقہ۔ اپنوں نے بھی اس سے قربانی لی تھی اور اب شوہر نے بھی۔ اس کے حصے میں صرف قربانیاں ہی آئی تھیں۔ پہلے میکے کی خاطر اس نے قربانیاں دی اور اب سسرال کی خاطر۔ عورت ہمیشہ ہی قربانیاں دیتی آئی ہے۔ اپنے کیا پرائے کیا' ہر کوئی عورت کی ہی قربانی لیتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ آخر وہ بھی تو گوشت پوست کی بنی ایک نازک مخلوق ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ کب تک زرین جیسی عورتیں کبھی میکے کی خاطر اور کبھی سسرال کی خاطر قربانیاں دیتی آئیں گی۔ کب تک؟ اس سوال کا شاید کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔

☆

صحرا کا آگ اگلتا سورج' شدید پیاس' پھوڑے' پھنسیوں سے بھرا جسم وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ نام' عہدہ' شخصیت' رشتے' محبت' نفرت..... اس لمحے اسے اپنے گناہ یاد آرہے تھے وہ اللہ کو پکار رہا تھا۔

ماہ رو' اریبہ' حلیمہ اور حسن المآب کالج میں دوست تھیں۔ ماہ رو کا آزاد خیال اور ماڈرن گھرانے سے تعلق ہے۔ اریبہ ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہونے سے پریشان رہتی ہے۔ حلیمہ کا تعلق ایک بہت مذہبی گھرانے سے ہے۔ حسن المآب غیر معمولی حسین ہے۔ اس نے سن شعور سے اپنے گھر میں شریعت کے احکام نے اور مذہب کی سختی سے پابندی دیکھی ہے۔ مفتی عبیدالرحمٰن اس کے نانا تھے۔

حسنل کا خاندان تبلیغ دین کے لیے مشہور تھا۔ جبکہ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت ان کے مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد کی انتہا پسندی کی وجہ سے حلیمہ کی بڑی بہن اور دو بھائیوں کے رشتے نہ ہو سکے تھے۔

مکمل ناول

حلیمہ اپنے والد کا پرتو تھی' جبکہ حسنل اپنے مذہبی ماحول سے شدید بے زار تھی۔
میری اپنی خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے چرچ جاتی ہے۔ وہاں دولہا یوحنا اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔
یوحنا نے پہلے اس کے لیے رشتہ دیا تھا۔ ماما کو بھی شدید رنج ہے کہ میری نے یوحنا کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔
حسنل کے لیے عبد المبین اور عبد المتین کا نام لیا جاتا ہے۔ جن سے حسنل شدید نفرت کرتی ہے۔
حسنا، ماہ رو اور اریبہ کے شدید اصرار پر ایک میوزک کنسرٹ میں جاتی ہے۔ وہاں موسی بی کو دیکھتی ہے۔ اسے لگتا

ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے تصورات میں دیکھتی رہی ہے۔ وہ موسی بی ہے۔ اس کا خیال پیکر مجسم ہو کر سامنے آگیا تھا۔
عقیلہ بیگم اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ ان کا پوتا ساری زندگی ان سے دور رہا تھا۔ ان کا پوتا ماورائی حسن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے حد نازک مزاج بھی تھا۔ خصوصاً" کھانے کے معاملے میں اس کے ہزار نخرے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر شیف رکھا تھا۔
حسنل کی تصورات کی دنیا موسی بی سے آباد تھی۔ موسی انڈین میوزک ڈائریکٹر کی چال بازیوں سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان اپنا کیریئر بنانے آگیا۔ جہاں چالاک اور نسبتاً" بڑی عمر کی اداکارہ شہرزاد عباسی نے اسے گھیر لیا اور دونوں ہی اپنے مفادات کی خاطر دوستی کے رشتے میں بندھ گئے۔
سعد حسن نے دور اندیشی سے کام لے کر محی الدین سہگل کو اپنا داماد بنا لیا۔ جو کہ مفتی عبید الرحمن کا کلاس فیلو تھا۔ محی

الدین سہگل نے ذہانت کے بل بوتے پر خوب ترقی کی اور اسی دوران وہ ایک بیٹے بدر الدین کا باپ بن گیا۔ بدر الدین کی آمد سہگل اور عقیلہ کے لیے ڈراؤنا خواب تھی۔ وہ صرف کیریئر بنانا چاہتے تھے۔

وہ اپنے دوستوں ایڈورڈ اور کیلاش کے ساتھ تفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر ایڈونچر کے شوق میں راستہ بھٹک گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت ڈھونڈا، مگر وہ صحرا میں کہیں کھو گیا تھا۔

خدیجہ بانو نوعمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے بل بوتے پر پالا۔ خدیجہ بانو کے اپنے بھائی اور اس کی فیملی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ خدیجہ بانو کا بیٹا ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماریہ عیسائی ہے۔ دونوں کے خاندان اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔ مگر ماریہ اور حنا دونوں ہی کسی معجزے کے منتظر ہیں۔

اپنے اپنے تحفظات کے ساتھ ماریہ اور منے کی فیملی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ماریہ کے والدین اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ خدیجہ اور ماریہ کے درمیان روایتی ساس بہو والی چپقلش نہیں۔ ماریہ عملی مسلمان بننے کی کوشش کرتی ہے، مگر خدیجہ بانو اس کے عقائد کے بارے میں شک میں پڑ جاتی ہیں۔

حسنل کو اس کی سہلیاں سمجھاتی ہیں کہ موسیٰ کا حصول ایک خواب ہے مگر حسنل اسے اپنی دعاؤں کا حصہ بنا لیتی ہے اور اسے پانے کے لیے نیک بن جاتی ہے۔ اس کی یہ کوشش اس کے نانا سے مخفی نہیں، مگر وہ اصل بات نہیں جانتے۔ موسیٰ نئی نئی ماڈلز کے ساتھ کام کرتا ہے، جس پر شہرزاد چراغ پا ہو جاتی ہے، مگر حقیقت کا ادراک کر کے موسیٰ سے دوبارہ دوستی کر لیتی ہے۔

محی الدین سہگل نے بدر کی تربیت کے لیے فلپ اینڈرسن کو رکھا تھا۔ وہ ایک ہوس ناک مرد تھا جس نے بدر کو برت لیا۔ بدر لندن تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے، فلپ اس کے ساتھ ہے، مگر ایک حادثے میں فلپ ہلاک ہو جاتا ہے۔ فلپ کی موت بدر الدین کو توڑ دیتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ سے برگشتہ ہو کر اسکارلٹ کی دوستی میں پناہ تلاش کرتا ہے جو بلا کی مے نوش ہے۔

کیلاش اسے تلاش کرنے میں اور وہ صحرا میں راستہ تلاش کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ اب اس کی تلاش ملکی سطح پر ہو رہی ہے کیوں کہ وہ برطانوی شہریت رکھتا ہے۔

جیک کی دوست اس کی محبت میں گرفتار ہے اور خود بھی اس کی تلاش کا عزم رکھتی ہے۔ محی الدین سہگل اپنے پوتے سمیع الدین کے ساتھ کچھ بے باک لڑکیوں کو دیکھ کر خدشات کا اظہار کرتے ہیں، مگر سمیع ان کی تسلی کرا کے اپنی شادی کے سارے اختیارات انہیں سونپ دیتا ہے۔

ماریہ اور خدیجہ بانو کے درمیان تناؤ آ جاتا ہے۔ ماریہ چار بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ منے کا ایک روز ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے تو ماریہ کا بھائی ڈیوڈ اسے خون دیتا ہے۔ اسی اسپتال میں ماریہ کے والد بھی داخل ہوتے ہیں۔ ماریہ محبت سے مجبور ہو کر دوبارہ اپنے گھر والوں سے تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ خدیجہ بانو سخت برا مانتی ہیں۔ ان کی پوتی میری اپنی دادی اور ماں کی چپقلش سے متاثر ہوتی ہے۔

شہرزاد ہر موقع پر موسیٰ بی کی پسند ناپسند کا خیال رکھ کے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

وہ صحرا میں بے بسی سے کسی مدد کا منتظر ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ عالمی میڈیا اس کی جانب متوجہ ہو چکا ہے اور اس کی تلاش کے لیے ہیلی کاپٹر سے مدد لی جا رہی ہے۔

خاندانی شرافت پر یقین رکھنے والی لڑکی کی تلاش میں محی الدین سہگل اپنے حلقے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ مفتی عبیدالرحمن ان کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف دلاتے ہیں جو بدر الدین کی پرورش کے سلسلے میں ان سے ہوئی تھیں۔

حسنل چھپ چھپ کے ریڈیو پر موسیٰ بی کے گانے سنتی ہے۔ صنم اسے ٹوکتی ہے اور اس کے پاس موسیٰ کی جیکٹ بھی نکلتی ہے، مگر حسنل اپنی زبان درازی کے آگے اس کی ایک نہیں چلنے دیتی۔

پانچویں قسط

سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ یہ ان کے ہی جیسے ایک موسٹ سینئر بیوروکریٹ کے بیٹے کا گھر تھا۔ یعنی محی الدین سہگل اپنے پوتے سمیع الدین کے لیے دوست کی پوتی کا رشتہ دیکھنے آئے تھے۔

دوست نے سفاری سوٹ پہننا چھوڑ کر اب شلوار قمیص اور واسکٹ کو اپنا لیا تھا۔ ان کی بیگم سوٹ کے ہم رنگ دوپٹے میں خود کو اچھی طرح سے لپیٹے سوشل ورک کرتی نظر آتی تھیں۔ اس وقت بھی نرم مسکراہٹ سے عقیلہ سے گفتگو کرتے وقت چھوٹی سی یاقوت کی تسبیح پر ورد جاری تھا۔

ڈرائنگ روم کی سجاوٹ میں مشرقی رنگ نمایاں تھا۔ مذہبی ٹچ کے ساتھ۔۔۔ قبلہ رخ دیوار پر ایک قدیم قرآن پاک کے نسخے کا فریم تھا جس نے تقریباً" پوری دیوار کو گھیر رکھا تھا۔ کھلے اوراق پر سورۃ الرحمٰن کے الفاظ دمک رہے تھے۔ بمعہ ترجمہ۔۔۔ اندر داخل ہوتے ہی بندہ مرعوب ہو جائے۔ مودب ہو جائے۔

باقی کمرے کی سجاوٹ سندھی ثقافت کا آئینہ دار تھی۔ اپنائیت سی اپنائیت۔۔۔ ملازمہ تک سادہ نیلے لباس میں سر جھکائے چائے پیش کر رہی تھی۔ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ بس اب لڑکی آجاتی تو سارا معاملہ نمٹ جاتا۔

ایسی اقدار و روایات کا پاسبان گھرانہ ہی تو درکار تھا انہیں۔۔۔

محی الدین کی سراہتی نگاہیں عقیلہ بیگم سے ملیں تو وہ بھی وہی سوچ رہی تھیں جو وہ سوچ رہے تھے۔ "اور کب آئے گی لڑکی۔۔۔؟" اشتیاق بے چینی بن کر چہرے پر پھیل گیا اور میزبان گویا شوق کو ہوا دے رہے تھے۔ ظلم کر رہے تھے۔

بیوروکریٹ صاحب انگوٹھے کے سائز برابر کی سورۃ یٰسین دکھا رہے تھے جو انہیں کسی نے کبھی "تحفتاً" دی تھی۔ محی الدین نے ستائشی نگاہوں سے دیکھا۔ ایسے کتنے ہی "تحفے" ان کے گھر میں بھی تھے مگر کہیں رکھے ہوں گے جب کہ یہاں۔۔۔ تحائف کو "یادگار" کا درجہ دے دیا گیا تھا۔

"اور آخر کب آئے گی لڑکی۔۔۔؟" عقیلہ بیگم نے نگاہوں کا پیام پڑھ لیا۔

وہ لڑکی کی دادی سے بچی کو بلوائیں' کہنے ہی والی تھیں جب بچی ماں کے ساتھ سج سج قدم اٹھاتی آگئی۔

سب سے پہلی ناگواری بچی کے لباس کے رنگ پر ہوئی یا لباس پر۔۔۔

اس سوال کا جواب بہت غور کے بعد بھی نہ ملا۔

اس نے سرخ پاجامے کے ساتھ زرد قمیص پہن رکھی تھی۔ ہدایت کی ماری نے سر پر دوپٹا بھی رکھا ہوا تھا جس سے اسٹیپ کٹ بال تو چھپ گئے تھے 'مگر بغیر آستین کی قمیص کی وجہ سے شانے اور نمایاں ہو گئے۔

حیا کی پتلی 'پارلیش دادا۔۔۔ اور بہت مدبر باپ کے کندھے سے کندھا جوڑ کر ان کے درمیان میں براجمان ہو گئی۔

دادی کے چہرے پر بھی ماں ہی کے جیسا تاثر تھا جیسے کوئی اپنی سب سے قیمتی چیز کی نمائش کرتا ہے اور پھر لوگوں کے چہروں پر ستائش ڈھونڈتے ہوئے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔

شانوں سے سفر کرتی نگاہ ناخن کی نوک پر آکر رکتی تھی اور ناخن جن کو اس نے بہت اہتمام سے سرخ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

عقیلہ بیگم نے بے ساختہ محی الدین سہگل کو دیکھا۔ انہوں نے زندگی میں جب جب اسکارلٹ کو سوچا تھا۔ اس کی شکل بعد میں یاد آئی۔ اس کے سرخ ناخن سرخ لپ اسٹک اور سرخ پمپ شوز۔۔۔ اسے سرخ رنگ پسند تھا۔

محی الدین سہگل کو اگر کوئی رنگ ناپسند تھا تو بس وہ سرخ ہی تھا۔ انہیں سرخ گلاب ناپسند ہو گئے اور اسٹرابیری سے نفرت ہو گئی اور سرخ ٹائی اور بو سے بھی۔۔۔ اور۔۔۔ اور گل لالہ سے۔۔۔

اور انہیں ایسی بہو نہیں چاہیے تھی اپنے سمیع

الدین کے لیے۔۔۔ اور ویسی تو بالکل نہیں جس میں کسی بھی حوالے سے اسکارلٹ کی مشابہت ہو۔

اسکارلٹ۔۔۔ اسکار۔۔۔ ایک بدنما نشان۔۔۔

کتنا مشکل تھا اس لڑکی کے سامنے بیٹھنا اور اپنی دلی کیفیات پر قابو پانا جب کہ عقیلہ بیگم ان کے "قطعاً" انکار و تنفر کو محسوس کرنے کے باوجود بہت سبھاؤ سے محو گفتگو ہو گئیں۔ وہ اس سے اس کی تعلیم و دیگر مشاغل کے بابت پوچھ رہی تھیں۔ وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتی تھی اور بہت اعلا ڈگریوں کی حامل تھی۔ وہ جو پیچھے والی دیوار پر پینٹنگ تھی وہ اسی کی بنائی ہوئی تھی۔

عقیلہ بیگم کی ستائشی نگاہیں اٹھیں پھر ان کا رنگ بدل گیا۔ محی الدین جن کو چپ لگی ہوئی تھی بے ساختہ گھومے۔

ایک ٹوٹے گلاس کی کرچیاں۔۔۔ اور بہتا سیال۔۔۔ کچھ گلاب کی پتیاں اور لہو کے قطرے۔

پینٹنگ تو خوب تھی۔

محی الدین سہگل سارا لحاظ بالائے طاق رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"انہیں ایسی لڑکی نہیں چاہیے تھی۔"

اور پھر بہت جلد ہر ایک کی زبان پر محی الدین سہگل کے لیے ناراضی کا ذکر ہونے لگا۔ خدا جانے انہیں کون سا گوہر مقصود درکار تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی۔۔۔ مگر۔۔۔ انہیں جو چاہیے تھی۔ خوب صورت لازمی۔۔۔ خوب سیرت یقیناً" پڑھی لکھی، مودب، خاندانی۔۔۔ یہ چلتی پرزہ۔۔۔ ہونٹ ٹیڑھے کر کے اپنی کوالیفیکشن بتاتی لڑکیاں زہر لگتیں۔ "نہیں ایسی نہیں۔"

"تو پھر کیسی۔۔۔ یہ بھی تو سوچیں زندگی سمیع کو گزارنی ہے۔ وہ ایڈجسٹ کر لے گا آپ کی پسندیدہ لڑکی کے ساتھ۔" عقیلہ بیگم چڑ گئیں۔

"کرے گا اس نے مجھے کھلی چھوٹ دی ہے۔ جو میں پسند کروں، جیسی میں لا دوں۔"

"تو آپ اس کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے؟"

"ناجائز فائدہ؟ میں اس کا بھلا چاہتا ہوں۔" ان کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔

"تو پھر ذرا لچک دکھایئے۔۔۔ اتنی کڑی شرائط۔۔۔ لڑکیاں تو سب ہی اچھی تھیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی رہا ناں تو لوگ ہم سے خفا ہو جائیں گے۔"

"لوگوں کی خفگی کے خوف سے میں اپنا نقصان کر لوں۔ مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے۔ تمہیں پتا ہے ناں ایک اچھی عورت۔۔۔"

عقیلہ بیگم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "ہاں مجھے پتا ہے کہ ایک اچھی عورت۔۔۔"

"اتنی مشکل تو نہیں ہے میری پسند کی لڑکی کی تلاش۔" وہ ناامید نہیں تھے۔

"ہاں مشکل تو خیر واقعی نہیں ہے، مگر یہ کام ہے صبر آزما۔"

"صبر ہی تو نہیں ہو رہا۔ میں کہتا ہوں کون سی گھڑی ہو اور وہ میرے سامنے آجائے۔ میرے ذہن میں اس کا خاکہ مکمل ہے۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔"

ان کی نگاہیں خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ بڑے وثوق سے دعوا کیا۔ عقیلہ بیگم حیرانی سے دیکھتی رہیں۔

محی الدین کی فرمائش یا شرائط میں سیرت کے ساتھ ساتھ صورت بھی اہم تھی۔ لڑکی کو بے پناہ حسین بھی ہونا چاہیے۔ کم عمر بھی۔۔۔ (کہ کم عمر لڑکیاں نرم شاخ کی طرح ہوتی ہیں جیسے چاہو موڑ لو) تو پھر کم عمر تو اسکارلٹ بھی تھی اور بدر الدین بھی۔۔۔ دونوں نے بیس برس میں شادی کر لی تھی۔ وہ کیوں نہ "مڑے" یا پھر کوئی موڑنے والا نہ ملا۔۔۔ باغباں نہ ملے تو پھلواری جنگل میں بدل جاتی ہے اور جنگلوں ہی میں تو لوگ بھٹکتے ہیں تو وہ تو دونوں بھٹکے ہوئے تھے۔ گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے، بے بس جرم کے ڈانڈے اگر جڑتے تو پھر محی الدین سہگل اور عقیلہ محی الدین ہی سے ملتے تھے ناں۔۔۔ اور سزا سے بچنے کا ایک طریقہ

پہلو تہی بھی ہوتا ہے۔ نہ بولیں گے نہ سنیں گے۔

محی الدین کا وہی حال تھا کہ مجرم خود مجلس میں کھڑا ہو کر جرم کی بیخ کنی کے لیے قرارداد پیش کردے اور عہد کرے کہ تب تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک ایک ایک کو چن چن کر کیفر کردار تک نہ پہنچا دے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" محی الدین سہگل نے عقیلہ بیگم کو پکارا۔

"اں۔" وہ بری طرح چونکیں۔ "نہیں کچھ نہیں۔" مگر چہرے پر فکر ہنوز تھی۔ محی الدین کی تسلی نہ ہوئی۔ عقیلہ بیگم نے سر جھٹک کر مسکرا کر دیکھا۔ خاصی شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"اتنی شرطیں تو آپ نے اپنے لیے لڑکی پسند کرتے وقت بھی نہ لگائی ہوں گی۔ جتنی بہو کے لیے ہیں اور اتنے پریشان تو آپ اپنے لیے بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ ہے ناں۔"

"او۔۔۔" محی الدین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "مجھے تو اللہ کی طرف سے اچھی خاصی مل گئی تھی نا۔۔۔ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا پھر میں نے بھی صبر شکر کیا۔" وہ اچانک قناعت پسند نظر آنے لگے۔

"صرف اچھی خاصی۔۔۔" عقیلہ بیگم نے ٹھنک کر کہا۔

"نہیں۔۔۔" محی الدین نے مسکرا کر انہیں سر سے پیر تک دیکھا۔

"بہت زیادہ اچھی۔۔۔ آثار بتاتے ہیں عمارت کبھی حسین تھی۔"

"آثار؟" عقیلہ بیگم کی آواز بلند ہوگئی۔ "آپ کھنڈر کہنا چاہتے ہیں۔"

محی الدین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ایسے لطیف مذاق بڑی خوش ذوقی اور تہذیب کی علامت ہوتے ہیں اور وہ دونوں خوش ذوق تھے۔ خوش گفتار اور تہذیب کے آئینہ دار۔۔۔

اور پھر کتنے آرام سے محی الدین سہگل نے کہہ دیا۔ مجھے تو اللہ کی طرف سے اچھی خاصی مل گئی۔ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا پھر انہوں نے صبر شکر کیا۔

جب کہ حقیقت تو اس سے الٹ تھی نا۔ نوجوانی کے زمانے میں انہوں نے ایک روشن مستقبل کے خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کتنے منظم طریقے سے جوڑ توڑ کر کے خود کوشش کی تھی ایک بیوروکریٹ سسر اور بیوروکریٹ بیوی اور خود بھی۔۔۔ ہوتا تو سب اللہ کی طرف سے ہی ہے، مگر اس میں ان کی خواہش و کوشش کا کتنا عمل دخل تھا۔ اب یہ یاد کرنے کی بات نہیں اور انہیں تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ دنیاوی جاہ و حشمت کے حصول کے لیے اپنی اولاد کو انہوں نے کیسے رول دیا۔

اولاد فرض اولین۔ فرض آخیر۔۔۔ فرض لازم۔ اولاد شفاعت بھی اور شکایت بھی۔۔۔ اللہ کے رجسٹر میں سب درج ہو جاتا ہے۔ ایک خود کار نظام ہے نا۔

☆ ☆ ☆

کلفٹن میں واقع آئس کریم پارلر میں داخل ہوتے وقت شہزاد اور موسیٰ کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ پرستار لڑکیوں کی اتنی بڑی تعداد میں گھر جائیں گے۔ دن کے اس وقت یہاں رش نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا' مگر۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ موسیٰ جاننا چاہتا تھا وہ کیسے اس صورت حال سے نمٹے۔ (دراصل پاکستانی جذباتی فینز سے اس کا ٹاکرا نہ ہونے کے برابر تھا) لڑکیاں گری پڑتی تھیں۔

شہزاد نے مسکرا کر شانے اچکا دیے۔ یہ تو اب ہونا ہی تھا' کرنا ہی پڑے گا۔ وہ سب اس کے گانوں کی تعریفیں کر رہی تھیں اور اس کی پرسنالٹی کی۔

سوائے ایک کے کسی کے پاس آٹوگراف بک نہیں تھی۔ موسیٰ نے انہیں یقین دلایا کہ وہ سب کو آٹوگراف دے گا۔ سو وہ اطمینان کا مظاہرہ کریں مگر کہاں جی؟ پتلی نوکیلی سریلی چیخیں۔۔۔ اوئی ہائے۔

موسیٰ اتنے جھگڑے اور شور سے بھاگنے کا عادی تھا۔ وہ فطرتاً "کم گو۔۔۔ بظاہر مغرور و بے نیاز نظر آتا تھا۔ اپنے دائرے میں پرسکون رہنے والا۔۔۔ مگر پندرہ سے بیس بائیس برس کی لڑکیوں کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور خالص پن تھا کہ اس نے شہرزاد سے چند منٹ کے لیے معذرت کرلی۔

شہرزاد نے سرہلایا۔ لڑکیاں اس سے بھی آٹوگراف لینا چاہتی تھیں اور اسے قطعاً "برا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ اس کے اندر کے فنکار کو کہ اس کے اندر کی عورت کو جو بڑی حساس تھی موسیٰ کے حوالے سے۔۔۔ لیکن اب اس نے خود کو عقل دے دی تھی۔ میٹھے پر لپکتی مکھیوں کی طرح گرتی لڑکیاں ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ اس کی کہنی میں شہرزاد کا ہاتھ پھنسا تھا۔ وہ دراز قامت اور دبلی پتلی عورت تھی مگر موسیٰ کے جلو میں چلتے ہوئے اسے اپنا آپ نازک کانچ کی گڑیا کی طرح لگتا۔

وہ بڑے وقار سے چھوٹے قدم اٹھا کر چلنے کی عادی تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کو ننھے قدم اٹھاتا۔ اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا۔ بٹھانے سے پہلے اتارنے سے پہلے اور ہمیشہ سر کو خم کرکے تعظیم دیتا تھا۔

(یہ برٹش کلچر میں رہنے کے باعث عادت بھی ہوسکتی تھی، مگر شہرزاد کا دل ڈول ڈول جاتا، وہ ہواؤں میں اڑتی۔۔۔)

بات کرتے وقت مقابل کے چہرے کو بغور تکتا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کی عادت تھی۔ وہ بہت اچھا سامع تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کے بیچ جب وہ گہری نگاہ سے موضوع کے حساب سے تاثرات دیتا اور مسکرا دیتا یا ہنس پڑتا۔ اور پھر جب گردن پیچھے کو گرا کر منہ کھول کر بہت سا دھواں ہوا میں چھوڑتا تب شہرزاد عیسائی جیسی زمانہ ساز عورت کے لیے اتھل پتھل دھڑکنوں کو سنبھالنا ناممکن ہوجاتا۔

اور ایک بار اس نے یوں ہی شرارتاً دھواں اس کے چہرے کی جانب چھوڑ دیا۔ ذرا سا جھک کر چہرے سے نزدیک ہو کر۔۔۔

وہ کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح ہاتھ سے دھوئیں کو روکتی بے ساختہ پیچھے ہوگئی تھی۔ جوانی لوٹ کر نہیں آتی اور اس نے بہت عرصہ پہلے اسے پیچھے چھوڑ دیا تھا، مگر موسیٰ کی محبت میں رہنے سے اسے لگتا اس کا دل بدل رہا ہے۔

وہ اتنا ہی شوخ اور امنگوں بھرا ہونے لگا تھا جتنا سولہ برس کی عمر میں تھا کسی نوخیز غزال کی طرح۔

اور یہ تو دل کا حال تھا ناں۔۔۔ اس کے ظاہری روپ پر بھی "محبت" (یک طرفہ۔۔۔ یاد رہے) اثر ڈالنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں دمکنے لگی تھیں۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح شاداب ہوگیا تھا۔

ایک صحافی نے پوچھ بھی لیا۔ "دن دوگنی رات چوگنی خوب صورتی کا راز۔۔۔"

وہ ہنس پڑی۔ (صحافی نے سوچا اگلا سوال ہنسی کے اتنے کھنکدار ہونے کے بارے میں پوچھے گا)

ادھر ہنسی تھمنے پر اس نے ادا سے بتایا۔ "بہت سارا پانی پئیں اور سوچوں کو پوزیٹو رکھیں۔ جن کا دل ستھرا ہو ان کے نقش بھی نکھرے نکھرے لگتے ہیں۔"

"واہ۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔" ایک دنیا اش اش کر اٹھی۔ "کیا جواب دیا ہے۔"

"لگتا ہے کسی نے جادو کے زور پر آپ کو پری بنادیا ہے۔" صحافی نے تو حد ہی کردی۔

وہ ایک بار پھر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ کہا کچھ نہیں۔

"محبت۔۔۔ محبت کی جادوگری۔۔۔ ایک منتر اور ایک پھونک۔۔۔ پھر سب بدل جاتا ہے کاش کہہ سکتی، مگر موسیٰ نے تو کچھ نہ کہا تھا اس نے "دوست" کہہ دیا تھا۔

بات ختم کردی تھی۔ "جسٹ گڈ فرینڈ۔۔۔" اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ صبر سے انتظار کرے گی۔

اور صبر کا سب سے بڑا مظاہرہ تو اس وقت آئس کریم پارلر میں بھی کررہی تھی۔ لڑکیوں کی بے تابی۔۔۔ اور بائیں ایک کے پاس کیمرہ تھا۔ وہ تصویر کھنچوانا

چاہتی تھیں۔
موسیٰ اپنے لیے دیے مزاج سے قطع نظر مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔
پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو پرسکون رہنے کو کہا۔ ساتھ ہی بے چارگی سے مدد طلب انداز میں شہرزاد کو دیکھا۔
شہرزاد ہنس دی۔ اس کی کہنی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر جیسے ہنستے ہنستے اس کے کندھے پر گال ٹکا دیا۔ وہ بڑے استحقاق سے کچھ کہہ رہی تھی۔
"فینز کو ناراض نہیں کرتے موسیٰ!"
موسیٰ نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے پہلے گروپ فوٹو لے لیتے ہیں۔" ایک ہاہاکار مچ گئی۔ پارلر کے اسٹاف کے لیے بھی صورت حال دلچسپ تھی۔ شور کی آواز سے پارلر کے اوپری پورشن کی چھت پر لگا پردہ ہلا۔ کچھ لوگوں نے جھانک کر دیکھا۔ اوہ۔ تو یہ بات تھی۔ ایک لمحے کی مسکراہٹ کے بعد کچھ پلٹ گئے، کچھ دلچسپی سے دیکھنے لگے۔
اور ان ہی رک جانے والوں میں ایک ماہ رو فیاض بھی تھی وہ اپنے کزنز کے ساتھ آئی تھی۔ موسیٰ بی۔۔۔ ماہ رو فیاض کے عین سامنے، نیچے کھڑا تھا۔ نیلی جینز پر سرمئی شرٹ۔ اس کے سر پر گولڈن فریم والی سیاہ عینک ٹکی تھی۔ تصاویر بنوانے کے بعد وہ کسی لڑکی کے ہاتھ پر آٹوگراف دے رہا تھا۔
اس نے تسلیم کیا کہ یہ شخص بلا کا پرکشش تھا۔ پھر اخبار و رسائل میں بھی اس خوبی کو برملا تسلیم کیا گیا اور پر سے ماڈلنگ وغیرہ میں اس کے شوکیس۔۔۔ نیا اضافہ۔۔۔ خوب صورت اضافہ، وہ تو بنا بنایا ہیرو تھا۔ اسے تو فلموں میں کام کرنا چاہیے۔
وہ شہرزاد عیسانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور وہ کتنی پیاری اور چھوٹی لگ رہی تھی سامنے سے۔۔۔ جیسی کہ اسکرین پر نظر آتی تھی۔ عنابی و نیلے رنگ کے امتزاج کے لباس میں اس کی سنہری رنگت دمک رہی تھی۔ تراشیدہ بال شانوں پر پڑے تھے۔ کمر کی جانب سے وہ خاصے لمبے اور سیدھے تھے۔ ایک لٹ بے ہدایت تھی۔ بار بار ماتھے پر سرک آتی اور جبرا" واپس بھیجی جاتی مگر۔۔۔ اتنی پیاری اور چھوٹی چھوٹی لگنے کے باوجود وہ موسیٰ سے بڑی تھی تو لگتی بھی تھی۔
اور اگر ابھی یہاں حسنل ہوتی۔۔۔ ماہ رو کو اس کے علاوہ اور کیا خیال آتا بلکہ موسیٰ پر نگاہ پڑتے ہی اسے حسنل یاد آئی تھی۔
وہ یوسف ثانی نہیں تھا، مگر وہ "زلیخا" کو جانتی تھی جس نے ہر حد سے گزرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مرجائے گی یا ماردے گی۔ کچھ بھی کر جائے گی۔
ہاں اس نے زلیخا کو دیکھ رکھا تھا، لیکن زلیخا نامراد رہی تھی۔ مطعون ہوئی تھی۔۔۔ تو کیا حسنل بھی۔۔۔ ماہ رو کا دل بہت اچھا تھا۔ اسے خود سے متعلق ہر چیز پیاری تھی۔ وہ تو پھر جگری دوست تھی۔ اللہ نہ کرے۔
کاش حسنل یہاں ہوتی۔ اگر وہ ہوتی تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی نا۔ رش چھٹ چکا تھا۔ موسیٰ اور شہرزاد بائیں جانب کے کونے میں آئس کریم کے کپ لیے بیٹھے تھے۔ وہ بے نیاز دلکش مرد۔۔۔ اور وہ نثار ہوتی عورت۔۔۔ حسنل جو سوچ رہی تھی۔۔۔ وہ ہو سکتا تھا بھلا۔۔۔ کبھی نہیں۔ دیوانے کا خواب۔ خدا حسنل کو عقل دے اور ہدایت بھی دے۔
مگر ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی۔ اس میں واقعی ایسا کچھ تھا جو بہکا دیتا تھا اور حسنل بھی ایک معصوم سی لڑکی ہی تو ہے۔

☼ ☼ ☼

"آپ دونوں اتنے اداس اور خاموش کیوں لگ رہے ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"
اس نے تفکر کا اظہار کیا۔ وہ ابھی ابھی فریش ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تھا۔ ملازم فریش جوس نفیس گلاس میں لیے مودب کھڑا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ ذائقے میں انیس بیس کے فرق پر بھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اٹھ جاتا تھا۔
ملازم نے سوچا تھا۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو

خراب ہانڈیاں بیویوں کے سروں پر توڑتے ہوں گے۔ مگر وہ جاہل لوگ ہوتے ہیں اور وہ قطعاً" جاہل نہیں تھا بس کچھ بھی کہے بغیر کھانا چھوڑ دیتا۔ کبھی اور کسی بھی چیز کو چکھنے سے صاف منع کر دیتا یا ایک نظر اٹھا کر دیکھتا نظریا تھے۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔

تو آج پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے لطف آگیا تھا اور چونکہ اس کا موڈ خوش گوار تھا۔ سوائے دادی دادا کی خاموشی زیادہ محسوس ہوئی جو اسے مطمئن دیکھ کر اپنی فکر بھلا چکے تھے۔

"اور وہ کیا ہوئی آپ کی مہم۔ وہ جو آپ بہو ڈھونڈنے جا رہے تھے بلکہ دادی جان نے بڑا ٹیپکل سا ورڈیوز کیا تھا۔"

"دسیرے کے پھول۔۔۔ لیں۔۔۔ کوئی اچھی نہیں لگی۔۔۔ یا میں کسی کو پسند نہیں آیا۔" اس کا موڈ واقعی بہت خوش گوار تھا۔ انداز شریر ہو گیا۔ جبکہ ان دونوں نے تڑپ کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر چہرے پر تنفر ابھر آیا۔ زعم اور حقارت بھی۔۔۔

محی الدین سہگل کی آواز کمرے میں یوں گونجنے لگی جیسے دربار میں بادشاہ سلامت کی۔ "کس کی مجال ہے جو سمیع الدین سہگل کے رشتے کو منع کرے۔ دنیا جانتی نہیں سمیع الدین کون ہے۔ محی الدین سہگل کا پوتا اور محی الدین سہگل۔۔۔" ابھی تو آغاز ہوا تھا مگر بڑھاپا اتنی سانس رکھتا نہیں۔ عقیلہ بیگم نے اسی وقفے کا فائدہ اٹھایا۔

"صرف محی الدین سہگل کیوں جناب۔۔۔ آپ عقیلہ سہگل کو کیوں بھول گئے۔ عقیلہ سہگل جو اتنے سال فارن منسٹری میں رہی اور۔۔۔"

پھر ایک لمبی فہرست تھی کارکردگیوں اور کارناموں کی۔۔۔

وہ شہادت کی انگلی ہونٹ پر ٹکائے بھرپور دلچسپی سے دونوں کے لال بھبھوکا چہروں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے سانس بھری اور کہنیاں میز پر ٹکا کر ذرا آگے کو جھکا۔

"یہ درست ہے کہ عقیلہ سہگل اور محی الدین سہگل کوئی معمولی چیز نہیں۔۔۔ مگر رشتہ میرا ہونا ہے یا محی الدین سہگل کا؟" اور میرے پاس تو ایسی کوئی کوالیفکیشن یا جاب نہیں ہے۔ میں بے چارہ تو ایک عام سا۔۔۔"

"یہ کس نے کہا۔" سمیع الدین کی بات ادھوری رہ گئی۔ محی الدین کو سخت صدمہ پہنچا تھا اس کی بات سے وہ اسے بتانے لگے کہ وہ کیسے عام سا ہو سکتا ہے۔

وہ تو اتنا خاص تھا کہ۔۔۔ ان دونوں کی کل دنیا تھا۔ ٹوٹل اثاثہ اور رشتہ نہ ہونے کا سبب بھی فی الفور بتایا۔ کہ کسی کی کیا اوقات انہیں انکار کرے یہ تو وہی ہیں جنہیں کوئی بھی اپنے پوتے کے قابل نہیں لگی انہیں اپنے نایاب پوتے کے لیے در نایاب ڈھونڈنا تھا اور موتی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ تھوڑا صبر' تھوڑی مشقت اور وہ اتنی جلدی تھکنے والے ہیں کہ جلدی میں کوئی غلط فیصلہ کر لیں۔

ان کی ہر بات پر عقیلہ کا سر تائیدا" ہلتا۔ وہ ان کے لفظ لفظ سے متفق تھیں۔ جہاں محی الدین اٹکتے یا بھولتے وہ ٹکڑا لگا دیتیں۔

محی الدین پوتے کو بتا رہے تھے کہ بہو کی تلاش آسان کام نہیں ہے۔ بہو نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ اقدار روایات کی پاسبان۔۔۔ اس کا کردار و اخلاق و شرافت و نجابت۔ ذات برادری خاندان و مقام جانچنا بڑا باریک بینی کا کام ہے۔ اور اس میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔

سمیع الدین کے چہرے کی شرارت دم توڑ چکی تھی۔ وہ بغور سن رہا تھا۔

دادا پوتے کی اس موضوع پر شاید یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔ مگر اس کی خاموشی بتاتی تھی جیسے یہ سب تو اس کے دل میں تھا جو دادا کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ مگر جوش میں ہوش کو نہیں کھوتے۔ اور ان کی بات کہیں سے بھی شروع ہوتی اسکارلٹ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتی تھی۔

محی الدین بھول گئے وہ ایک بیٹے کے سامنے ماں کا

ذکر کر رہے تھے۔ اور خدا کی قسم یہ ذکر خیر نہیں تھا۔ باعث خیر بھی نہیں تھا۔ سمیع الدین کا رنگ صبح کی ترو تازگی میں دمک رہا تھا۔ مگر اب ایسا نظر آنے لگا۔ جیسے کوئلے کو لال کر دو یا لوہے کی سلاخ آوے کی تہ میں دھری ہو۔

تو سمیع الدین جل رہا تھا۔ جو کچھ محی الدین کہہ رہے تھے۔ وہ بنیادی طور پر قیاس و گمان تھا۔ اور جھٹلایا بھی جا سکتا تھا۔ مگر سمیع الدین یہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب تو اس کی آنکھوں دیکھی تھی۔ آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو اس کی یادداشتیں تھیں۔

اور ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔ اور سننے کی تو بالکل نہیں ہے۔

کوئی ہے جو محی الدین سہگل کو چپ کروا کے ایک ترو تازہ مست ہواؤں والی صبح میں یک دم اسے آکسیجن کی کمی کا گمان ہونے لگا۔

اور تب ہی عقیلہ بیگم اور محی الدین سہگل دونوں نے ایک ساتھ اسے دیکھا تھا۔ اور سیکنڈ کے سویں حصے میں انہیں اپنی غلطی ۔۔۔ کا احساس ہو گیا۔

اور وہ اتنا ساکت تھا۔ جیسے مادام تساؤ کے میوزیم سے لا کر کرسی پر بٹھا دیا گیا ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو شرم ساری سے دیکھنے لگے۔

"میں تو آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ آپ ایسی لڑکی ڈھونڈیں، جو ان جیسی نہ ہو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں اس کی ماں جیسی لگنے لگیں۔ ان میں سرخیاں تیرنے لگی تھیں۔

"کہاں جا رہے ہو؟" عقیلہ بیگم سراسیمگی سے کھڑی ہوئیں۔

"کچھ کام ہے ۔۔۔ شام تک آجاؤں گا۔" اس نے بہت نرمی سے انہیں دیکھا تھا۔

عقیلہ بیگم کی نظریں احساس جرم سے جھک گئیں۔

"میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا۔" محی الدین نے کھوکھلے لہجے میں صفائی دینا چاہی، وہ گھبرا گئے تھے۔

"اور میں اس موضوع پر کسی بھی قسم کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ ایکسکیوز می۔" اس کا جملہ قطعیت سے بھرپور تھا۔ ہاں اس نے چہرے کی نرمی کو برقرار رکھا تھا۔ کمال کا ضبط تھا۔

اور کتنی دیر گزر گئی۔ اسے گئے ہوئے۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھی۔ چائے ٹھنڈی ہوا ۔۔۔ اور جوس گرم ہو گیا۔ دونوں وہیں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

"آپ کو معذرت کرنا چاہیے۔ اسے بہت دکھ ہوا ہے۔" عقیلہ بیگم نے کہا۔ محی الدین نے چونک کر دیکھا۔ پھر ان کی پرسوچ نظریں بیوی کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"میں اسے دکھی کرنے کے لیے معذرت کر سکتا ہوں۔ مگر میں نے جھوٹ تو نہیں کہا، وہ ہم سے زیادہ واقف ہے۔"

"دوبارہ محتاط رہیے گا۔"

عقیلہ بیگم نے بحث سے پرہیز کیا ۔۔۔ وہ اپنے پورے وجود کو شل محسوس کر رہی تھیں۔ کیسا بوجھ پڑا تھا۔ جیسے ہمالیہ اٹھا کر چلتی ہوں۔

بدر الدین کی بدحالی کی ایک ذمہ دار تو وہ بھی تھیں ناں ۔۔۔ یاد ہے ناں وہ رات جب فلپ اور بدر الدین ۔۔۔ جب وہ پلٹ گئی تھیں۔ انہیں رکنا چاہیے تھا پھر بات یہاں تک پہنچتی ہی نہیں ۔۔۔

"اس روز شفاعت بھائی صاحب کے ہاں حج مبارک کی دعوت میں آپ کی کزن ملی تھیں۔" محی الدین سہگل کا دھیان کسی اور طرف تھا، عقیلہ بیگم چونکیں۔

"کون سی کزن؟"

"ان کے ساتھ ان کی بچیاں تھیں۔ جس نے آپ کو کھانا نکال کر دیا تھا۔ بہت مودب اور پیاری بچی تھی۔"

"اچھا وہ ۔۔۔ مگر اس کا تو نکاح ہو چکا ہے۔" عقیلہ بیگم کو یاد آگیا۔

"اوں ہوں، جو دوسری والی تھی۔" محی الدین نے

سختی سے تردید میں سر ہلایا۔
آخر عقیلہ بیگم کو یاد کیوں نہیں آرہا۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ بانو نے گھر بھر میں ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا تھا۔ سب کو کام سونپ دیے گئے تھے۔ اور پہلو تہی کی گنجائش نہیں تھی۔ زیادہ زور ماریہ پر تھا۔ خدیجہ بانو نے زیرے والے بسکٹ کہے تھے اور چاکلیٹ کیک... میری اور مہکی نے پیزا کا نعرہ لگا دیا۔ دونوں بھائی بھی ہمنوا ہو گئے۔ ریفرشمنٹ کے باقی لوازمات کے لیے ماریہ کو فری ہینڈ دے دیا۔ جو جی چاہے بنائے۔ شوہر نے شامی کباب اور میٹھے دہی بڑے کا کہا۔

"اس سے اچھا کھانا ہی کر دیتے۔" ماریہ نے دبے لہجے میں کہا۔

"انہوں نے سختی سے چائے کے لیے کہا ہے۔ پانچ بجے کون سا دسترخوان سجا دوں۔" خدیجہ بانو نے برا مان کر کہا۔

"اللہ خیر کرے تو بڑے مواقع ملیں گے کھانے کے بھی۔"

ان کا لہجہ پُر امید اور پُر یقین ہو گیا۔ ماریہ نے پھر مزید ایک لفظ نہ کہا۔ خدا جانے کون سے رشتے دار کے آنے کا ذکر تھا۔ اس نے سسرالی رشتے داروں کے نام پر چند لوگ ہی دیکھے تھے۔

دونوں بیٹیاں نین نقش میں ماں سے مشابہ تھیں مگر رنگ روپ' بال' بالخصوص مہکی کے گھنگریالے بال خدیجہ بانو پر پڑے تھے۔ پھر تربیت خدیجہ بانو کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ مہکی اپنے مزاج کی بچی تھی۔ اس کی اپنی دلچسپیاں اور ترجیحات تھیں۔ اپنی دنیا... جبکہ میری پر دادی کا زیادہ اثر تھا۔ وہ دادی کا پرتو تھی۔ کبھی اختلافی موضوع چھڑ جاتا کہ رایا ہلکا۔ تو وہ جانتی تھی میری اس کی طرف نہیں ہوگی۔

اس وقت بھی وہ دادی کے پیچھے پڑی تھی کہ اسے رشتے سمجھائیں۔ یہ جو لوگ آرہے ہیں آپ کے کون ہیں۔ اور کیوں آرہے ہیں؟ ماریہ بری طرح کچن میں بڑی تھی۔ اس کے ہاتھ سخت ہوئے۔ اس کے کان باہر لگے ہوئے تھے۔

"میری سگی پھوپھی کے دیور کی بیٹی ہے عقیلہ... اس زمانے کی سول سرونٹ ہے جب لڑکیوں کی پڑھائی کا خیال بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اتنی قابل اتنی لائق... ہر امتحان میں اول آتی تھی۔ اتنے لڑکوں کو پچھاڑ کر سب سے آگے آئی۔ اس کا شوہر بھی اپنی ہی برادری کا ہے۔ اس کا ننھیالی رشتے دار... وہ بھی سول سروس میں تھا۔ بلکہ ٹی وی میں بھی کبھی کبھی آتا ہے۔ بلکہ روز۔" دادی کسی نیوز چینل پر براجمان صاحب کو دیکھ کر کچھ کہہ تو رہی تھیں۔

"اب تو بے چاری شوگر اور بی پی کے باعث کسی کام کی رہی نہیں ورنہ دو چار سال پہلے تک بڑی فعال تھی۔ اب بس گھر تک محدود ہو گئی ہے۔" خدیجہ بانو دکھی ہو گئیں۔

"اچھا دادی... مگر وہ ہمارے گھر کیوں آرہی ہیں؟" مہکی کو جماہیاں آنے لگیں۔ اسے خدیجہ بانو نے کشنز کے غلاف بدلنے کا کام دیا تھا۔ اس کے احتجاج پر بڑی طرح ڈانٹا۔ "ایک ہی تو کام دیا ہے صرف کور بدلنے ہیں۔"

"صرف کشن۔" مہکی نے گود میں موجود کشن پر سر ڈال دیا۔ "یہ صرف کشن ایک درجن سے بھی زیادہ ہیں دادی جان۔"

"اتنی دیر میں دو سوال یاد کر لیتی۔" اس کے لہجے میں تاسف کھل گیا۔ وہ دنیا میں صرف پڑھنے کے لیے آئی تھی۔ سوے رٹنے پر رٹا...

"ہاں ہاں جاؤ۔" خدیجہ بانو نے خفگی سے کہا۔

"جا رہی ہوں۔ اب کوئی مجھے سلام کرنے کو بھی نہ بلائے۔"

"ہاں ہاں نہیں بلائیں گے۔ تمہارا کام بھی نہیں ہے۔" خدیجہ بانو کسی سوچ میں گم تھیں ورنہ اس بد تہذیبی والے آئیڈیے پر ایک کلاس ابھی ہوتی۔

ادھر ماریہ کا شک یقین میں بدل گیا۔ ہو نہ ہو یہ

مہمان میری سے متعلق تھے۔

اسے خدیجہ بانو کی پوتیوں سے محبت پر ذرا بھی شک نہ تھا۔ وہ ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ اپنی پنشن ان پر خرچ کرتی تھیں۔ گریجویٹی کی رقم سے ان کے لیے زیور بنوا کر رکھ دیے تھے۔

ماریہ کو یاد نہیں تھا کہ وہ ماں بیٹیاں کبھی ایسے نکلی ہوں جیسے یہ دادی پوتی نکلتی تھیں۔ کسی نے تو یہ تک کہہ دیا کہ یہ تمہاری بیٹیاں نہیں نندیں لگتی ہیں۔ اسے برا نہیں لگا تھا۔ اسے ناپسند کرنے والی ساس اگر اس کی ــــ اولاد سے بھی بیر باندھ لیتی۔ تنفر ہوتی تب۔۔۔

دوسری نوعمر لڑکیوں کی نسبت مہکی اور میری بھی کمال کی تھیں۔ انہیں بوڑھی دادی کے ہم قدم رہنے سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دادی تو سہیلی جیسی تھیں۔

(ہاں میری کی زیادہ پکی دوستی تھی)
لیکن خدیجہ بانو کے لیے دونوں کی فکر برابر تھی۔
جب ہی تو سال بھر پہلے جب مہکی فقط سترہ برس کی تھی۔ اس کا رشتہ منے کے جگری دوست کے بیٹے سے کر دیا جو اس کا ہم جماعت بھی تھا۔

ماریہ کے لیے یہ مقام حیرت تھا۔ ابھی وہ صدمے اور غم و غصے تک ہی پہنچ ہی پائی تھی۔ اسے تو اپنی بیٹیوں کو بہت زیادہ پڑھانا تھا۔ اور کسی بہت اچھے مقام تک پہنچانا تھا۔ شادی تو بہت بعد کا مرحلہ تھی۔ کرنی ہی ہوتی ہے۔ مہکی بھی کر لیتی۔ مگر خدیجہ بانو۔۔۔ ان کے پاس ہر ہر اعتراض کا شافی جواب تھا۔

"کیا گھرانہ اچھا نہیں؟"

"نہیں بہت ہی اچھی فیملی ہے۔ ویل ایجوکیٹڈ ہائی کوالیفائیڈ' ویل آف۔۔۔"

"کیا لڑکا اچھا نہیں۔۔۔"

"نہیں بہت اچھا لڑکا ہے۔ دیکھنے میں بھی اور کردار واخلاق میں بھی۔"

ماریہ اسے بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ بہت قابل نرسری سے اب تک پورے اسکول میں اول آتا رہا تھا۔ اور آگے بھی اس کے خواب اور کوششوں سے انکار نہیں تھا۔ وہ سب ارادوں میں کامیاب ہو گا۔ ان شاءاللہ۔۔۔ مگر۔۔۔

وہ مہکی سے فقط آٹھ ماہ بڑا تھا۔ اسے آٹھ سال نہ سہی پانچ سال بڑا ہونا چاہیے تھا۔ اور یہ رشتہ بھی آٹھ سال بعد نہ سہی پانچ سال بعد کرنا چاہیے تھا۔

دونوں کم عمر تھے۔ اس رشتے کی حساسیت کو نہ سمجھ سکتے تھے نہ اس رشتے کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ سنبھال سکتے تھے؟

آج دونوں کی دنیا محدود تھی۔ کل کو جب وقت آگے گزرتا۔۔۔ یا پھر منگنی کر دی جاتی۔

نکاح کیوں کیا۔

اس کے سارے اعتراض شوہر نے ماں تک پہنچا دیے۔ خدیجہ بانو نے تحمل سے سب کو سنا۔ اور مختصر جواب ایسے دیا کہ مزید سوال کی گنجائش نہیں بچی۔

وہ دنیا کو زیادہ بہتر سمجھتی ہیں اور انہوں نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ بے نام رشتے کو نام دے دیا تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی ڈھکی چھپی تو نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی باتیں بناتا' بہتر نہ کیا کہ دونوں کی دلچسپی کو جائز رشتے میں باندھ دیا۔۔۔ اور ماریہ کے خدشات۔۔۔ ہونے کو تو دنیا میں کیا کیا نہیں ہوتا مگر وہ اپنی پوتیوں کا اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانا چاہتی تھیں بعد میں کون کرتا۔۔۔ انہیں ماریہ پر ذرا بھروسہ نہیں تھا۔ "ماریہ کو کیا پتا ہو گا۔ بیٹی کے رشتے ناتے کرنا کتنا نازک کام ہے۔ ماریہ کو کیا پتا ایک اچھے مسلمان گھرانے۔۔۔ اور معیار سو وہ خود کریں گی سب کچھ۔۔۔ ماریہ نہ بولے۔" اور ماریہ چپ ہو گئی۔

اس کے خدشات اپنی جگہ درست تھے۔ مگر خدیجہ بانو کے اقدامات بھی غلط نہ تھے۔

لیکن مالی اعتبار سے مضبوط اور ذمہ دار شوہر ماریہ کے نزدیک زیادہ بہتر ثابت ہوتا۔ اور یہ کوئی سکہ بند

بات نہیں تھی۔ سو اس نے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ دوسرا اہم پہلو اور قابل طمانیت بات یہ بھی تھی کہ میگی اور ذیشان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ یہ رشتہ ان کی خواہش کی تکمیل تھا گویا۔۔۔

"میری پیاری دادی۔" میگی خدیجہ بانو کا منہ چومتی رہی۔ "آپ کو میرے دل کے حال کا کیسے پتا لگا۔" وہ دادی کو جھلائے جاتی تھی۔ وہ فخر سے گردن تانے سب کو دیکھتی رہیں۔ "دیکھی پھر میری نگاہ۔۔۔ اور پیش بینی۔"

ذیشان الگ بھنگڑے ڈالتا پایا گیا۔ اوون کا بزر بج گیا تھا ماریہ اپنے خیالات سے چونکی۔ باہر خدیجہ بانو تیاری کے حوالے سے مطمئن ہی نہیں تھیں۔۔۔ ہلکان ہو رہی تھیں۔ سب کو کیے جا رہی تھیں۔

"تو وہ مہمان کیا ہمارے گھر انسپکشن کے لیے آرہے ہیں دادی جان۔۔۔؟ چھوٹے والا تنگ آکر پوچھنے لگا۔

"ہاں۔" خدیجہ بانو ایک پل کی خجالت کے بعد دہاڑیں۔ "اور چلو بھاگو' جاکر کپڑے بدل لو اور خبردار جو ذرا سی بھی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا۔" ان کے کڑے لہجے پر وہ کچھ سہم گیا۔

"آتش بازی کا مظاہرہ کرلیں دادی جان۔۔۔؟" یہ میری کی آواز تھی۔ آج امبریلا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر آئی تھی۔

بڑی کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ میگی کا لباس بھی بالکل ایسا ہی تھا بس رنگ دوسرا تھا۔ ماریہ کا استری شدہ لباس بھی انہوں نے ہی چنا تھا۔ نفیس اور قیمتی۔۔۔

"تم سے فقط تمیز داری کے مظاہرے کی استدعا ہے۔" وہ اسے سخت تنقیدی انداز سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کو کبھی مجھ سے شکایت ہوئی؟" اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔ خدیجہ بانو کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔ ہاں انہیں مہو سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ان کی لاڈو رانی۔

"ویسے آپ کچھ غلط نہیں کر رہیں دادی جان؟ اس کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔ "ہم میزبان ہیں۔ مہمان نہیں کہ اتنا بناؤ سنگھار کریں۔ کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا۔ نئے جوڑے چڑھا کر بیٹھ گئے ہیں۔ تیار تو مہمانوں کو ہو کر آنا چاہیے میری سمجھ میں تو ابھی تک نہیں آیا کہ آپ کے رشتے دار تھے۔ تو اتنے سالوں سے تھے کہاں؟"

"ابھی تو بتایا تھا دونوں کتنے بڑے افسر۔۔۔" خدیجہ بانو نے بڑی تسلی سے وہ سب تفصیل دہرانا شروع کردی جو وہ کتنی بار بتا چکی تھیں۔

"اوکے۔۔۔" اس نے ہاتھ اٹھادیے۔ "اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔"

"حکم کیا بس اچھے سے ملنا۔۔۔"

"میں تو کہتی ہوں وہ جیسے ہی نظر آئیں' بھاگ کر جاکر لپٹ جانا۔ زور زور سے معانقہ کرنا' کس کس کر چومنا۔۔۔ دونوں گالوں کو ساتھ دہائیاں دینا "آنٹی آپ کہاں تھیں آنٹی! ہم کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے تھے۔" میگی کسی کہنہ مشق ہدایت کار کی طرح کرکے دکھا رہی تھی۔

"ہائیں ہائیں۔" خدیجہ بانو اچھل پڑیں۔ "دماغ تو نہیں چل گیا۔" انہوں نے دونوں کو جھاڑنا شروع کردیا۔ "جو جی میں آتا ہے بول دیتی ہیں۔ خبردار جو ایسی ویسی حرکتیں کیں۔"

دونوں بہت فرماں بردار تھیں مگر فطرتاً شریر تھیں۔

"اور میگی اور ذیشان کے رشتے کا سب سے اہم سبب باہم پسندیدگی والگاؤ تھا۔ مگر اب جو خدیجہ بانو کرنے جا رہی تھیں۔ یعنی یہ جو لوگ آرہے تھے۔ جن کی

سرورق کی شخصیت

ماڈل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عینی رضوی

میک اپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ موسیٰ رضا

حیثیت بڑی پرکشش تھی۔ ان کی تعلیم، عہدے شان وشوکت کا تذکرہ بار بار کررہی تھیں مخصوصی طور پر ماریہ کو سنانا مقصود تھا۔ یہ البتہ مروتاً" بھی نہ بتایا کہ وہ لوگ کس مقصد کے لیے آرہے ہیں۔ مگر ماریہ کوئی بچی تو نہ تھی پتا چل گیا تھا۔ وہ ان کے گھر اپنے پوتے کے رشتے کے لیے آرہے تھے۔

پوتے کی تفصیلات بھی بہت پرکشش تھیں۔ عجیب سی کیفیت ہورہی تھی۔

منتشر سوچوں کے ساتھ ماریہ ڈونگے بھرتی رہی۔ ڈشیں سجاتی رہی۔

مہگی اور ذیشان کے رشتے میں باہمی پسندیدگی تھی جبکہ میری بے خبر تھی۔ اس کے تو فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ خدیجہ بانو کی فرماں بردار تھی مگر اچانک آنے والے رشتے کو مان جاتی۔ جس کو جانتی نہیں۔ پہچانتی نہیں، دیکھا تک نہیں... مشکل بات تھی۔

پتا نہیں خدیجہ بانو نے اس پہلو پر سوچا تھا کہ نہیں۔ فی الوقت تو وہ بہت خوش... اور خوش امیدی کا شکار تھیں۔ میری کو تو بہت پڑھنا اور کچھ بننا ہے۔ شادی....

ماریہ نے حنان کے رشتے کے حوالے سے بات کی تھی۔ تب وہ کیسے بھڑکی تھی۔ اور پھر اس نے صفا انکار کیا۔ اسے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ ماریہ کو لگا ایسا تو ہر لڑکی کہتی ہے۔ مگر شادی تو کرتے ہیں ناں... تو حنان سے کرلیتی... تب اس نے جس قطعیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ حنان تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسے سخت دھچکا پہنچا تھا تو اب کیا ہوگا۔ کیا وہ مان جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"واقعی... اچھا..." یہ اچھنبے بھرے لفظ حلیمہ اور اریبہ کے منہ سے ایک ساتھ برآمد ہوئے۔

"ہاں..." ماہ رو نے پرزور انداز سے سرہلایا۔ "وہ واقعی اتنا خوب صورت شخص ہے کہ اسے دیکھ کر دل ہار دیا جائے۔"

"تو کیا تم نے بھی ہار دیا؟" حلیمہ نے چبھتے لہجے میں کہا۔ اریبہ کے چہرے سے جواب کی چاہ ابھرنے لگی۔

"ہاں... کیا میں لڑکی نہیں..." وہ گویا برا مان گئی۔ "حسن مجھے بھی متاثر کرتا ہے۔ بلکہ میں تو خاصی حسن پرست واقع ہوئی ہوں۔"

"وہ ملکہ حسن... اس حسن اتفاق کا ذکر اس حسن المآب سے غلطی سے بھی نہ کردینا۔ پتا چلے ان آنکھوں کی بلائیں لینے لگے۔ جنہوں نے اسے اتنے قریب سے دیکھا تھا۔" اریبہ نے کھٹاک سے دونوں ہاتھ جوڑدیے۔

ماہ رو کا شرارت سے مسکراتا چہرہ گہری سنجیدگی کی قبا میں چھپ گیا۔ "میں کوئی پاگل ہوں۔ آگ میں پانی ڈالتے ہیں نہ کہ تیل۔"

ہوم... اریبہ نے طمانیت سے سرہلایا۔

"اور وہ جو اس کے ساتھ تھی۔ کیا نام ہے شہرزاد عیسانی... وہ کیسی تھی۔" حلیمہ نے یوں ہی پوچھا۔

"اچھا دیھ... یار اس نے تو مجھے حیران کردیا۔ نازک لمبی گڑیا تھی گویا... اتنی فریش اتنی پنک 'مائی گاڈ... اللہ جھوٹ نہ بلوائے ہماری پیدائش کے زمانے سے فلموں میں آرہی ہے۔ اس کے ہاتھ... لگتا تھا مکھن سے ڈھلے ہیں۔ اور اسکن اتنی شائنی تھی جیسے سنہری دھوپ میں پیتل کی تھالی لشکارے مارتی ہے۔"

"واہ...؟" حلیمہ زور سے ہنسی۔ "کیا شاندار مثال دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اریبہ نے ناسمجھی سے دیکھا۔

"پہلی شرط سنہری دھوپ اس کے بعد لشکارے، مگر اوقات کیا پیتل، ہنہ پیتل گھسائی مانگتا ہے۔ رگڑائی... ہو تو انسان سونا۔ جو گارے میں سے بھی نکلے تو آنکھوں کو چندھیا دیتا ہے۔ اس کی خوب صورتی محبت کی مرہون۔"

اریبہ تو اریبہ، ماہ رو بھی اش اش کر اٹھی۔ ایسی وضاحت... بلکہ صاف کہیں تو جوتا مار دیا تھا سیدھا منہ پر.....

"یعنی اسے جبری خوب صورتی کہیں گے۔" ماہ رو کو ہنسی آگئی۔
"جو جبری مشقت ہی سے حاصل ہوتی ہو۔" اریبہ کا جملہ بھی شاندار تھا۔
"جیسے کہ۔۔۔ جیسے۔۔۔ یار حسن ہو تو جیسے۔۔۔"
"جیسے اپنی حسن المآب۔" اس نے مثال ڈھونڈ ہی لی۔
حلیمہ اور ماہ رو نے چونک کر دیکھا پھر دونوں کے چہروں پر تائید پھیل گئی۔
"پیاری تو میں بھی ہوں۔" ماہ رو نے مصنوعی خفگی سے اپنے گالوں پر ہاتھ ٹکائے۔
"اس میں کیا شک۔۔۔" اریبہ نے سہلایا۔ "مگر وہ حسنل والی بات نہیں۔" اریبہ نے آج حق گوئی کی قسم کھالی تھی۔
"تم میری دوست ہو کہ نہیں۔" ماہ رو نے اسے دھمکاتے انداز سے دیکھا۔
"دونوں کی دوست ہوں میں۔" اریبہ نے اس کا ہاتھ بڑی محبت سے تھام لیا۔ "مگر میری جان! اچھا دوست وہ ہوتا ہے جو سچ بولے۔"
"بات یہ ہے کہ اللہ کی بنائی ہر چیز خوب صورت ہے۔ کیونکہ دنیا کی بنیاد خوب صورت ہے۔ دوسرے ہر انسان کی ایک خاص خوبی ہوتی ہے، حسنل کے پاس حسن ہے۔ جبکہ ماہ رو کے پاس عقل ہے، دانش ہے، ذہانت ہے، جو حسن سے افضل ہوتی ہے۔" حلیمہ کا لہجہ پُرخلوص تھا۔
اریبہ کی آنکھوں سے تائید چھلکنے لگی۔ وہ تو بس یوں ہی چھیڑ رہی تھی۔ جبکہ ماہ رو کی آنکھوں سے الجھن ہویدا تھی۔
"تمہاری باتیں بالکل درست۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ دانش کون ہے۔ میں تو نہیں جانتی۔"
"ماہ رو کی بچی۔۔۔" حلیمہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جرنل اس کے سر پہ مارا۔
"اور کرو تعریفیں۔۔۔ بڑی قابل ہے۔ بڑی یہ بڑی وہ عقل سلیم والی۔۔۔ ہنہ' دیکھ لو۔"
"اچھا اب یہ نیا نام۔۔۔ یہ سلیم کون ہے۔ کون ہے یہ؟" ماہ رو سچ مچ پریشان دکھائی دینے لگی۔ اس کے نام کے ساتھ کس کے نام جوڑ دیئے تھے دونوں نے۔۔۔
"ہے کوئی؟" اریبہ نے شانے اچکا دیے۔
حلیمہ نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے شریر چہروں پر سنجیدگی ٹھہر گئی۔ ماہ رو نے بے ساختہ نظر چرائی۔ وہ اس سے ہی جاننا چاہ رہی تھیں۔
ماہ رو کے ذہن میں اس روز کی ساری باتیں لوٹ آئیں جب اس نے یہی سوال حسنل سے کیا تھا۔ اور اس کے جوابات جان کر وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔ تو کیا ابھی وہ ان دونوں کو سب بتادے۔
بتانے میں حرج تو نہیں تھا۔ مگر اس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ کیا کہتی۔ بلاوجہ کی بحث۔۔۔ اللہ ہی ہدایت دیتا تو دیتا اور اس نے اس معاملے پر بہت سوچا تھا۔ حسن المآب کی اس خواہش (بے وقوفی۔ بے عقلی) کا انجام کیا ہوگا' اسے دور دور تک کوئی انجام نہ سوجھا۔ نہ اچھا انجام نہ برا۔۔۔ اور ایسی باتوں کا انجام ہو ہی کیا سکتا تھا۔۔۔ کوئی سرا تو ہوتا۔ پر یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اللہ سے مانگ لے گی اسے۔۔۔
ماہ رو کو اللہ کی دین پر یقین واثق تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ جو جی چاہا منہ اٹھا کر مانگ لیا۔
کوئی مذاق ہے بھلا۔
اور حسنل کو دعا کی طاقت پر یقین تھا۔ ماہ رو نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے بھرپور یقین سے اللہ کے حضور دعا کی۔ حسنل کو عقل دے' اس کے لیے بہتر کرے۔ اے اللہ! حسنل کی دعا سن لے۔ وہ جو چاہتی ہے اسے دے دے مگر۔"
اسے اللہ سے ضد کرنے سے ڈر لگا تھا۔ گزارش اور حکم کے باریک فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اپنی اوقات یاد رکھنی چاہیے۔
مگر ان سب سوچوں سے پرے، جب ماہ رو نے اس روز موسیٰ کو دیکھا تھا۔ تب اس نے سوچا تھا۔ مرد کی خوب صورتی عورت پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہ اٹھارہ

برس کی زندگی کا پہلا مگر بڑا گہرا تجربہ تھا۔ اسے دیکھ کر پہلا خیال حسن المآب کا آیا تھا۔ پھر نجانے کس وقت حسنل بیچ میں سے نکل گئی اور وہ صرف ماہ رو رہ گئی۔ وہ دوشیزہ جس کا دل نکھرا ستھرا تھا۔ جس پر کوئی نقش نہیں تھا۔ جس کی نظر کہیں ٹھہری نہیں تھی۔ اور وہ اسے اچھا لگا تھا۔ اتنا زیادہ اچھا کہ کتنی دقتوں سے اس نے دھیان بٹایا تھا اور ابھی بھی جب وہ اس کا ذکر لے کر بیٹھی تھی۔ اسی کیفیت میں گھر گئی تھی۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر اس سب کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ بھی حسن المآب کی طرح۔۔۔؟

اور حلیمہ و اریبہ کی متفقہ رائے بلکہ فیصلہ تھا۔ وہ اس واقعہ کا ذکر حسنل سے قطعاً" نہیں کرے گی۔ (حسنل موسمی بخار کی وجہ سے غیر حاضر تھی) ماہ رو نے سہلایا۔ یہ بھی کہنے کی بات تھی۔

"میرا رشتہ دادی ؟" وہ توقع سے زیادہ حیران رہ گئی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

مسکراتی دادی کے لب بھنچ گئے۔ اسے کہنا چاہیے تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کے جملے میں تو فیصلہ تھا۔ قطعیت سے بھرپور انداز۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ شادی تو کرنی ہوتی ہے۔" ان کا لہجہ شہد آگیں تھا۔

"ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔۔۔ ابھی تو مجھے۔" اس نے بات اڑانی چاہی۔

"یہ بھی تمہاری ہم عمر ہے اور اس کا نکاح ہوئے چھ ماہ گزر چکے ہیں۔"

"اس لیے کہ اس کو یہ سب کرنا تھا، مجھے نہیں کرنا۔" اس نے بھنچے لہجے میں کہا۔

"تم کسی اور کو تو۔۔۔" "نہیں ایسے منہ پھاڑ کر نہیں کہنا چاہیے۔ خدیجہ بانو نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں دادی! اوہ۔۔۔" اسے بھی ایسے قیاس کی امید نہیں تھی۔۔۔ سرعت سے صفائی دی۔ "ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔۔۔ بہت بڑے بڑے خواب ہیں میرے۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھائے۔

"اوہو۔" خدیجہ بانو کے لبوں پر پُرشفقت مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو پڑھنے سے، کچھ بننے سے کون منع کرتا ہے۔ تمہیں لگتا ہے عقیلہ بیگم تمہارے راستے میں روڑے اٹکائیں گی۔ بھول گئیں، وہ اس زمانے کی پڑھی خاتون ہیں جب لڑکیوں کو پڑھانے کا تصور بھی محال تھا۔"

خدیجہ بانو نے دس بار کا دہرایا ہوا سبق دوبارہ شروع کر دیا۔ وہ تحمل سے ان کے چپ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

خدیجہ بانو بہت دیر بعد رکیں۔ انداز یوں تھا اب تم بولو کہ اگر بولنے کا کچھ ہے تو۔۔۔ مگر اس بار میری نے انہیں حیران کے ساتھ ساتھ پریشان کر دیا تھا۔

"یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مجھے شادی نہیں کرنی دادی!" وہی ڈھاک کے تین پات۔

"شادی کے حوالے سے میری اپنی ایک سوچ ہے۔ کچھ نظریات ہیں۔ مگر وہ بھی تب جب میں شادی کرنے کا سوچوں گی۔ کبھی اگر کی تو۔۔۔ ارادہ بنا تو ابھی تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ تنگ آگئی۔ اس نے اس حوالے سے کبھی خوابوں خیالوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یا یہ کہ اسی حوالے سے بہت سوچا تھا کہ اگر کرنی پڑ گئی تو پھر ایسے نہیں ایسے اور ویسے۔

اور ایسے ہی حیرت کے جہاں میں رہ گئی تھیں خدیجہ بانو۔

سارے بچے ان سے بہت قریب تھے مگر میرو۔۔۔ سب سے زیادہ جسم کا حصہ لگتی تھی۔

دونوں بچپن سے نزدیک تھیں مگر میرو زیادہ۔ جب بڑے ہونے پر دونوں کے کمرے الگ کیے گئے تب بھی میرو بھاگ کر ان کے پاس آجاتی۔ یہ بچپن تو چھوٹو۔۔۔ ابھی بھی بڑی لجاجت اور مان سے لپٹ کر سوتی تھی۔ یہ لونھاکی لونھا ہو کر بھی۔

تو وہ کون سی سوچ اور نظریات تھے جو حائل ہو گئے اور یہ سوچ تھی کیا۔۔۔ اور کیسے پہنچی۔

ماریہ چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئی۔ بحث

شروع ہوتے وہ بھی خدیجہ بانو کے کمرے میں موجود تھی۔ ان کے لیے اس کی موجودگی اتنی اہم نہیں تھی۔ بیٹھے نہ بیٹھے اس کی مرضی۔ ہونا تو وہی ہے نا جو وہ چاہیں گی۔ دوسرے وہ کل شام ہی سے ماریہ کے چہرے پر پھیلی خوشی دیکھ چکی تھیں۔ اس سے پہلے کی الجھن و بے آرامی سے بھی واقف تھیں۔ (جب وہ معترض تھی لیکن پھر جب وہ مہمانوں سے ملی محی الدین سہگل اور عقیلہ سہگل۔ اور پھر جب لڑکے کا ذکر ہوا تو اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت پھیلتی چلی گئی۔ اتنا شان دار رشتہ... لڑکا ابھی دیکھا نہیں تھا مگر سب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کیسا ہو گا ہے۔

لڑکے کا میری سے عمر کا فرق بھی ماریہ کو پسند آیا۔ شادی میں جلدی والی بات پر وہ بوکھلائی تھی۔ مگر محی الدین سہگل نے کہا۔ وہ پڑھائی جاری رکھے گی۔ شادی پڑھائی سے روکتی ہے بھلا۔ ویسے تو سمیع الدین نے مستقلاً ''پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے مگر میری کو پڑھائی کی غرض سے وہ انگلینڈ بھیج دیں گے۔ دو چار لاکھ کی تو بات ہے۔

اور ماریہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خدیجہ بانو کی گردن تفاخر سے اکڑی تھی۔ عقیلہ بیگم کم بول رہی تھیں مگر وہ شوہر کی ہر بات پر یا تو مسکراتیں یا پھر اثبات میں سر ہلاتیں۔ ان کا انداز پر تکلف تھا۔

جبکہ محی الدین سہگل کی خوشی چھلکی پڑتی تھی۔ انہوں نے میری کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ محبت سے ہاتھ تھاما۔ اس سے اس کی دلچسپیاں پوچھتے پوچھتے ایسے شاد ہوئے کہ بازو لمبا کر کے شانے پر رکھ دیا۔

مشرقی لباس میں سلیقے و قرینے کا مظاہرہ کرتی مکمل ڈھکی لڑکیاں بہت خوب۔

میری بہت پیاری تھی۔ نازک لانبی... کھلتا رنگ، لمبے بال اور ذہین آنکھوں والی لڑکی... مگر شاید خوب صورتی کے اس تصور تک نہیں پہنچ رہی تھی جیسے عقیلہ بیگم نے سمیع کی دلہن کے حوالے سے سوچ رکھا تھا۔ یا شاید وہ پہلی ملاقات میں اتنی گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے میں محتاط تھیں۔

محی الدین تو شاید ہاں لینے کے ساتھ ہی بارات کا دن طے کر کے آنے کی ٹھان چکے تھے مگر خدیجہ بانو اور دیگر نے بھی انہیں جلد بازی سے پرہیز کے بارے میں بتایا۔

وہ کھسیا گئے پھر زور سے ہنس دیے۔ ان سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا۔ سر جھکا کر خاموش بیٹھی شرمیلی بچی کتنی سادہ اور تابع دار لگی تھی۔ پھر جب مغرب کی اذان ہوئی تو وہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی تھی۔ ان کو جائے نماز دیتے ہوئے اس کا وضو کے پانی سے بھیگا چہرہ، بھیگی پلکیں... وہ کتنی پاکیزہ لگ رہی تھی۔

اور اب جب اس نے صاف انکار کر دیا تھا تو ماریہ بھی بھونچکارہ گئی۔

''کیوں میری...؟''

''بس نہیں کرنی۔''

''کیوں بیٹا؟''

''کیوں کا کیا سوال... مجھے وضاحتیں نہیں دینی ممی! ... پلیز اور اب مجھ سے کوئی کچھ نہ پوچھے۔''

وہ خفا دکھائی دینے لگی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ ماریہ پکارتی رہ گئی۔ خدیجہ بانو کی سنجیدہ آواز ابھری۔

''چپ رہو تم... کرتی ہیں لڑکیاں ایسے ہمیں سمجھاؤں گی تو سمجھ لے گی۔ تم تیاریاں کرو۔ ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر گئے ہیں محی الدین... ایک بار لڑکے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ تسلی کر لوں تو پھر میری کو بھی دیکھ لوں گی۔ تم فکر مت کرو۔ میری پوتی ہے، مجھے معلوم ہے کیسے پوچھنا ہے۔ کیسے منانا ہے۔''

ماریہ کے متفکر حیران چہرے کے رنگ پھیکے پڑے۔ ممی نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا کہ وہ پریشان نہ ہوں، دادی تو ایسے ہی بس دل توڑ دیتی ہیں ہمیشہ سے ممی کا۔

✲ ✲ ✲

تینوں طے کر چکی تھیں۔ وہ حسنل سے ذکر نہیں کریں گی۔ ماہ رو نے جو موسیٰ کو دیکھا اور بالخصوص

اس کی کیفیت ... مگر اس روز جب لڑکیوں کا ایک گروپ جمنازیم کے پیچھے پڑے ٹوٹے ڈیسکوں کے ڈھیر پر جگہ بنا کر بیٹھا فراغت کے مشاغل سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک لڑکی اپنے بھائی کی منگنی کی تصاویر لائی ہوئی تھی۔

منگنی والا بھائی بہت خوب صورت تھا۔ سب اسے کسی نہ کسی اداکار سے ملا رہی تھیں۔ پھر ایک رائے پر متفق ہو گئیں۔ وہ موسیٰ بی سے لگتا تھا۔ حسنل سمیت سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

"دکھاؤ۔" اریبہ نے ہاتھ بڑھایا۔ حلیمہ اور ماہ رو بھی جھک آئیں۔

البم حسنل کی رانوں پر دھرا تھا۔ بہت غور سے مشابہت تلاش کرنے لگیں۔ پھر تینوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر انکار میں سر ہلایا۔

"بالکل بھی نہیں۔" حسنل کے چہرے پر استہزاء پھیل گیا تھا۔ "کہاں موسیٰ اور کہاں یہ بھائی۔"

"لگتا ہے تم نے موسیٰ کو غور سے دیکھا نہیں۔" اس نے البم واپس کر دیا۔

"کیا مطلب؟" بہن کے ابرو کھنچ گئے۔

"کوئی مطلب نہیں بس اگر دیکھا ہوتا تو وہ نہ کہتیں جواب کہہ رہی ہو۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے اس کے ساتھ رہتی ہو۔" بہن نے ہاتھ نچایا۔ دو چار لڑکیاں متوجہ ہو گئیں۔

"ساتھ بھی رہ لوں گی۔ اس میں کیا انوکھی بات ہے۔"

حسنل کی آنکھیں جھپٹا مارنے سے پہلے قدم تولتی بلی کی سی ہو گئیں۔ حلیمہ اور اریبہ بری طرح گڑبڑائیں۔ کیا کہہ دیا تھا اس نے ... مگر بہن کا گروپ آستین چڑھا کر سامنے آگیا تھا۔ کسی نے سنا نہیں شاید۔

"ساتھ رہ لو گی ... یہ کہا ہے تم نے؟" ایک لڑکی کے کان صاف تھے۔

حسنل جارحانہ انداز سے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہنے لگی تھی۔ ماہ رو نے اس کے پہلو میں چٹکی کاٹی۔ اریبہ ان دونوں سے آگے بڑھ آئی۔ اب وہ سپہ سالار ہو گئی تھی۔

"حسنل نے نہیں دیکھا تو کیا۔ ماہ رو نے تو دیکھا ہے۔ ہے ناں ماہ رو! تم بتاؤ اس کا بھائی ملتا ہے کیا اس سے ... کسی بھی پہلو سے، آؤ بتاؤ۔" اس نے ماہ رو کو ہاتھ سے پکڑ کر روبرو کر دیا۔

"ہاں ..." ماہ رو شروع ہو گئی اور ثابت کر کے دم لیا کہ بھائی بہت پیارا ہے مگر موسیٰ سے اس کا ناخن بھی نہیں ملتا۔

"ماہ رو نے اتنے قریب سے دیکھا ہے موسیٰ کو۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اریبہ کو بغل میں لے لیا۔

"اور اس کی آنکھیں سنہری ہیں جیسے جیسے ..."

"چھاپہ ..." ایک گھبرائی عجلت زدہ آواز پر بھگدڑ مچ گئی۔

والنٹیئرز کا ایک گروپ جمنازیم کی طرف آرہا تھا۔ منٹ کے اندر ٹوٹے ڈیسکوں پر بچی رونق غائب ہو گئی۔ چونکہ ماہ رو نے جوش میں ہوش کھو دیا تھا تو اس کا دوپٹہ کسی ڈیسک کی کیل میں اٹک گیا تھا۔ چڑھی آستین ڈھیلی ہونے والی تھی ... وہ فوری طور پر بھاگ نہ سکی۔

دوستوں کو بھی رکنا پڑا ... والنٹیئرز کو یہی چاروں ملیں۔

ماہ رو نے اپنا سارا وزن حلیمہ کے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا۔ چہرے پر نقاہت آ گئی۔ رنگت زرد اور آنکھیں ویران ہو گئیں۔

والنٹیئرز سے زیادہ حیران یہ تینوں ہو گئیں۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔

"موچ آ گئی ہے۔ ارے کوئی مجھے لے جائے، ہائے امی، ہائے ابا۔" اس نے ایسا واویلا کیا کہ والنٹیئرز کے توتے اڑ گئے۔ وہ تو کسی مخبری پر پہنچی تھیں۔

"میں ہل بھی نہیں سکتی۔ اسٹریچر منگواؤ ... ہائے کوئی وہیل چیئر ہی مل جائے۔" یہ تینوں بھی بہت پریشان ہو گئیں۔

(ماہ رو گھاگ کھلاڑی تھی۔ شاطر حسینہ ... ہر بار بچ

جانے پر خود کو پیار سے اسی نام سے پکارتی تھی)

حلیمہ، اریبہ اور حسنل کے لیے اس کی آج کی حرکتیں ناقابل فہم تھیں۔ وہ یہاں ہونے والی کسی سرگرمی کا حصہ نہیں تھیں۔ صرف منگنی کی تصاویر کے شوق میں آگئیں۔ تو یہ ڈراما کیوں... مگر یہ سوال تو بعد میں بھی پوچھا جاسکتا تھا۔ ابھی تو ساتھ دینا تھا۔

وہ دھڑام سے گر گئی۔ اب کی بار تینوں کے ہوش بھی اڑ گئے۔ پیر کو ہاتھ بھی تو نہ لگانے دیتی تھی۔ وہ چیخ پکار کہ اللہ توبہ... جمنازیم سے کلینک تک کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔

اوپر سے وہ چاہتی تھی گود میں اٹھا کر لے جایا جائے۔

"ہائے ہائے وائے... امی... ابا... او کوئی میرے بھائیوں کو بلا دے۔"

بھائی تو فوری طور پر دستیاب نہ ہوئے۔ ایک کرسی منگوانی پڑی۔ کیونکہ پہلے تو بے چاری سہارے سے گھسٹ رہی تھی اب وہ بھی نہ ہو پا رہا تھا۔

ان تینوں کے خیال میں یہ کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ کرسی کو دونوں جانب سے والنٹیرز نے پکڑ رکھا تھا۔ (ماہ رو کی بھی والنٹیرز سے بدلہ لینے کی برسوں پرانی خواہش پوری ہو رہی تھی۔)

"اس تماشے کی وجہ ماہ رو؟" حلیمہ نے اس کے کان میں گھس کر دانت پیسے۔ حسنل بھی بے زار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے بیگز سنبھال رکھے تھے اریبہ کو احساس جرم ہو رہا تھا (مجرم کا ساتھ دینا بھی تو...)

"میرے بیگ میں واک مین ہے۔ اور فلمی میگزین۔"

"فلمی میگزین؟" حلیمہ کی سانس اٹکی۔

"ہاں صرف چار..."

"صرف... "حلیمہ نے ہچکی بھری" چار..."

ماہ رو نے سر جھکا لیا۔ پھر جتنی ہائے ہائے نکلی وہ حلیمہ کے منہ سے نکلی اور یہ خطرے کا نشان تھا۔ اریبہ نے بلاوجہ شور ڈال دیا۔

جمنازیم سے کلینک کے راستے میں صحرائے گوبی بھی پڑتا تھا۔ والنٹیرز کے ماتھوں سے پسینہ نکلا۔

ماہ رو نے اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے سارے حربے آزمائے۔ (کمینگی کی انتہا تھی یہ) کرسی کلینک میں بیڈ سے جوڑی گئی کہ اب وہ بیڈ پر لیٹے تو... اس سے یہ بھی نہ ہوا۔

والنٹیرز ہی نے ڈنڈا ڈولی کر کے بیڈ پر پٹخا۔

ماہ رو نے آنکھیں موند لیں تھک گئی تھی بے چاری۔

حلیمہ نے چیک اپ کے دوران ماہ رو کے بیگ سے سامان نکال کر اپنے بیگ میں منتقل کر لیا۔ خطرہ مول کیوں لیتی۔ اس کا ریکارڈ بالکل صاف تھا۔

ماہ رو کا مشکوک... اگر جو یہ سامان مسز ریحانہ تبسم فاضلی کے ہاتھ لگ جاتا۔ اللہ اللہ...

☆ ☆ ☆

"تم نے مجھے نہیں بتایا کہ تم نے موسیٰ کو دیکھا تھا۔" حلیمہ اور اریبہ جوس لینے کینٹین تک گئی تھیں۔ ماہ رو بیڈ پر دراز تھی۔ ہنسی روکنے کو منہ پکا کر رکھا تھا۔ تکلیف ظاہر کرنے کے لیے بند آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

حسنل بیڈ کے ساتھ کرسی ڈال کر تیمار دار کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ ماہ رو کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

"بس یونہی دھیان نہیں رہا۔" اس نے سرسری انداز اپنایا۔

"وہ کیسا تھا سامنے سے دیکھنے پر؟" حسنل کے سوال پر ماہ رو حق دق رہ گئی۔

"صحیح تھا۔"

"تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا ماہ رو۔"

"کیوں؟" ماہ رو کی تیوری چڑھی وہ کچھ سخت کہنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے لہجے اور چہرے کی حسرت نے اسے حیران کر دیا۔

"اتنا آگے مت جاؤ حسنل کہ واپسی کا راستہ یاد نہ رہے۔"

"پہلے کہتیں۔ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔"

”تم مجھے لاتوں کا بھوت لگ رہی ہو حسنل! جو... باتوں سے نہیں مانتا۔ میں تمہاری امی ہوتی نا تو جوتے مار مار کے ساری عاشقی ناک سے باہر نکال دیتی۔“

اس کا جملہ و انداز بہت سخت تھا۔ طیش آنا فطری تھا مگر یہ کیا ہوا؟ حسن المآب کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ہنسی کا جلترنگ دلفریب تھا۔ حیرت آمیز غصے میں گھر جانے والی ماہ رو کے دل سے خواہش ابھری، وہ سدا یوں ہی ہنستی رہے۔

”میری امی کو پتا لگ جائے تو وہ بھی تمہارے بتائے طریقے والی ایک کوشش کریں ضرور۔“ وہ ہنسی سے آنکھوں میں آنے والی نمی کو پونچھتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔

”سب معلوم ہے پھر بھی...“ وہ کہنیوں کے بل ذرا اوپر کو اٹھتے ہوئے بولی۔ ہلکی سی کراہ نکل گئی۔

(پاؤں مڑنے سے تکلیف تو ہو رہی تھی۔ اس نے شور زیادہ ڈالا تھا۔ مگر ٹخنہ ہلکا سا سوجا ہوا تھا)

”بہت اچھا ہے حسنل! دل کا حال اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔“ اس کے جملے میں گہرا طنز چھپا تھا۔

”ہاں... اور جو جان جاتے ہیں۔ وہ پھر کہاں باز آتے ہیں کچوکے لگانے سے۔“ اس نے صاف اسی کو موردالزام ٹھہرایا تھا۔

”کچوکے نہیں حسنل... سمجھانے بجھانے سے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ حسنل سنجیدہ ہو گئی۔

”اور وہ تمہارا؟“

اچھا ایک بات بتاؤ...“ حسنل نے اپنی کہنی بیڈ کے کنارے پر ٹکا کر ہاتھ پر گال ٹکاتے ہوئے ماہ رو کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تمہیں موسیٰ کو دیکھتے ہی پہلا خیال کس کا آیا تھا؟“ اس کا سوال بہت سادہ تھا۔

ماہ رو نے بہت تیزی سے جواب دیا... غلطی کی۔

”تمہارا... اور کس کا...“ حسنل کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ ماہ رو تا بھی سے دیکھنے لگی۔

”پھر تمہیں اور کون سی نشانی درکار ہے۔ اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اسے دیکھ کر تمہیں میرا خیال آیا۔ تم نے اسے میری آنکھ سے دیکھا، میری نظر سے جانچا، میرے لیے دیکھا۔ یہ سب نشانیاں کیا بتاتی ہیں ماہ رو فیاض۔“

وہ یقین کے کس مرحلے پر تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟

”ہم دونوں لازم و ملزوم ہونے لگے ہیں۔ اور یہ سب اتفاق نہیں ہے۔“ آگ کا ذکر ہوتے ہی جلنے کا خیال بھی آتا ہے حسن المآب۔ بے وقوفوں کا سب سے بڑا مسئلہ پتا ہے کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مطلب کے معنی ڈھونڈ کر خوش کن نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔“

”اسے دیکھنے پر میرا خیال آنا بہت بڑی کامیابی ہے ماہ رو! اگر تمہیں اس کی خبر نہیں۔“

”خدا مجھے بے خبر رکھے۔“ ماہ رو نے کروٹ بدل لی۔ پھر کچھ خیال آنے پر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”ایک بات بتاؤ... اتنے یقین کے بعد بھی اگر وہ تمہیں نہ مل سکا۔ کسی اور کو مل گیا تو؟“

”اول تو ایسا ہوگا نہیں... لیکن اگر کسی اور کو مل گیا تو یہ ضرور دیکھوں گی کیوں مل گیا۔ ایسی کیا خاص بات تھی اس میں... جو مجھ میں نہیں تھی۔“

ماہ رو پوری کی پوری گھوم گئی۔ اسے اتنے متوازی و مدلل جواب کی توقع نہیں تھی۔

”تم اتنی تحمل تو کبھی نہیں تھیں۔“

”ہاں تھی تو واقعی نہیں۔“

”نہیں... اگر واقعی تمہاری دعائیں مستجاب نہ ہوئیں تو...“

”پھر میں مانگنا چھوڑ دوں گی۔“ اس نے ماہ رو کے سر پر پہاڑ توڑ دیا تھا۔

”لیکن ایسا ہوگا نہیں۔“ اگلے ہی پل وہ عاجز بندی ہو گئی۔

”تم کسی بابے سے تعویذ واویذ تو نہیں لے آئیں حسنل۔“ ماہ رو کے لہجے میں شک کی سرسراہٹ ابھر آئی۔ اس کا چہرہ بھی عجیب بے یقینی کی تصویر بن گیا تھا۔ وہ ہاں سننے کے یقین اور نہیں سننے کی خواہش کے درمیان لٹک گئی تھی۔

"اوہ!" حسنل کو پوری بات سمجھنے میں ایک منٹ لگا پھر چہرے پر سخت ناگواری پھیلی۔ اسے جیسے دھچکا لگا۔

"تعویذ... بابا... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ نعوذ باللہ تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔ لاحول ولا قوۃ... بابے کے پاس وہ جائے جس کا ایمان متزلزل ہو۔" اس نے ایسے یقین سے کہا کہ ماہ رو رشک میں مبتلا ہو گئی۔

"تمہارا یقین قابل رشک و قابل تقلید ہے حسنل۔ اگر بیج بو کر کونپل پھوٹنے کا انتظار کرتے ہیں۔ خالی زمین پر پانی ڈالنے سے صرف کیچڑ پیدا ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا اور بار بار پوچھا کہ وہ سب نہ ہوا جو تم توقع کرتی ہو تب کیا کرو گی۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ تم صبر کرو گی۔"

ماہ رو جواب میں فقط اثبات چاہتی تھی۔ لیکن حسنل کا جواب اس کے مزاج کا عکاس نکلا۔

"جو کام میں کر نہیں سکتی۔ اس کا دعوا کیوں کروں۔"

"ارادہ تو کر سکتی ہو نا۔" ماہ رو نے ترنت کہا۔ "زندگی میں بعض اوقات صبر کے سوا کچھ چارہ نہیں ہوتا حسن المآب!" ماہ رو کی آواز خلوص و دردمندی سے لبریز تھی۔

اور... اور حسن المآب کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔

اس نے کبھی بھی ناکامی کا نہیں سوچا تھا۔ ہاں ناکامی کی صورت میں وہ کیا کرے گی۔ ماہ رو کی مانے تو صبر... لیکن وہ نہیں ملے گا تو پھر کیا ملے گا۔ اس کی نظروں کے سامنے عبدالمتین و عبدالمبین کے سراپے دوڑ گئے۔ اور وہ دونوں نہ ہوئے تو کوئی اور مکران ہی کے جیسا۔

پھر نہیں... ایسا تو وہ ہونے نہیں دے گی۔ ماہ رو متوقع نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

اور وقت گمان میں ہو تو بہت دور لگتا ہے لیکن جب سر پر پڑ جاتا ہے تب پچھتاوے ہوتے ہیں۔ یہ یقین تھا یا ہٹ دھرمی... ماہ رو فیصلہ نہ کر سکی۔

☆ ☆ ☆

عجیب بات ہوئی۔ اس نے عشاء کی آخری رکعت میں سلام پھیرنے کے بعد جائے نماز کا کونہ موڑ دیا۔ اور گھٹنے کھڑے کر کے پیروں کی قینچی بنا کر بیٹھ گئی۔ دعا کے لیے پھیلائی ہتھیلیوں کو چند لمحے دیکھنے کے بعد اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

ایسا لگتا تھا اس کے پاس مانگنے کو کچھ ہے نہیں... یا حرف دعا بھول گئی۔ بھولی تو نہیں تھی پر دھیان کہیں اور تھا... اور صبح ہی سے تھا۔

ماہ رو کی باتیں... اس کی دوستیں... حلیمہ اور اریبہ۔

"خدا لگتی بات کہوں تو حسنل... یہ ہے نری بے وقوفی۔ ایسے بھی کوئی کرتا ہے۔ یا ایسے بھی کہیں ہوتا ہے؟" کوئی اس کے اندر رونے لگا۔

اور ماہ رو نے ٹھیک کہا۔ مجھے سوچنا چاہیے وہ نہ ہوا جو میں چاہتی ہوں تو پھر میں کیا کروں گی۔

سوال تو بنتا ہے۔ دعا پوری نہ ہوئی۔ وہ نہ ملا تو پھر کیا ہو گا۔ کیا کرو گی؟

"صبر" نجانے کون بولا۔ وہ یوں چونکی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"ہو سکے گا کر پاؤں گی؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں ہو سکے گا لیکن ماہ رو کہتی ہے زندگی میں بعض اوقات صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا اور صبر بڑی ہی مشکل چیز ہے۔"

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس سارے معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ رہی تھی۔

اگر ماہ رو، حلیمہ اور اریبہ دیکھتیں تو نہال ہو جاتیں۔ انہوں نے یہی دعا مانگی تھی۔

"خدا حسنل کو عقل عطا فرمائے۔"

اور دعائیں تو قبول ہوتی ہی ہیں۔ تو پھر حسنل کی بھی قبول ہو سکتی تھی۔ اس کا سوال صحیح تھا یا نہیں مگر اس کا یقین قابل رشک تھا۔

"دعا قبول ہوتی ہے۔ بس مانگنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔" اریبہ نے کہا تھا۔

اللہ پر اسے بھی اتنا ہی یقین ہے مگر چاند مانگ لے تو رکھے گی کہاں۔۔۔ وہی ہلکے پھلکے لہجے میں گہری بات۔۔۔

اور حلیمہ نے کہا تھا۔ "وہ رب کی رضا میں راضی ہے۔ جس نے اسے انسان بنا کر بھیجا وہ اسے بلی کتا بنا کر بھی تو بھیج سکتا تھا۔ تو جب اس کے ساتھ پہلا کام اتنا اچھا ہوا تو آگے بھی وہ مایوس کیوں ہو۔ سو وہ توکل کرے گی۔ اور دیکھے گی کہ پردہ غیب سے اس کے لیے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہاں وہ اللہ سے سب خیر کی دعا مانگتی تھی۔

کیونکہ توکل خوبی ہے۔ تقاضا بندگی ہے۔ مگر دعا شان بندگی ہے۔

دعا ضرورت ہے، دعا نجات ہے۔ دعا فراز ہے۔ دعا حصار ہے۔ دعا تسکین قلب کا ذریعہ ہے۔ دعا آنکھ کا نور ہے۔ تو پھر کیوں دور ہے انسان اس سے، سو وہ سب دعا پر یقین رکھتی تھیں۔ مگر حسنل جیسی دھونس کیوں؟ دعا کی خوب صورتی عاجزی میں ہے۔ مٹ جانے میں۔۔۔ ریزہ ریزہ ہو جانے میں اور حاصل کلام یہ کہ دعا پوری ہو نہ ہو۔ بندگی کے تقاضوں پر حرف نہیں آنا چاہیے۔ وہ دے دے تو سبحان اللہ۔۔۔ وہ نہ دے تو۔۔۔ تو الحمدللہ۔

اور بڑی معجزاتی رات تھی۔ حسنل کا ذہن سوچنے لگا تھا۔ الحمدللہ۔ ہر حال میں۔۔۔؟

تو نہ ملنے پر وہ الحمدللہ کہے گی؟ اوں ہوں۔۔۔ سوئی یہیں آکر اٹکی تھی۔ وہی ضد۔۔۔ کہ ملے گا کیوں نہیں۔۔۔ اسے "لازما" چاہیے۔

اس کے رخسار تپ سے گئے۔ ایک ہی حالت میں بیٹھے رہنے سے ٹانگیں لکڑی ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں سے عجب طیش جھلکنے لگا۔ وہ ادھر ادھر یوں دیکھنے لگی جیسے پاگل کسی کو مارنے کے لیے ہتھیار ڈھونڈتا ہے۔ اس نے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا تھا تم کو تو مشکور ہونا چاہیے تھا ویسے بھی ہو سکتا ہے تب کیا کرو گی؟

"تم اب تک جائے نماز پہ ہو حسنل۔۔۔" صبغہ کی کروٹ بدلتے آنکھ کھل گئی۔ وہ بری طرح چونکی۔

"نہیں اٹھ گئی ہوں۔"

"کیا وقت ہوا ہے۔" صبغہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پوری رات پڑی ہے ابھی سو جاؤ تم۔" حسنل نے نائٹ بلب بھی آف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بحث کی تھی حسنل سے اس موضوع پر۔۔۔ مگر۔۔۔

"دنیا خوب صورت مردوں سے بھری پڑی ہے حسنل! ایک سے بڑھ کر ایک۔۔۔ موسیٰ بہت دلکش ہے مگر ایسا بھی کیا کہ تم اس حد تک چلی گئیں۔" اس نے جل کر بالآخر کہہ دیا۔

"مانتی ہو نا کہ وہ دلکش ہے۔" حسنل کا چہرہ کھل سا گیا۔ کھو سا گیا۔

"یعنی تمہیں صرف اس کے حسن نے متوجہ کیا۔ کیونکہ باقی تو تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ صرف حسن نے۔" حسنل سنجیدہ ہو گئی۔ "تم حسن کی طاقت سے واقف نہیں ماہ رو۔" وہ جیسے اس پر افسوس کر رہی تھی۔

"حسن مدہوش کر دیتا ہے۔ سحر زدہ کر دیتا ہے۔ دنیا بھلا تو دیتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھن جاتی ہے۔ انسان۔۔۔"

"میری سمجھ میں آگیا حسنل۔۔۔ دوسری نگاہ "گناہ" کیوں قرار دی گئی ہے۔" ماہ رو کی آنکھوں میں تضحیک سی ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

حسنل کا مسکراتا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"اور یہ کہ خیال کا پاکیزہ ہونا کیوں ضروری ہے۔ پیر میں بیڑی ڈال کر فقط جسم محدود کیا جا سکتا ہے۔ کاش سوچوں پر دفعہ لگتی۔ ہتھکڑی لگائی جا سکتی۔"

"مجھے تو پھر سزائے موت ملتی۔۔۔ ہے ناں۔" حسنل بڑی خوش دلی سے ہنس دی۔

"لگتا ہے تم نے زلیخا کا قصہ نہیں سنا۔ اسے بھی تو حسن نے متاثر کیا تھا۔"

"تمہیں زلیخا کا عشق یاد ہے۔ زلیخا کا انجام بھول گئیں۔"

ماہ رو کا لہجہ متاسف تھا۔ وہ کمرے سے جانے کو کھڑی ہو گئی تھی۔

"بددعا دے رہی ہو۔ تم تو سہیلی ہو ناں؟" ششدر رہ جانے والی حسنل سنبھل کر بولی۔

"اف..." ماہ رو سر جھٹک کر حال میں لوٹی۔

اس نے ٹیبل لیمپ کے بٹن کو آن، آف کرنا شروع کر دیا تھا۔

اندھیرے اجالے کی اس کیفیت میں گھری وہ اس وقت کا تصور کرنے لگی۔ جب وہ دیکھے گی کہ حسنل کے ساتھ کیا ہوا؟ حسنل کا انجام یا اس کے عشق کا انجام... صرف عشق و حماقت یا جنس مخالف کی کشش کی کہانی نہیں تھی۔ اس نے اس میں اپنا تیقن ڈال دیا تھا۔ اس نے دعا کو شامل کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"جوتے دو، پیسے لو..." میگی میز بجا رہی تھی۔

"رس ملائی آپ کے لیے
اتنی مٹھائی آپ کے لیے
پہلے جوتے کھائیں گے کیا
آپ کی مرضی، نہ جی توبہ... نہ جی توبہ
دلہن کے دیور تم دکھلاؤ نہ یوں تیور
جوتے دے دو، پیسے لے لو
"اے ہے... اے ہے ہے..."

خدیجہ بانو کے لبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی، تفاخر سے ماریہ کو دیکھا، وہ بھی جواباً مسکرا دی۔ وہ چاروں یعنی خدیجہ بانو، ماریہ، منا اور میگی ابھی کچھ دیر پہلے ہی محی الدین سہگل کے گھر سے لوٹے تھے۔

اور سب کے کھلے چہرے بتاتے تھے سب کچھ توقعات سے بھی بڑھ کے تھا۔ ماریہ کے چہرے پر بھی طمانیت اور خوشی پھیلی ہوئی تھی۔

اسے لڑکا اتنا پسند آیا تھا کہ حد نہیں۔ وہ سوچوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ اور محی الدین سہگل کا گھر۔ عالیشان محل کہنا چاہیے۔

اور اس پر محی الدین سہگل کا بچھتا انداز اور لڑکے کا مودب انداز...

وہ کتنا سلجھا ہوا اور تابع دار تھا۔ کم گو تھا مگر خوش مزاج تھا اور اس کی تعلیمی قابلیت جن یونیورسٹیز سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔

ماریہ کے حلق میں تھوک اٹک گیا۔ انگلستان کی مشہور و معروف یونیورسٹیز اور وہ کتنا جاذب نظر تھا۔ میری بہت پیاری تھی۔ مگر ایک ماں ہونے کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ سمیع الدین بہت خوب صورت شخص تھا۔

کہاں تو وہ بڑے خدشات کے ساتھ آئی تھیں۔ اور کہاں انہیں لگا کہ ہاں کر کے ہی اٹھا جائے مگر ساتھ ہی میری کے انکار کا یاد آیا۔ خدیجہ بانو کا بھی یہی خیال تھا یقیناً"... تب ہی تو... گفتگو بے تکلفی و اپنائیت کا مظہر تھی۔ مگر خدیجہ بانو نے اس حوالے سے منہ بند رکھا۔

ماریہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ زیادہ بہتر سمجھتی ہوں گی۔ خدیجہ بانو نے تو نجانے کب گفتگو کرنی تھی میری سے اس بابت... مگر میگی کو کیا امر مانع تھا۔

وہ گھر میں چلاتے ہوئے گھسی تھی۔ پھر اس نے میری کو شانوں سے تھام لیا۔ گھما لیا۔ چھوڑنے کو راضی نہ ہوئی۔ میری چھڑوانے کی جدوجہد میں بے حال ہو گئی۔ بمشکل خود کو چھڑایا تو میگی صوفے پر جا گری۔ خود میری بھی سر پکڑے بیٹھی تھی۔ میگی نے گانے گانے شروع کر دیے۔

اور کوئی وقت ہوتا تو خدیجہ بانو سرزنش کرتیں۔ مگر وہ مسکرائے جاتی تھیں۔ میری کی آنکھوں میں حیرت آمیز سرشتی در آئی۔ وہ بھنویں ملائے میگی کو دیکھ رہی تھی۔ اور ماریہ کو دیکھ کر حیرت دوچند ہوئی تھی۔ ایسا کھل کر تو وہ بہت کم مسکراتی تھیں۔ اور میگی نجانے کون کون سے گانے تھے۔ جو اسے یاد آئے

جاتے تھے۔

"راجہ کی آئے گی بارات رنگیلی ہو گی رات"

"یار! اتنا امیر دولہا۔۔۔ لندن پلٹ رئیس اور میں اکلوتی سالی۔ واہ میرے اللہ! تو جب بھی دیتا ہے چھپٹر پھاڑ کر دیتا ہے۔ میرے تو عیش ہو گئے ناں' ٹیک ہی ٹیک۔ سوچ رہی ہوں دودھ پلائی میں دریائے ٹیمز مانگ لوں اور رستہ رکوائی میں بکنگھم پیلس۔"

"جوتا چھپائی میں ملکہ کا تاج مانگ لینا جس میں کوہ نور ہیرا جڑا ہے۔ وہی ہیرا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دے دیا سفید آقاؤں کو بطور تحفہ۔" موحد کو بھی دادی سے قصے سننے کا شوق تھا۔ فوراً" یاد دلایا۔

خدیجہ بانو کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"ہے ناں دادی؟"

"ہاں میرے بچے۔۔۔ ایک ہیرا ہی کیوں۔۔۔ سب کچھ ہی لے گئے تھے۔ برٹش میوزیم میں جا کر کبھی دیکھو تو پتا لگے۔" ان کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ اب تو لازمی دیکھوں گا۔ جب آپی وہاں رہیں گی تو ان سے ملنے جایا کروں گا بلکہ میں تو سب واپس لے آؤں گا۔"

"افوہ۔۔۔" میگی بدمزہ ہوئی۔ "انہوں نے دے دیا اور یہ لے آئے۔"

"سمیع کے بارے میں تو بتاؤ۔ وہ کیسا لگا تمہیں۔"

خدیجہ بانو کن اکھیوں سے میرو کو دیکھ رہی تھیں۔

"سمیع؟؟؟" میگی چونکی پھر جیسے غش کھا گئی۔

"اتنا اسمارٹ' اتنا شاندار۔۔۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہیں اتنا شاندار دولہا ملے گا میری!"

ماریہ کو ہنسی آ گئی۔ خدیجہ بانو نے طمانیت سے اسے دیکھا۔

"اب آگے کے کیا مراحل ہوں گے امی۔" ماریہ کا انداز مودب تھا۔

"کیا مراحل۔۔۔ دس بارہ روز ٹھہر کر ہاں کہوں گی۔ اس دوران ایک دو اور ملاقاتیں بھی ہو جائیں گی۔ میرو کو بھی تو ملوانا ہو گا ناں سمیع سے۔"

ماریہ کی آنکھوں میں تشکر آمیز حیرت ابھر کر معدوم ہو گئی۔ اتنا لبرل ازم!! لیکن خیر لبرل تو تھیں خدیجہ بانو۔ جب ہی تو میگی اور ذیشان کا رشتہ بھانپ لیا۔ پوتیوں کے لیے ان کا دل بہت بڑا تھا۔ (اتنا ہی بڑا۔۔۔ جتنا ماریہ کے حوالے سے چھوٹا تھا۔۔۔)

بیٹیوں کے رشتے کتنا بڑا مسئلہ تھا معاشرے کا۔۔۔ ہر گھر کی الگ کہانی۔۔۔ پر ماریہ کی بیٹیوں کے لیے اللہ نے شہزادے بھیج دیے تھے۔ وہ شکر گزار تھی خداوند قدوس کی۔۔۔ اور خدیجہ بانو کی۔۔۔

"لیکن مجھے کسی سے نہیں ملنا۔۔۔ میں کہہ چکی ہوں' مجھے شادی نہیں کرنی۔" میری کی آواز پر سب اپنی خوش کن سوچوں سے ابھرے اور چونکے۔

"ایسے نہیں کہتے مہو!"

"پھر کیسے کہوں دادی جان۔۔۔ ایک بار منع کر دیا مگر آپ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔" اس کے لہجے میں ناراضی آمیز بے بسی تھی۔ مگر انداز مضبوط تھا۔

یعنی وہ قائم تھی اپنے ارادے پر۔۔۔ پھر سب کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

پہلی بار خدیجہ بانو کے چہرے پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔ ماریہ بھی اس راستے کو دیکھنے لگی جہاں وہ گئی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں دادی! میں بات کرتی ہوں۔" میگی اٹھی۔

"اگر تم نے مجھ سے اس موضوع پر اب ایک بھی لفظ کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔" تنگ آ کر اس نے میگی کو گھونسا دکھا دیا۔ کتنی دیر سے وہ اس کے کان کھا رہی تھی۔ وہ ایسا۔۔۔ ویسا اور جیسا ہے۔

میری کو دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس کا انداز عجیب مگر قطعیت سے بھرپور تھا۔

"تم کسی اور کو پسند کرتی ہو میری؟" میگی اس کے علاوہ اور اب کیا پوچھ سکتی تھی۔ اندر آتی خدیجہ بانو کے کان کھڑے ہو گئے۔

"پسند کرتی تو بتا دیتی' مجھے پہیلیاں بجھوانے کا شوق نہیں ہے۔" اس کا انداز یک بیک موسمی ہو گیا۔

"تو پھر وجہ میرو؟" خدیجہ بانو کمرے میں داخل ہو

گئیں۔

"تم ایسی ضدی تو نہیں تھیں میری چندا۔" انہوں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

"میں ضد نہیں کر رہی.... بس مجھے شادی نہیں کرنی۔" اس نے یکدم کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

صبح سب کو ناراض ہونے کا تاثر دیتے ہوئے وہ ایک بے زاری کے عالم میں کالج جانے کو نکلی تھی۔ پہلا پریڈ فری تھا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ اس چال سے چلتی کہ آخری پریڈ میں پہنچتی۔ مگر اسے جیسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سست قدم، پُرسوچ مگر کچھ بے زار و خفا چہرہ۔

کبھی کسی پتھر کو جا کر سے ٹھوکر مار دیتی۔

پیڑوں کے پاس کچے امرود گرے تھے۔ انہیں جیب میں ٹھونس لیا۔ پانی کی موٹر کی آڑ میں سفید بلی نے بچے دیے تھے۔ اتنے بہت سارے بچے اور سب کے سب مزے سے دودھ پی رہے تھے۔

وہ بیگ کو پیچھے دھکیلتی باڑ کے اوپر رکوع کی طرح جھک گئی۔ ایک پورا سفید بچہ بھی تھا جو صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرو....؟"

"ہاہ....!" وہ بری طرح اچھلی۔ "یہ کون بولا".... اوہ۔"

وہ دوپٹا سر پر جماتی مگر ہاتھ جھاڑتی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ یہ تو وہی انکل ہیں وہی آنٹی.... کیا بھلا سا نام تھا۔ ہوں عقیلہ سہگل اور محی الدین سہگل۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ان کا انداز دوستانہ تھا۔ سنسان سڑک اور یونی فارم میں ملبوس میری.... صبح سات بجے سے آٹھ کے وقت کے درمیان تو تقریباً سب گلیاں اور راستے یونی فارم والے طالب علموں سے بھری ہوتی تھیں۔ مگر ساڑھے آٹھ کے بعد.... عام طور پر وہی نکلتے تھے جو ٹلا (اسکول بنک کرنا) مار رہے ہوں۔

ہائے کتنی بری بات ہے۔ وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ میں ٹلے باز ہوں۔ دادی کی کتنی بے عزتی ہو گی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام.... جیتی رہو ماشاء اللہ...." محی الدین کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ اپنے گھر سے گاڑی ڈرائیو کر کے خدیجہ بانو کی گلی تک وہ خیر سے صبح کی واک کے لیے تشریف لائے تھے۔ زور واک پر ہوا۔

"میرا پہلا پریڈ فری ہوتا ہے تو اس لیے ذرا لیٹ نکلتی ہوں۔" اس نے وضاحت ضروری خیال کی۔ پھر گردن موڑی۔

"یہ بلی ہے۔ میں اس کے بچے گن رہی تھی۔"

"اوہ....!" محی الدین اس کے معصوم انداز پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

"تمہیں بلیاں پسند ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے ناک چڑھائی۔ "بس ان کے بچے اچھے لگتے ہیں۔"

"اوہ.... واہ بہت خوب! محی الدین اش اش کر اٹھے۔ بہت فخر سے عقیلہ بیگم کو دیکھا۔ دیکھی میری چوائس۔

عقیلہ بیگم کے چہرے پر بھی نرم مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"اور یہ تمہاری جیب میں کیا ہے۔"

"اوہ...." میری سٹپٹائی۔ بے ساختہ پھولی جیب پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تو اس کا مطلب ہے تمہیں امرود پسند ہیں۔ ہمارے گھر میں ہیں امرود کے پیڑ۔"

"نہیں۔" اس نے ایک بار پھر ناک چڑھائی۔ صرف کچے امرود پسند ہیں۔"

اب اش اش کرنے کی باری عقیلہ بیگم کی تھی۔ محی الدین کا سینہ پھول گیا۔ کتنی معصوم لڑکی تھی۔ واہ!! انہیں بالکل ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی۔ ایسی ہی بے ساختہ.... صاف گو۔

میری اب جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس نے پشت پر لگا بیگ سیٹ کیا پائنچہ درست کیا رسٹ

واچ دیکھی۔ گویا اجازت طلب کی۔
"آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔"
"ہائیں۔۔۔ نہیں، نہیں میرا مطلب ہے۔ میں دادی سے پوچھے بغیر کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔"
"تو دادی سے پوچھ لیتے ہیں۔ ایک منٹ لگے گا۔"
محی الدین سہگل کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اتنی فرماں بردار بچی۔
"نہیں پلیز۔۔۔" پر محی الدین سہگل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گاڑی میں بٹھالیا۔
عقیلہ بیگم کا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔
"اچھا تو پہلے آپ کی دادی سے اجازت لیں یا۔۔۔"
محی الدین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔
"نہیں کالج چلیں۔۔۔ دیر ہو گئی ہے۔" اس نے لہجے کی ناراضی پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔
"گڈ۔۔۔ تو اب آپ کالج کا نام بھی بتا دیں۔" وہ نجانے کیوں شوخ ہو رہے تھے جیسے خود ان کی اپنی فرسٹ ایئر کی کلاس کا پہلا دن ہو۔
میری نے ٹھنڈی سانس بھری۔
دونوں نے ہلکی پھلکی گفتگو سے آغاز کیا۔ کالج کی تاریخ و تعریف۔۔۔ وہ پڑھائی میں کیسی ہے اور اساتذہ کیسے ہیں۔ اب میری کو اپنے کالج سے عشق تھا۔ اسے غرور تھا اپنے تعلق پر۔۔۔ اسٹارٹ ہو گئی بھول گئی کتنا غصہ تھی۔ کتنا برا لگا تھا ان دونوں کو دیکھ کر۔
کالج آنے پر دونوں کو خوش دلی سے خدا حافظ کہا۔
اچھے تھے دونوں انکل، آنٹی۔۔۔ اور انکل، آنٹی خوشی سے بے حال تھے۔
"اتنی اچھی تھی میری۔۔۔"
"واہ۔۔۔ ان کی بے تابی حد سے سوا ہو گئی۔" کب خدیجہ بانو کو کال کریں گی۔"

☆☆☆

"تو آپ ایک کام کریں، مجھے کالج کا روٹ ذرا سمجھا دیں۔ ایکچوئلی مجھے ابھی راستوں کا اتنا پتا نہیں ہے۔" سمیع الدین کا لہجہ شریر تھا۔

"تم کیا کرو گے جان کر؟" محی الدین کی سمجھ میں نہ آیا۔ عقیلہ بہت زور سے ہنسیں۔
"آپ بھی ناں۔۔۔ آپ کا پوتا کہہ رہا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کرنا تو اس کا حق بنتا ہے ناں؟"
"اوہ۔۔۔ ہو۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ بالکل بالکل۔"
"بھئی اس کا حق ہے اور ہمیں انکار نہیں۔۔۔ مگر ہمارا ابھی تو فرض ہے ناں۔۔۔"
کتنی بے یقینی کی بات تھی ناں سمیع جیسا لندن پلٹ ماڈرن نوجوان۔۔۔ اور اتنے بڑے فیصلے کے حوالے سے اس نے ان پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لیا تھا۔
اور کتنی خوشی سے وہ میری سے ملاقات کی تفصیلات سن رہا تھا۔ اور جب بولا بھی تو کیا۔
"ایک بار منگنی ہو جانے دیں پھر دیکھیں ایسا نہ ہو اپنی گاڑی پر لکھوا لے۔ موبائل نمبر سہگل ٹرانسپورٹ پک اینڈ ڈراپ سروس۔" عقیلہ بیگم کو اپنی ہی مثال پر اتنا مزہ آیا کہ ہنس ہنس کر آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔
سمیع کا قہقہہ بھی بے ساختہ تھا۔ کتنا خوب صورت تھا وہ۔۔۔ عقیلہ نے ٹھٹک کر دیکھا۔ وہ ماں سے کم مشابہہ تھا۔ مگر تھا تو۔۔۔
"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ منگنی سے شادی کا دورانیہ اتنا طویل نہیں ہو گا۔ ہمیں جلد شادی کرنی ہے۔" محی الدین نے کہا۔
"یعنی آپ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اس سے دور رہوں۔"
"ارے نہیں۔۔۔ تمہیں ملاقات کا موقع دیا جائے گا۔ بھئی بہت وضع دار خاتون ہیں خدیجہ بانو۔۔۔ وہ جیسے چاہیں گی ویسے ہی کرنا پڑے گا۔"
"لیکن ملاقات تو ہمارا شرعی حق ہے۔ میں بات کروں گا۔"
"نہیں قطعاً نہیں۔۔۔ آپ کو پسند ہے ناں۔۔۔ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔"
"یعنی دیکھے بغیر بھی کر لو گے؟" عقیلہ بیگم تحیر آمیز

لہجے میں پوچھنے لگیں۔
"ہاں.... کرلوں گا۔"
"اور اگر پسند نہ آئی؟" یہی سوال ہو سکتا تھا۔
"آجائے گی۔" اس کا لہجہ قطعیت سے بھرپور اور طمانیت سے لبریز تھا۔ دونوں کی آنکھیں خوشی و فخر سے جھلملانے لگیں۔
بدر الدین کی نافرمانیوں نے دل پر کیسے کیسے گھاؤ لگائے تھے اب جیسے پھاہے رکھے گئے۔
"آپ لوگ میرے لیے غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔" اس نے ان کا مان بڑھادیا۔
"میرے بچے۔" عقیلہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔
وہ بھی بچے کی طرح لپٹ گیا۔ اور وہ ایک رخ سے بالکل بدر الدین جیسا تھا۔ ہاں جب آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا تھا۔ تب اسکارلٹ اف.... محی الدین سہگل نے سر جھٹکا۔
وہ سمیع الدین کو بتانے لگے۔
"میری کتنی انوسنٹ ہے اور بااعتماد بھی... اور قابل بھی بہت ہے۔ ہمیشہ اول آتی ہے۔ اور ہر موضوع پر اس کی معلومات قابل رشک ہیں۔
مودب بھی ہے۔ کبھی چھوٹی سی بچی لگتی ہے کبھی عالمہ فاضلہ۔
واہ، واہ.... سبحان اللہ کیا لڑکی ہے مہو۔"
بات تو خیر وہ ٹھیک کر رہے تھے۔
اور ابھی تو میری کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جاننے کے لیے باقی تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم اس شخص کو مجھ سے ملوانے کے لیے لے آئے ہو؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ جیک کو اردو کی کچھ شدھ بدھ تھی۔ اس نے اردو کا سہارا لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مائیکل اس کے نقطہ اعتراض سے واقف ہو۔
"یہ کیا کہہ رہی ہے۔" مائیکل نے اس کی شکل دیکھتے ہوئے جیک سے استفسار کیا۔ اس کی آنکھوں کا غم، تکلیف اور شکوہ مائیکل سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔
جیک نے مائیکل کو اشارے سے سمجھانے کا کہا۔ اب وہ اس سے مخاطب تھا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ مائیکل بغور سننے لگا۔
"ہمارا مقصد تمہیں ڈس ہارٹ کرنا نہیں ہے ڈیئر۔ ہم تو تمہیں گراؤنڈ ریئلٹیز (زمینی حقائق) بتا رہے ہیں۔"
"کیا ریئلٹیز...." اس نے اپنے ہاتھ کا قلم میز پر پھینک دیا۔
"یہ کہ اسے ڈی ہائیڈریشن ہو جائے گا یا ہائپو تھرمیا.... یا یہ کہ ایک صحت مند انسان پانی کے بغیر تین دن رہ سکتا ہے۔
اور پانچ دن کھانے کے بغیر۔
اور پھر دماغ سن ہو جائے گا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جائے گا۔ الوژن ہوں گے۔"
"تم دونوں مجھے ہمت دلانے آئے ہو یا یہ بتانے کہ موت اسے کس طرح قطرہ قطرہ زیر کرے گی۔ اس کی موت کے اسٹیپ بتا رہے ہو، دن باقی دن۔"
اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ اور رونے لگی تھی۔
"او مائی گاڈ پلیز..." مائیکل اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور گھبرا کر جیک کو دیکھنے لگا۔ جیک نے اسے پرسکون رہنے کا کہا اور پانی کا گلاس بھر کے اس کی کرسی کی طرف بڑھا۔
"ہمارا قطعاً" کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا ڈیئر۔" مائیکل کا انداز معذرت خواہانہ و ہمدردانہ تھا۔
"نہیں، مجھے کچھ نہیں سننا۔ سوری تم جاؤ۔ اور تم بھی جیک۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے دروازہ کی سمت دکھائی۔
"ایسی مثالیں بھی موجود ہیں۔ لوگ دس بارہ دن بعد بھی زندہ رہے ہیں۔" مائیکل کا لہجہ پرامید اور ہمت دلاتا ہوا تھا۔ جبکہ اس پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا تھا۔ اور کرسی پر آگے کو جھک آئی جیسے مائیکل کا منہ توڑ دینا چاہتی ہو۔ وہ بولی تو اس کا لہجہ

خونخوار تھا۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اسے بھی دس بارہ روز لگیں گے۔"

"مائیکل نے صرف مثال دی ہے۔ اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔"

"تم چپ رہو۔" وہ کھانے کو دوڑی۔

"صحیح کہتے ہیں لوگ، تم لوگوں کے پاس دل ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس ملک کے موسم نے تم لوگوں کے جذبات پر بھی برف جما دی ہے۔ انسان کچھ بھی ہو انگریز نہ ہو۔" وہ سخت شکوہ کناں نگاہوں سے جیک کو دیکھنے لگی۔

جیک کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ جبکہ مائیکل جو پہلے سمجھا نہیں تھا پھر وہ کچھ برا ماننے والا تھا۔ لیکن جیک کے رد عمل پر حیران رہ گیا۔

"بالکل درست لیڈی۔۔۔ انسان سب کچھ ہو مگر انگریز نہ ہو۔ کیونکہ ہم کلام سے زیادہ کام پر یقین رکھتے ہیں۔

اور انسان سب کچھ ہو مگر اتنا جذباتی اور بے وقوف نہ ہو۔ ایک بات بتاؤ صرف تم ہی ایسی ہو یا سارے پاکستانی ہی۔۔۔ اور اگر واقعی سارے تم جیسے ہی۔۔۔ ہوتے ہیں تو انسان سب کچھ ہو پاکستانی نہ ہو۔"

"اے جیک۔۔۔ خبردار جو پاکستانیوں کو کچھ کہا۔"

اس نے پین کو خنجر کی طرح تھام کر دھمکایا۔ مائیکل سینے پر بازو لپیٹ کر دونوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہونے لگا۔

"دیکھو۔" جیک سنجیدہ ہوا۔ "ساری دنیا متوجہ ہو چکی ہے۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے اور یہ تو تم بالکل ذہن سے نکال دو کہ انڈین گورنمنٹ یا آر سی اس کے ساتھ کچھ غلط کرنے کا سوچیں گے بھی۔۔۔ وہ برٹش گورنمنٹ اور انٹرنیشنل رولز سے ڈائریکٹلی روگردانی نہیں کر سکتے۔"

"اس طرف سے تم بے فکر رہو۔"

"میں نہیں رہ سکتی بے فکر۔۔۔ تمہارا یہ دوست کہتا ہے کہ ریگستان رات کے وقت بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ دن کے وقت تو وہاں مغل دربار سج جاتا ہو گا ناں!"

وہ اونچا بولنے سے تھک گئی تھی۔

"تم تاج برطانیہ بھی کہہ سکتی تھیں۔" جیک نے شریر نگاہوں سے اسے دیکھا مائیکل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

بی بی سی کے اس دفتر میں جیک کی یہ دوست۔۔۔ وہ اسے نام سے جانتا تھا۔ بہت جینئس نیوز پروڈیوسر' ڈائریکٹر۔۔۔ اسے اس طرح روتے اور جھگڑتے دیکھ کر کوئی یقین نہ کرتا کہ وہ سب سے بڑا شو ہینڈل کرنے والی لڑکی ہے۔

وہ گمشدہ کے حوالے سے مکمل تسلی و تشفی چاہتی تھی۔ مگر اس نے ایک بار بھی نہ بتایا تھا کہ کس رشتے ناتے سے۔۔۔

لگتا تھا وہ کچھ چھپا رہی ہے اور چھپی ہوئی چیزوں کی خاص بات پتا ہے کیا ہوتی ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی عیاں ہو جاتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

ایک غلط فیصلہ زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک غلط قدم راہ کھوٹی کر سکتا ہے۔ اور اس نے تو بھاگ بھاگ کے نجانے کتنے غلط قدم اٹھا لیے تھے۔ جب وہ سورج کی پہلی کرن کو چپ چپ آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے زندہ ہونے کا یقین کر رہا تھا اسی پل کیلاش اپنے مددگاروں کے ساتھ جیپ کے پاس کھڑا اسے یوں کھوج رہا تھا۔ جیسے وہ سیٹ کے نیچے چھپا ہو یا ڈیش بورڈ کے اندر۔

اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔ وہ کہاں تھا؟؟

کیلاش سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گیا وہ رات بھاگتے بھاگتے جس جگہ بے دم ہو کر گرا تھا۔ اس کے متلاشی اس تمام علاقے کو کل دیکھ کر مایوس جا چکے تھے۔ وہ اب سچ مچ کھو گیا تھا۔ وہ تلاش کے حدود اربعے میں موجود اس علاقے کو چیک کر کے کلیئر کر چکے تھے۔ یہ جگہ چیک ہو چکی تھی وہ یہاں نہیں تھا۔

آہ! جبکہ وہ اب یہاں تھا۔

یہ تیسرا دن تھا۔ وہ تین راتیں یہاں گزار چکا تھا اور اب مزید کتنے دن راتیں گزار سکے گا۔۔۔ شام یا پھر چند گھنٹے۔۔۔ بے حد شدید گرمی لو کے تھپیڑے 'بے آب و گیاہ صحرا' ریت۔۔۔ نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔۔۔

وہ یہ سوچ چکا تھا کہ اس میں دم نہیں ہے۔

مگر اس کے اندر نجانے کہاں سے انرجی عود کر آئی کیا اسے کرنٹ لگا تھا۔ ریت کے اندر سرسراہٹ ہوئی تھی۔ وہ ایسے کیونکر ہل سکتی تھی اور احساس ہونے پر وہ زمین سے کئی فٹ اچھل گیا تھا۔

یہ۔۔۔ یہ تو سانپ تھا اس نے اردگرد عمیق نگاہی سے جائزہ لیا۔ زمین کے اندر ہلچل ہوتی تھی۔ اوپر بھنور سا بنتا اور یہ بچھو تھے۔ بڑے چھوٹے عجیب و غریب۔ وہ حشرات الارض کے بارے میں قطعا" نہیں جانتا تھا اور ایسی عجیب شکلیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ۔۔۔ وہ کہاں تھا۔ وہ کہاں پھنس گیا تھا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا مگر کیسے؟ وہاں زمین کے اندر ہی نہیں اوپر بھی سانپ تھے اور وہ ریت کے ہمرنگ تھے۔ خوف و دہشت کی لہر نے اس کے پورے جسم کو ہلا دیا تھا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری مگر کسی قسم کی تری نہیں تھی اس کی زبان سوکھ کر چمڑہ بنتی جا رہی تھی۔

وہ اونچا لمبا تومند مرد تھا۔ اس کے پاس قد تھا' جسم تھا۔ شکل و صورت تھی اور یہ سب اس خاک کا حصہ بننے والا تھا۔ وہ' وہ کیا یہیں مرے گا۔

اس کا پیٹ کمر کے ساتھ چپک چکا تھا اور پسلیاں شدید ترین درد میں مبتلا تھیں۔ اسے چکر آرہے تھے۔ وہ یہاں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پھر قدم بڑھائے اور۔۔۔

چلتے چلتے پلٹا۔ وہ اپنا شاپر بھول رہا تھا۔ جس میں اس کا پاسپورٹ تھا۔ جس میں دنیا جہان کی ویزہ اسٹیمپ تھیں۔

اس کا آئی ڈی کارڈ تھا۔

اور اس کا کریڈٹ کارڈ بھی۔

اور یہ کیسی دنیا تھی۔ جہاں ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اور وہ احمق انہیں یوں سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ جیسے اگلی چوکی پر سب دکھانا ہو گا۔

زندگی کے انت پر ایک ایسی شاہراہ بھی آتی ہے جہاں ہاتھ خالی ہوتے ہیں اور آگے جانے کے لیے کچھ اور درکار ہوتا ہے۔

کیا آپ کے پاس وہ گیٹ پاس ہے۔

☆ ☆ ☆

کتنے دنوں سے اس کے چہرے کا عنوان افسردگی تھا۔

وہ شیشے سے بنی دیوار سے باہر دیکھنے لگی' یہ مرکزی ہال تھا اور سب گردوپیش سے انجان ان چیونٹیوں کی طرح تھے' جو قطار در قطار مال ڈھونے میں مصروف ہوتی ہیں۔

اس کا ذہن کہیں اور تھا مگر ہاتھ بدستور ماؤس پر ٹک ٹک کر رہے تھے۔

چند ایک کلک کے بعد وہ اس پیج پر چلی گئی جہاں گمشدہ کے حوالے سے کمنٹ تھے۔ سب کی ہمدردیاں' نیک خواہشات کہ وہ جلد مل جائے۔

"او گاڈ۔۔۔" خوشی سے تمتماتے چہرے والی یہ سینڈی تھی۔ اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔

"شکر ہے مل گیا۔" سینڈی اس کے نزدیک آگئی۔ خوشی و اطمینان آواز سے بھی عیاں تھا۔

"مل گیا۔" وہ اپنی جگہ سے مانو اچھل گئی۔ اس نے سینڈی کے دونوں بازو تھام تھے۔ "مل گیا؟ تمہیں کس نے بتایا۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"بتایا۔۔۔" سینڈی نے دہرایا۔ "مجھے کس نے بتانا ہے' مجھے خود ہی پتا لگ گیا۔ ان فیکٹ میں نے خود ڈھونڈا' سب سے کہہ کہہ کر تو ہار گئی تھی۔" اس نے نروٹھے پن سے گلاس وال کے پار مرکزی ہال میں موجود تمام لوگوں کو دیکھا۔

"تم نے خود ڈھونڈا۔" اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔

"ہاں۔۔۔!" سینڈی چونکی۔ "تم کیا سمجھ رہی ہو۔ میں تو اپنے آئی ڈی کارڈ کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ دکھایا جس میں کارڈ تھا۔

"اوہ!" اس کے بازو نیچے گر گئے۔ وہ الٹے قدم سرک کر کرسی پر بیٹھی۔

"تم کیا سمجھی تھیں ڈیئر؟" سینڈی نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں کمپیوٹر اسکرین پر جمی تھیں۔ سینڈی نے بھی دیکھا۔۔۔ اوہ۔۔۔ وہ سمجھ گئی وہ کیا سمجھی تھی۔

"وہ بھی مل جائے گا۔" اس نے پُریقین انداز سے کہا۔ اس نے یہ سن کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

"اور شادی تو کرنی ہوتی ہے میری۔۔۔ میں تو اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنے کے لیے قابل نہیں کہ جس نے میری پوتیوں کے ایسے نصیب کھولے۔"

خدیجہ بانو کو لچک نظر آگئی تھی۔ وہ سن رہی تھی۔ ٹوک بالکل نہیں رہی تھی۔

اس سے پہلے تو آغاز ہی بھڑک جاتی تھی۔

دراصل اسے انکل آنٹی اچھے لگے تھے۔ پھر اس نے سوچا' دادی کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر پاپا بھی راضی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر ماریہ۔۔۔ یعنی ماں اور دادی' اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دونوں کو ایک پیج پر دیکھا تھا۔

ماریہ بھی اتنی ہی خوش اور پُرجوش تھی' جتنی کہ خدیجہ بانو۔۔۔ بلکہ اس نے تو یہ ناقابل یقین منظر بھی دیکھا کہ ساس' بہو دھوم دھام سے منگنی کرنے کا پروگرام طے کر رہی تھیں اور ایک سے بڑھ کر ایک رائے دیتی تھیں اور خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

"میں کتنی خوش ہوں میری۔۔۔ کاش تمہیں بتا سکتی۔" ماریہ نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

"موحد اور واحد کی بھی فکر ہے مجھے۔ مگر تم دونوں محفوظ و مامون اپنے گھروں پر ہوں' اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی ہے بھلا۔" (وہ ماریہ کو بخشتی نہیں تھیں کبھی بھی۔)

موحد اور واحد بھی مل آئے تھے۔ انہیں بھی سمیع الدین بہت پسند آیا تھا۔

اور۔۔۔ اور پاپا بھی بہت خوش تھے۔ تو ایک اس کا اقرار خوشی کو مجسم کرتا۔

تو پھر میری۔۔۔ یعنی خدیجہ بانو کی میرو مان گئی۔

"اوہ میری چندا۔۔۔ میری میرو۔" خدیجہ بانو کا بس نہیں چلتا تھا اسے گود میں بھر لیں۔ چوم چوم کر بقول موحد میری کے ناک' گال گھسا دیے۔

"تو آپ فون کر دیں اب ان لوگوں کو امی!" ماریہ نے پُرمسرت لہجے میں ساس کو مخاطب کیا۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تم۔۔۔ ایسے کیسے فون کھڑکا دوں۔ گزرنے دو چند روز' ایسی بھی ہلکی نہیں ہے ہماری ہاں۔"

خدیجہ بانو کی بات شاید درست تھی' مگر ماریہ سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کا لہجہ بدل جاتا تھا۔

ماریہ نے سالوں پہلے صبر کا گھونٹ پینا سیکھ لیا تھا۔

"چھوڑیں نا دادی۔۔۔ کپڑوں کی باتیں کرتے ہیں۔" مہکی نے موضوع بدل دینا مناسب سمجھا۔ وہ ماں کا اڑتا رنگ دیکھ کر ایسے ہی بیچ میں کودا کرتی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔۔ سمیع تو لندن' امریکہ کے کپڑے پہنتا ہے' مگر میں چاہتی ہوں وہ منگنی پر واسکٹ پہنے۔"

"صرف واسکٹ دادی۔" مہکی بھونچکا رہ گئی۔

"اُفوہ۔۔۔" خدیجہ بانو نے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر مہکی کی شرارت سمجھ گئیں۔ میری کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ تو یہ جو خوشی کا منظر تھا' اس کی ایک ہاں سے وابستہ تھا۔ ایسے ہی اس نے سب کو تنگ کیا۔ لیکن وہ کیا کرتی اس نے شادی کا سوچا ہی نہ تھا۔

"میرے خیال میں پینٹ کوٹ ہی اچھا لگے گا۔ میری کے لیے مغلئی فراک پاجامہ بنوا لیتے ہیں۔" ماریہ نے رائے دی۔ خدیجہ بانو فوراً "ٹوکنے والی تھیں۔

مگر میری کے چہرے پر پھیلتی تائید پر نظر پڑ گئی۔
"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... بالکل... مگر یہ یاد رکھو ذرا سی بھی کسر نہ رہے، خاص طور پر وہ لباس و تحائف جو عقیلہ کے لیے لینے ہیں۔" ماریہ نے سر ہلایا۔ وہ یہاں بھی متفق تھی۔
"اور ہاں..." خدیجہ بانو کو یاد آیا۔ "چاہے محی الدین... سمیع کی ماں سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوں۔ مگر ہم کا ہے کو عناد پالیں۔ ہمارے لیے سب برابر ہونے چاہئیں۔"
"میں بھی آپ سے یہ ہی بات کرنا چاہ رہی تھی۔" ماریہ نے چونک کر کہا۔
"ہاں تو ٹھیک ہے۔ ساس اور دادی ساس کے کپڑوں میں کمی نہ ہو۔ کم از کم پانچ پانچ سوٹ تو رکھوں گی۔ کشمیری شال بھی... جوتے دینا اچھا نہیں لگتا۔ دیگر تحائف مل کر سوچ لیں گے۔ میرے پاس صندل کی لکڑی کی رحل ہے۔ وہ میں عقیلہ کو دوں یا سمیع کی ماں کو..." وہ ذہن پر زور ڈال رہی تھیں۔
"ایک جیولری بکس بھی تو تھا نا دادی جان!" میگی نے یاد دلایا۔
"اوں ہوں، وہ تمہاری ساس کو شادی میں دوں گی۔ انہیں شوق ہے زیورات کا۔" ماریہ نے مسکرا کر میگی کا ہاتھ دبایا۔ دادی بے انصاف بالکل نہیں تھیں۔
"ایک منٹ..." میگی نے نعرہ لگایا۔ "یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے۔ سمیع کی ماں کے پاس رحل کا کیا کام۔ سو وہ تو آپ عقیلہ آنٹی کو ہی دیجیے گا۔"
خدیجہ بانو نے چونک کر دیکھا، پھر سمجھ گئیں۔
"ارے ہاں..." انہوں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "میرے تو ذہن ہی سے نکل گیا، سمیع کی ماں کو بھلا رحل سے کیا کام۔ وہ تو عقیلہ بیگم ہی کو دی جائے گی۔" ماریہ نے بھی مسکرا کر تائید کی۔ دھیان ہی نہ دیا۔
"سمیع کی امی... میرا مطلب ہے۔" میری کی آواز پر تینوں متوجہ ہوئیں۔ "انہیں رحل کیوں نہیں

چاہیے؟" اس کے چہرے پر الجھن تحریر تھی۔ باری باری سب کی صورتیں دیکھتے ہوئے وہ جواب چاہتی تھی۔

"ہنہ۔" خدیجہ بانو کی تیوری چڑھ گئی۔ "اس یہودن کا رحل شریف سے بھلا کیا کام۔"

ماریہ اور مہگی کے چہروں پر درباری تاثرات در آئے تھے۔

میری کا چہرہ ہونق ہوگیا۔ اس نے کیا سنا تھا۔ "کیا دادی۔۔۔ آپ نے کیا کہا؟"

"او بابا! کیا کہنا ہے میں نے۔۔۔ اور اللہ جانے یہودن ہے کہ عیسائی' یا یہ کہ کسی کو بھی مانتی ہے کہ نہیں اللہ جانے۔۔۔ کون سا بدر نے اسے مسلمان کرکے نکاح پڑھایا تھا۔ وہاں تو وہ ہو جاتی ہے نا عدالت میں جاکر شادی' جج کے سامنے پیش ہوکر میرج سرٹیفکیٹ پر سائن مارے اور ہوگئے میاں' بیوی۔" ان کے لہجے میں حقارت و بےزاری کا امتزاج تھا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھی دادی۔" میری کو اپنی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اُفوہ۔۔۔" اس میں کیا سمجھنا۔۔۔ سمجھانا؟ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ سمیع کے باپ بدرالدین نے اسکارلٹ۔۔۔

یہ کسی تنقید نگار کے مضمون جیسا بیان تھا اور تنقید نگار بھی کون' جناب محی الدین سہگل۔۔۔ پھر اس پر سونے پہ سہاگا یا مرے پر سو درے کی مصداق کہنے والی خدیجہ بانو۔

سو یہ واقعہ۔۔۔ واقعہ نہ رہا۔ طنز و نفرت کا ایک ایسا باب بن گیا۔ جس کو پڑھنے کے بعد لگے سینے میں دل نہ رہا۔ کھکتس کا جنگل اُگ آیا ہو۔ اور سننے سے۔۔۔؟

محی الدین سہگل کیا' کیا نہ کہتے ہوں گے جو کچھ رنگ آمیزی خدیجہ بانو نے کی۔ ان کا بھی تو ذاتی تجربہ تھا نا۔

شعوری یا لاشعوری طور پر تضحیک آمیز نظریں ماریہ کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ ماریہ کا سر مجرموں کی طرح جھک گیا تھا۔

مہگی نے پہلو بدلا۔ وہ پر تول رہی تھی کہ انہیں ٹوکے۔۔۔ کہ بس کریں۔ "انہیں کیا مطلب سمیع الدین کی ماں سے۔۔۔ وہ جو بھی تھی' جیسی بھی' انہیں تو سمیع سے غرض تھی نا اور وہ بہت اچھا تھا۔

تب ہی میری اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ سب ہی چونکے۔ خدیجہ بانو کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ میری کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔

"کیا ہوا میرو؟" خدیجہ بانو نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"میں یہ منگنی نہیں کرسکتی دادی۔۔۔ ان فیکٹ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔"

"کی۔۔۔ کی کی کی۔۔۔ ند۔۔۔"

میری کی کی کی۔۔۔ خدیجہ بانو اور ماریہ یک آواز ہوگئیں۔

"کر ہی نہیں سکتی۔" آنکھوں میں بھرا دھواں چھٹنے لگا۔"

"کیا ہوگیا' پھر سے وہی اول فول۔۔۔" خدیجہ بانو' مصنوعی خفگی سے گھورا۔

"ہاں میری۔۔۔ ایسے نہیں کہتے بیٹا!" ماریہ نے پیار بھرے لہجے میں سرزنش کی۔

"جیسے بھی کہوں ممی میں انکار کر رہی ہوں۔" اس کا لہجہ فولادی تھا۔

"کیوں۔۔۔" سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ میری کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔

"کبھی نہیں۔۔۔"

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔۔۔ ابھی تو تم مانی تھیں۔" خدیجہ بانو اتنے بلند اور سخت لہجے میں کم از کم میرو سے کبھی مخاطب نہیں ہوئی تھیں۔

"نہیں' اب میں نے انکار کردیا ہے۔" اس نے "اب" پر زور دیا۔

"وجہ۔۔۔" ماریہ نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"میں ایسے کسی شخص سے شادی کا سوچ بھی نہیں

سکتی۔ جس کی ماں ایسی ہو۔"

"ایسی کیسی؟" مہکی نے تیزی سے پوچھا۔

"ایسی۔۔۔ یعنی کسی دوسرے مذہب کی ماننے والی۔۔۔ یہ فیصلہ میں بہت سالوں پہلے کر چکی تھی۔"

"کیا۔۔۔" تینوں کے چہرے بگڑ گئے۔۔۔ یہ کیا وجہ تھی۔ پھر خدیجہ بانو نے سرا پکڑا۔ ان کا سخت طنزیہ چہرہ ماریہ کی طرف اٹھ گیا۔

اور ماریہ کا چہرہ شب دیجور کو شرمانے لگا۔

اس کی اپنی بیٹی نے یہ کیا کہہ دیا تھا۔ ہاں وہ اس کی نسبت دادی سے قربت رکھتی تھی۔ مگر دادی سے محبت ماں سے نفرت کا باعث تو نہیں ہونا چاہیے تھی اور ماریہ کو دونوں بیٹیاں بہت پیاری تھیں۔ جان کا ٹکڑا۔۔۔ اور اس ٹکڑے نے آج اس کے وجود کے ٹکڑے کر دیے۔ تو اس کا وجود بیٹی کے لیے ایسا قابل نفرت تھا؟

ایسا جبری رشتہ۔۔۔ وہ نہ جانے کب سے اور کیسے "ماں" کو برداشت کر رہی تھی۔ تو بیٹی کے دل میں ماں کے خلاف ایسی بے زاری۔۔۔ خون اور دودھ سے تو نہیں ملی تھی۔ تو پھر یہی پتا لگانا یہ کارنامہ خدیجہ بانو کا تھا۔

خدیجہ بانو کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ "دیکھا آج تمہاری خود کی بیٹی۔۔۔"

اور مضبوطی سے فیصلہ دے کر ہلکی پھلکی ہو جانے والی میری نے خدیجہ بانو کے چہرے پر درج الزام پڑھ لیے۔ وہ بری طرح چونکی۔ پھر اس نے ماریہ کی آنکھیں دیکھیں اور وہ تاریک چہرہ۔۔۔ اور۔۔۔

اوہ نہیں۔۔۔ تو دادی اس کا باعث ماریہ کو سمجھ رہی ہیں۔ ماریہ نے اسی دم نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں سے جو غم چھلکا تھا' میری کو لگا اس کی ہستی تہس نہس ہونے لگی ہے۔

اور خدیجہ بانو نے دانت پیسے تھے۔ ان کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ ماریہ پر پل پڑنا چاہتی ہوں۔

اور ماریہ کے چہرے پر ذلت' پچھتاوے' شرمندگی کے احساس کے ساتھ خوف ابھر آیا اور میری بہت مضبوط تھی' نڈر اور صاف گو۔۔۔

"اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور اس کی وجہ آپ ہیں دادی۔۔۔ اور۔۔۔" اس نے ایک اور نام بھی لے دیا۔ کمرے کی چھت خدیجہ بانو کے سر پر آ پڑی۔

مہکی اور ماریہ بھی ملبے تلے موجود تھیں کہیں۔۔۔ میری کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

''اور یہ دنیا کی ہوگی جروب۔ ماں جئی۔۔۔ بالکل ماں جئی۔''

میں اپنی ہم عمر کسی لڑکی کے ساتھ نیاز کے چاول بانٹتی پھر رہی تھی۔ بڑھیا نے چندھی آنکھوں سے مجھے گھورا اور کہا۔

ایسا ہمیشہ ہوتا' میری شکل میرا تعارف خود کروادیتی۔ میری ماں کا پتا بتادیتی۔ وہ ماں جو خود اپنا پتا کھوچکی تھی اور ابا کے گھر میں لاپتا ہوئی پھرتی تھی۔ میں اس جیسی ہرگز نہیں تھی کیونکہ میں باپ کے گھر سے بھاگ گئی اور شوہر کے گھر کو لات مار آئی۔ میں ماں جئی کیسے ہوئی؟

''پر دیتا تو دودھ ملائی تھی۔۔۔ حور پری۔۔۔ یہ لمبے

پڑگیا۔ وہ ہمیں مار مار کر سوکھی روٹیاں کھلا رہی تھی۔ جو ہمارے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھیں۔

''درفٹے! ماں تو شاہی لونڈی بنی ٹھسے سے میکے بیٹھی ہے اور میں یہ اودبلا میں پالنے کو رہ گئی ہوں۔''

شاہی لونڈی اماں خون بھرے جبڑوں اور سوجے ہوئے ہاتھ' منہ' پیر لے کر میکے گئی تھی کہ دو دن ابا بچوں کو رکھیں گے تو لگ پتا جائے گا۔ پر پتا تو اماں کو لگ گیا۔ جب مہینوں بعد بھی ابا اسے لے کر نہ آئے۔ خود ہی واپس آگئی۔ پھر دوبارہ کبھی نہیں گئی۔ بڑی پاگل تھی اماں۔ جانا ہی تھا تو آئی کیوں۔ آنا ہی تھا تو گئی کیوں؟ کوئی ایک فیصلہ کرتی اور جی جان لگا کر نباہتی۔ بلکہ جان دے کر نبھاتی۔ یہی وہ حرکتیں تھیں جو اماں کو لے ڈوبیں۔

کالے سیاہ بال۔۔۔''

یعنی میں ماں جئی تھی لیکن دودھ ملائی نہ تھی۔ دادی جواب مرکھپ گئی' کہتی تھی کہ ''جب تو پیدا ہونے والی تھی تو اوپر تلے تیرے نانا نانی مرگئے تھے۔ تیری ماں نے وہ سوگ منایا کہ منی کا رنگ روپ کھال بال سب کھا گئی۔۔۔''

منی کون؟ میں! جسے دادی ساری عمر کا کی' اے چھوکری' ٹن مرن جوگی' کہہ کر بلاتی رہی۔ اماں کو اوقات دکھانی ہوتی تو منی بنادی جاتی۔ ویسے میری دادی ایک ایسی ساس تھی جو بہو کو کمینی لچی سمجھتی اور کہہ کر بلاتی۔

ایسی آوارہ بہو کی لچی اولاد کو انہیں ایک بار سنبھالنا

اسے سہاگ کا ڈنٹھل بنا دا تر سے گردن کٹوا بیٹھیں۔ ویسے اماں سے اچھے تو ڈنٹھل ہی ہیں جو کم سے کم ''ڈنگروں'' کے کام تو آتے ہیں۔ اماں تو کسی کام جوگی نہ تھی۔ نہ ہمارے نہ ابا کے۔ خود اپنے لیے تو بالکل ہی ''درفٹے'' تھی۔

ہاں تو جب تک دادی زندہ رہی (خیر سے بہت دیر تک زندہ رہی) اماں کا غصہ' گالیاں' دو ہتڑ' چھتر' طعنے' کوسنے' ماں جئی کو بھی ملتے رہے (اماں کا حصہ الگ سے)۔

''اے ہندنی درفٹی' کھول اسے۔''

میں دادی کی چارپائی کے نیچے سے اپنی جوتی نکال رہی تھی کہ دادی نے ذرا جھک کر میری چوٹی پکڑلی اور

زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ ہندوؤں سے انہیں خاص خار تھی۔ نہ جانے کوئی ہندو ان کا لوٹا لے کر بھاگ گیا تھا یا انہیں بھگانا بھول گیا تھا۔ وہ خود تو بسے بسائے پنجاب میں پاکستانی بن کر بیٹھ گئی تھیں۔ نہ بارڈر پار کیا' نہ بلوائیوں کو بھگتا۔ نہ کسی ہندو کے لیے اپنا گھر بار چھوڑا۔ پھر بھی دل میں عناد کا کھیت اگا لیا۔ ساری نفرت اور غلاظت ہندوؤں کے نام کردی تھی۔

"اتنی اونچی چوٹیاں نیچ ذات کی ہندنیاں بناتی ہیں۔ مسلمان لڑکیاں یوں سروں پر لومڑیوں کی طرح دمیں لٹکائے نہیں پھرتیں....."

اب مجھے کیا معلوم نیچ ذات کی ہندنیاں کیا کیا کرتی رہی تھیں۔ میں تو اونچی ذات کی دلدی کو جانتی تھی جو ایک بد کردار عورت کی ساس اور اس کی آوارہ بیٹی کی دادی تھی۔ مسلمان عورتیں بھی میری نظر سے دو ہی گزری تھیں۔ ایک میری دادی جو روز مردہ ماں کی زندہ لاش پر دولتی مارتی اور ایک اپنی ماں جو سانس لیتی بھاگتی دوڑتی اور دولتیوں کو کھاتی۔

"یہ سوانگ کس کو رجھانے کے لیے رچاتی ہے۔ مردودنی....؟"

وہ میرے بال کھول کھال خوب جھٹکے دیے جارہی تھی اور منہ اندر کی طرف کرکے اماں کو سنا رہی تھی۔ اماں بھی کبھی کبھار ایسی ہی اونچی چوٹی بناتی تھی۔ ویسے اماں یوں چوٹی نہ بھی بناتی تو بھی وہ نچلی سے نچلی ذات کی ہی رہتی۔ لونڈی.... مردودنی....

"کیسا پیارا دین ہے ہمارا۔ اس دین سے کوئی بات تو سیکھو۔ درفٹے.... اجڑ گئیں پاک دامن بیبیاں اور ڈیرے جمالیے ان انہوں نے۔ غلافوں میں لپیٹ کر رہنے کو تو جی ہی نہیں چاہتا ان کا۔ بس نہیں چلتا کہ اپنی کھالوں سے بھی باہر نکل آئیں اور چلا چلا کر کہیں کہ آؤ ہمیں دیکھو.... کرو نظارہ ہمارے حسن کا.... ہاں دیکھو ان کم ذاتوں کو۔"

اب دادی سب "ذاتوں" کو گنوا کر ہی چپ ہونے والی تھی۔ اندر سے اماں نکلی۔ میرا ہاتھ پکڑا' بال سنوارے اور پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ میری اماں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ حاجی شوہر اور حاجن ساس کی بہو بن گئی تھی۔ جبکہ میری دلاری دادی کی قسمت خراب تھی کہ وہ ایک نوعمر شہری لڑکی بیاہ کر لے آئی تھی اور میری اماں منحوس' کم بخت ماری' بیاہ کر آ بھی گئی۔ ویسے بھی اماں لکیر کی فقیر تھی۔ لکیر جو ابا نے کھینچ دی اور فقیر اماں نے خود کو خود بنا لیا۔ سر ڑاڑے اڑے چیدہ چیدہ بال' کہیں کہیں سے نظر آتی کھال اور ہاتھ.... توبہ استغفار.... بھدے' بدصوت' لعنتی ہاتھ۔

اسی لیے دادی کہتی "درفٹے! میں تو شیر کے لیے چھچھوندر لے آئی۔"

میں نے اماں سے پوچھا۔ "یہ چھچھوندر کسے کہتے ہیں؟" تو وہ جھٹ بولی۔ "تجھے۔"

لو اماں تو چھچھوندر نکلی اور دادی کی قسمت خراب۔ ٹھیک کہتی تھی دادی۔ جب ابا گھر آتے سو شیر ساتھ لاتے۔ محلے اور کھیل کے میدان کے سب ہی بچوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا ابا شیر ہے شیر۔ جب میں اور میری سہیلیاں کھیلتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ ساتھ ساتھ یہ پاس والی سڑک پر نظر رکھنی ہے۔ جمیلہ کے ابا کی اسکوٹر نظر آتے ہی اسے جھٹ سڑک پار کروا کر پچھلی گلی کے پچھلے دروازے سے اندر کرنا ہے۔ اسی میدان کے دوسری طرف عقیل اور شکیل کھیل رہے ہوتے۔ شکیلہ جسے دادی نے ذرا سا قد نکلنے پر زبردستی آپا بنا دیا تھا' ساتھ والوں کی چھت پر کھیل رہی ہوتی۔ ہر ایک پر فرض تھا کہ جو پہلے ابا کو دیکھ لے گا وہ سب کو اطلاع دیتا ساتھ لے کر گھر پہنچے گا۔ یہ سب جذبۂ بھائی چارہ کے تحت نہیں بلکہ باہمی مار سے بچاؤ کے تحت کیا جاتا تھا۔ پکڑا ایک جاتا یا دو' مار بہرحال مشترکہ سب کو پڑتی۔ پوری طرح پڑتی' مکمل طور پر پڑتی۔ ابا دل لگا کر مارتے۔ بے شک کتنے بھی تھکے ہوئے ہوتے۔ مار مار کر ابا ہمیں قبر تک ہی کیوں نہ پہنچا دیتے۔ اماں ہمیں نہیں بچاتی تھی۔ ویسے بھی اماں نے ہمیں بچانے کے لیے ہاتھ بڑھایا نہیں۔ یا زبان ہلائی نہیں کہ ان کے

ہجرتی اماں باوا کو وہ ماں بہن کی گالیاں پڑتیں کہ اماں منہ چھپا چھپا کر روتی۔ اور اماں کو آتا ہی کیا تھا۔ اگر اماں گالی دینے والی زبان نہیں کھینچ سکتی تھی تو گالی سننے والے کان ہی کچل ڈالتی پھر یوں رونا تو نہ پڑتا۔

سنا تھا کہ چیز جتنی پرانی ہوتی جاتی ہے اس کی قدر اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ اماں کی قدر الٹا گھٹتی جارہی تھی۔ بلکہ اتنی گھٹ گئی تھی کہ ٹکسال بھی اماں کو شرمندہ کردے کہ جا بہن تیرے "دام" کا کوئی سکہ نہیں بن سکتا۔ نہ ابھی نہ کبھی۔ تیری قیمت ہی کیا ہے جو "سکہ" بنے۔ اسی لیے تو اماں مجھے کبھی پسند نہیں رہی۔ بھلا کیا فائدہ ایسے انسان کا جسے وقت پڑنے پر بیچا جائے تو دمڑی بھی ہاتھ نہ آئے۔

عقیل، شکیل تو تھوڑے بڑے تھے پر میرا گڈا جسے میں سارا وقت کمر پر ٹکائے پھرا کرتی تھی بمشکل بھاگنے دوڑنے لگا تھا کہ ابا نے باہمی مار میں اسے بھی رگڑ دیا۔ میں اسے بھی میدان میں اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے گئی تھی نا۔ بے چارہ!

سرکاری اسپتال کے ڈاکٹروں نے کہا "پیٹ میں کوئی آنت پھٹ گئی ہے۔" خون رستا بند ہی نہیں ہوسکا اس کا۔ نو ماہ تک پاخانے میں خون آتا رہا۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہوگیا۔ بھلا چنگا..... خوش باش۔۔۔

مرحوم جلیل ولد حاجی ستار احمد۔۔۔۔

خیر ہمیں کیا۔ ہم سب تو کئی دن تک یہ ماتم کرتے رہے کہ وہ اتنا "خوش قسمت" کیوں رہا۔ اتنا خوش قسمت کہ اب اسے یہ سننا نہیں پڑے گا کہ "تیرا باپ (گالی) قبر میں لیٹا ہے اور تجھ (گالی) کو میرے سر پر ناچنے کے لیے چھوڑ گیا۔"

"اماں کا ابا۔۔۔؟" آپا پوچھتی۔ ویسے آپا تھی بڑی بھولی۔

"دادی سے نہ پوچھ آئیں؟" شکیل نے مشورہ دیا اور شکیل تھا بھی پاگل۔ ایک بار اس کے ہم جماعتوں کے والدین آگئے اسکول اس کی شکایت لے کر۔

"یہ کن بازاری لوگوں کے بچے پڑھاتے ہیں آپ۔ توبہ اتنی گندی باتیں۔ اتنی گندی گالیاں، اتنے سے بچے کہاں سے سیکھتے ہیں یہ۔"

اس دن اماں نے پہلی بار شکیل کی خوب پٹائی کی۔ اس اماں نے جو کائی لگے گھڑے کا بدبودار پانی تھی۔ جسے پیاس میں پیا جاسکتا تھا نہ احترام میں۔۔۔۔

☆☆☆

دادا کو اللہ جنت میں بڑے سے بڑے محل میں رکھے۔ دادی کو بٹھائے ایک بار سائیکل پر لیے جارہے تھے کہ سامنے سے آتی گھوڑا گاڑی نظر نہیں آئی۔ خود وفات پاگئے اور دادی کی آدھی ٹانگ لے گئے۔ ان ڈیڑھ ٹانگوں کے ساتھ دادی گھر میں ایسے اور اتنے دھمال کرواتی تھی کہ میں سوچتی ہوں دو ٹانگوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کرتی۔ ویسے دادی بھی گیدڑوں کے سامنے ہی شیر تھی۔ پھوپھا کے سامنے تو دم کٹی چھپکلی بن جاتی۔

پھوپھا اور ابا کی بنتی نہیں تھی۔ عمر بھر کا مرنا جینا ختم تھا۔ لاہور کی کسی شادی میں پھوپھی آئی تو چپکے سے دادی سے ملنے آگئی۔ اگلے دن اسی شادی میں ہم سب بھی شریک تھے۔ میں نے پھوپھا کو سلام کیا اور پوچھ لیا۔

"آپ کل پھوپھی کے ساتھ گھر کیوں نہیں آئے۔"

شادی والے گھر میں جو پھوپھی کے ساتھ ہوئی وہ الگ، اور جو میرے ساتھ میرے گھر میں ہوئی وہ الگ۔ اس ساری رات اماں میرے سرہانے بیٹھی رہی۔ نہ پچکارا، نہ دلار کیا، بس بیٹھی مجھے گھورتی رہی، گھورتی رہی۔ جیسے یا خود مرنے والی ہو یا مجھے مار دینے والی ہو۔ ویسے اماں میں ٹھیک سے زندہ رہنے کی طاقت نہیں تھی، زور لگا کر مرتی یا مارتی کیا۔ بس بددعا ہی تھی اماں ہم سب کے لیے۔ خود اپنے لیے تو سب سے پہلے تھی اور سب سے زیادہ تھی۔

پھوپھا پھر کئی بار مجھے خاندان میں آتے جاتے نظر

آئے مگر دوبارہ ان پر سلامتی بھیجنے کی میں نے غلطی نہیں کی۔ جب ان کے بیٹے کے ساتھ آپا کا رشتہ پکا ہوگیا تب بھی۔ نہ جانے پھوپھا رشتہ کیسے لے گئے آپا کا۔ دادی پھولی نہیں سماتی تھی کہ بیٹی اور داماد گھر آنے جانے لگے ہیں۔ ملنے ملانے لگے ہیں۔ آپا دنوں میں سوکھ کر تیلی سی بن گئی۔

اماں نے قسم کھا رکھی تھی کہ بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے مار دیں گی' خاندان میں نہیں بیاہیں گی۔ اماں اللہ مجھے معاف کرے جھوٹی بہت تھی۔ نہ آپا کو مارا' نہ اکسایا اور بیاہ دیا پھوپھا کے گھر۔

پھوپھا ان دنوں بہت بیٹھے تھے دادی کے ساتھ۔ دادی نے ہی ابا سے رشتہ لے کر دیا پھوپھا کو۔ رشتہ کیا بیاہ بھی دیا اور پھر آئے پھوپھا کی جوتی کی نوک تلے ابا.....

"احسان مانے میرا۔ کی اولاد کو کھلاتا ہوں (ابا نے بھی تو کھلایا تھا)۔" پھوپھا خاندان میں دہاڑتے پھرتے۔

شادی کے شروع میں تو وہ ایک بار آپا آئی کہ اس جہاں کی بابت بیان کرسکے جہاں "دھتکار" راج کرتی ہے اور "بے بسی" رعایا بنتی ہے۔ تاکہ ابا کی راتوں کی نیند اڑ سکے۔ بھولی آپا۔ بے چاری نے دس بھی پاس نہیں کی تھی کہ ابا نے شادی کردی۔ دادی نے پھوپھی کی راہ کھولنے کے لیے دونوں کی راہ ہی کھوٹی کردی۔ پھوپھی' دادی' ابا سب آپا کو لے ڈوبے۔

سنا تھا پھوپھا جو کہ ابا کے ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جوانی کے دنوں سے ہی ابا سے بیر لیے ہوئے ہیں۔ نہ جانے کس کبڈی کے دنگل میں ہرا دیا تھا ابا نے کہ پھوپھی کا رشتہ لے کر ہی پھوپھا نے ہار کا بدلہ لیا۔ ویسے عورت وہ ترپ کا پتا ہے جو ہر مرد جواری کو راس ہے۔ پھوپھا کو بھی پھوپھی خوب راس آئی کہ پھوپھی کی روز صبح و شام جوتیوں سے تواضع ہوتی تھی۔ سات آٹھ سال تک تو وہ نام کی ہی دلہن رہی۔ لوگ تھو تھو کرتے۔ پھوپھی کو تو خاندان کی عورتیں نئے نئے نام دیتیں۔ ویسے ٹھیک ہی کہتی تھیں' پھوپھی بھی اماں جیسی ہی تو تھی۔

☆ ☆ ☆

عقیل ایک بار فیل ہوا تو ابا نے اسے ویلڈنگ کی دکان پر بٹھا دیا۔ ایک بار پھر اماں نے اپنے ماں باپ کی گالیاں سنیں اور چھٹے بچے سے بڑھا ہوا پیٹ... اف توبہ اماں کیسے چیخی تھی۔

اگلی کئی راتوں تک میں خواب میں ڈرتی رہی۔ اماں خون میں لت پت ہوگئی۔ ابا نے رکھ رکھ کر لاتیں ماریں۔ ساتھ والی پڑوسن خالہ ابا کو پرے دھکیل کر دو تین اور ہمسایوں کے ساتھ اندر آئی۔ پر دیر ہوچکی تھی۔ بھلا اماں کو کیا ضرورت تھی اتنی لمبی زبان چلانے کی۔ ابا نے کہا بھی۔

"دفعان ہوجا... میرا سر نہ کھا!"

اور اماں بار بار یہی کہتی رہی۔ "شام کو دکان پر چلا جایا کرے گا۔ دن میں اسکول جانے دو۔"

ابا نے سالن کی پلیٹ منہ پر دے ماری۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کمینی عورت کھاتے کے دوران بولے جارہی تھی۔ مار کھائے جارہی تھی۔ بکواس کیے جارہی تھی۔

"دن میں اسکول چلا جائے گا۔ شام میں دکان۔"

میرے کان پک گئے تو کیا ابا کے نہیں پکے ہوں گے۔ اب سکون رہا جب چھٹا بچہ پیٹ میں ہی مرحوم ہوگیا۔ تھو ہے ایسی عورتوں پر جی... سو بار تھو ہے... جب ہمت نہیں ہے تو ایسے شیروں کے منہ کیوں لگتی ہو۔ چپکی کیوں نہیں پڑی رہتیں... مار نہیں سکتیں تو پھر مر کیوں نہیں جاتیں۔

عقیل ویلڈنگ کرنے لگا۔ بڑا خوش رہتا۔ کہتا استاد بڑا پیار کرتا ہے۔ رات گئے تک گھر نہ آتا۔ شکیل نے رات دن کتابیں چاٹنا شروع کردیں۔ اور میں تو بمشکل ہی پاس ہوتی تھی۔ اماں اسکول میں استانیوں کے آگے ہاتھ جوڑتی کہ سالانہ میں کیسے بھی کر کے اسے پاس کردو۔ عجیب اماں تھی... سمجھتی ہی نہیں تھی..... جس دن حساب کا پرچہ تھا۔ اس رات ابا نے اماں کی

چٹیا پکڑ کر وہ گھمائی وہ گھمائی کہ ساری رگیں صفر رہ گئیں۔

اماں سے ابا کی خاندانی گرم شال جل گئی تھی۔ استری کی شکل شال پر چھپ گئی تھی۔ میں نے اس رات قسم دادا مرحوم کی دادی کو ایسی کیفیت میں دیکھا جیسے ان پر "اماں کی دھلائی" نے وجد طاری کر دیا ہو۔ وہ سرور سے ہلکورے لینے لگی۔ ایک وجد مجھ پر بھی طاری ہوا اور میں حساب کے پرچے میں فیل ہو گئی۔ اماں کے دو ہاتھ ایک گردن کو چھڑاتے نظر آتے۔ نہ ضرب ہوتے کہ دو سے چار ہو جاتے۔ نہ تفریق کہ دونوں ہی نہ رہتے۔ جواب کوئی تو آتا۔۔۔ حاصل صفر ہی سہی۔۔۔ جواب کوئی تو ہوتا۔۔۔ وصول صفر ہی۔۔۔

استانی جی نے بلا کر مجھے پرچہ دکھایا۔ پورے تیرہ نمبر لیے تھے میں نے۔ "جمیلہ تجھ اپنی اماں کا ہی خیال کر کے پڑھ لیا کرو۔"

اب انہیں کیا بتاتی ان ہی کا خیال کر کے تو نہیں پڑھا۔ ساتھ کے بستر پر پڑی اپنے پھٹے ہونٹوں کا خون صاف کرتی رہی اور اپنے کالے بھدے ہاتھوں سے گردن کو سہلاتی رہی۔ کیسی عورت تھی' بات مانتی ہی نہیں تھی کہ عورت ہی بن کر رہے' انسان نہ بنے۔ غلطی تو انسانوں سے ہوتی ہے۔ یہ گنجائش انہیں حاصل نہیں تھی۔ ملتی بھی کیسے۔ انہیں یہ گنجائش نکلوانی آتی ہی نہیں تھی۔ پھر مرد۔۔۔ کھاؤ مار۔۔۔ کبھی بکری اور شیر بھی ایک گھاٹ سے پانی پیتے ہیں؟ اگر پیتے ہیں تو وہ میاں بیوی ہوتے ہیں۔۔۔ روز حملہ۔۔۔ روز شکار۔۔۔ ہاں پھر یہی ہوتا ہے۔۔۔ لیکن صرف بکری کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

ہمارے گھر میں نانا نانی کا نام لینا ایسا ہی تھا کہ تھا جیسے خنزیر کا نام لینا۔ دادی اپنے ہر خطبے میں فرماتی کہ "اس کے باپ نے کسی طوائف کے پیچھے خودکشی کر لی تھی۔ ماں بھی کیوں پیچھے رہتی وہ بھی چھت سے لٹک گئی۔ حرام موت مرے۔ ان کی اولاد ہے تمہاری ماں۔"

دادی اپنے پارسا بیٹے کی ماں کے بطن سے جنمی اولاد سے مخاطب ہوتے ہوئے عالمانہ روپ اختیار کر لیتی۔

"تمہارے نانا کا آنا جانا تھا وہاں ہیرا منڈی۔۔۔ توبہ مجھے تو رات کی نماز بھی پڑھنی ہے۔ خیر وہ ایسار تھا ایسار تھا اس کم ذات پر کہ جان سے گیا۔ ایسی عورتیں بھی کسی کی بنتی ہیں بھلا۔۔۔ اس نے الٹی جوتی کا تلوا دکھایا! دردوتی مار در فٹ کیا۔۔۔ لٹک گیا چھت سے اس کے عشق میں۔۔۔ در فٹ۔۔۔ اٹھ کر وضو کروں۔۔۔"

طوائف کہتے دادی ایسی کلمہ گو بن جاتی جو "حق بات" کہنے سے بالکل نہیں جھجکتی ۔۔۔ نانا نانی تو تھے نہیں ہمارے لیکن ابا اور دادی کے حج پر جانے کے بعد جب کبھی ہم وہاں گئے۔ کسی کو بڑے نانا کہتے' کسی کو بڑی نانی۔ وہاں کافی کھیپ تھی چھوٹے' بڑے' منجھلے نانوں اور نانیوں کی۔

"اللہ بخشے بہت نیک تھے تمہارے نانا تہجد گزار۔ ہر ایک کی مدد کے لیے تیار۔" کوئی دور پار کی نانی بتاتی۔ تو بھلا ہمیں کیا ان باتوں سے۔ ہم کھیلنے کودنے لگے لیکن عقیل بیٹھا سنتا رہا۔ بڑی اونچی چیز تھی عقیل۔

"وہ لڑکی بھاگ کر نانا کے پاس آگئی کہ میاں جی بچالیں مجھے۔ نانا نے گھر رکھ لیا۔ خاندان والوں نے تہجد گزار میاں جی کو نظر باز بنا دیا۔ جب سب نے انہیں ایسا ہی سمجھ لیا تو چھت سے لٹک گئے۔ انہیں چھت سے لٹکا دیکھ کر پہلے تو وہ ہیرا منڈی والی ننگے سر گھر سے بھاگی۔ پھر یہی کام نانی نے کیا۔ خاندان والے نانی کو تو پکڑ دھکڑ کر میت کے پاس لے آئے۔ ان کی چوڑیاں توڑیں اور سونے کی اتروائیں۔ سر پر سفید دوپٹا دیا۔ بیوہ بیوگی میں ہی رہے۔ انہوں نے سارے زرق برق کپڑے فوراً ٹرنکوں میں سے نکال لیے۔ جیسے مرحوم کی بیوہ میت کے اٹھتے ہی پہلے انہیں ہی تو نکال کر پہنے گی۔ خیر ویسے جب نانی میاں جی کے کپڑے کتر کتر کھانے لگیں' اور ان کی جوتیاں چاٹنے لگیں تو وہ "مکمل بیوہ" کہلائیں۔"

عقیل نے جان توڑ کوشش کر کے سنا سنایا مضمون ہم تک پہنچادیا۔

نانی کو ایسے بیوہ بنادینے والے نہ جانے کس نسل سے تھے۔ کہاں سے لٹے پٹے آئے تھے۔ یہاں آکر پڑاؤ کیوں کیا۔ دادی کہتی۔

"یہ سکھ تھے۔ پھر کبھی کہتی نچلی ذات کے دلت تھے۔ یہاں آئے تو مسلمانی اوڑھ لی کہ جی مسلمان ملک میں مسلمان بن کر رہیں گے تو مزے ہی مزے ہوں گے۔ تمہاری پر نانیاں نہ جانے کہاں کہاں منہ کالا کرتی پھرتی تھیں۔ در فٹ۔ اور مرد۔ مردودوں نے کوئی سکھنی' ہندنی چھوڑی نہیں تھی۔ چوتڑوں چماٹوں میں گھسے رہتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں منہ مار کر' اسے اٹھا کر بنا کر لے آئے خاندان۔ پاک سرزمین میں قربانیاں دیں ہمارے بڑوں نے اور آبسے یہ دلت' کم ذات۔"

دادی کو اپنے پاکستان میں پیدا ہونے پر بہت فخر تھا۔ ان کے لیے سب مہاجر ہندو سکھ تھے۔ اسی لیے دادی انہیں "رلا کہتی۔ کوئی یہاں سے رلا کوئی وہاں سے رلا اور در فٹ آگئے بن ٹھن کے قبضہ کرنے۔ اسی رلے میں دادی اپنے مینتیس سالہ بیٹے کا رشتہ لے کر گئی تھی۔ بقول چھوٹی بڑی کسی نانی کے جوتیاں گھس گئی تھیں بہت سوں کی میاں جی کی اکلوتی بیٹی کا رشتہ لینے کے لیے۔

آپا نے ایک بار اماں سے پوچھا۔ "کیا دیکھ کر نانا نے آپ کی شادی کردی تھی ابا سے؟"

اماں ہنسنے لگی۔ ہنسی بھی تو کب۔

"شرافت! تمہارے نانا کہا کرتے تھے۔ بھوکا نہیں مارے گا تمہیں۔ بہت محنتی ہے۔"

کیا کمال کے حوالدار تھے نانا۔ ابا کی آنکھ کی شرافت تو پڑھ لی۔ اس شرافت کی نزاکت نہیں پڑھی۔ ویسے اچھے محنتی تھے ابا کہ دنیا کی کوئی ایسی گندی گالی نہ تھی جو کما کر اماں کے کان میں نہ ڈالی ہو۔ اور دنیا کی کوئی ایسی بدکردار عورت نہ تھی جس سے اماں کو تشبیہ نہ دی ہو۔ ابا نے اماں کو بھوکا مارا نہ بھرے پیٹ سے زندہ رکھا۔ کمال کی بات ہوئی نا۔ اور ہاں کوٹھے باز نہیں تھے ابا۔ شریف اتنے کہ محلے کی کسی عورت نے انہیں کبھی سر اور نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں مؤذن اذان دیتا اور یہاں ابا مسجد کی طرف نکل جاتے۔ دو حج اور تین عمرے کیے تھے۔ ایسے نیک اور مومن صفت تھے ابا۔

گھر میں بکرے کا گوشت پکواتے۔ مہینے میں دو درجن دیسی مرغیاں لے کر آتے۔ صبح حلال کر جاتے اور شام آتے ہی یخنی پیتے۔ اسی لیے تو دادی کہتی تھی۔

"ہم تو ایسے ہی شاہی کھانا کھاتے ہیں۔ بھوکے ننگے تھوڑی تھے ہمارے دادے پر دادے۔ یہ بیسن کی ٹکیاں' آلو کے ملیدے' پتلی دالیں ہم نہیں کھاتے۔ پیلے چاول' اور دھنیہ پودینے کی چٹنی۔ در فٹ ہمیں کیا پتا سینتالیس کے کیمپوں میں کیا کیا دیا جاتا تھا۔"

☆ ☆ ☆

اماں چھت پر سردیوں کی دھوپ میں بیٹھی دونوں ہاتھ (وہی ہاتھ) لہرا لہرا کر نہ جانے کس سے باتیں کررہی تھی ۔ وہ خدا کو سنا رہی تھی' بتا رہی تھی' یا

پوچھ رہی تھی یا اپنے اماں باوا کو کٹہرے میں کھڑا کیے اپنے پیدا کیے جانے کی وجہ پوچھ رہی تھی۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا پھر میں نے ذرا غور کیا تو جانا کہ وہ بڑبڑا رہی تھی اور ہاتھ (اللہ مارے ہاتھ) ایسے لہرا رہی تھی جیسے دہائیاں دے رہی ہو۔ پھر... پھر... گو مجھ میں سکت نہیں اس منظر کو دوبارہ دہرانے کی لیکن کوئی اگر مجھے تھام لے۔ میری کپکپاہٹ روک دے تو شاید..... ہاں تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے۔ اور اتنی زور سے ایسی عجیب چیخ ماری کہ میں مارے ڈر کے نیچے بھاگ گئی۔ کچھ دیر میں میں عقیل، شکیل کو بھی اوپر لے گئی۔

ہم تینوں نے اماں کو بڑبڑاتے' بال نوچتے' دہائیاں دیتے' اور آنکھوں سے خون رستے... میں قسم کھا سکتی ہوں وہ خون ہی تھا... دیکھا۔

نیچے سے دادی کے چلانے کی آواز آئی تو ہم نیچے بھاگے۔ اماں نیچے آکر ایسے کپڑے دھونے لگی جیسے اوپر کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ دیکھو اماں کیسے ناٹک کرتی ہے۔ دادی ٹھیک کہتی ہے۔

"نٹنی ہے۔ لے جاکر کسی چوراہے میں کھڑا کردو ایسا ناٹک کر کرکے دکھائے گی کہ دنیا گھروں کو جانا بھول جائے گی۔"

چند دن پہلے تایا آئی تھی تو اماں بلک بلک کر روتی رہی تھی۔ بیٹی کے جسم کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جو نیلا پیلا نہیں تھا۔ ابا آئے' ابا کو بتایا کہ ایسے جانوروں کی طرح مارتے ہیں۔ ابا کھانا کھاتے سنتے رہے اور پھر سو گئے۔ کیا کرتے بے چارے ابا۔ چند دنوں بعد تایا کے بیٹے کے ساتھ آپا کو گاڑی میں بٹھا دیا۔

"جاؤ جی۔ اپنے جھگڑے خود سمیٹو۔"

جھگڑا سمٹ گیا۔ اماں چند دنوں بعد ہی چل بسی۔ کان اور ناک سے خون نکلنے لگا تھا۔ کوئی کہتا دماغ کی نس پھٹ گئی۔ کوئی کہتا۔ تینوں ایک اکٹھے ہو گئے۔ دل، بند۔ اماں ختم۔

جو بھی ہوا' اماں مر گئی۔ تین چار دن ہم سب خوب روئے۔ پھر سب ٹھیک ہو گئے۔ پڑوسن خالہ البتہ بہت ہفتوں تک روتی رہیں۔ بیمار بھی ہو گئی تھیں۔ انہیں بہت غم لگا تھا اماں کے جانے کا۔ جبکہ عقیل نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ روز کی جنگ سے جان چھوٹی۔"

مہینہ بہت سکون سے گزرا۔ نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا۔ نہ ماں کی نہ باپ کی۔ اتنا سکون تھا گھر میں یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ اماں پہلے ہی مر جاتی بھلا۔ ایسے سکون کے لیے کیا مائیں اپنی جان نہیں دے سکتیں۔ ایک دن ساتھ والی خالہ مجھے چپکے سے ساتھ لے گئیں۔ نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں مجھے تو سب بکواس لگا۔ کہنے لگیں۔

"سب کا کہنا ہے کہ تمہارے ابا نے اماں کو زہر دے کر مارا ہے۔"

میں کیسے مان لیتی... بھولی خالہ... زہر دے کر مارنے والوں میں سے نہیں تھے ابا... زندہ لاشیں بنا کر گھر کی قبر میں رکھنے کے حق میں تھے۔ خالہ کے ابا تھوڑی تھے جو خالہ کو پتا ہوتا۔ اماں نے زہر کھا لیا ہو تو ہو۔

میں گھر واپس آئی تو ایک ایک برتن سونگھنے لگی۔ عقیل شکیل کو بتایا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے اور کہنے لگے۔

"اتنی ہمت والی ہوتی اماں تو ابا یا دادی کو زہر نہ کھلا دیتی۔"

کہہ تو ٹھیک رہے تھے۔ چلو ابا یا دادی کو نہ دیتی ہم چاروں بہن بھائیوں کو ہی دے دیتی۔ ورنہ آپا کو تو ضرور ہی دے دیتی۔ اسی لیے تو اماں مجھے کبھی پسند نہیں رہی۔ اور میں نے اس کے مرنے کا سوگ نہیں کیا۔ اسکول میں لڑکیاں حیران ہوتیں کہ جمعہ جمعہ چار دن نہیں ہوئے جمیلہ کی ماں کو مرے اور اس کی کھلکھلاہٹیں تو دیکھو۔ ایک لڑکی اماں کا افسوس کرنے لگی تو میں ہنسنے لگی۔ اس نے مجھے خوب کھری کھری سنائیں۔ بے شرم' بے غیرت کہا۔ تو ان لڑکیاں... سب کی سب..... وہ کیا جانیں بے چاریاں' ماں کی لاڈلیاں' باپ کی دلاریاں کہ اماں کا مرنا کتنی خوشی کی

بات تھی۔۔۔ کتنا سکون تھا اب مجھے۔ کتنا سکون ہوگا اماں کو بھی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ! تیری ماں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جمیلہ سے کہنا کہ پڑھائی نہ چھوڑے۔ موت کا کیا پتا کہ کب آجائے۔ جمیلہ پڑھ کر کوئی نوکری کرلے اور جانوروں کے اس باڑے سے نکل جائے۔" خالہ مجھے بٹھائے سمجھا رہی تھیں۔

میں جو ہر پرچے میں بارہ تیرہ نمبر لے کر بھی اگلی جماعت میں بھیج دی جاتی تھی۔ اماں کی جانوروں کے باڑے والی بات سمجھ گئی۔ اس بار اچھے نمبروں سے پاس ہوئی۔ کیسے نہ پاس ہوتی۔ میرے پرچوں سے چند دن پہلے ہی دادی نے ابا کو سکھا دیا کہ بس بہت ہوگیا اسکول۔ گھر کے کاموں میں لگے اب یہ۔

ابا نے میری طرف منہ کر کے کہا "گھر بیٹھ جمیلہ!"

اس نے بستہ لیا اور شکیل جو گھنٹی پر گھنٹی بجا رہا تھا کی سائیکل پر جا کر بیٹھ گئی۔ ابا نے وہیں میری چٹیا پکڑی اور دے کر زمین پر پٹخا۔ میں بھی پنجے کھاتی رہی لیکن اسکول ضرور آئی۔ مجھے مار پڑتا دیکھ کر شکیل تو سائیکل بھگا کر دکان پر چلتا بنا تھا۔ وہ تھا ہی اماں کی طرح بزدل۔ ان ہی کی طرح رل رل کر مرے گا ان شاء اللہ۔ میں پیدل اسکول گئی۔ واپس گھر آئی تو سیدھی کچن میں گھس گئی۔ روٹی پکانے کا دادی کا وزنی لوہے کا چمٹا آگ پر رکھ دیا۔ اور لے جا کر دادی کی آدھ کٹی ٹانگ پر رکھ دیا۔ دادی نے ایسی چیخ ماری جیسے اماں نے بچے کے پیٹ میں ہی مر جانے پر ماری تھی۔

"عقیل کے پاس ویلڈنگ مشین ہے گردن کے آر پار کردے گا۔ شکیل نیلا تھوتھا اپنے بکس میں چھپا کر رکھتا ہے۔ کسی دن چپکے سے کھلا دوں گی۔ نیلی ہو کر بھی نہیں مرے گی۔ اگر ابا نے آج مجھے مار بھی دیا تو عقیل اور شکیل تو ہیں۔"

اللہ بخشے مجھے جب بھی مر جاؤں۔ دادی اپنی تکلیف بھول بھال مجھے گھور رہی رہی۔ نیلے تھوتھے سے ڈرتی دادی تایا کے گھر جا ٹکی اور جلد ہی قبر میں۔

لو جی یہ ہوئی نا بات۔ میرے پاس جو جمع جتھا تھا میں نے اس کی جلیبیاں منگوائیں۔ اور جنازہ اٹھنے سے پہلے بچوں میں تقسیم کروادیں۔ اماں کہا کرتی تھی۔

"تمہاری دادی قوم نوح سے ہے۔ سات نسلیں مار کر مرے گی۔" سات کا تو پتا نہیں لیکن اماں کی نسل ضرور مار کر مرنے والی تھی دادی۔

پھوپھی نے کہا "اماں کے لوٹے سے سب نہانا۔ خدا سب کو ایسی صحت اور عمر دے۔"

میرے کان میں جیسے ہی بھنک پڑی میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ لوٹا چھپا دیا۔ دو دن کافی ڈھونڈ پڑی لوٹے کی۔ پر لوٹا مل کر نہیں دیا۔ ابا تو وہ بین کر کر کے روئے کہ ہم اپنی اماں کے مرنے پر نہ روئے ہوں گے۔ ابا کو میں نے میت کے پاس دانت کچکچاتے دیکھا۔ شاید اس کی بھی حسرت تھی، دادی کی گردن نوچ کھانے کی۔ ویسے دادی کی ہم عمر بوڑھیوں نے دادی کو نیک ترین بنا کر کفنایا۔ وہی دادی کے چہرے پر ڈھونڈ کر نور لائیں۔ دیکھا۔ ہم سب زندگی ہی نہیں موت کے ساتھ بھی منافق ہوتے ہیں۔ اچھا ہی ہو جو روح کا فرشتہ روح لے جاتے ہوئے ایک ٹھپہ بھی پیشانی پر لگا جائے۔ "نیک بخت"۔۔۔ "بد بخت"۔

دادی کے مرنے سے آزادی سی آزادی تھی۔ میں نے اسکول میں سب کو ڈانس کر کے دکھایا۔ ابا دوسری شادی کرنے کے لیے ایسے تیار ہوگئے جیسے ان کی شادی تو طے تھی۔ بس اماں کی موت ٹل رہی تھی۔ میری بات تایا کے گھر پکی کردی۔

خالہ نے خوب اکسایا کہ اپنے نانکے گھر کو بھاگ جاؤ جمیلہ۔ لیکن ماں جئی تھی تو کیسے بھاگ جاتی۔ اتنی ہمت نہیں تھی۔ عقیل جہادی گروپ کے ساتھ نکل گیا تھا۔ جانے سے ایک دن پہلے اس نے ابا کی گردن دبوچ لی تھی۔ جب ابا مجھے اماں کی طرح مار رہے تھے۔ عقیل نے گھونسے مارے، گردن دبوچی اور جہادی گروپ کے ساتھ کشمیر بھاگ گیا۔۔۔ "دھگوڑا۔۔۔ تو کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔۔۔ تو اونچی پہاڑی سے گر کر

مرجائے گا۔ شہید نہیں ہوگا... تیری لاش کھائیوں میں سڑتی رہے گی' مٹی نہیں بنے گی... تجھ گند کو فرشتے کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ نہ حساب کے نام پر نہ سزا اور سوال کے نام پر۔ جو گھر کا جہاد چھوڑ کر باہر بھاگے' وہ بے شہید ہو کر مرے۔" میں نے اس کو بددعا دی۔

شکیل اللہ مارا عورتوں سے بھی بدتر تھا۔ میرے کان میں گھسا کہتا رہا کہ "چپ چاپ تایا کے گھر شادی کرلے۔ ورنہ ابا ہم دونوں کو مار دے گا۔"

توبہ کتنی بیاری تھی کی شکیل کو اپنی جان اور مجھے بھی۔ میرے سر کی کھال نظر آنے لگی تھی۔ رنگ کولتار اور ہاتھ بھدے لعنتی ہوتے جارہے تھے۔ میں شیشہ دیکھتی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میں تیزی سے "اماں" بنتی جارہی تھی۔ مجھے نفرت تھی ماں جیسی بننے سے۔ نفرت سے زیادہ خوف... خوف سے زیادہ اور خوف...

آپا مرتے دم تک ہم سے مل نہیں سکتی تھی۔ شکیل زنانہ ابا کی گردن دبوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میری استانی نے میرا سر کھالیا تھا کہ "جمیلہ! باپ ہے وہ تمہارا۔ قربان ہوجاؤ اس کی رضا پر۔ صبر کرو! خدا اجر دے گا۔"

مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ "صبر کروں اور اجر کا انتظار کروں یا جبر کروں اور صبر سمیٹ لوں۔"

☼ ☼ ☼

میری ہونے والی سوتیلی ماں "ابا کے خاندان کی دو بار کی بیوہ تھی۔ ہر دوسرے دن آجاتی۔ شکیل کہتا۔

"پھلجھڑی" ہے۔ رونق رہے گی گھر میں۔ ایسی عورتوں کو تو وزارتیں سنبھالنی چاہئیں۔ لیکن ہمیں کیا محلے سنبھالے یا وزارتیں۔ ابا کو ایسی ہی عورت ملنی چاہیے جو اگر ایک جوتی کھائے گی تو دس خود بھی مارے گی اور دوسرے مردوں سے پڑوائے گی بھی۔"

ایک رات کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی... دیکھا تو وہ بھینسا میری چارپائی کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے وہ چیخ ماری کہ ڈر گیا۔ بھاگ کر کمرے سے نکل گیا۔ منحوس مارا شکیل چیخ سن کر بھی دبکا رہا۔ پورا اماں پر گیا تھا۔ ہمت کرکے کمرے سے باہر جھانکا تو تایا تائی اور وہ بھینسا سر جوڑے بیٹھے نظر آئے۔

اماں کہا کرتی "میری شادی میں یہ لمبا تڑنگا تھا۔" اس لمبے تڑنگے کی پہلی شادی میں ہمیں بھاگی پھرتی تھی۔ جس کی دلہن کو بعد میں مرگی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ یہ کہتے رہے دلہن مرگی کی مریض ہے۔ دلہن والے کہتے رہے "مرگی زدہ کردیا معصوم کو"۔ جس نے جو بھی کہا بہرحال لڑکی کسی ایک دورے کا اثر لے گئی اور چل بسی۔ دوسری نے طلاق لے کر جان بچائی۔

صبح ابا کے کمرے سے مٹھائی کا ڈبا ملا۔ یعنی تکبیر پڑھی جانے والی تھی۔ شام کو پڑوسن خالہ بھاگی آئیں۔

"تمہارے ابا نے مجھے جہیز کے رضائی گدوں کے لیے پیسے دیے ہیں۔ بھاگ جاؤ جمیلہ... بھاگ جاؤ..." وہ بے چاری رونے لگی اور میں بھی۔

"آؤ۔ میں تمہیں تمہارے نانا نانی کے چھوڑ دوں۔ اسی جمعہ تمہارا نکاح ہے۔"

میں اور رونے لگی۔ کیا کروں کہاں جاؤں۔ کم بخت میری ہی کمی تھی دنیا میں آنے کی۔ میں خلیفہ تھی یا سلطان جس کا دنیا میں آنا بہت ضروری تھا۔ کس قوم کی کمان سنبھالنی تھی میں نے' جو مجھے عرش سے فرش پر اتار اگیا۔

خالہ نے شکیل کو بلوایا اسے سمجھایا۔ درفٹ وہ تو الٹا خالہ پر چڑھ دوڑا۔

"خالہ! آپ کیوں اسے الٹی پٹیاں پڑھا رہی ہو؟"

خالہ بے چارگی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ رات کو شکیل سو گیا تو میں نے زیور نکالے لیکن پھر ان پر تھوک کر واپس رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

میرے نانا نانی کا گھر داتا دربار کے پیچھے گھوڑا اسپتال کے آس پاس کہیں تھا۔ چند ایک بار بہت چھوٹے

ہوتے تو حویلی دیکھی تھی۔ اور اماں بھی بتایا کرتی تھی کہ بہت شاندار حویلی ہے تمہارے نانا کی۔ ویسے مجھے اماں کی باتوں پر ایسا کوئی یقین نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی کہا کرتی تھی کہ میرے نانا گبھرو جوان تھے۔

ہم حویلی آگئے۔ لیکن کہاں کی حویلی اور کہاں کی شان۔ میں نے کہا نا اماں کو عادت تھی جھوٹ بولنے کی۔ وہ حویلی تھی یا انسانوں سے بھری، گلی سڑی، بدبودار، ڈربوں سے اٹی "بستی"۔ جو ابھی تک کسی عذاب سے تباہ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ شاید اس بستی کو "عذاب" کا مستحق بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔ مجھے تو ایسی ہی پھٹکاری ہوئی "بستی" ہی لگی وہ۔

پھر یوں ہوا کہ خالہ تو خود پریشان ہو گئی وہاں آکر۔

"تمہاری اماں کے ساتھ ایک بار آئی تھی۔ لیکن تب تو اچھی خاصی حویلی تھی۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائیں۔ کس کے کمرے سے، کس گلی سے، کس سیڑھی سے، کس چوبارے کو پار کرکے۔ کس طرف کو نکلیں۔ خیر ہوا ان دو بڑھیوں کی انہوں نے ماں جی کو پہچان لیا۔ خالہ نے وقت ضائع کیے بغیر سب کچھ کہہ دیا۔ اور پھر تو جیسے بھونچال اٹھا اس حویلی نما بستی میں۔

کونے کھدروں، سرنگوں، ڈربوں، چوباروں، چھجوں سے وہ لمبے، چوڑے، پلے، بوڑھے، لاغر، جوان، مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں، بچے، گود کے بیٹ کے، ایسے نکلے جیسے بگل بجا ہو کہ آؤ آؤ۔ نک چڑھی باندری کا تماشا دیکھ لو۔

"اے یہ بھاگ آئی کیا؟"

اس بڈھی کا کانوں کا مسئلہ نہیں تھا اسے جسکے کا مسئلہ تھا۔ دس بار اس کے کانوں میں گھس کر بتایا گیا تھا کہ کیا چل رہا ہے۔ پر وہ ہر دو منٹ بعد مجھ پر نظر ٹکا کر چلانے لگتی۔

"اے یہ بھاگ آئی کیا؟" (درفٹ میرا)

"اس کا باپ تو ہمیں مار ہی دے گا۔" (کم بخت ماری میں)

"اے منے بھاگ کر جائیو پھاٹک کا کنڈا کس دیو۔" (مرن جوگی)

وہ گاہے بگاہے چلاتی رہی۔ اس کی پھٹی ہوئی آواز دادی کی آواز سے مشابہ تھی۔ ایک بڈھے نے آگے بڑھ کر بڈھی کے دونوں شانے ہاتھوں میں دبوچ کر اس زور سے جھنجھوڑا کہ بڈھی مرونڈے کی طرح چرمرا گئی۔ شاید یہ اس کے لیے خاص گھنٹی تھی جس کے بجتے ہی خیر سے بڑی بی رات تک سہمی بیٹھی رہی۔ لیکن باقی حویلی والوں کو نئی فلم مل گئی۔ دیکھنے، سننے، ہنسنے کے لیے۔ ساتھ ساتھ نمکو، چپس اور پان بھی چلتے رہے۔ دادی ٹھیک کہتی تھی۔ ہم نٹنی کی اولادیں ناٹک کرنا خوب جانتے ہیں۔

میرا ابھی ناٹک جاری تھا...... ہاؤس فل شو رہا۔

خالہ پریشان سی پریشان ہوئیں کہ پلو سے گیلی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ تو مجھے ان کے حوالے کرنے آئی تھی۔ ان کا اپنا دم ابا کا نام سن کر نکلا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اماں کا دم تو بہت دیر بعد نکلا۔ ہاں شاید تھوڑی سی بہادر تھی اماں۔ جان کو کافی دیر تک جان سے لگائے رکھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ بول پڑھوا دو ابھی کے ابھی، پھر کیا کرلے گا وہ۔"

یہ آواز کسی عورت کے منہ سے نکلی تھی۔ ظاہر ہے عورتیں ہی ایسی بزدلانہ باتیں کرتی ہیں۔ پھر خیر سے سب کے منہ سے یہی آواز نکلی۔

"چلو بھئی بچوں جاؤ یہاں سے۔"

کسی نے کہا۔ اب خیال آیا تھا انہیں پرے کرنے کا۔ مجھے بھی اندر کہیں بھیج دیا۔ جہاں چھوٹا بڑا ہر وہ جو بڑوں کی پنچائیت سے پرے تھا وہ پنچائیت لگا کر بیٹھا تھا۔

چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ مولوی صاحب آگئے۔ میں نے اپنی گندی سی اردو کی لکھائی میں اپنا نام "بنت دینا" لکھ دیا۔ کسی نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ بچی نے لکھا کیا ہے۔ خالہ نے اچھی خانہ پری

کروائی تھی۔ دو ہزار جیب خرچ۔ دو لاکھ حق مہر اور طلاق کا حق میری طرف۔ لڑکا اماں کے چھوٹے چچا کے منجھلے بیٹے کا بیٹا تھا۔ خالہ مجھے سمجھا گئیں کہ نکاح ابا کی وجہ سے ضروری تھا۔ میں خوب دل لگا کر پڑھوں۔ رخصتی وہ دھوم دھام سے اپنے گھر سے کریں گی۔

میں اس رات ڈٹ کر سوئی۔ شام ہوتے ہی ابا' تایا اور وہ بھینسا آئے ایک دو غنڈے ٹائپ آدمی لے کر۔ ابا کو صرف شک تھا وہاں میرے ہونے کا۔ انہوں نے جب میرا پوچھا تو سسر جی نے نکاح نامہ آگے کر دیا۔ ابا تو آپے سے باہر ہو کر ماں کی گالیاں دینے لگے۔ تایا نے تو فوراً" کہہ دیا کہ ہم ایسی آوارہ صفت لڑکی کو نہیں جانتے۔ گھنٹوں میں نکاح پڑھوا کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے کس کا گند تھا جو میرے بھائی کے سر تھوپا۔ ایسی لڑکیاں' ہمارے خون کی پیداوار نہیں۔ خوب بھونک کر گئے۔ ساری نانیوں' پرنانیوں' نانوں' پرنانوں کو گالیاں نکال کر گئے۔

شکیل بھی آیا' زنانہ بک جھک کر چلا گیا۔ خس کم جہاں پاک۔

میرے سسر مجھے اسکول چھوڑ دیتے۔ لے بھی آتے۔ صبح مجھے ایک نان اور چائے کا پیالہ مل جاتا ناشتے میں۔ پھر رسک اور چائے۔ پھر صرف چائے۔ پھر وہ بھی گئی۔ جسے زیادہ بھوک لگتی وہ دربار چلا جاتا لنگر کھا آتا۔ جہاں ساری بستی والے جاتے تھے۔ میں بھی لنگر کھانے چلی جاتی۔ شروع شروع میں پیدل چلتے دربار دور لگا۔ پھر وہ نزدیک آتا گیا۔ پھر تو وہ بالکل ایک ہاتھ کی دوری پر رہ گیا۔ ہم یوں جاتے' کھاتے' اور گھر آجاتے...... بس اتنی ہی مشقت......

سفیدا ہر وقت اپنے کبوتروں اور دوسری چھتوں کی کبوتریوں یعنی چھوکریوں پر نظر رکھتا۔ نام نہ جانے کیا تھا اس کا۔ سفیدا ابھی یوں کہ بال تھے اس کے ہلکے بھورے۔ بھنوؤں کے بھی۔ جیسے سردخانے کا مردہ۔ گورا رنگ جیسے سارے جسم پر پھلبہری پھیل کر پھل گئی ہو۔ وہ اس بستی کا سب سے خوب صورت "دکھکھا" اور میں اس کی کھکھی۔

اماں بتایا کرتی تھی کہ نانی کے بیٹے ہو ہو کر مرجاتے تھے۔ ایک اللہ ماری اماں بچ گئی۔ اماں کی کارکردگی یہاں بھی صفر رہی۔ جب لڑکے ہو ہو کر مرجاتے تھے تو اماں کو کیا پڑی تھی زندہ رہنے کی۔ نہ وہ آتی نہ ہم آتے نہ ہم آتے نہ "میں کھکھی" بنتی۔

جب میں نے تنگ و تاریک ڈربوں میں گھسنا شروع کیا۔ تو مجھے نت نئی باتیں بتائی جانے لگیں۔ کہ جہاں میں بیاہی ہوں ارے وہی سفیدے کے وہ میرے نانا نانی کا گھر ہووے تھا۔ دونوں آگے پیچھے مرگئے تو اماں نے اپنے چچا کے بیٹے کو دے دیا۔"

"دیا نہیں تھا بنو! تمہاری اماں غم میں ہووے تھی۔ ان کم بختوں نے اس دکھیاری سے غم میں انگوٹھا لگوالیا۔"

تیسری نسل آباد تھی اس حویلی میں۔ کچھ باقیات پہلی نسل کی بھی موجود تھی جو لٹے پٹے آئے تھے۔ اور اس حویلی کے کمروں' دالانوں' برآمدوں' احاطوں میں مقیم ہوگئے تھے۔ چھوٹے گھرانے' بڑے بڑے کنبے بن گئے۔ حویلی بستی بن گئی۔ حد تو یہ کہ یہ چھ سات فٹی پرچھتیاں تک کنبوں سے آباد تھیں۔ کہیں فلاں کے لڑکے کی فلاں بہو آباد تھی۔ کہیں نجانے کس پھوپھا کی بیوہ جوان پوتی کے ساتھ۔ کہیں اماں کے تایا' چچا کی آل اولاد' کہیں کوئی کہیں کوئی۔ اتنے لوگ تھے اتنے کنبے... اتنے بچے..... اتنے گھر جیسے ہتھیلی بھر زمین پر کسی نے جھاڑو کے تنکے بکھیر دیے ہوں۔

خدا جانتا ہے مجھے تو شکلیں یاد ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ کہاں ان کے نام یاد رکھتی۔ اور خدا یہ بھی جانتا ہے کہ مجھے جانا کہیں ہوتا میں گھس کہیں جاتی۔ ہوتا یوں کہ اوپر کی چھت کی پتلی گلی سے دو سیڑھیاں نیچے اتر کر دو تین گلیاں پار کرکے' ایک گھر کے پیچھے سے جوان کا یا اور چی خانہ بھی تھا' سے گزر کر نیچے والی سیڑھی پر آتی اور نیچے کی سرنگ میں گھس جاتی۔ اس سرنگ میں کم و بیش آٹھ گھر تھے۔ ایک گھر

تو اباوالے گھر میں جو بیٹھ تھا اس جتنا تھا۔ وہیں کمرے میں غسل خانہ، ایک طرف چولہا، اور دوسری طرف کونے میں دو چارپائیاں اوپر نیچے رکھی تھیں۔

ان بستی والوں کو پرندہ بانی کا بھی بہت شوق تھا۔ قید کرکے رکھنے کے شوقین تھے۔ آقا بننے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی ان میں۔

ویسے میں سفیدے، ہوردں کی بات کررہی تھی۔ تو سب نے اچھی غیرت دلوائی کہ جی ان کا حصہ ضبط کر کے بیٹھ گئے ہو۔ اب بیٹی آئی ہے دینا کی۔ حصہ دوا سے اس کا۔ دوا سے اس کا گھر۔ رہے وہ اپنے گھر میں۔

سفیدے ہوروں نے سوچا کہ نکاح نہ کیا تو خاندان والے جتا ہی دیں گے کہ "بٹیا مزے سے رہو۔ نانا نانی کا گھر تھا اب تمہارا ہے۔"

کسی کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بات تو صرف گھر رکھنے کی ہو رہی تھی کہ لڑکی کو تم سنبھالو۔ ان کی اماں کا گھر بھی سنبھالا ہے نا۔"

انہوں نے سوچا، دو بول ہی پڑھوانے ہیں نا، سفیدے سے پڑھوا دیتے ہیں۔ کسی اور نے اپنے لڑکے سے پڑھوا دیے تو مکان سے بھی جائیں گے۔

"نکاح اور اس سفیدے سے۔" بوا کی بیوہ بیٹی کی لڑکی ہنسی۔ "اسے تو ہم ہش ہش کر کے بھگا دیتے ہیں۔ جہاں دو لڑکیاں دیکھتا ہے۔ ہاہا۔ بس اب خود ہی جان لینا۔ کھکھی تو ہو ہی گئی ہو۔ سفیدی بھی ہو جاؤ گی۔"

☆ ☆ ☆

نویں جماعت میں نے پاس کرلی۔ ابا نے دوسری شادی کرلی۔ شکیل کسی دوست کے ساتھ رہنے لگا۔ شکیل اگر میرے لیے کھڑا ہو جاتا تو مجھے ایسے ہجرتی خاندان میں آکر نہ رہنا پڑتا۔ جو سب کچھ غصب کر کے بھی بھوکے ہی تھے۔ جو ایسے خالی ٹین ڈبے تھے جن میں تازہ ہوا تک نہ باسی اخلاق۔ سب کے سب کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے پھر بھی ننگے۔

مرد، بڑے بوڑھے، ہٹے کٹے گھروں میں گھسے رہتے۔ کچھ کبوتر پالتے کہ کبوتر نہ ہوگئے عربی گھوڑے ہوگئے۔ پھاٹک سے باہر چارپائیاں بچھا کر تاش کھیلتے، حقہ پیتے، گالی گلوچ، تانکا جھانکی کرتے۔ کوئی ایک آدھ سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا۔ کسی ایک کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ گھروں کی باگ دوڑ عورتوں کے ہاتھوں میں تھی۔ کچھ صبح ہی گھروں سے کام کے لیے نکل جاتیں۔ کچھ گھر بیٹھے کرتیں۔ لڑکے چھتوں پر چڑھے رہتے۔ لڑکیاں کھڑکیوں، چوباروں میں ہمہ وقت ٹنگی رہتیں۔ جیسے گھروں میں نہیں منڈی کے چوباروں میں کھڑی ہوں۔ گجروں اور گھنگروؤں کی چاہ کو دبائے بات بے بات ہنسی جاتیں خیر ہنستیں تو میری جماعت کی لڑکیاں بھی بہت تھیں۔ لطیفے سناتیں، ایک دوسرے پر پانی پھینکتیں، چوٹیاں کھینچتیں، چٹکیاں بھرتیں۔ پھر بھاگ بھاگ کر ایک دوسرے کو پکڑتیں۔ میں ہونقوں کی طرح ان کی شکلیں اور حرکتیں دیکھتی۔

"جمیلہ! ہنسا کرو اور نہیں تو بول ہی لیا کرو۔" استانی جی کہتیں۔

میں بولتی تھی۔ اور جو میں بولتی تھی اسے سننے والے کان کسی کے پاس نہیں تھے۔ جماعت میں بیٹھتی تو عجیب سا لگتا پھر سوچتی۔

"ارے کہاں یہ ننھی منی بچیاں.... کہاں میں عورت.... میرا یہاں کیا کام...."

میں نے اسکول چھوڑ دیا۔

پڑوسن خالہ آئیں۔ ادھر ادھر کے بیماری زدہ دبلوں، نکموں، تاش کھیلتوں کو اکٹھا کیا۔ پنچائیت لگائی۔ ویسے یہ زیادتی تھی جو عورتیں گھر سنبھال رہی تھیں۔ پنچائیت بھی انہیں ہی سنبھالنی چاہیے تھی۔

یہ کیا بات ہوئی کہ مرد "بے کار" ہو کر بھی بدحال نہیں ہوتا۔ پنچائتوں میں اسے پھر "سردار" بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ عورتیں "کار آمد" ہو کر بھی "ناکارہ" ہی رہتی ہیں۔

"یہ کیا تماشا کیا تم لوگوں نے۔ زبان کا پاس ہی رکھ

لیتے۔ اتنی سی بچی پر کچھ رحم کرتے۔ اور نہیں تو دنیا دکھاوے کو ہی اسے دلہن بنا دیتے۔ کوئی باجے گاجے کر لیتے۔" خالہ بھڑک بھڑک جارہی تھیں۔

سب جواب دینے کے بجائے خباثت چھپا کر سہلانے لگے۔ کئی مردوں نے تو ایک دوسرے کو آنکھ تک ماری۔ ہونہہ..... جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ سفیدا میرا شوہر بن گیا۔

☆ ☆ ☆

تیسری منزل پر جہاں اس کے کبوتروں کا پنجرہ تھا۔ وہیں پانچ چھ فٹی جگہ خالی پڑی تھی۔ تین اطراف دیواریں 'ایک طرف ٹاٹ کا پردہ۔ ان چاروں پر ٹین کی چھت اور بنا چوکھٹ دروازے کے۔ "کمرہ" نئی دلہن جمیلہ کو دے دیا گیا۔ میں باقاعدہ مسز کھکھا بن گئی۔ بٹیا سے بو' اے دینا کی گڑیا رانی سے "اے دلہن 'اری دلہن' سفیدے کی دلہن بن گئی۔ مجھے مبارک ہو میں دلہن بن گئی۔

"اماں باوا اندھے تھے یا تم نے کوئی گل کھلایا تھا؟" پڑوس کی لڑکی پوچھ رہی تھی۔

"اماں باوا کا تو پتا نہیں۔ ہاں پیدا ہونے کا گل ضرور میں نے کھلایا تھا۔" میں نے گردن کی چھلی کھال کو دوپٹے سے چھپا کر کہا لیکن لڑکی وہ بھی سیانی تھی۔ مسکرا دی۔

"اس حویلی کے سارے مرد عورتوں کا کھاتے ہیں اور عورتوں کو بھی۔"

سفیدے نے مجھے بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔

سفیدے کی اماں روز صبح حویلی کی دوسری عورتوں کے ساتھ نکلتی اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر کام لے کر آتی۔ کبھی ستارے موتی ٹانکنے ہوتے 'کبھی اونی سوئیٹروں کے ڈھیر کے ڈھیر ادھیڑ کر گولے بنانے ہوتے۔ کبھی ہوٹلوں کی منوں سبزی کاٹنی ہوتی۔ اور کبھی پاپڑ تل کر انہیں شاپر میں پیک کرنا ہوتا۔ سارا دن گزر جاتا اور پتا بھی نہ چلتا۔ اور کیا چاہیے تھا مجھے۔

مہینوں بعد شکیل بھی آجاتا اور چند ہزار پکڑا جاتا۔ وہ پڑھ بھی رہا تھا اور دو دو نوکریاں بھی کر رہا تھا۔ بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک بار میرے پیر پکڑ کر معافی مانگنے لگا۔ میں نے جھٹ معاف کر دیا۔ اور کیا کرتی۔ جو کر سکتی تھی وہ کر دیا۔

کئی بار شکیل نے سفیدے کو ساتھ لے جانا چاہا کہ "آؤ کسی کام پر لگا دوں۔" پر سفیدا کہتا تھا کہ اپنی پک اپ لے گا یا جنرل اسٹور کھولے گا۔ شکیل کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ اسے پک اپ یا اسٹور کے لیے دے دیتا۔ میری ساس نے کہا کہ لڑکی کو جہیز نہیں دیا تو چلو کوئی ماں کا زیور ہی لا کر دے دو۔ ہونہہ..... جیسے میرا تھا نا ان کا بیٹا کہ میں ماں کے "سونے" میں تولتی۔ گھر سے بھاگتے ہوئے میں اماں کا زیور ضرور لے آتی اگر وہ دادی کے قبضے میں نہ رہا ہوتا۔ وہ زیور دادی کے لمس سے پاک ہوتا تو وہ اب میرے پاس ہوتا۔ دادی سے یاد آیا میری کوئی دور پار کی دادی ساس آتے جاتے میرے کان میں بہت خوش ہوتی تھی۔

"اری دلہن بات سنو!"

میں نے ایک دو بار سن لی۔ پھر چپکے سے نکل جاتی۔ بات ہی ایسی ہوتی کہ میرا خون جلا دیتی۔

ایک دن یہی دادی بیٹھی تھی میلاد میں۔ سب بیٹھے چاول کھا رہے تھے میں نے سفیدے سے کہا' دادی مجھ سے پوچھتی ہیں کہ نہ انڈا دوں نہ بچہ۔ تم ہی انہیں بتا دو۔"

سفیدے نے سب کے سامنے گرم چاول میرے منہ پر دے مارے اور رات کو گھونسے۔ مار لو..... جتنا جی چاہے مار لو۔ نہ تم خود روکو گے نہ تمہیں کوئی روکے گا۔ باپ سے کھائی تھی نا تو شوہر سے کھانی بھی بنتی تھی۔ بیٹی بن کے پچی تھی تو بیوی بن کے بھی وہی رہنے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

بستی میں تازہ تازہ میرے جیٹھ کی مرگ ہوئی تھی۔ پانچ لڑکیاں چھوڑ کر مرا تھا۔ رات بھر جوا کھیلتا' دیسی شراب پیتا' دن میں پڑا سوتا رہتا۔

جوئے کی ہی کسی لڑائی میں کسی نے پیٹ میں دو گولیاں ماردیں۔ جب لاش آئی تو بھابھی مزے سے سکتے میں چلی گئی۔ بچیاں کہیں اندر باہر کھیلتی رہیں۔ بھابھی کا سکتہ میت کے اٹھنے کے بعد تک قائم رہا۔ میری دادی ساس اور اس کے ساتھ کی بڈھیوں نے یہ رکھ رکھ کر اسے مارا۔ اس کے بال نوچے۔ کہ رولے مردودنی۔۔۔ رو۔۔۔ رو۔۔۔

پر وہ نہ روئی۔ دکھ ہوتا تو روتی۔ پھر ایسے شوہروں کے مرنے کا دکھ ہوتا کسے ہے۔ جنازہ اٹھا۔ رات ہوئی اس نے چپکے سے سکتہ توڑا۔ ایک پلیٹ چاول کی اٹھائی اور کمرے میں بند ہوگئی۔ صبح میں نے اسے بے سدھ سوئے دیکھا۔ صبح افسوس کرنے والیاں آ آکر اس کے گلے سے لگیں اور وہ دو چار چیخیں مار کر پھر سکتے میں چلی گئی۔

اتنی ذہین اور مکمل بیوہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ دل چاہا' تالیاں بجاؤں' لیکن بستی والے تالیاں بجانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"اے توبہ! یہ تو پھر سکتے میں چلی گئی۔ آج تو کوئی رونا پیٹنا کرلیتی۔ اس کا سائیں قبر کی مٹی سے مٹی ہو رہا ہے۔ یہ رو کر نہیں دے رہی۔ کوئی مرے کوئی جیے انہیں بھیترے۔" دادی ساس اپنی ہانکنے لگیں۔

بھابھی سرشام ہی کمرے کی کنڈی لگا کر بچوں کو کھانا کھلا کر فارغ کردیتی۔ مجھے بھی اندر بلا لیتی اور ہلکی آواز میں ریڈیو سنتی۔ یہ سرشام ہی کمرے میں بند ہوجانے والا قصہ بھی بعد میں کھلا۔ بھابھی اپنے منہ سے کچھ نہیں بتاتی تھی مجھے۔ بچی سمجھتی تھی۔

جیٹھ سے چھوٹا' سفید سے بڑا ایک بھائی اور تھا ان کا۔ کبڑا تھا اور ایک پیر بھی ٹیڑھا تھا۔ اچھا خاصا پتھر کے زمانے کا انسان لگتا۔ سب اسے مستو کہتے۔ ہاں لیکن میری ساس اسے مست ملنگ کہتی۔ کئی کئی ہفتے' مہینے غائب رہتا' کبھی کبھار گھر آجاتا۔ جس دن پہلی بار مجھ سے ملا میں اپنے دھیان سے بیٹھی تھی ایک دم سے میرے گلے میں پڑے دوپٹے پر ہاتھ ڈالا۔۔۔

"ہائے! اسے سر پر لے۔"

میں چلاتی ہوئی نیچے بھاگ گئی۔ نیچے والیاں ہنسنے لگیں۔

"ارے اللہ لوک ہے۔ ذرا مست' مست ہے' نماز روزے اور سر ڈھانپنے کو کہتا ہے' درباروں پر رہتا ہے نا۔" ساس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا اللہ لوک ہے۔" میں تو اس رات نیچے کی سرنگ کے کسی کے گھر میں جگہ بنا کر سو گئی۔ اب یہ مستو جیٹھ کے مرنے کے بعد مستقل ہی گھر میں رہنے لگا تھا۔ دن کو غائب رہتا رات کو یاد سے گھر آجاتا۔ روز بھابھی کے گھونسے' جوتے کھاتا پر باز نہ آتا۔ ساس کو بتایا' سسر کو سمجھانا چاہا۔ پر بہت سیدھے تھے دونوں۔ سمجھتے ہی نہیں تھے۔ ایسے واہیات اشارے۔۔۔ پر وہ سب تو پٹی ہوئی تھیں' لات مار کر پرے پھینکتیں۔ بھابھی بھی یہی کرتی۔ پھر سرشام کمرہ بند کرنے لگی۔

"کتا روز رات کو میری جان کھانے آجاتا ہے۔ سارے بے غیرت' بے شرم اسی حویلی میں مرے پڑے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے کہ غیرت شرم ان ہی گھاٹوں پر چھوڑ آئے۔" بھابھی غصے سے باؤلی ہوجاتی۔

یہ درباری مجاور مستو ایک بار رات گئے بھابھی کا دروازہ بجا رہا تھا۔ میں اوپر کھڑی تھی۔ میری طرف دوبار دیکھا پر باز نہیں آیا۔ میں نے بھی چھت پر پڑا ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھا کر تاک کر مار دیا۔ کتے کے پلے کی طرح بلبلانے لگا۔ کھانسی زدہ سسر اٹھے۔ ہش ہش کرنے لگے۔ ساس نے پوچھا کیوں اٹھے۔ بولے بلی ہے۔

"کیوں ہش ہش کرتے ہو۔ چپ رہو بس۔" ساس نے سمجھداری سے کہا۔

آٹھ دس دن بھابھی کو سکون رہا۔ وہ بے چاری سارا

سارا دن فیکٹری میں کام ڈھونڈ کر لے کر آتی۔ پہلے شوہر اس کے پیسے نکال کر لے جاتا تھا۔ دیسی شراب پی کر روئی کا گدا سمجھ کر دھنکتا۔ اب مار سے آرام ملا تو یہ مستو آگیا۔ بھابھی نے لکڑی کے دیمک زدہ دروازے پر لکڑی کے مضبوط تختے لگوائے۔ اندر سے دو دو کنڈیاں لگوائیں۔ موٹا تالا لگاتی اور سو جاتی۔ صبح ہوتے ہی نکل جاتی۔ مردانہ وار کام کرتی تھی۔ ویسے چڑیا کی طرح ڈری سہی رہتی تھی۔

"بڑا ڈر لگتا ہے جمیلہ! دل کرتا ہے بے غیرت بن جاؤں ادھر ادھر منہ ماروں۔"

"مجھے بھی بڑا ڈر لگتا ہے بھابھی۔ پر میرا دل چاہتا ہے ادھر ادھر کے سارے بے غیرتوں کو مار دوں۔"

☼ ☼ ☼

آپا آئی تھی میرے گھر۔ وہی پھوپھی والی عادت۔ شادی تھی کسی کی لاہور میں۔ آپا پھوپھی کے ساتھ آئی تھی۔ پھوپھی ابا اور تایا سے ملنے چلی گئی اور آپا یہاں آگئی۔ حویلی میں گھستے ہی اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ اتنی اچھی حویلی اسے پسند نہیں آرہی تھی۔ البتہ بھابھی سے مل کر آپا بہت خوش ہوئی۔ میں کھانا پکاتی رہی۔ بھابھی کمرے میں آپا سے پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتی رہی۔ پھر آپا آئی اور مجھے گلے سے لگا کر رونے لگی۔ چپکے سے چند ہزار جو خود اس نے جانے کیسے جمع کیے تھے پکڑا دیے۔

کھانے کے بعد میں برتن دھونے لگی اور سفید ا آپا کو اوپر لے گیا کہ آؤ کبوتر دکھاؤں۔ جب سے آپا آئی تھی آپا کے پیچھے پیچھے ہی تھا۔ حویلی کے مردوں کی تو عید ہو جاتی جب کوئی "نئی نکور عورت" مہمان بن کر آجاتی۔ ایک وہی تو بحث نہیں کرتی تھی۔ بھابھی پیچھے لپکی پر ذرا دیر ہو چکی تھی۔

بھابھی نے آخری سیڑھی سے سر نکالا اور دہاڑی۔ اس دہاڑ سے پہلے ہی آپا بری طرح سے ڈر کر سفید ے سے دور ہو چکی تھی۔ ہانپتی کانپتی بے چاری نیچے آئی۔

آپا فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ معصوم کے ہاتھ کانپ رہے تھے برقع پہنتے ہوئے۔ میں تو خود چاہتی تھی وہ چلی جائے۔ کیوں ملنے آئی تھی وہ مجھ سے؟

حویلی کے ڈربوں کے مکین تو قسم کھا کر کہتے تھے کہ نانا جیسا شریف، تہجد گزار، پاک باز اس پورے خاندان میں نہیں تھا۔ اسی نے حکومت سے یہ حویلی الاٹ کروائی۔ دو بھائیوں اور بیوہ بہن کو پناہ دی۔ وہ عورت ہندنی تھی۔ سینتالیس میں کسی مسلمان کے ہاتھوں برباد ہوتی کوٹھے جا پہنچی۔ نانا نے اس کی کہانی سنی تو وعدہ کر لیا کہ بارڈر پار کروا دیں گے۔ وہ کہنے لگی۔

"اب کیا منہ لے کر بارڈر پار کروں گی۔ عزت کی روٹی دے دو میاں جی۔"

منہ اندھیرے دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ نانی نے بڑھ کر استقبال کیا۔ سینے سے لگایا۔ بے چاری حویلی کے ایک کونے میں دبکی اپنی پوجا پاٹ میں لگی رہتی تھی۔ یہی نیکی کی اس نے اور وہ بدنام ہو گیا۔ بات مسجد کے امام اور نمازیوں تک جا پہنچائی۔ کہاں کی تہجد اور کیسی کی شرافت۔ لاکھ صفائیاں دینے پر بھی کوئی نہ مانا تو دل برداشتہ ہو کر لٹک گئے۔

شاید نانا کے بھائیوں کو یہ ڈر تھا کہ ہندنی کو مسلمان کر کے میاں جی نکاح ہی نہ پڑھوالیں۔ پہلی والی کے لڑکے ہو ہو کر مر جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسری والی کے بھی لڑکے ہو کر مر جائیں۔ اگر لڑکے ہو کر نہ مرے تو انہیں مرنا پڑے گا۔ جب ساری حویلی وارثوں کو دینی پڑے گی۔ یوں اگلے پچھلوں نے حویلی سنبھال لی۔ ادھر ادھر کے دور پار کے رشتے داروں کو حویلی کے حصے تھوڑے تھوڑے کر کے بیچ دیے۔ ایسے ہی تو حویلی بستی نہیں بن گئی تھی۔

میں یہ بات کر رہی تھی کہ سفید ا الٹا نانا نانی، اماں شکیل، عقیل کے قصے لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ نہ اپنا بڑا بھائی دیکھتا ہے، نہ باپ اور نہ وہ بدی سی دو بہنیں۔ یہ بھر بھر کر نیازوں کی پلیٹیں آتی تھیں دونوں کے لیے۔ خدا ہی جانتا تھا کہ صبح و شام وہ کون سے ختم شریف دلائے

جاتے اور صرف ان ہی کے لیے پلیٹیں بھر بھر کر آتیں۔ دکانوں پر بوتل لینے جاتیں تو بھر بھر شاپر اپنے دوپٹے کی بکل میں چھپا کر لاتیں۔

ایک تازہ واقعہ تو سنایا ہی نہیں۔ دو چھتیں چھوڑ کر سفیدا اور کبوتری (شادی شدہ) پکڑے گئے۔ اس کے شوہر نے تو وہ بجایا دونوں کو کہ سب نے اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ کر جی بھر کر یہ تماشا دیکھا۔ میرے اور بھابھی کے تو ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔

وہ تو مرنے مارنے پر تلا تھا' لیکن سسر جی نے سفیدے کو کسی جاننے والے کے یہاں دوسرے شہر چلتا کیا۔ اب سکون ہے... سفیدے سے... جمیلہ کو...

میں بھابھی کے کمرے میں سونے لگی۔ ایک رات گرمی بہت تھی۔ کمرے میں دم گھٹ رہا تھا۔ بھابھی تو عزت کے مارے بے چاری تنور میں پڑی رہتی تھی۔ بچیوں کو بھی باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔ مجھ میں تھوڑی دلیری باقی تھی۔ میں اللہ ماری تیسری منزل پر آگئی اور چارپائی نکال کر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی سو گئی اور پھر چیخ ماری اور خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔

میں نے مستو کو پرے دھکا دیا۔ دوپٹا گلے میں پھندا سا بن گیا۔ میں جھٹ کبوتروں کی کابک میں گھس گئی اور اندر سے کنڈا لگا لیا۔ میرے جاتے کبوتر پھڑپھڑانے لگے۔ مستو پاگل کتے کی طرح کابک کے چکر لگانے لگا۔ گالیاں بکتا رہا' دھمکیاں دینے لگا۔ میں نے سر گھٹنوں میں دے لیا اور اونچی آواز میں رونے لگی۔

مستو پچکارنے لگا' بہلانے لگا' باہر آنے کے لیے منانے لگا۔ جیب سے پیسے نکال کر بھی دکھائے۔ میں زمین پر دبکی بیٹھی تھی۔ جسم میں ایسی کپکپاہٹ تھی جیسے ہڈیاں کھال چھوڑ رہی ہوں۔ مستو پھر گالیاں بکنے لگا۔ میں نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ جی ہاں...

...اور اپنے بال نوچنے شروع کر دیے۔

میں کیوں پیدا ہوئی...

جمیلہ تو کیوں پیدا ہوئی...

ناخنوں سے اپنا منہ کھرچنا شروع کر دیا۔ دانتوں سے اپنے بازو کاٹے۔ اس سور نے مجھے ایسا کرتے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ رات کے اندھیرے میں جب کہ مردے بھی اپنی قبروں میں سکون سے سو رہے تھے۔ زندہ جمیلہ کونے میں کبوتروں میں دبکی سسکیاں لے رہی تھی۔ مجھے اماں یاد آرہی تھی۔ پھر فوراً" ہی مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ یہ وہی تھی جس کی چپ کا پھل میں کاٹ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی تھی جو مجھے اس کابک میں بند کر گئی تھی۔ وہی یہ چاہتی تھی کہ مجھے احترام ملے نہ پناہ اور یہ بھی کہ جیسے وہ ہاتھ اٹھا کر تنہائی میں بیٹھی دہائی دیا کرتی تھی میں بھی وہی کروں۔

میں نے دور تک پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر دہائی دے دی۔ میں نے بھی دونوں ہاتھ اٹھا لیے اور ساتوں آسمان ہلا ڈالنے چاہے۔ میں ماں جی بن گئی۔ میرا پھٹا گریبان' اجڑے بال' کانپتا جسم' اس ذرے کی حیثیت اختیار کر گیا جو موجود ہو کر بھی "ناسور" ہی ہوتا ہے۔

"چھپ کر بیٹھی ہے تھو ہے تجھ پر... گونگی رہتی ہے... لاچار بنتی ہے... تھو تھو... ڈرتی ہے... آخ تھو..."

آہستہ آہستہ... جیسے دبے پاؤں ماں جی بنے مجھے یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جو شاید میرے حصے کی وحی تھی ورنہ یقیناً" الہام۔ میں نے ایسی باتیں پہلے سوچیں نہ سنیں۔ میرے جسم کی بوٹی بوٹی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان کانوں نے کان لگا کر کام کی باتیں سنیں۔

"ایمان پاکر تم جیسوں نے کھویا۔ چاہتے ہو اللہ اپنی فوج لے کر آئے تمہاری جنگ لڑنے کے لیے۔ پھر تمہیں خلیفہ کیوں بنایا اللہ نے۔ بچاؤ اور وار ایک ہی ہتھیار سے ہوتا ہے۔ ہتھیار والے جانیں بچاؤ کرنا ہے یا وار۔ تمہارے اعمال کی پوچھ پڑتال ضرور ہوگی اور تمہارے خوف اور بزدلی پر لعنت بھی ضرور بھیجی جائے گی..."

"آدم... آدم نہیں رہے گا تو وہ اس صفت سے

منکر ہوگا جس صفت پر اسے اللہ نے پیدا کیا۔ جس جس صفت سے پیچھے ہٹے گا اس اس صفت کا منکر ہوگا۔ کتنی دیر ہو گئی۔ کتنے زمانے بیت گئے۔ کتنی بستیاں اجڑ گئیں۔ نسلیں ختم ہو گئیں۔ ایک انسان کو اس کی صفات پر قائم رکھنے کے لیے۔

میں ہمہ تن گوش ہو گئی کہ مجھے بتایا جا رہا تھا کہ جنہیں کبوتر سمجھتی ہو جن میں پناہ لیے بیٹھی ہو وہ جلد ہی گدھ بننے والے ہیں۔ اگر ایسے ہی میں پناہ لیے بیٹھی رہیں تو وہ مجھے کمزور جان لیں گے۔ میری آہیں سنیں گے تو ہنسیں گے۔ آنسو دیکھیں گے تو مزے لیں گے۔ پھر وہ آگے بڑھیں گے اور نوچ لیں گے....

مستو اب نیچے جا رہا تھا....

میں اٹھ کھڑی ہوئی اور کابک میں کبوتروں کے بیٹھنے کے لیے رکھی موٹی لوہے کی سلاخ کو زور لگا کر نکالنا چاہا جو آسانی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ٹھیک ہے آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا....

سلاخ میرے ہاتھ میں آگئی.... بہت دیر سے آئی....

گریبان کو گرہ لگائی۔ دوپٹے سے سلاخ کو اپنے ہاتھ پر باندھ لیا اور کابک کا دروازہ کھول کر جھک کر باہر نکل آئی۔ میرا جسم ابھی بھی کانپ رہا تھا۔ بھلے سے کانپتا رہتا۔ چھت کی طرف کی سیڑھیوں کی اوٹ میں مستو ابھی بھی چھپا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کا سر نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ساری رات کابک میں نہیں بیٹھ سکتی۔ ٹھیک جانتا اس نے۔ میرے نکلتے ہی مستو چھلانگ لگا کر اوپر آگیا اور میری طرف لپکا۔ میرا ہاتھ پیچھے کی طرف تھا۔ مستو کے جھپٹتے ہی وہ ہاتھ سامنے آگیا۔

میں نے نئی نئی اڑان پر نکلی چڑیا کی طرح پورے دل سے ہوا میں غوطہ کھایا۔ دونوں پر پھیلائے اور پورے زور سے سلاخ کو مستو کے سر پر دے مارا۔ مستو ادھ کٹے بکرے کی طرح تڑپا اور پیچھے جا گرا۔ پھر میں نے کمر پر مارا۔ اب مجھ پر جھپٹنے کے بجائے وہ کتے کے پلے کی طرح چوں چوں کرتا نیچے بھاگا۔

☆ ☆ ☆

نیچے بڑا کمرہ جس میں سارا کنبہ سوتا تھا۔ جس کے دروازے کو باہر سے کنڈی وہ خود ہی لگا کر اوپر چھت پر آیا تھا میں وہ مرے ہوئے چھپکلی کی طرح ڈھیر ہوا۔ سب ایسے ہڑبڑا کر اٹھے جیسے کسی نے ان کے تلووں پر تیل چھڑک کر تیلی لگا دی۔ ہو۔ یک دم بھگدڑ مچ گئی۔ گالیاں بکتا مستو اپنی ماں کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پیچھے جا کر اس کی دونوں ٹانگوں پر ضرب لگائی۔ سسر نے پیچھے سے آ کر بالوں سے پکڑ کر مجھے پرے گھسیٹا۔ مستو۔ جس کے منہ سے کتوں کی طرح رال ٹپک رہی تھی بھاگ کر باورچی خانے سے بیلن اٹھا لایا۔

بھابھی ہانپتی کانپتی دو دو کنڈیاں کھول کر اپنے کمرے سے باہر آئی۔ نند نے جھٹ دروازہ بند کر لیا کہ حویلی میں سے کوئی اور یہ تماشا نہ دیکھ لے۔

"کیا ہوا جمیلہ؟" بھابھی میری طرف لپکی کہ مستو

بھونکا۔

"اپنے نانے پر گئی ہے۔۔۔ وہ نظر باز تھا یہ خود۔۔۔"

میں نے کمرے میں موجود سب کی طرف دیکھا۔

سسر کی طرف جو مستو کے ہر کرتوت سے واقف تھا۔ ساس جو کئی بار مستو کو چھوٹی بچیوں کے ساتھ چھت پر دیکھ چکی تھی۔ بھابھی کی طرف۔ جو خود کو اور اپنی بچیوں کو بچاتی سر شام کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔

ساس مجھے گھور رہی تھی۔ وہی ساس جو کہتی ہے۔

"کیوں ہش ہش کرتے ہو۔ چپ رہو بس۔" اسی ساس نے گالیاں دینی شروع کر دیں اور کھینچ کر میرے منہ پر چانٹا مارا۔ کیونکہ اسے لگا وہاں میں اکیلی ہوں۔۔۔ ایک۔۔۔ اکیلی۔۔۔

ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے اکیلا ہونا منظور ہے۔۔۔ پر ماں جی نہیں۔۔۔

مستو آگے بڑھا اور بیلن میرے پیٹ میں دے مارا۔ بھابھی نے مستو کو پرے کرنا چاہا' لیکن انیلا' فرزانہ نے بھابھی کو پرے پھینکا۔ ساس نے میری چوٹی پکڑ کر گھمانی شروع کر دی۔

"گشتی کی اولاد کو عزت راس نہیں۔ بھاگ آئی باپ کے گھر سے۔ بڑی عزت والی ہے نا جو بھاگ آئی۔ اپنے محلے میں کیا کیا کر کے آئی ہے۔ کیا ہو گا۔۔۔ اسی لیے باپ بڈھے سے بیاہنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ہر وقت چھت پر ٹنگی رہتی تھی۔ کتنی بار میں نے ساتھ کی چھت کے لڑکے کے ساتھ پکڑا۔۔۔ آج مستو نے پکڑ لیا ہو گا۔" ساس چلانے لگی۔

نجانے کون کون کیا کیا بک رہا تھا۔ میں پیٹ لیے زمین پر دہری ہو رہی تھی۔ بھابھی کی چوٹی بھی ایک نند کے ہاتھ میں تھی۔ مستو مجھے مارنے میرے قریب آیا۔ میں نے سارے دردوں کو پرے دھکیل کر دور گری سلاخ پر جھپٹا مارا۔ پوری قوت سے اس کے پیروں پر دے ماری۔

سسر نے جوتا اٹھا لیا۔ انیلا' فرزانہ مجھ پر ایک ساتھ پل پڑیں۔ ساس اپنے ناخنوں سے مجھے نوچنے لگی' لیکن میں نے سلاخ نہیں چھوڑی۔ سب کو اس کی زد پر رکھ لیا۔

جس وقت ساس نے اپنے دوپٹے کا پھندا بنا کر میرے گلے میں ڈال کر کسا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے ایک ہاتھ سے پھندا ڈھیلا کرنا چاہا کہ مستو آگے آیا اور میرے منہ پر چانٹے مارنے لگا۔

جب ساس پورا زور لگا کر میرا پھندا کس رہی تھی تب ہی میں نے بھی کس کر مستو کے سر پر سلاخ دے ماری۔

سب اس کی طرف لپکے۔ بھابھی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ تقریباً" سارے ہی بستی والے اندر آ گئے۔

"تو تنکی دیکھنے۔" اور کر ہی کیا سکتے ہیں یہ لوگ۔ تماشا لگا سکتے ہیں یا تماش بین بن سکتے ہیں۔ نہ اوپری درجے پر نہ نچلے پر۔۔۔ ہونہہ۔۔۔

میری آنکھیں اندھیرے سے نہیں "سکون" سے بند ہو گئیں۔ اچھا ہے۔۔۔ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔۔۔

☆ ☆ ☆

اماں کبھی سرہانے بیٹھی نظر آتی۔ کبھی سرہاتے۔

اماں یوں ہی آئے دن آتی رہی۔ پھر ایک دن عقیل آیا۔ یہ لمبی داڑھی' نورانی چہرہ' شہید ہوا لگتا تھا۔ گبھرو جوان۔۔۔ پاک باز۔۔۔ ہمارے باپ کا خون نہیں لگتا تھا۔۔۔

"کر آئے جہاد؟"

اس نے سر ہلایا۔۔۔ اللہ جانے ہاں میں کہ ناں میں۔

"ہو گیا کشمیر آزاد؟"

"اللہ کی راہ بہت اچھی ہے جمیلہ۔" وہ مسکرایا بھی۔

میں نے آنکھیں موند لیں۔۔۔ اللہ کی راہ۔۔۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ کی راہ کتنی دل فریب ہے۔۔۔

"جمیلہ چلے گی میرے ساتھ؟"

اگلی بار آیا تو پوچھا میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

"مجھے اپنے پاس رکھوں گا۔ تیرا منہ اپنے ہاتھوں سے دھلایا کروں گا۔ بالوں میں کنگھی کروں گا۔ منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالوں گا۔ لوریاں سناؤں گا۔۔۔ میٹھی نیند سلایا کروں گا۔۔۔"

"سناؤ لوری میں سونا چاہتی ہوں۔۔۔"

اس نے میرا سر سہلانا شروع کر دیا اور حمد پڑھنے لگا۔ مجھے گہری نیند آگئی۔ اس نے میری گیلی آنکھیں اپنی پوروں سے صاف کیں۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ بڑا صدمہ ہوا۔ آنکھ کھلنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس دنیا کا وہی پرانا نظارہ۔ میں نے آنکھیں بند کر لینی چاہیں۔

"جمیلہ۔۔۔ جمیلہ۔۔۔" وہ اس کے گال تھپک رہا تھا۔

جمیلہ کو آنکھ کھولنی پڑی۔ عقیل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں درد تھا، بہت درد تھا، لیکن یہ درد جتنا زیادہ تھا اسے اتنا ہی پیارا تھا۔ اس کا بستر اجنبی تھا۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ کمرے کی دیواروں سے ہوتی ہوئی اس کی نظر کمرے کے باہر تک گئی۔ اس چھوٹے سے کمرے اور باہر کے نظر آنے والے منظر سے اسے یاد آنے لگا کہ بڑے سے کنبے کا یہ چھوٹا سا گھر بھابھی کا میکہ ہے۔

عقیل اس کے گال پیار سے تھپک رہا تھا۔ چند دن ایسے ہی آنکھیں کھلتی بند ہوتی رہیں۔ بھابھی، بچے، عقیل، شکیل گاہے بگاہے نظر آتے رہے۔ دوبارہ اس نے آنکھیں کھولیں تو عقیل گیلے تولیے سے اس کا منہ صاف کر رہا تھا۔ پھر وہ اس کے بال سنوارنے لگا۔ بچیاں اور بھابھی کمرے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ بھابھی تو رو بھی رہی تھی۔

"میں گاڑی کا انتظام کر کے بیٹھا ہوں جمیلہ۔ جلدی سے ٹھیک ہو جا کہ سفر کر سکے۔ باقی تو وہاں جا کر ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کہاں؟"

"میرے گھر۔۔۔ اماں کے گھر۔"

"تمہاری اماں؟"

"مجاہدوں کی اماں۔۔۔ میں نے اماں کی بات مان لی۔ اماں نے کہا جاؤ میری بچیوں کو لے آؤ۔ آپا کے پاس گیا تھا وہ نہیں مانی۔ کہتی ہے، بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی اور تو جمیلہ۔ تو چلے گی میرے ساتھ۔۔۔؟ اماں کا چھوٹا سا گھر ہے۔ روٹی کبھی کبھی ملتی ہے ہمیں۔ ٹھنڈ سے ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔ میری تو پیروں کی دو انگلیاں جھڑ گئی ہیں۔ جمیلہ! وہاں کھانے کو روٹی نہیں، جلانے کو لکڑیاں نہیں، کمانے کو روزی نہیں، پھر بھی وہاں زندگی ہے۔ اماں چھوٹے سے کھیت میں کام کرتی ہے۔ سبزیاں اگاتی ہے۔ ہمیں کھلاتی ہے۔ چلے گی میرے ساتھ؟"

"میں اپنے بچوں کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

عقیل چپ ہو گیا۔ بہت دیر بعد بولا جب بھابھی کمرے سے چلی گئی۔ "اور ان کی ماں؟"

"بھابھی سے نکاح کر لو عقیل۔ انہیں بچا لو۔۔۔"

عقیل کا نورانی چہرہ دھندلا سا گیا۔ تھوڑی دیر لگی پھر وہ دمک اٹھا۔

"ٹھیک ہے جمیلہ۔۔۔ یہ جہاد ہی سہی۔۔۔ تو بس میرے ساتھ چل۔۔۔ وہاں کھلی چراگاہیں اور اونچے پہاڑ ہیں۔۔۔"

"کیا وہاں کے چشموں میں مچھلیاں ملتی ہیں۔۔۔؟"

"میں نے بھی پکڑی نہ کھائیں۔" عقیل ہنسنے لگا۔

"مجھے چشموں سے مچھلیاں پکڑنے دو گے؟"

"ہاں۔"

"اور کشمیری سیب۔۔۔؟"

"سرخ و شیریں۔۔۔"

"اور کشمیری بچے؟"

"غیرت مند اور جرات والے۔۔۔ بڑے پیارے ہیں۔۔۔"

"اور کشمیری بچیاں۔۔۔؟"

"وہ پہاڑوں پر جھٹ پٹ چڑھ جاتی ہیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے میں چلوں گی۔۔۔ ضرور چلوں گی۔۔۔ ہر کشمیری لڑکی کے ساتھ پہاڑوں پر چڑھنے۔۔۔ سرخ و شیریں پھل کھانے۔"

☆ ☆ ☆

بچیاں اور بھابھی گاڑی میں ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔ عقیل میرے ساتھ اندر آنا چاہتا تھا، لیکن میں نے منع کردیا۔ جس وقت میں نے برا پھاٹک پار کیا۔ اسی وقت جس جس کی مجھ پر نظر پڑی وہ میری طرف لپک کر آیا۔ میں نے بستی کی چند عورتوں اور چھوٹی بچیوں کی نگاہوں کو خود کو سلامی دیتے دیکھا۔ انہیں مجھ پر فخر تھا۔ میں ان کا وہ دبنگ ہیرو تھی جو وہ خود نہیں بن سکی تھیں۔

ادھر ادھر سے سب کونے کھدروں سے نکل کر میرے ساتھ ہوتی گئیں۔ اوپر کے چھوٹے گھروں سے گزر کر میں نانا کے گھر آگئی۔ سامنے ہی مستو بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے سر، ہاتھ، پیر پر پٹیاں بندھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چلانے لگا۔

"اماں... اماں... اسے دیکھ... یہ..."

اس کی ماں اس کی دل دہلا دینے والی آواز سن کر باورچی خانے سے نکلی۔ اس کے نکلنے سے پہلے ہی میں نے کمرے میں رکھی لوہے کی الماری کا چھوٹا خانہ چابی سے کھول کر اس میں سے اپنی چادر نکالی تھی، جو ابا کے گھر سے نکلتے وقت میں اپنے ساتھ لیتی آئی تھی۔ یہ اماں کی چادر تھی۔ یہ ان کے پاس ان کی اماں کی نشانی تھی۔

نشانی سے محبت کا یہ سفر تکلیف دہ رہا۔ یہ ایک سہارے کی طرح تھا جو اماں نے ڈھارس کے لیے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر اس چادر سے لپٹ کر رویا کرتی۔ نشانی کے اس سفر کو میں ایک نیا سفر دینے والی تھی... میں نے چادر اوڑھ لی...

میری ساس بکتی رہی۔ "نکل جا حرافہ... اب ہم تجھے پناہ دینے کے نہیں... تو نے کیا سمجھا ہے، ہر بار تو منہ اٹھا کر آئے گی تو ہم تجھے بانہوں میں بھر لیں گے... تیرے گناہ چھپاتے پھریں گے۔ تیری کالک اپنے منہ پر لیپ لیں گے۔ نکلو تم سب بھی یہاں سے کیا تماشا دیکھ رہے ہو... دفعان ہو... نکل..."

میں باورچی خانے میں گئی۔ یہاں ایک ڈبے میں نے کچھ پیسے چھپا کر رکھے تھے جو شکیل دے جایا کرتا تھا مجھے۔ جیسے ہی میں نے وہ نکالے ساس نے جھپٹ لیے۔

"کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیو۔"

بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ تیزی سے ساس کے ہاتھ سے واپس جھپٹ لیے۔

"اماں! تو پرے ہو جا... بھوکی ننگی کو لے جانے دے، جو لینا چاہتی ہے۔"

چادر اوڑھ کر میں اوپر آئی۔ جہاں میرا چھ فٹی کمرہ اور کبوتروں کا کابک تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کابک میں کون گیا تھا... جمیلہ... اور اس کابک سے باہر کون آیا تھا... "میں"...

اس رات میں نے خود کو دوبارہ پیدا کیا تھا... حقیقی خالق کے بعد میں اپنی خالق ہوں...

جس وقت میں کابک کے پاس پہنچی۔ سفید اجو آس پاس کی کبوتریوں پر نظر رکھے کھڑا تھا ایک دم سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ میں آئی ہوں۔ اس نے یہ اندازہ بھی لگا لیا ہو گا کہ میں اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگوں گی۔ باپ کے گھر جانے سے تو رہی میں۔ اب مجھ جیسیوں کا ٹھکانا اور کہاں ہو گا... اسی کا گھر نا۔

"میں بنت جمیلہ" پورے ہوش و حواس میں سلیم عرف سفیدا ولد وزیر احمد کو بقائمی ہوش و حواس طلاق دیتی ہوں۔" میں نے ہاتھ میں پکڑا قانونی طلاق کا کاغذ بھی اس کے منہ پر دے مارا۔ میرے ساتھ آنے والے سارے مجمع کو سانپ سونگھ گیا اور کسی ایک چھوٹی سی بچی نے تالی بجائی۔

جس وقت میں گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ اس وقت بستی کے سب ہی لوگ باہر کھڑے مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

وہ سب نہیں جانتے، لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ انسان اس زمین کے اہل نہیں ہیں... یہ بستی اور ایسی ہر بستی جلد ہی تباہ ہونے والی ہے... جلد... بہت جلد...

☆

ایک ہی مسئلہ تا عمر مرا حل نہ ہوا
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا

شہرِ دل کا جو مکیں ہے وہ بچھڑتا کب ہے
جس قدر دور گیا، آنکھ سے اوجھل نہ ہوا

آج بھی دل کی زمیں خشک رہی تشنہ رہی
آج بھی مائلِ الطاف وہ بادل نہ ہوا

روشنی چھن کے ترے رخ کی نہ مجھ تک پہنچے
ایک دیوار ہوئی یہ کوئی آنچل نہ ہوا

جس کو اک عمر کا ندرانہ دیے بیٹھے ہیں
آج تک اس سے تعارف بھی مفصل نہ ہوا

ان سے ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں پھر ملتے ہیں
زندہ رہنے کا عمل ہم سے مسلسل نہ ہوا

جس پہ رکھنا تھی مجھے اپنی اساس ہستی
اپنی قسمت میں منور وہی اک پل نہ ہوا

منور ہاشمی

تتلیاں

ہماری خواہشیں تو
دل کے باغیچے میں
اڑتی تتلیاں ہیں
کہ جن کے رنگ کچے
اور عمریں مختصر ہیں

فیضان عارف

جگ کے آگے رونا کیا
صحراؤں میں بونا کیا

وقت کی سنگت میں اپنا
ہونا اور نہ ہونا کیا

اشکوں سے شفاف ہوا
چہرے کو اب دھونا کیا

ہم تو یوں بھی تیرے ہیں
ہم پر جادو ٹونا کیا

دل کو دل سے مطلب ہے
پیتل، چاندی، سونا کیا

جس کو پا نہ سکا فاروق
اس کو دل سے کھونا کیا

زبیر فاروق

اک حقیقت بھی اک فسانہ بھی
کتنا فن کار ہے زمانہ بھی

تم سے مل کر ہوا ہے یوں محسوس
تم سے تھا ربط غائبانہ بھی

اطلاع بتا رہا ہوں تمہیں
راہ میں ہے غریب خانہ بھی

سونے والے ابھی نہیں جاگے
قافلہ ہو گیا روانہ بھی

زیست لے آئی ہے وہاں کہ جہاں
سخت مشکل ہے مسکرانا بھی

وہ بھی نازک خیال ہے رفعت
میری غزلیں ہیں عاشقانہ بھی

رفعت سلطان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

کبیرہ گناہوں میں ایک بڑا گناہ کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔

(ابوداؤد)

پہلا حق،

حضرت عمر فاروق نے دانش وروں کی ایک مجلس میں سوال کیا۔

"ایک بچہ جو دنیا میں آتا ہے، اس کا پہلا حق کیا ہے؟"

لوگوں نے مختلف جواب دیے۔ آپؓ نے فرمایا۔

"اس کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کو ایک باشعور ماں ملنا چاہیے۔"

قدیم نصیحت،

حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے دو ہزار دو سو برس پہلے شاہ معر اخطوی نے اپنے فرزند کو جو نصیحت کی تھی اس کی آج پہلے سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس ضعیف العمر بادشاہ نے آج سے چار ہزار سال پہلے سے نوشی کے دوران اپنے فرزند سے کہا تھا۔

"اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تدبیر سے کام لو۔"

آسکر وائلڈ کے اقوال،

آسکر وائلڈ معروف ناول نگار ہونے کے علاوہ ڈراما نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، مضمون نگار، تنقید نگار اور شاعر بھی تھا۔ اسے انگریزی ادب کا سب سے زیادہ خوش گفتار اور بذلہ سنج انسان کہہ سکتے ہیں۔ آسکر وائلڈ کے چند اقوال۔

☆ آج کل لوگ قیمت تو ہر چیز کی جانتے ہیں، قدر و قیمت کسی چیز کی نہیں۔

☆ میں اچھی نصیحت کو ہمیشہ آگے بڑھا دیتا ہوں۔ اچھی نصیحت کا بہترین مصرف یہی ہے۔ یہ کسی کے کام نہیں آتی۔

☆ گناہ ایک ایسی چیز ہے جو اپنے آپ کو انسان کے چہرے پر لکھتا ہے۔ اسے چھپایا نہیں جا سکتا۔

☆ ایک ولی اور گناہ گار میں فرق صرف یہ ہے کہ ولی کے پاس ایک ماضی ہے اور گناہ گار کے پاس ایک مستقبل۔

☆ جو کچھ مقبول ہے، وہ غلط ہے۔

☆ جدید جمہوریت کے خطرناک دشمن صرف اچھے بادشاہ ہیں۔

قابلیت،

موروثی بیماریوں کی تعریف کرتے ہوئے میڈیکل کے ایک طالب علم نے اپنے امتحانی پرچے میں لکھا۔

"وراثت میں ملنے والی بیماریوں کو موروثی کہا جاتا ہے مثلاً اگر آپ کے دادا کے ہاں اگر اولاد نہیں ہوئی تو زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ کے والد کے ہاں بھی اولاد نہیں ہو گی اور عین ممکن ہے کہ آپ کے ہاں بھی نہ ہو۔"

نادیہ۔ گلستان جوہر

اختصاریے،

☆ سکھ بکرا ذبح کرنے لگا تو کنفیوز ہو گیا کہ پڑھنا کیا ہے؟

ایک لمحہ سوچنے کے بعد چھری چلاتے ہوئے جوش

ہے بولا۔ "نہیں۔ بڑھ ڈے ٹو یو۔"

٭ لڑکی آئس کریم کھاتے ہوئے بوائے فرینڈ سے بولی۔ "مجھے کچھ ایسا کہو کہ میرا دل زور سے دھڑکنے لگ جائے۔"
لڑکے نے کہا۔ "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

٭ ایک ٹرک دوسرے ٹرک کو رسّی سے باندھ کر لے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کے ایک سردار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کہنے لگا۔
"ایک رسّی کو لے جانے کے لیے دو دو ٹرک۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکّا

کیا آپ جانتے ہیں؟

- سائنس دانوں نے سب سے زیادہ تجربات شہد کی مکھی پر کیے۔
- پاکستان کے قومی ترانے میں اُردو کا صرف ایک لفظ "کا" شامل ہے۔
- نور جہاں کا مقبرہ خود نور جہاں نے بنوایا تھا۔
- مشہور پنجابی شاعر بابا بلھے شاہ کا اصل نام عبداللہ تھا۔
- غزل کے بہترین شعر کو "بیت الغزل" کہتے ہیں۔
- ہلالِ احمر کا دوسرا نام "ریڈ کراس" ہے۔

شمیم ارشد اعوان۔ واہ برٹن

امتحان کیسے کیسے

ریسٹورنٹ میں ایک صاحب نے کھانا منگوا کر کھانا شروع کیا تو انہیں احساس ہوا کہ اردگرد کی میزوں پر بیٹھی ہوئی بہت سی لڑکیاں یک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ذرا پریشان ہو کر ویٹر کو بلایا اور ان کے بارے میں پوچھا۔ ویٹر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔
"سر! بات دراصل یہ ہے کہ اس ریسٹورنٹ کے برابر میں ہی ایک کمیونٹی ہال ہے جہاں پکانے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ یہ کھانا وہیں سے آیا ہے۔ اگر آپ نے کھانا پورا ختم کیا یا آپ کھانا کھا کر لمبے لیٹ گئے تو یہ لڑکیاں امتحان میں فیل ہو جائیں گی۔"

عندرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

شیر ہوں خاوند نہیں

مجھے خود ایک مرتبہ شیر پالنے کا خیال آیا لیکن پھر سوچا کہ بیوی کی موجودگی میں ایک گھر میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔

ویسے بھی ہماری بیوی کے رعب داب کا یہ عالم ہے کہ اگر شیر چار دن بھی ہمارے ہاں رہ جائے تو اسے مان لوں گا۔ ہوگا یہی کہ ایک دن شیر صاحب الماری پر چڑھ کر بیٹھے ہوں گے اور دُم دبائے تھر تھر کانپ رہے ہوں گے۔ نیچے ہماری بیوی کھڑی ہوں گی اور کہہ رہی ہوں گی۔ "اگر شیر ہو تو میرا سامنا کرو بزدل کہیں کے... شیر بنے پھرتے ہو۔"

اور شیر تھر تھر کانپتے ہوئے کہے گا۔ "بیگم صاحبہ! میں آپ کا خاوند نہیں ہوں جو آپ یوں مجھ پر برس رہی ہیں۔ عزت دار شیر ہوں۔ کچھ خیال کیجیے۔"

(مستنصر حسین تارڑ کی کتاب "الو ہمارے بھائی ہے" سے اقتباس)

عینی سحر۔ ہری پور ہزارہ

ضمیر

بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا بگڑ سکتا
ہوا کا زور تو چڑیوں کے آشیاں تک تھا
مجھے زمین کے مسافر کیا شکست دیتے
میرا ضمیر بلندی میں آسماں تک تھا

نمرہ، اقرا۔ کراچی

اشفاق احمد

عورت کا مرد کی زندگی میں اتنا ہی دخل ہونا چاہیے جتنا پکوان میں نمک۔ زیادہ نمک بھی زہر ہوتا ہے۔

(اشفاق احمد۔ حیرت کدہ)
نوال افضل گھمن۔ کراچی

گڑیا شاہ کی ڈائری سے

حقیقت پر مبنی یہ غزل مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے وفا آج کے دور میں نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ جس طرح زندگی کی تلخ حقیقتوں کو شاعر نے بیان کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج کے دور میں کوئی کسی کا نہیں۔ میرے اپنوں اور قاری بہنوں کے نام۔

وفا کا پودا شجر ہوا تو امیتوں کا پتا چلے گا
نصیب اس کا ثمر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

ابھی تو پھرتے ہو دوستوں میں عزیز کوئی جدا نہیں ہے
کوئی اِدھر سے اُدھر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

یہ خوش نصیبی ہے شہر بھر میں تمہارا دشمن کوئی نہیں ہے
کبھی کسی کا جو ڈر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

یہ کیا بچھڑنا کہ شام ہوتے ہی اپنے پیاروں میں لوٹ جانا
کبھی جو لمبا سفر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

شائستہ اکبر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر فرحت عباس شاہ کی بے حد خوبصورت غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب کو بھی ضرور پسند آئے گی۔

کہیں آرزوئے سفر نہیں کہیں منزلوں کی خبر نہیں
کہیں راستہ ہی اندھیرے ہیں یا نہیں کہیں پر نہیں

مجھے اضطراب کی چاہ تھی مجھے بے کلی کی تلاش تھی
ان ہی خواہشات کے جرم میں کوئی گھر نہیں کوئی در نہیں

کوئی چاند ٹوٹے یا دل جلے یا زمیں کہیں سے ابل پڑے
ہم اسیرِ صورت حال ہیں ہمیں حادثات کا ڈر نہیں

اے ہوائے موسم غم ذرا مجھے ساتھ رکھ مرے ساتھ چل
میرے ساتھ میرے قدم نہیں مرے پاس میری نظر نہیں

یہ عمر بھر کی ریاضتیں یہ نگر نگر کی مسافتیں
یہ جو روگ ہیں مہ و سال کے یہ تو گردشیں ہیں سفر نہیں

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ناصر کاظمی کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

پھر لہو بول رہا ہے دل میں
دم بدم کوئی صدا ہے دل میں

تاب لائیں گے نہ سننے والے
آج وہ نغمہ چھڑا ہے دل میں

چشمِ تر ہی نہیں محوِ تسبیح
خون بھی سرگرمِ دعا ہے دل میں

کہیں چہرہ، کہیں آنکھیں، کہیں ہونٹ
اک صنم خانہ کھلا ہے دل میں

اسے ڈھونڈا وہ کہیں نہ ملا
وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں

کیوں بھٹکتے پھریں دل سے باہر
دوستو! شہر بسا ہے دل میں

کوئی دیکھے تو دکھاؤں نامبسر
وسعتِ ارض و سما ہے دل میں

وانیہ عقیل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب بہنوں کی نذر

دن نکلے تو سورج الگ، شام ڈھلے دھلان الگ
امید الگ، آس الگ، سکون الگ، طوفان الگ

تیری الفت کے تقاضے بھی عجیب انداز کے تھے
اقرار الگ، تکرار الگ، تعظیم الگ، فرمان الگ

گر ساتھ نہیں اب رہ سکتے، تو بانٹ دو یک جان لمحے
مسرور الگ، نڈھال الگ، پُرکیف الگ، پریشان الگ

وقتِ رخصت الوداع کا لفظ جب کہنے لگے
آنسو الگ، مسکان الگ، بے تابی الگ، ہیجان الگ

جب چھوڑ گیا تب دیکھا رنگ اپنی آنکھوں کا
حیران الگ، پشیمان الگ، سنسان الگ، بیابان الگ

نمرہ، اقرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں حمایت علی کی یہ نظم تحریر ہے امید ہے آپ بہنوں کو پسند آئے گی۔

آئینہ در آئینہ

اس بار وہ ملا تو عجیب اس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خد میں تھی
اک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں
اک جسم تھا کہ روح سے مصروفِ جنگ تھا
میں نے کہا کہ یار تمہیں کیا ہوا ہے یہ
اس نے کہا کہ عمرِ رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمرِ رواں تو سبھی کی ہے
اس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں
اس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ
دیکھا تو میرا اپنا ہی عکس جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

طلعت ثنا کی ڈائری سے

جو محبت کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ محبوب کا ساتھ اس کی قربت کے لمحے کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ سعد اللہ شاہ کی اس غزل میں اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔

ملیں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے
میں سوال بھول جاؤں تو جواب بھول جائے

وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال ہی میں
کبھی میرے راستے میں وہ گلاب بھول جائے

جو کبھی تو پڑھنے بیٹھے مجھے حرف حرف دیکھے
تیری آنکھیں بھیگ جائیں تو کتاب بھول جائے

تیری سوچ پہ ہو حاوی میری یاد اس طرح سے
کہ تو اپنی زندگی کا حساب بھول جائے

مجھے غم وہ دے رہا ہے مگر اس پہ چاہتا ہے
میں حساب رکھ نہ پاؤں، وہ حساب بھول جائے

مجھے سعد جاتے جاتے فقط اتنا کہہ گیا ہے
جتنے دے دکھائی اچھا وہ خراب بھول جائے

خالدہ جیلانی

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

ہم بھی پیچھے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑتی ہے وہ کیا کرتے ہیں

حدیقہ انصاری ـــــــ لاہور

زمیں پہ چل نہ سکا اور آسماں سے بھی گیا
کٹا کے پر وہ پرندہ اڑان سے بھی گیا
تباہ کر گئی پکّے مکان کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچّے مکان سے بھی گیا

ملائکہ کوثر ـــــــ بسم اللہ پور

پرائی آگ میں جل کر کیا ملا مجھ کو
اسے بچا نہ سکا اور اپنی جان سے بھی گیا
کسی کے ہاتھ کا نکلا ہوا وہ تیر ہوں میں
ہدف کو چھو نہ سکا اور کمان سے بھی گیا

یاسمین کنول ـــــــ پسرور

بھول بیٹھے ہیں گیت ساون کے
ان پرندوں کی کیا کہانی ہے
دوسروں کو دکھا نہیں سکتے
درد ہے یا کوئی نشانی ہے

ریحانہ چوہدری ـــــــ مدوکے

میرے ہجر کے فیصلے لب عام تک نہ پہنچیں
میں نے ہر غم کو چھپایا ہے خزانے کی طرح

صائمہ عبدالحمید ـــــــ خیرپور میرس

ہر شخص بااصول ہے ہر شخص باضمیر
پر اپنی ذات تک، ذاتی مفاد تک

سیدہ لوبا سجاد ـــــــ کہروڑپکا

اس لیے کوئی زیادہ نہیں رکتا ہے یہاں
لوگ کہتے ہیں میرے دل پہ تیرا سایہ ہے

نسیم کوثر ـــــــ کراچی

ہم چل تو پڑے ہیں جذبۂ دل جانے کدھر معلوم نہیں
آغاز سفر پر نازاں ہیں، انجام سفر معلوم نہیں

حنا سلیم اعوان ـــــــ آخون باندی

درد کی خوشبو گئی، زخموں کی رعنائی گئی
موسم ہجراں تیری اب کے پذیرائی گئی
کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیسا تمام
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی

حورین زینب ـــــــ کہروڑپکا

زندگی بن کے تم بچھڑ جاؤ
فیصلہ تھا یہ آسمانوں کا

ثریا شاہ ـــــــ کہروڑپکا

وہ پہچان جو میرے اخلاص کی تھی
چھین کر لے گئے احباب وہ چہرہ میرا

نسبت گیلانی ـــــــ کہروڑپکا

نہ شکایتیں نہ سوال ہے، کوئی آسرا نہ ملال ہے
تیری بے رخی بھی کمال تھی، میرا ضبط بھی کمال ہے

ثمینہ یاسمین ـــــــ خیرپور ٹامیوالی

منزل پہ آکے شاد عجب حادثہ ہوا
میں ہم سفر کو بھول گیا ہم سفر مجھے

یاسمین کنول ـــــــ پسرور

جب یقیں سامنے نظر آئے
پھر تو سارے گمان مٹی میں
وہ کرے گا حفاظتیں اس کی
جس نے ڈالی ہے جان مٹی میں

ثمرہ، اقرا ـــــــ کراچی

اے صبا! شہر نگاراں سے گزرو جب تیرا
بھولنے والے سے کہنا یاد کیوں آیا بہت

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

حیا رانا۔۔۔کبیر والا

"ادا فروش" نعیمہ ناز کا مکمل ناول پڑھا۔ شائنہ کی کہانی دکھی کرنے والی تھی۔ سائرہ رضا کا ناول قسط وار ہے اس لیے وہ ابھی نہیں پڑھا۔ افراح سکندر خان کی "آغوش رحمت" بھی اچھی تھی، شازمین کو سدھارنے کا اچھا طریقہ اپنایا سب نے۔ بس اب نمرہ احمد کے نئے ناول کا انتظار ہے اور عمیرہ احمد کوئی نیا ناول لکھ رہی ہیں کیا؟ سب قارئین کے تبصرے بھی اچھے تھے۔

ج: پیاری حیا! معذرت کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہو سکا۔ ہمیں بہت سی قارئین ایک ہی شعر لکھ کر بھیج دیتی ہیں۔ نام غلط شائع نہیں ہوتا۔ جو شعر آپ نے بھیجا ہوتا ہے۔ وہ پہلے سے ہی کسی اور نے بھی بھیج رکھا ہوتا ہے۔ ہمیں آپ کے خطوط ملے ہی نہیں۔ ملتے تو ضرور شائع کرتے۔ سائرہ بہت محنت سے کہانی لکھ رہی ہیں انہیں کتنا دکھ ہوگا کہ آپ ان کی کہانی پڑھ ہی نہیں رہی ہیں۔

اقراجٹ۔۔۔منچن آباد

"دشت جنوں" بہت اچھا جا رہا ہے۔ "حسن المآب" بھی زبردست جا رہا ہے۔ "دل کی رہ گزر پر" بہت زبردست تحریر تھی۔ بہنوں کی خاطر قربانی دی گئی۔ ادا فروش بھی اچھی کاوش تھی۔ "عشق مجذوب" میں سسپنس بنی کری ایٹ ہو گیا ہے۔ کیا حذیفہ، عبیر کے گھر جائے گا؟ نیلم نے بہت برا کیا۔ یہ سارے کردار آج کل ہمارے اردگرد ہی موجود ہیں۔

"آغوش رحمت" ویری نائس ایک زبردست آموز سبق تحریر تھی۔ "دھنک کے رنگ" ہاہاہا بڑی فنی سی لگیں باتیں۔ افسانے تمام ہی زبردست تھے۔ "نالہ دل کی صدا" سب سے زبردست لگا۔

ج: پیاری اقراء! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ آئندہ بھی اس سلسلے میں شرکت کریں۔ ہم آپ کے منتظر رہیں گے۔

مہناز رانی، رمشاء شہزادی۔۔۔مانانوالہ ضلع شیخوپورہ

"کرن کرن روشنی" اس سلسلے میں بہت پیاری پیاری احادیث پڑھنے کو ملتی ہیں۔ عدنان بھائی بھی بہنوں کو بہت ہی اچھے مشورے دیتے ہیں، پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔

انٹرویو میں کبریٰ فاطمہ سے مل کر اچھا لگا۔ افسانے تو چاروں اس ماہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آپی، میکال ذوالفقار اور سائرہ چوہدری کا نئی تصویروں کے ساتھ انٹرویو لیں "دشت جنوں" آپی آمنہ اب تو پورا یقین ہو گیا ہے کہ یہ آبو شمیٰ خوش نصیب کی روح ہی ہو سکتی ہے۔ "حسن المآب" سائرہ رضا آپ ماریہ، خدیجہ اور منے کو زیادہ ہائی لائٹ کر رہی ہیں۔ حسن المآب اور صحرا میں ذلیل ہونے والے کو منظر پر لا کر جلدی سے ہی غائب کر دیتی ہیں۔ انہیں کون سی ہماری نظر لگ جائے گی حالانکہ یہ دونوں زیادہ توجہ کا مرکز ہیں۔ آپی سائرہ کے ناول کی چند اقساط ہی رہتی ہیں لیکن ابھی تو کردار ہی سمجھ میں نہیں آرہے۔ اختر جہاں کے لیے تو ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے والد صاحب خود ناول پڑھتے ہیں۔ حنا سلیم آپ کو بھی مبارک ہو کہ آپ کے والد خود خط لکھنے کو کہتے ہیں اور آپ کو بی اے کے امتحان میں کامیابی کے لیے مبارک ہو۔ مریم، عائشہ،

نوشابہ، ہما، سحرش اور خدیجہ۔ آپ لوگ کیوں ہم پر ظلم کرنے لگ گئی ہیں پلیز ایسی فرمائشیں تو نہ کریں۔ گھروں میں اور ارد گرد کون سے کم جھگڑے اور اختلاف ہوتے ہیں اور نظر آتے ہیں جو ناول میں بھی ایسا ہی ہو۔ ویسے آپ کے گروپ میں سے یہ فرمائش کس نے کی۔ "دھنک کے رنگ" عفت سحر طاہر کا ناولٹ اچھا تھا مگر یہ رویہ گل نے نکاح اور منہ دکھائی کی رسم تو خواب میں دیکھی ہے تو از میر بٹ کا نرم رویہ اور جو لہنگا لایا تھا وہ بھی سب خواب تھا۔ "آغوش رحمت" افراح سکندر آپ نے بہت اچھی تحریر لکھی۔ سبق آموز تحریر ہے۔ معصوم سی صفا بہت ہی پیاری لگی۔ "ادا فروش" نعیمہ ناز کی تحریر بھی بہت اچھی رہی۔

"دل کی راہ گزر پر" نگہت عبداللہ نے بہت ہی پیاری اور اچھی تحریر لکھی ہے۔ ٹائٹل اس ماہ کا بس ٹھیک ہی تھا۔

ج: ممناز اور رمشاء! خواتین کی محفل میں خوش آمدید آپ نے تمام تحریروں پر تفصیلی تبصرہ کیا، بہت اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کرتی رہیں گی۔

سمیرا رحمان...... ہری پور

ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنی ساس سے فرمائش کی کہ مجھے کچھ صاف کاغذ چاہئیں اور پھر ذہن میں کئی یادوں کے بند دریچے کھلنے لگے۔ یہ 1999ء کی بات ہے کہ دوست کے ہاتھ سے لے کر کہانی پڑھنی شروع کی افشاں آفریدی کی، عنوان ایک آئینہ تھا سو ٹوٹ گیا یا پھر بے عیب تھے آئینے۔ تب سے یہ سلسلہ شروع ہوا تیرہ برس کی عمر میں اور اب سترہ سال گزر گئے اس ادارے کی شاگردی اختیار کیے ہوئے۔ شاگردی سے مراد یہ ہے کہ جو نصیحتیں ای تربیت کی غرض سے غصے کا خول چڑھا کر ایک فقرے میں کرتی تھیں جنہیں، میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے میں شاید ایک دن بھی نہ لگاتی مگر یہ شمارے، وہ نصیحتیں، وہ تربیت وہ معاشرتی اقدار، زمانے کی اونچ نیچ اور صحیح اور غلط کا ادراک باتوں باتوں میں ہلکے پھلکے انداز میں ذہن میں اتار دیتے تھے۔

ان سترہ سالوں میں تقریباً" سترہ بار خط لکھنے کا سوچا مگر بہت سی وجوہات آڑے آتی رہیں۔

آج سے کئی سال پہلے مجھے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر میرے دل میں عجیب سی بے کلی اور خلش سی تھی۔ اب سمجھ میں آیا کہ جو لوگ ہوا کی لہروں سے موسیقی کا لطف اٹھاتے ہیں، جو دھنک کو اوڑھتے ہیں، جو بارشوں کو انعام کی سی خوشی کے ساتھ وصول کرتے ہیں وہ بھی کتاب کے بغیر نہیں جی سکتے۔

اب اس ماہ کے شمارے کی طرف آتے ہیں۔ آمنہ ریاض کا دشت جنوں ابھی تک تو کچھ متاثر کن نہیں ہے صرف معاویہ کی خود اعتمادی زبردست ہے مگر شاید کہانی ابھی کھلی نہیں ہے اس لیے مزہ نہیں دے رہی۔

اب وہ کہانی جس نے، جو ہمت میں ستر بار نہ کر سکی اکہترویں بار کر لی "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے" (شمارہ مارچ)

آج سے چودہ سال پہلے میں نے اس درد کو محسوس کیا تھا کہ جو عورتیں بازار سے نکل کر زندگی کے ڈھب کو تبدیل کرنے کے لیے معاشرے کے صدیوں پرانے لگے بندھے گھن چکر میں پستی ہیں ان کے لیے تو بہت لکھا جاتا ہے لیکن ابھی ہم اتنے باظرف نہیں ہوئے کہ اللہ کی دی ہوئی برتری کو خود سے منسوب نہ کریں، ہمارا معاشرہ انہیں قبول نہیں کرتا۔

نعیمہ ناز سلطان صاحبہ کا شکریہ جو انہوں نے بہت بہتر انداز میں اس موضوع کو اٹھایا۔

ج: پیاری سمیرا! محفل میں خوش آمدید۔ دنیا میں دو طرح کے انسان بستے ہیں۔ ایک جو طاقتور ہیں خواہ مرد ہوں یا عورت دوسرے جو کمزور ہیں چاہے مرد ہوں یا عورت۔

بس زندگی اسی اختیار و بے اختیاری کا نام ہے۔ جسے نعیمہ نے واضح کیا اور آپ نے محسوس کیا۔

امید ہے آئندہ بھی شریک محفل رہیں گی۔ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ افسانہ نگاری کی طرف توجہ دیں۔

یاسمین کنول...... پسرور

شادیوں کے سیزن کے حوالے سے سرورق پسند آیا دلہن بڑی نکھری نکھری لگی۔ ڈاکٹر شکیل احمد کا انٹرویو پسند آیا۔ شوگر کے مریضوں کے لیے تو زیادہ اچھا ثابت ہوا ہو گا۔ نگہت عبداللہ دل کی راہ گزر پر، حسن المآب، دھنک کے رنگ اچھی تحریریں ہیں۔ افسانوں میں شکایت اور پیناگاہ اچھے لگے۔ سائرہ رضا کی سالگرہ نمبر کے حوالے سے

تحریر "وقت کی راہ گزر پر" بہت پسند آئی۔ باقی مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ مجموعی طور پر سالگرہ نمبر کامیاب رہا دیکھنے اور پڑھنے میں اچھا لگا۔

ج : پیاری یاسمین! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہمیں بھی آپ کا جامع اور مختصر تبصرہ اچھا لگا۔ اور شکریہ کی کیا بات۔ یہ سلسلہ تو آپ لوگوں کی شمولیت ہی کے لیے ہے۔

ناظمہ زیدی۔۔۔ چوک اعظم

ٹائٹل میں زیور بہت خوب صورت تھا۔ کرن کرن روشنی' خوب صورت جزاک اللہ خیرا"۔ انشاء جی کا کالم مجھے کچھ میں نہیں آیا کس بارے میں بات تھی۔ سائرہ رضا' آپ کا احوال خواتین کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ سمیرا حمید جی آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ کبریٰ فاطمہ کا انٹرویو کچھ خاص نہ لگا۔ ہمیں ان کے روز و شب سے کیا۔ کوئی گہری نیند سے جگائے یا سلائے۔ سانوں کی؟ "ڈاکٹر شکیل سے ملاقات" اگر مستقل سلسلہ ہے تو بہت بہت اچھا ہے۔ یقین جانیں "خواتین" ان دور دراز گاؤں میں بھی پہنچتا ہے جہاں اکثر مائیں شہر لانے تک مرجاتی ہیں۔ اس لیے اس کو مستقل کریں۔ خصوصاً "عورتوں کے مسائل' پریگننٹ عورتوں کا علاج' دوا اور پرہیز۔ بلکہ اگر ایسا ہو کہ خواتین ہر ماہ اپنے سوال پوچھیں اور آپ اگلے ماہ کسی ماہر ڈاکٹر کے جواب شائع کریں۔ یقین جانیں خواتین کے کھاتے میں ایک اور کار ثواب شامل۔

"دشت جنوں" ابھی پڑھا نہیں مگر آئے کت مجھے ڈراما لگتی ہے۔ معاویہ کا باپ سچا ہے اس معاملے میں

"پکھی" نے تو رُلا دیا اپنا دکھ یاد آگیا بس فرق صرف اتنا کہ اس کا باپ سوتیلا تھا اور میری ماں۔۔۔ پناہ گاہ بھی اداس سی تحریر تھی' دل کو دکھی کر گئی اینڈ خوشگوار ہوتا تو۔۔۔ خیر رائٹر کی مرضی جناب۔ نگہت عبداللہ جی آپ کو اتنے عرصے بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بعض کہانیاں پڑھ کر دل کرتا ہے ان کرداروں کی اگلی زندگی کی جھلک بھی دیکھ لیں آپ کی کہانی ان ہی میں سے ایک تھی زبردست۔ "نالہ دل" پھر ایک دکھی کہانی "حسن المآب" اچھی جارہی ہے۔ یہ قسط ابھی نہیں پڑھی "شکایت" اچھی کاوش "ادا فروش" اچھی تحریر تھی۔ رائٹر کا نام ہی گارنٹی ہے۔ "عشق مجذوب" اچھی جارہی ہے مگر عبیر کا تذکرہ کم تھا۔ مجھے یہ کردار پسند ہے۔ "اف شوق" کیا کوئی نیا سلسلہ ہے۔

آخر میں ایک بات (میں ہمیشہ نہیں کہتی کیونکہ رسالہ تنقیدی نظر سے پڑھتی ہوں) اس مرتبہ کا خواتین بہت اچھا تھا۔ پورا رسالہ شعاع سے بازی لے گیا۔

ج : پیاری ناظمہ! صرف شعاع والے ہی نہیں ہم بھی آپ کو خوب سمجھتے ہیں اور رسالے پر تنقید بے شک کریں مگر اسے محبت کی نظر سے پڑھا کریں۔ "اف شوق" کے بارے میں آپ کا سوال پڑھ کر حیرت ہوئی۔ تحریر خود بتا رہی تھی کہ وہ تاثرات ہیں۔ آپ کا مسئلہ شعبہ بیوٹی بکس کو دے دیا ہے۔

آپ نے دیہات میں رہنے والی خواتین کے مسائل پر توجہ دلائی۔ ان شاء اللہ' جلد ہم خواتین میں یہ سلسلہ شروع کریں گے۔ خواتین آپ کو پسند آیا۔ تہہ دل سے شکریہ۔ مزید شکریہ کہ آپ نے پورا پرچا پڑھ کر ہر تحریر پر تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

عابدہ مغل۔۔۔ بھیر کنڈ مانسہرہ

نو سال پرانا غبار ہے۔ کس کس کہانی پر تبصرہ کروں۔ اگر پچھلے سارے ناولوں پر تبصرے شروع کیے تو موجودہ کے ساتھ شدید زیادتی ہوگی۔ البتہ نمل اور آب حیات نے تو حیات رہنے تک ساتھ ساتھ رہنا ہے۔ اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اس بار خواتین میں نے عمدہ تحاریر' یک نہ شد دو شد والے افسانے مگر ایک گلہ ہے کہ ایک ہی بار میں اتنی دکھوں بھری کہانیاں؟ لگتا ہے آپ کا ہر گھر میں سیلاب لانے کا ارادہ ہے۔ ادا فروش تو حقیقتاً "ایک قسم کی ادا سے لکھی گئی تھی کہ ہمارے آنسو رکے ہی نہیں (اللہ جانے ناول ہی اس قدر دکھی تھا یا ہم اداس تھے۔) شہریار اگر شائنہ کو اپنا نہیں سکتا تھا تو نور جہاں کو تو نہ چھوڑتا کیونکہ محبت تو بڑی سے بڑی غلطیاں معاف کر دیتی ہے۔ عشق مجذوب کا ہینڈسم حذیفہ اور عبیر کی جوڑی بنا دیں ناں۔ زویا نام کے کردار کو کہیں اور فٹ کردیں۔ حسن المآب کی جسنل کی دیوانگی ہمیں بھی دیوانہ بنا گئی۔ موسیٰ کو صحرا سے نجات کب ملے گی۔ ذرا جلدی کہانی کو کھول کر بیان کریں۔ اتنی قسطوں سے انتظار کر کے مر گئے ہم تو۔ دشت جنوں میں شاہ میر نے کیا خوش نصیب کو بدنصیب بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وسامہ کا حال سرے سے غائب تھا افسوس۔ جناب ماضی زبردست ہے مگر آیو شمتی سے ڈر جاتے ہیں۔

پکھی نے بتا دیا کہ ہم بھی پکھی ہیں۔ اور ہم بھی مٹی ہی لے جانے کا حق رکھتے ہیں۔ دل کون دیتا ہے پکھی ذات کو۔ آغوش رحمت نے بھی رونے پر اور سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بچے ایک دوسرے سے بچھڑ کر کیسے گزارہ کرتے ہوں گے۔ دل کی راہ گزر بہت پسند آیا نام کی وجہ سے۔ گل ریز اور زینب لوگوں کی سمجھ نہیں آئی کہ گل محلے میں رہتا تھا اور اس کے بارے میں جانتی ہی نہ تھیں اور کیا ان کا تائی کے علاوہ کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ ایک جملہ پسند آیا کہ "نکاح تو تم سے میں ہی کروں گا کوئی اور کرے تو سیدھا اوپر" زبردست جناب۔ پناہ گاہ میں سلیمہ کی خاموشی پسند نہیں آئی اور زبردست تھی تحریر۔ شکایت سے ہمیں شکایت ہے کہ تھوڑا سا تو شوہر حضرت بھی کمپرومائز کرنے والا ہوتا۔ نالہ دل کی صدا کا روایتی انجام نہیں ہوا دکھ ہوا مگر اچھا لگا۔ سمیرا حمید کا پرواز آسماں زبردست تحریر تھی۔ سائرہ رضا کی بنی بھی ہے اچھا لگا پڑھ کر۔ فریدہ نے صحیح فرمایا کہ شوق کا عالم ہی ہے جناب ہمارا بھی۔ اگر پورے رسالے میں دھنک کے رنگ نہ ہوتے تو ہم رو رو کے بے حال ہو جاتے۔ رویحا گل کو محبت کا ٹوٹکا کیا بتائیں۔ (شادی کے بعد ہو جائے گی محبت بھی رویحا گل) مسرت الطاف، حنا سلیم اور لوبا سجاد کا تبصرہ پسند آیا۔ توقیر کی ڈائری سے جو غزل تھی دل کو بھا گئی۔ کرن کرن روشنی تو ہر چیز سے بالاتر ہوتی ہے۔

ج : پیاری عابدہ! مانسہرہ کا تو پتا نہیں مگر کراچی میں پانی کی شدید قلت ہے۔ اب اگر ایسے میں ہر گھر میں سیلاب آ بھی گیا تو لوگ غالباً" ہمیں دعائیں ہی دیں گے۔ ویسے خواتین جو سیلاب لائیں گی ہمیں اندازہ ہے کہ کیسا ہو گا۔

خط کے آغاز میں ہمیں شرمندگی ہو رہی تھی مگر پورا خط پڑھ کر احساس ہوا کہ رونا تو آپ کی عادتوں میں شامل ہے اور رویحا گل کو کوئی ٹوٹکا نہ بتائیں شادی کے بعد اس کی عقل خود ہی ٹھکانے پر آ جائے گی۔ آپ وشمتی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں.... جب اس کا راز کھلے گا تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ کیا چیز ہے۔

نازیہ تبسم..... فیصل آباد

ٹائٹل پر خوب صورت سی مسکراتی ہوئی ماڈل کو دیکھ کر ہمارا تو موڈ فریش ہو گیا اور پھر کچھ ایسے خواتین پڑھنے میں مگن ہوئے کہ حفظ کر کے ہی چھوڑا۔ خواتین کے تمام سلسلے ہی بہت پسند آئے۔ سچی بات کہوں تو میں رسالہ پڑھتے پڑھتے کسی اور ہی دنیا میں کھو جاتی ہوں اور یہ سحر ٹوٹا تب جب شمارے میں اپنی دونوں غزلیں غائب پائیں، تھوڑا سا دل ٹوٹ گیا۔ ہم پانچوں بہنیں خواتین ڈائجسٹ کی بہت بڑی فین ہیں۔ پچھلے 10 سال سے ہم یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی رائے کا اظہار کرنا نہیں آتا کہ کہیں آپ کو کوئی بات بری نہ لگ جائے۔

ج : پیاری نازیہ! ہمیں آپ سب قارئین اتنی محبت و خلوص سے خط لکھتی ہیں۔ ہمیں کیوں آپ کی کوئی بات بری لگنے لگی۔ ہاں مگر ایک گزارش ہے کہ یہ شاعری، شعراء ــــ کے لیے ہی رہنے دیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اور رائے کا اظہار کرنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ شمارہ آپ کو جیسا لگے، اچھا یا برا بلا تکلف ہمیں لکھ کر بتا دیا کریں۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔

صائمہ عبدالحمید..... خیرپور میرس

کھولتے سمے "دل ضرور دھڑکا کہ وعدے کے مطابق، اس شمارے میں ہماری پیاری رائٹر نمرہ احمد کو جو شامل ہونا تھا" سلسلہ وار ناولز سے شمارے کا آغاز کیا تو "حسن المآب" سائرہ رضا کی تحریر پہلے نمبر پر ٹھہری۔ کہانی کی روش کافی پُرسحر ہونے کے ساتھ ساتھ، سنسنی خیز بھی ہے، خاص طور پر صحرا میں بھٹکے راہی (جو کہ شاید بدر ہے) کی دگر گوں حالت پڑھ کر جسم کی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دوسرے نمبر پر "عشق مجذوب" پڑھا۔ شکر ہے آخری قسط کا بتا دیا، ورنہ تو .... مسٹر ہینڈسم تو امید ہے حذیفہ ہے، پر یہ بابا کی لاڈلی کون ہے! عبیر؟ ویسے سارا شمارہ بہت اچھا رہا۔

آپی! آپ سے دو باتیں کرنی ہیں۔ ایک تو یہ، یہ ہمارے شہر میں (خیرپور میرس) رسالہ 10 تک آتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے پہلی کو ہی رسالہ مل جائے؟ دوسرا یہ کہ میں نے جب بھی کسی سلسلے میں شرکت کی اکثر میرا نام غلط لکھا ہوتا ہے۔ پچھلے شمارے میں "خاتون کی ڈائری" میں جو غزل بھیجی تھی۔ وہ میری تھی۔

ج : پیاری صائمہ! معذرت چاہتے ہیں کہ آپ کا نام سہواً" غلط شائع ہو گیا اور ہونے کو دنیا میں کیا ہو نہیں سکتا۔

ہم پوری کوشش کررہے ہیں کہ پرچا جلد آجائے اور آپ کو پہلی تاریخ کو ہی مل جائے۔

نائلہ عرف ایمن۔۔۔۔ نامعلوم شہر

ہمارا نام اور انداز بیاں سے سمجھ تو گئے ہوں گے آپ کو ہم کون ہیں۔ آں ہاں جی ہاں.... ایمن .... وہی باغ و بہار طبیعت کی مالک... بقول آپ کے وہی جو ہمیں ہر ماہ لیٹرز یہ کارٹون بنا بنا کر بھیجتی ہے۔

"بھولی ہوئی ہوں داستاں
گزرا ہوا خیال ہوں
جس کو نہ تم سمجھ سکے
میں ایسا اک سوال ہوں

اس ماہ کے شمارے پہ کیا تبصرہ کروں پہلے کیوں نہ کچھ گلے شکوے کروں خیر.... گلے شکوے کرکے بھی کیا کرتے ... اپنے حالات کے بارے میں بتاتی چلوں، بہت اچھی جاب مل گئی تھی (اس وقت سے جب سے خط لکھنا بند کر دیا تھا۔) وقت بہت کم ملتا تھا اور دوسری بات اپنی تحریر کے بارے میں سن کر دلی صدمہ ہوا تھا کہ وہ قابل اشاعت نہیں۔ دل بہت اداس بھی تھا مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور پھر سے کمر کس کے میدان میں کود ے۔

ج: پیاری ایمن! محفل میں خوش آمدید۔ الجبرا کا مضمون تو ہماری گھٹی میں شامل تھا۔ اب شاید ہی کوئی سوال ہو جسے ہم نہ سمجھ سکیں۔ اور یہ جاب خط نہ لکھنے کی وجہ سے ملی ہے؟ آپ کے اندر کا درد تو واقعی ہم نہیں جانتے مگر ملکہ جذبات بن کر اگر ہم نے ہر کہانی شائع کرنا شروع کردی تو پھر قارئین جس درد میں مبتلا ہوں گے وہ ضرور جانتے ہیں۔

اقرا احمد۔۔۔۔ گھوٹکی

اس ماہ کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ برائے مہربانی نمرہ احمد کا انٹرویو اور بنت سحر کا ناول شائع کیجئے پلیز....

ج: پیاری نمرہ! اقراء کی بات بھی مان لیا کرو کبھی اور اقراء اجب بھی نمرہ انٹرویو دیں گی تو ضرور شائع کریں گے۔ وعدہ.... پکا وعدہ۔

ایمن نیازی۔۔۔۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اپریل کے شمارے کا بے صبری سے انتظار کیا جس کی ایک وجہ تو اس کا سالگرہ نمبر ہونا جبکہ دوسری اور زیادہ اہم اس میں نمرہ احمد کی تحریر لیکن شمارہ ہاتھ میں آتے ہی جب میں نے فہرست نکالی تو اس میں نمرہ احمد کا ناول نہ پا کر مایوسی کا سامنا ہوا۔

باقی سرورق کی ماڈل کچھ خاص اچھی نہیں لگی شاید کیمرے کا اینگل ہی کچھ ایسا تھا۔ از میرہٹ سیریز کا ناولٹ بھی اچھا لگا۔ آخر میں سوال ہے کہ آپ کی ردی کا ٹوکرا ساری ڈاک کھا جاتا ہے اسے بدہضمی نہیں ہوتی؟

ج: پیاری ایمن! ناحق آپ نے ہمارے ٹوکرے کو بددعا دی۔ ساری ڈاک کہاں کھاتا ہے، بچارے کو بچا کھچا ہی کھانے کو ملتا ہے۔

آپ کی تحریر ان شاءاللہ باری آنے پر لگ جائے گی۔

حدیقہ انصاری۔۔۔۔ لاہور

خواتین کا مطالعہ پہلی بار کب کیا؟ اب تو یہ بات ٹھیک سے یاد بھی نہیں مگر جب بھی اسے پڑھا کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ملا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو اس نے پکی سچی سہیلی کی طرح اس مسئلے کا حل بتایا اور کبھی ایسا لگا کہ یہ ایک سمجھ دار ماں کی طرح ہماری تربیت کررہا ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ شکریہ خواتین ڈائجسٹ، میں تم سے محبت کرتی ہوں!

"ہمارے نام" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اس میں حصہ لینے والی تمام بہنوں کو میرا سلام۔ سیدہ لوبا، آپ کا نام مجھے بہت پسند ہے۔ اقصیٰ بشیر کی طرح ہم نے بھی بہت بار ڈانٹ کھائی ہے مگر باز نہیں آئے۔ اب ابو کچھ نہیں کہتے کیونکہ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ اس میں صاف ستھری تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

نمرہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید، ایمل رضا، نایاب جیلانی اور آمنہ ریاض بہت زبردست تحریریں پڑھنے والوں کے لیے پیش کرتی ہیں۔ شکریہ آپ سب کا! اندرون سندھ میں ایک بے حد بری رسم کا چلن ہے وہ یہ کہ باپ بھائی وغیرہ اس لیے لڑکی کی شادی قرآن مجید سے کردیتے ہیں کہ جائیداد بہن کے ذریعے بہنوئی کے پاس چلی جائے گی اور لڑکی کو یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو کہ تم قرآن مجید سے شادی کررہی ہو۔ لڑکی نکاح کے بعد

گھر کے ایک کمرے میں ساری زندگی گزار دیتی ہے۔ میری گزارش ہے کہ اس رسم کے بارے میں کسی باصلاحیت مصنفہ سے کوئی ناول لکھوائیں!

"کرن کرن روشنی" میں نکاح اور طلاق کے بارے میں احادیث شامل کریں۔ "موسم کے پکوان" میں فرنی، زنگر شوارما اور اوون کے بغیر کیک بنانے کا طریقہ سکھایا جائے۔ شاہین صاحب سے گزارش ہے کہ اداکار بابر اور اداکارہ میرا کا انٹرویو بھی کریں۔ "خبریں ذبریں" میں واصفہ سہیل کے کمنٹس لاجواب ہوتے ہیں اور عدنان صاحب کو میں کہنا چاہوں گی کہ گڈ جاب! عدنان جی!"

ج : پیاری حدیقہ! قرآن سے شادی کی رسم پر بہت سے ڈرامے اور فلمیں بن چکی ہیں۔ اس پر کافی مصنفین نے لکھا ہے۔ بہرحال آپ کی فرمائش ہے تو ضرور لکھوائیں گے۔ پکوان کے سلسلے میں آپ کی فرمائش پر اس ماہ زنگر برگر دے رہے ہیں۔ باقی فرمائشیں آئندہ ماہ ان شاء اللہ۔

عروبہ کنول شاہ..... کراچی

میں نے خواتین کو آٹھ سال کی عمر میں پڑھنا شروع کیا۔ اور قاری بہنوں کو دیکھ میرا بھی دل کرتا کہ میں آپ کو خط لکھوں۔ مگر ہمت ہی نہ ہوئی۔ ویسے بھی خط لکھنے پر مجبور عفت سحر کی تحریر دھنک کے رنگ نے کیا جسے پڑھ کر میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ویسے تو میری ساری ہی رائٹر پسندیدہ ہیں مگر ان میں کچھ موسٹ فیورٹ ہیں جیسے اشفاق بابا، بانو قدسیہ، عمیرہ احمد، نمرہ احمد، راحت جبیں، فاخرہ جبیں، فائزہ افتخار، نمرہ بخاری، سائرہ رضا، نگہت عبداللہ، سمیرا حمید، سمیرا گل عثمان، نفیسہ سعید، آمنہ ریاض وغیرہ وغیرہ میں نے محض تیرہ سال کی عمر سے باقاعدہ خواتین کو پڑھنا شروع کیا۔ نمرہ احمد کے ناول سے شروعات کی "مکمل" سے جی۔ اور میں صرف سترہ سال کی ہوں۔ آپی 29 اپریل کو میرا پہلا پیپر ہے، ایف ایس سی کا۔ دعا کیجیے گا۔

ج : پیاری عروبہ! آپ ہمیں شوق سے خط لکھیں ہم شائع بھی کریں جہاں تک رائٹنگ کی بات ہے تو اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا ہم ہر طرح کی رائٹنگ پڑھنے کے عادی ہیں۔ اصل چیز تو آپ کی رائے ہے جو ہم تک پہنچنی چاہیے تاکہ ہم اپنی پیاری قارئین کی پسند ناپسند جان سکیں۔

ہادیہ..... کراچی

میں نے کئی کہانیاں اور افسانے تحریر کیے ہیں جو واقعہ مجھے متاثر کرتا ہے اسے میں تحریر ضرور کرتی ہوں۔ ان ہی میں سے پہلی تحریر "شرف قبولیت" آپ کی نذر ہے۔

ج : پیاری ہادیہ! خلاصہ پڑھ لیا ہے مگر رائے قائم کرنے کے لیے پوری تحریر پڑھنا ضروری ہے۔ آپ مکمل کہانی بھیجیں تب ہی کچھ کہہ سکیں۔

صائمہ مشتاق..... بھاگٹانوالہ، سرگودھا

ٹائٹل گرل بہت پسند آئی۔ کرن کرن روشنی دل و روح کو روشن کر گئی سائرہ رضا "وقت کی رہ گزر پر" بہت مزہ آیا۔ پرواز آسمان سمیرا حمید! عورت کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ کبریٰ فاطمہ سے ملاقات اچھی لگی۔ نگہت عبداللہ کا مکمل ناول "دل کی راہ گزر پر" واہ جی واہ نگہت جی، کیا کہنے آپ کے۔ اتنی اچھی سٹوری لے کر آئیں، بہت پسند آئی۔ آمنہ ریاض کا ناول دشت جنوں زبردست جا رہا ہے۔

مصباح نوشین کا مکمل ناول "عشق مجذوب" امیزنگ حذیفہ نے بہت اچھا کیا کہ وہ چلا گیا۔ سلیم سے نکاح نہیں کیا۔ دوسری جانب پلیز مصباح جی عبیر کی شادی یاسر جیسے لوفر سے مت کرنا۔ عفت سحر طاہر کا ناولٹ "دھنک کے رنگ" عفت سحر جی اتنا ہنسے کہ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ وہاں پر زیادہ جہاں قاضی صاحب نکاح پڑھا رہے ہوتے ہیں تو رو بیحا کا دوپٹا اٹھا کر کہنا اور اینڈ پر خواب نا بہت اچھی اسٹوری تھی۔ آغوش رحمت افراح سکندر کا بھی اچھا تھا۔ افسانے سارے زبردست لگے۔

ج : پیاری صائمہ! بہت شکریہ کہ آپ نے تفصیلی تبصرہ کیا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ مصباح نوشین کو بھی تاکید کر دی ہے کہ عبیر کا انجام اچھا کریں۔ ہمیں بھی عبیر سے بہت ہمدردی ہے۔

پری زاد..... شیخوپورہ

"کہنی سنی" سے شروع کیا اور کرن کرن روشنی سے خوب روشنی سمیٹی۔ بے شک انسان کی نجات کا دارومدار اس کے اعمال پر ہے۔ وضو کے متعلق ——— پڑھ کر اچھا لگا۔ سالگرہ نمبر میں اپنے پسندیدہ رائٹرز کو پڑھ کر اچھا

لگا۔ خاص طور پر سائرہ رضا کو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ فریدہ گوہر اور سمیرا حمید کے خواتین سے متعلق تاثرات جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ واقعی خواتین ڈائجسٹ 'خواتین ڈائجسٹ ہی ہے اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ کبریٰ فاطمہ خان سے ملاقات خوب رہی۔ آمنہ ریاض صاحبہ آپ کے لیے تو کھڑے ہو کر تالیاں بجانی چاہئیں (بھی بجا بھی رہی ہوں) فنٹاسٹک' آمنہ کا ٹاپک بہت زبردست ہے' سب سے الگ۔ آئے کت کی شادی مجھے لگتا ہے پھر نہیں ہوگی۔ مجھے لگتا ہے آئے کت آبوشمتی کی کوئی رشتہ دار ہے اور خوش نصیب یہ کیا کر دیا تم نے؟ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی یہ لڑکی کسی مشکل میں پھنس جائے گی اور ساتھ ہمیں بھی پریشان کرے گی اور دیکھا کر دیا نا ہمیں پریشان۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو خوش نصیب۔ اور سائرہ رضا نے تو ایک شاہکار تخلیق کیا ہے "حسن المآب اور" حسنل اور ماہ رو کا کردار میرا فیورٹ ہے۔ (حسنل کی طرح کبھی میں بھی پاگل ہوئی تھی وظائف اور دعاؤں سے اپنی تقدیر بدلنے چلی تھی مگر ہمیں ملتا وہی ہے جس قابل ہم ہوتے ہیں۔ اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے بچا لیا)۔ "ادا فروش" ابھی آدھا پڑھا ہے اس لیے تبصرہ ادھار رہا۔ غزلوں میں ساغر صدیقی کی غزل دل کو بھا گئی۔ باقی سب سلسلے بھی خوب رہے۔ عدنان بھی خوب دعائیں سمیٹ رہے ہیں۔

ج : پیاری پری زاد! "آپ کا باورچی خانہ" اور "خامشی کو زباں ملے" یہ دونوں سلسلے بمع سوالات شائع ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے ذہن میں کچھ سوالات ہیں تو آپ ان کے مطابق جواب لکھ کر بھیج دیں' کوئی مسئلہ نہیں۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عابدہ چراغ..... نامعلوم شہر

اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کے ادارے کا معیار کافی بلند ہے (صرف چند رائٹرز کی بنا پر) وہ اتنا اچھا لکھتی ہیں کہ ریاض صاحب کے لیے مغفرت کی دعا دل سے نکلتی ہے کہ جنہوں نے اتنا اچھا پلیٹ فارم مہیا کیا کہ ہمیں گھر بیٹھے اتنا اچھا پڑھنے کو مل رہا ہے۔

آپ لوگ دل کے کافی اچھے ہیں اس لیے ہر لکھاری کو جسے تھوڑا سا بھی لکھنا آتا ہو' جگہ ضرور دیتے ہیں! اس لیے میں نے بھی ذرا سی کوشش کی ہے۔ مجھے نہ تو نمرہ احمد کی طرح الہام آتے ہیں' نہ سمیرا کی طرح اچھے لفظوں کے جھرمٹ میں رہتی ہوں۔ نہ ہی میں خدا کے ان چنے ہوئے بندوں میں سے ہوں جن کو پڑھ کر اور کچھ بھی پڑھنے کو جی نہیں کرتا!

بے شک نمرہ' سمیرا اور عمیرہ کی تحریروں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں مگر آپ سے اتنی گزارش ہے کہ میرے احساسات کا ان کی تحریروں سے موازنہ کیے بغیر ان کی قدر کی جائے۔

میں کسی بھی تحریر پر تبصرہ نہیں کروں گی۔ جو اچھا لکھ رہی ہیں ان کی تعریف میں برے لفظوں میں کرنا نہیں چاہتی اور جو صرف لکھ رہی ہیں' ان کے بارے میں میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔

ج : پیاری عابدہ! پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ ہم کسی بھی تحریر کا موازنہ 'خواہ کوئی مستند لکھاری ہی کیوں نہ ہو۔ کسی دوسری تحریر سے نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ آپ پر نمرہ احمد کی طرح الہام اتر سکتے ہیں نہ ہی آپ سمیرا کی طرح لفظوں کی کہکشاں سجا سکتی ہیں' وجہ یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو عابدہ چراغ بنایا ہے۔ سمیرا یا نمرہ نہیں تو پھر آپ عابدہ بن کر ہی اپنا مقام بنائیں۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ لکھ سکتی ہیں مگر آپ کی تحریر بہت شاعرانہ ہے۔ کچھ سادہ سا لکھ کر بھیجیں۔

فرحانہ فرحان..... گھوٹکی

اگر مجھے کوئی کہے کہ تم کو کس کہانی نے امپریس کیا؟ تو میں کہوں گی صرف اور صرف "جنت کے پتے" میں آج تک اس کہانی کو بھول نہ سکی۔ وہ بہارے گل کی شرارتیں' عائشے گل کی نصیحتیں' ڈی جے کی باتیں۔ نمرہ جی آپ نے ڈی جے کو کیوں مارا تھا؟ آج تک میرا دل دکھی ہو جاتا ہے۔ نمرہ آپی پلیز پلیز پلیز جنت کے پتے کا سیکوئل لکھیں۔ کبھی تو ہماری بات مانا کریں۔

ج : فرحانہ اب تو نمرہ نے حالم شروع کر دیا ہے شاید ان کے پاس وقت نہ ہو' پھر بھی آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

☆

باتیں کنزہ ہاشمی سے

شاہین رشید

1. "اصلی نام؟"
"کنزہ ہاشمی۔"

2. "پیار کا نام؟"
"میرا نام نہیں بگڑا۔ کنزہ ہی بلاتے ہیں۔"

3. "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"7 مارچ 1997ء / لاہور۔"

4. "قد / ستارہ؟"
"میرا خیال ہے کہ 5 فٹ 4 انچ اور ستارہ ہے Pisces (حوت)۔"

5. "بہن بھائی؟"
"اکلوتی اولاد ہوں۔ والدین کی۔"

6. "مادری زبان؟"
"پنجابی۔"

7. "تعلیم؟"
"زیر تعلیم ہوں ابھی فی الحال سیکنڈ ایئر پاس کیا ہے۔"

8. "شوبز میں آمد؟"
"دراصل مجھے گانے کا شوق تھا اور یہ شوق مجھے اس فیلڈ میں لے کر آیا... مگر جب گانا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ سیکھنا بہت ضروری ہے۔ بس اس دوران ایک ڈرامے کی آفر آگئی۔ بس پھر اداکاری کی طرف ہی آگئی۔"

9. "پہلا ڈرامہ؟"
"ادھورا ملن۔"

11. "مارننگ پرسن ہیں؟"
"جی میں صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں۔"

12. "صبح اٹھ کے پہلا کام؟"
ہنستے ہوئے "فریش ہو کر میکڈونلڈ جاتی ہوں' ناشتہ کرنے۔ کیونکہ میں کراچی میں اکیلی رہتی ہوں۔"

13. "فوڈ لور ہو یا کوکنگ لور؟"
"فوڈ لور تو ہوں ہی۔ کھانا پکانے سے بھی بہت دلچسپی ہے اور سب کچھ اچھا پکا لیتی ہوں۔ خاص طور پر میکرونی۔"

14۔ "کون سا کھانا کھا کر کبھی بور نہیں ہوتیں؟"
"بریانی.... صبح و شام، رات دن جب کھلا دیں، چاہے روزانہ کھلا دیں۔"
15۔ "بھوک کس چیز سے مٹاتی ہیں؟"
"جو قریب سے مل جائے کھا لیتی ہوں۔"
16۔ "تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"نہیں کوئی خاص نہیں۔ بس سو کر ہی گزر جاتے ہیں۔"
17۔ "اپنے آپ میں کوئی کمی محسوس کی؟"
"قد لمبا ہونا چاہیے تھا۔ 5 فٹ 6 انچ ہونا چاہیے تھا۔"
18۔ "ملک میں کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"کوئی بات بری نہیں لگتی۔ پاکستان مجھے اچھا لگتا ہے۔"
19۔ "تھکن کا احساس کب ہوتا ہے؟"
"میں تھکتی نہیں، ایکٹو رہتی ہوں۔ الحمد للہ اور ہر دم کہیں بھی جانے کو تیار رہتی ہوں۔"
20۔ "فخر کا کوئی لمحہ؟"
"جی جب میں اپنے ایک نئے پروجیکٹ کے لیے ملائیشیا گئی تھی اور وہاں جا کر بہ حیثیت پاکستانی کے ہمارا تعارف ہوا تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔"
21۔ "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"
"اکیلے جا کر گھومتی پھرتی ہوں۔ مزے کرتی ہوں۔"
22۔ "بچپن کی کوئی بری عادت؟"
"مجھے نہیں لگتا کہ مجھ میں کوئی بری عادت ہے... اپنے آپ کو تو سب کچھ اچھا ہی لگتا ہے۔"
23۔ "ضدی ہیں؟"
"ضدی ہوں۔"
24۔ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"موبائل فون۔"
25۔ "پارہ کب چڑھتا ہے؟"
"جب کوئی چیز آرگنائزڈ نہ ہو۔ جس کا کام ہے اور وہ اپنا کام نہیں کر رہا تو غصہ آتا ہے، پارہ چڑھ جاتا ہے۔"
26۔ "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"
"جمعہ۔"
27۔ "بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟"
"مارچ۔۔۔ برتھ ڈے۔"
28۔ "کوئی لڑکا بدتمیزی کرے تو؟"
"اول تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔۔۔ اگر ہوا تو اگنور کروں گی، کیونکہ مجھے لڑائی جھگڑا پسند نہیں ہے۔"
29۔ "لڑکوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"جو خاموش طبیعت کے لڑکے ہوتے ہیں وہ مجھے اچھے لگتے ہیں۔"
30۔ "کیا بات بری لگتی ہے؟"
"جو زیادہ بولتے ہیں اور سب کے سامنے سگریٹ پی رہے ہوتے ہیں وہ برے لگتے ہیں۔"
32۔ "بچت کس صورت میں محفوظ کرتی ہیں؟"
"مما کو پیسہ دے دیتی ہوں... ان کی مرضی ہے جس طرح سیونگ کریں۔"
33۔ "کبھی برا وقت گزرا؟"
"الحمد للہ نہیں۔"
34۔ "شاپنگ پہ پہلی ترجیح؟"
"جو چیز اچھی لگ جائے۔"
35۔ "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"گولڈ کا تحفہ ہے۔ میں گفٹ دیتی ہوں یا پھر نہیں دیتی۔"
36۔ "دنیا میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"ایک اولڈ ہاؤس بنانا چاہتی ہوں۔ جہاں ان والدین کو پناہ دوں جن کے بچے انہیں گھر سے نکال دیتے ہیں۔"
37۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"کشمی چوک جاتی ہوں.... جہاں بہترین کھانے ہوتے ہیں۔"
38۔ "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہوں؟"
"ہاں جی.... ابھی اٹھتی ہوں، نہیں کہتی، نہ سستی دکھاتی ہوں۔"
39۔ "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"پرائے۔"

40۔ "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"گھر پہ گزارتی ہوں یا پھر دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جاتی ہوں۔"
41۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"ان کے ساتھ سفر کر کے دیکھیں۔"
42۔ "لڑکا حسین ہو یا ذہین؟"
"دونوں۔"
43۔ "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"مما کے۔ ورنہ وہ ناراض ہو جائیں گی کیونکہ وہ سیکنڈ نہیں لگاتیں ناراض ہونے میں۔"
44۔ "بوریت دور کرتی ہوں؟"
"فلم یا ٹی وی دیکھتی ہوں۔ گیمز کھیل لیتی ہوں یا پھر کتاب پڑھتی ہوں۔"
45۔ "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟"
"پری کا۔"
46۔ "بی پی ہائی ہو جائے تو؟"
"جب کوئی میری بات نہ سن رہا ہو۔ میرا کام نہ ہو رہا ہو۔ کیونکہ مجھے ہر کام خود کرنے کی عادت ہے۔ تو وقت پر کام نہ ہو تو بی پی ہائی ہو جاتا ہے اور غصہ آتا ہے۔"
47۔ "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"سچ بتاؤں... جب آتے ہیں تو تھوڑا سا موڈ آف ہوتا ہے۔ مگر پھر گھل مل جاتی ہوں اور مزہ آتا ہے۔"
48۔ "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"کافی بار ہوا ہے۔ لوگ پریشان کرتے ہیں۔"
49۔ "آپ کے ڈراموں کی تعداد؟"
"بس ابھی تک سترہ ڈرامے کر چکی ہوں۔"
50۔ "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو؟"
"منٹ پرفیوم، واچ، جیولری، چیک بک، برش ہر قسم کی چیزیں نکلتی ہیں۔"
51۔ "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"تصاویر... اپنی فیملی کی، اپنے دوستوں کی وغیرہ وغیرہ۔"
52۔ "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کبھی بھی بری نہیں لگتی نہ لگے گی، کیونکہ یہ ہمارے مفاد کے لیے ہوتی ہیں۔"
53۔ "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"بہت زیادہ کرتی ہوں اور توقع کرتی ہوں کہ دوسرے بھی کریں جو کہ نہیں کرتے۔"
54۔ "کس پہ دل کھلے سے خرچ کرتی ہیں؟"
"جو پیار سے بات کرے، جو مجھے ایک نظر میں اچھے لگیں۔"
55۔ "اپنی کمائی اپنے پہ خرچ کرتی ہیں؟"
"جی کرتی رہتی ہوں... کبھی لیپ ٹاپ لے لیا... کبھی اچھا والا موبائل لے لیا۔"
56۔ "اپنے گھر میں کس انداز میں کھانا کھانا پسند ہے؟"
"مجھے ہمیشہ ڈائننگ ٹیبل پہ اہتمام کے ساتھ کھانا کھانا پسند ہے۔"
57۔ "طبیعتاً خاموش ہیں یا شوخ و چنچل؟"
"میں خاموش طبیعت کی مالک ہوں... زیادہ ہلا گلا پسند نہیں ہے مجھے۔"
58۔ "کیا زیادہ استعمال کرتی ہیں۔ فیس بک۔ انسٹا گرام یا ٹوئیٹر؟"
"میں آج کل زیادہ تر انسٹاگرام استعمال کرتی ہوں۔"
59۔ "کب زندگی بہت حسین لگتی ہے؟"
"جب میں گھر پہ اپنی مما کے پاس ہوتی ہوں۔"
60۔ "آنے والے وقت کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"
"کچھ نہیں... میں تو آج میں مگن رہتی ہوں۔"
61۔ "دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"
"پاکستانی... یعنی اپنے دیسی کھانے بہت پسند ہیں۔"
62۔ "نرم گوشہ کس کے دل میں ہوتا ہے؟"
"عورت کے دل میں... کیونکہ اس کے اندر ماں کا دل ہوتا ہے۔"
63۔ "گھر میں کون سب سے زیادہ پیار کرتا ہے آپ سے؟"
"میری ماں۔"
64۔ "کس کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

"ہنستے ہوئے... اتنی ہمت کہاں ہے مجھ میں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچتی ہی نہیں جو مجھ سے ہو نہیں سکتیں۔"

65۔ "کس چیز کا فوبیا ہے؟"

"مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے اگر آپ مجھے اندھیرے میں چھوڑ دیں تو 100٪ میرا ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔"

66۔ "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں ڈرتی۔"

67۔ "محبت اندھی بہری کیا ہوتی ہے؟"

"جی اندھی بہری سب کچھ ہوتی ہے۔ خاص طور پر ٹین ایج لوگوں کے لیے۔"

68۔ "لوگوں کی آپ کے بارے میں رائے؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ تم میں ستر' اسی سال کے بزرگوں والی روح ہے۔ میں بہت سمجھ داری کی باتیں کرتی ہوں' یہ لوگوں کا کہنا ہے۔"

69۔ "دل دکھتا ہے؟"

"جب کوئی منہ پر جھوٹ بول دے جبکہ ہمیں پتا ہو کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یا رہی ہے۔"

70۔ "آپ تو جھوٹ نہیں بولتی ہوں گی؟"

"بولتی ہوں... مگر وہ جھوٹ جس میں کسی کا نقصان نہ ہو رہا ہو۔"

71۔ "شادی میں پسندیدہ رسم؟"

"مجھے شادی میں شرکت کرنا ہی پسند نہیں اور میں جاتی ہی نہیں ہوں۔"

72۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"ناشتہ امی کے ہاتھ کا اور کھانا میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی کھاتی ہوں۔"

73۔ "شوٹ کے لیے گھر سے نکلتے وقت لازمی اپنے ساتھ رکھتی ہوں؟"

"بیگ... میک اپ بیگ' پرس' میرے کپڑے اور ایک بیگ میں میرے کھانے پینے کا سامان ہوتا ہے۔"

74۔ "لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

"جی پہچان لیتے ہیں مگر پاس نہیں آتے زیادہ تر لوگ کہ پتا نہیں برا نہ مان جائیں۔ کئی لوگ آ بھی جاتے ہیں۔"

75۔ "فون نمبر جلدی جلدی تبدیل کرتی ہیں؟"

"نہیں۔ ایک ہی نمبر چلا آرہا ہے۔"

76۔ "امی ناراض ہو جائیں تو؟"

"تو مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ مگر میں ایک دو دن بات نہیں کرتی۔ پھر جب فون کرتی ہوں تو اپنی پچھلی کوئی بات نہیں دہراتی اور بہت پیار سے بات کرتی ہوں۔"

77۔ "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہوں؟"

"جی بالکل۔"

78۔ "دل کی سنتی ہو یا دماغ کی؟"

"دماغ۔"

79۔ "بچپن کے کھلونے سنبھال کر رکھے ہیں؟"

"جی... کافی چیزیں ہیں۔ جیسے بھالو وغیرہ۔"

80۔ "غصہ کھانے پہ نکلا کبھی؟"

"پہلے بہت نکلتا تھا... اب نہیں... اب پہلے کھانا پھر کچھ اور۔"

81۔ "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"

"جی بالکل سنتی ہوں... اور جب "مما" پاپا کو شکایتیں لگا رہی ہوتی ہیں تو ضرور سنتی ہوں۔"

82۔ "لیٹتے ہی سو جاتی ہیں یا؟"

"ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے سونے میں۔"

83۔ "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھتی ہیں؟"

"موبائل... چارجر... بالوں کا کیچر اور پانی کی بوتل بھی۔"

84۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"اکثر بری لگتی ہے۔"

85۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"

"کولڈ ڈرنک کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ کھانا نہیں کھاتی۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"تب بھی اللہ کا شکر ادا کروں گی۔"

☆

بقیہ شہزاد اقبال

تھا کہ میں اینکر بنوں گا۔۔۔ ریزرو رہتا تھا اور لوگوں میں آسانی سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔"

"بچپن کے کیا خواب تھے کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟"

"بچپن میں ایسے کوئی خواب نہیں دیکھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے۔ لوگ پلاننگ کرتے ہیں۔ مگر مجھے بچپن سے ہی پلاننگ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ صحیح ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہاں بچپن میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا کیونکہ مجھے پائلٹ ابھی بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ بہت متاثر ہوتا ہوں ان سے جب کبھی وہ ائیرپورٹ پہ نظر آجائیں تو۔۔۔ اینکر نہ بنتا تو لائر بنتا۔ کیونکہ لائر بہت پسند تھے۔ جب کچھ موویز میں لائرز نظر آتے تھے تو بہت اچھے لگتے تھے دل چاہتا تھا کہ لائر بن کر عدالتوں میں بحث کروں۔۔۔ مگر ایسا کچھ نہ ہو سکا۔۔۔ تو جناب لائر نہ بن کے عدالتوں میں بحث نہ کر سکا۔ البتہ اینکر بن کر ٹاک شو میں ضرور بحث کر لیتا ہوں اور سوالات کر لیتا ہوں۔"

"کچھ نہ کچھ بن کے پیسہ کمانے کی دُھن تھی یا نام کمانے کی دھن تھی۔۔۔ اور والدین کیا چاہتے تھے کہ آپ پڑھ لکھ کر کیا بنیں؟"

"پیسہ کمانے کی تو کوئی خاص دُھن نہیں تھی۔ بس ایک اچھی لگژری لائف گزارنے کی خواہش ضرور تھی۔ پیسے کمانے کی دُھن نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔۔۔ اور مشہور ہونے کا تو خیر کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ٹی وی اینکر بنوں گا یا جرنلسٹ بنوں گا اور میں مشہور ہو جاؤں گا۔۔۔ کیونکہ میں تو بچپن میں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ کم گو اور خاموش مزاج تھا۔۔۔ اور نہ ہی کبھی میں نے تقریری مقابلوں میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا۔۔۔ اور والدین کی کیا خواہش تھی تو ایک بڑا دلچسپ واقعہ آپ کو بتاؤں کہ جب میں گیارہ، بارہ سال کا تھا تو کھیلتے کھیلتے گر پڑا اور میرا ایک دانت ٹوٹ گیا۔۔۔ تو ابو مجھے دو تین ڈینٹسٹ کے پاس لے گئے اور آپ کو پتا ہی ہے کہ ان کی اچھی خاصی فیس ہوتی ہے تو میرے دانت کے لیے بڑا خرچا ہوا تھا۔ اس وقت میرے والد نے یہ ضرور کہا تھا کہ بیٹا، بڑے ہو کر تم ڈینٹسٹ بننا اور پھر انہوں نے مجھے کئی مثالیں دیں کہ ڈینٹسٹ پڑھ لکھ کر کتنے کامیاب ہوتے ہیں اور ان کا فیوچر کتنا سیکور ہوتا ہے۔"

"صحافت کی فیلڈ میں کیسے آئے اور کہاں سے شروعات کی؟"

"جب میں ایم بی اے میں تھا تو میں نے ایک چینل جوائن کیا تھا "سن بز" یہ چینل بزنس ایکٹیوٹیز اور خاص طور پر اسٹاک مارکیٹ کو کور کرتا تھا۔ اس چینل کو جوائن کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میں پڑھائی کی روٹین سے تھوڑا بور ہو گیا تھا اور کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی جرنلسٹ بننے کی طرف کوئی رجحان نہیں تھا۔ میں نے بہ حیثیت پروڈیوسر کے وہ چینل جوائن کیا تھا اور چونکہ میری فیملی کا تعلق اسٹاک مارکیٹ سے تھا۔ میرے والد اسٹاک مارکیٹ کے بروکر تھے، میرا بھائی بھی اسٹاک مارکیٹ میں بروکر ہے تو مجھے اندازہ تھا کہ یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔ کچھ کمپنیز کے بارے میں بھی معلومات تھیں تو خیر۔۔۔

اس چینل پہ مجھے ایک پروگرام ہوسٹ کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ میں ہوسٹ نہیں کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس وقت کی ہیڈ نوشین مسعود نے مجھے بہت اعتماد دیا اور کہا کہ ضرور کرو۔۔۔ اسٹاک مارکیٹ کی رپورٹنگ کے بارے میں پروگرام تھا۔۔۔ تو اس چینل پہ تقریباً" ایک سال کام کیا۔۔۔ اور اس میں اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے ہی تجزیے اور تبصرے ہوتے تھے۔ اس چینل پہ "شاہ زیب خانزادہ" بھی تھے جو ہم سے سینئر تھے۔

اس چینل کے بعد پھر میں نے "بزنس پلس" جوائن کیا، اس چینل پہ بھی پاکستان کی معیشت کے بارے میں اور اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے پروگرام کرتا

تھا۔ اس چینل پہ تقریباً" تین سال کام کیا اور مجھے بہت جلد "ہیڈ آف بزنس پروگرامنگ" بنا دیا گیا اور یہ میرے لیے بڑی کریٔ ایٹو جاب تھی کہ نئے پروگراموں کو شروع کرنا، ہر پروگرام کو ایک دوسرے سے مختلف بنانا اور ٹیم کے ساتھ کام کرنا، میرے لیے ایک بہت اچھا، دلچسپ تجربہ تھا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اس کے بعد کچھ وجوہات کی بنا پر میں نے پروگرام سے سوچ لیا۔

اس زمانے میں مشہور اینکر جو کہ آج بھی اتنی ہی مشہور ہیں 'جیسمن منظور' اس چینل میں اینکر تھیں تو جب استعفیٰ دے کر دوسرے چینل میں چلی گئیں تو انتظامیہ نے ان کے پروگرام کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ شروع میں تو بہت جدوجہد کرنی پڑی کیونکہ میرے لیے ایک نئی فیلڈ تھی' کرنٹ افیئرز اور پالیٹکس' لیکن مجھے اچھے لوگ ملے۔ کچھ انہوں نے سکھایا' خود میں نے بھی کتابوں کا مطالعہ کیا اور معلومات حاصل کیں اور یوں تقریباً" ڈیڑھ پونے دو سال میں نے کرنٹ افیئرز اور پالیٹکس کے پروگرام کیے۔ چار ساڑھے چار سال کام کرنے کے بعد پھر میں نے "سی این بی سی" جوائن کرلیا۔

"کوئی ایسا پروگرام جو شہرت کے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا ہو۔"

"جی ایک پروگرام میں نے کیا تھا "بزنس پلس" میں اس میں جھگڑا ہوگیا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں وہ شاید پہلا پروگرام تھا جس میں دو سیاست دان گتھم گتھا ہوگئے تھے اور باقاعدہ ان کی لڑائی ہوئی تھی۔ ان میں ایک پی ٹی آئی کے "نعیم الحق" اور دوسرے "جمیل سومرو" صاحب تھے' پی پی پی کے۔ یہ اس وقت بلاول بھٹو کے ایڈوائزر ہیں اور نعیم الحق اس وقت سیکریٹری انفارمیشن تھے۔"

اس پروگرام میں جمیل سومرو صاحب نے گالی دے دی تھی جس پر نعیم الحق صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے گلاس اٹھا کر جمیل سومرو صاحب کو مارا اور پھر گتھم گتھا ہوگئے۔

اس پروگرام کی شہرت سوشل میڈیا پہ بہت ہوئی اور اس پروگرام سے میری بہت زیادہ پہچان ہوئی' یوں کہیں کہ بہت مشہور ہوگیا اور پھر اس پروگرام کے بعد مجھے "سی این بی سی" سے آفر آئی تھی اور میں نے اس چینل کو جوائن کرلیا اور وہاں بھی میں نے کرنٹ افیئرز کے پروگرام کیے۔ "پاکستان آج رات" کے عنوان سے اور تقریباً" چار سال پروگرام کیا۔ "سی این بی سی" جوائن کیا تو مجھے اسلام آباد جانا پڑا کیونکہ آفس اسلام آباد میں تھا اور اب میں گزشتہ دو سال سے "سماء ٹی وی" پہ ہوں اور "آواز" کے نام سے پروگرام کرتا ہوں۔

"اینکر کی جاب یقیناً" خاصی مشکل جاب ہے۔ تو اسے ایزی لیتے ہیں' انجوائے کرتے ہیں یا بور ہو جاتے ہیں؟"

"جی اینکر کی جاب بہت مشکل ہے' بہت محنت طلب ہے' بہت ریسرچ کرنا پڑتی ہے۔ جس ایشو پہ پروگرام ہو یا جس شخصیت پہ پروگرام ہو اور اس میں صرف ایک آپ کی محنت ہی نہیں ہوتی' پوری ٹیم کی محنت ہوتی ہے اور بے شک مشکل جاب ہے' مگر اس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ اس لحاظ سے کہ آئے دن پاکستان کے حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر دوسرے دن کوئی بڑی خبر ہوتی ہے اور میں انجوائے اس لیے کرتا ہوں کہ روز آپ کے پاس کچھ مختلف کرنے کو ہوتا ہے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ روٹین جاب کرنے والے کس طرح سروائیو کرتے ہیں' ایک ہی جیسی جاب کرکے انہیں کتنی بوریت ہو جاتی ہوگی۔

ہماری جاب میں ہر دن ایک نیا دن ہوتا ہے۔ ہر دن ایک نئی خبر ہوتی ہے۔ نئے ایشوز' نئے لوگ۔ تو بڑا اچھا لگتا ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ اگر آپ دل سے اور لگاؤ کے ساتھ نہ کریں تو پھر پروگرام کو جان دار بھی نہیں بنا سکتے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ ایسے سوال کروں جو ایک عام آدمی کے ذہن میں ہوتے ہیں اور جواب ضرور لوں۔۔۔ سامنے والے کو موقع نہ دوں بات بدلنے کا۔"

"کس سیاست دان کے لیے آپ کہیں گے کہ یہ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے ہیں۔ چکر نہیں دیتے۔"

"ٹو دی پوائنٹ تو میرے خیال سے کوئی بھی بات نہیں کرتا۔۔۔ سوائے ایک دو کے۔ جب یہ لوگ پھنس جاتے ہیں کسی ایشو پہ۔ تو پھر تو ہر کوئی گھما تا پھراتا ہے۔ اچھے سے اچھا مہمان بھی چاہتا ہے کہ میں گھما پھرا کر کہیں سے نکل جاؤں، لیکن پھر بھی چند نام ایسے ہیں کہ جن کا انٹرویو کرکے مزا آتا ہے، ان میں ایک تو "شیخ رشید" صاحب ہیں، ان کی جملے بازی بڑے مزے کی ہوتی ہے۔ قمر زمان کائرہ صاحب بڑی دلیل کے ساتھ بات کرتے ہیں اور ان کی باتوں میں اکثر وزن ہوتا ہے۔ اسد عمر (پی ٹی آئی) کو ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کی عادت ہے۔ بہت زیادہ وقت بھی نہیں لیتے۔ بہت سارے ایشوز پر ان کی معلومات بہت اچھی ہیں۔ سابق صدر پرویز مشرف صاحب۔ بہت صاف گوئی سے جواب دیتے ہیں اور کسی سوال کا جواب انہیں نہیں دینا ہوتا تو وہ منع کردیتے ہیں کہ میں نے اس کا جواب نہیں دینا۔ اور وہ اتنی صاف گوئی سے بات کرتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی خبر نکل آتی ہے اور اکثر ان کے خلاف نکل آتی ہے۔"

"سب سے اچھا انٹرویو کس کے ساتھ رہا؟ اور گھر جاتے ہیں تو آؤ بھگت ہوتی ہے۔"

"یہ بہت مشکل سوال ہے۔۔۔۔ پھر بھی کہوں گا کہ ابھی تک سب سے اچھا انٹرویو پاکستان عوامی تحریک کے ڈاکٹر طاہر القادری کا انٹرویو ہے۔۔۔۔ چند ماہ قبل میں نے یہ انٹرویو کیا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ اس دن میری تیاری بہت اچھی تھی۔۔۔ اور میں سوچ کے آیا تھا کہ سخت سوال کرنے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے لوگوں سے بہت وعدے وعید کرتے ہیں اور میڈیا ان کو ٹائم بھی بہت دیتا ہے۔۔۔ تو میں نے کچھ زیادہ ہی سخت سوال کرلیے تھے کہ جس کی وجہ سے وہ جھنجلا گئے اور 36 منٹ کا پروگرام بھی پورا نہیں ہونے دیا۔۔۔ مگر میں خوش تھا کہ میں نے سخت سوال کیے اور جو میں پوچھنا چاہ رہا تھا میں نے پوچھ لیا۔۔۔ اور آؤ بھگت تو خیر نہیں

لیکن ایک اچھا ریلیشن شپ بن جاتا ہے... مگر پھر بھی میں ایک فاصلہ ضرور رکھتا ہوں... گہرے تعلقات نہیں رکھتا کیونکہ پھر کہیں نہ کہیں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے گہری دوستی نہیں کرتا۔

"کن لوگوں کا ابھی تک انٹرویو نہیں کیا اور کرنا چاہتے ہیں؟"

"نواز شریف صاحب کا انٹرویو ابھی تک نہیں کیا۔ اور کرنے کی خواہش ہے کہ ہمارے وزیر اعظم ہیں... مگر وہ ہر کسی کو انٹرویو دیتے نہیں ہیں... اسی طرح آصف علی زرداری سے انٹرویو کرنے کی خواہش ہے۔ آف دی ریکارڈ تو ان سے بات ہوئی ہے... مگر انٹرویو کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے... وہ بھی سب کو انٹرویو نہیں دیتے۔ ان کی فہرست میں چند ہی لوگ ہیں جن کو وہ انٹرویو دیتے ہیں۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں... کہ پیپلز پارٹی کو کہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور بلاول بھٹو جنہوں نے ابھی انٹرویو دینا شروع نہیں کیا۔ تو وہ جب انٹرویو دینا شروع کریں گے تو ضرور کروں گا۔"

"ہمارے یہ سیاست دان ملک کے ساتھ مخلص ہیں؟"

"بہت سارے لوگوں کے لیے یہ رائے قائم کرلی جاتی ہے کہ وہ ملک کے لیے مخلص نہیں ہیں۔ تو ایسا نہیں ہے... وہ پاکستان کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہماری رائے ان سے مختلف ہوتی ہے اس لیے ہم ان پر یہ مہر ثبت کر دیتے ہیں کہ وہ پاکستان کے لیے کام نہیں کرنا چاہتے... ہاں چند ایسے عناصر ہیں جو کرپٹ ہیں ان کے نام آپ ٹی وی پر سنتی بھی رہتی ہوں گی۔ بہت سارے لوگوں پر الزام ثابت بھی ہو چکے ہیں تو شاید یہ لوگ صرف پیسہ بنانے کی خاطر سیاست میں آئے... اور ان کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ یہ پاکستان کے لیے مخلص نہیں ہیں لیکن پھر بھی اختلاف رائے اپنی جگہ۔ مگر ہم کسی کو سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتے اور نہ ہی ہمیں دینا چاہیے کہ کون مخلص ہے اور کون نہیں ہے...

اور انٹرویوز کی بات میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ سیاست دانوں کے انٹرویوز کے علاوہ دیگر شعبوں کے لوگوں کے انٹرویوز کرنے کی بھی میری خواہش ہے اور میں کرتا بھی ہوں... اور اسٹوڈیو میں بیٹھ کر نہیں... آؤٹ ڈور بھی انٹرویوز کرتا ہوں اور جب ملک میں کوئی پریشانی آتی ہے جیسے زلزلہ اور طوفان یا کچھ بھی تو متاثرہ جگہ پر لوگوں سے بات چیت کرتا ہوں۔ چترال گیا تھا جب سیلاب آیا تھا تو متاثرین سے بات کر کے اندازہ ہوا تھا کہ لوگ کن کن مسائل کا شکار ہیں۔

انٹرویوز کے حوالے سے میں دو اور لوگوں کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا جن کے میں نے انٹرویوز کیے۔ ان میں ایک "الطاف حسین صاحب" تھے جن کا انٹرویو اس سے اگلے دن کیا جب 90 پہ رینجرز نے چھاپا مارا تھا۔ یعنی چھاپے سے ایک دن بعد۔ میں نے خاصے سخت سوال کیے اور اس وقت وہ غصے میں بھی بہت تھے۔ اور کبھی مزاحیہ انداز میں گنگنانے بھی لگتے تھے... اس انٹرویو کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ کبھی لندن آکر بھی میرا انٹرویو کریں۔ مگر پھر آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کے انٹرویوز پر اور ان کی تصاویر پر پابندی لگ گئی تھی۔

"سب سے مشکل پروگرام یا انٹرویو کون سا لگا آپ کو؟"

16 دسمبر 2014ء کو جب آرمی پبلک اسکول پر حملہ ہوا اور 145 بچے شہید کر دیے گئے تو مجھے سماء جوائن کیے ایک ہی دن ہوا تھا۔ تو اسی دن میں لاہور سے پشاور گیا۔ اور اس اسپتال میں جا کر پروگرام کیا جہاں پر زخمی بچے تھے۔ 17 دسمبر کو میں اے پی ایس گیا تھا... اور بھی صحافی اور دیگر لوگ وہاں تھے۔ تو سچ بتاؤں کہ اس سے زیادہ مشکل وقت نہیں دیکھا میں نے... بہت جذباتی ہو رہا تھا میں... اور سانحے کے بعد اسکول کی صفائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تو بچوں کا خون، کسی کے جوتے، کسی کے کپڑے، کتابیں، بیگ تو وہاں جا کر شو کرنا کہ کس طرح ظالموں نے بربریت کی تھی وہ میرے لیے بہت مشکل پروگرام تھا۔ بہت رندھی ہوئی آواز تھی میری۔ اور برابر والی بلڈنگ جہاں پرائمری کلاس کے بچے تھے، جب میں وہاں گیا تو

جس برے طریقے سے بچوں کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں اس سے اندازہ ہوا کہ بچے کس خوف سے بھاگے ہوں گے۔ شکر الحمد للہ کہ اس بلڈنگ تک دہشت گرد نہیں پہنچے تھے مگر یہ سوچ کر کہ بچوں پہ کیا بیتی ہوگی، دل کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔۔۔ وہ پروگرام میرے لیے مشکل ترین پروگرام تھا۔

”لوگ جب آپ سے ملتے ہوں گے تو اپنے مسائل تو بتاتے ہوں گے۔ اور کیا انداز ہوتا ہے لوگوں کے ملنے کا۔“

”لوگ بہت پیار سے محبت سے اور اپنا مسیحا سمجھ کر ملتے ہیں۔ اپنے مسائل اپنی مشکلات ہمیں بتاتے ہیں اور ہم ان کے مسائل آگے تک پہنچا بھی دیتے ہیں مگر ہم اس پر عمل در آمد نہیں کرواسکتے۔ اور لوگ میری تعریف کرتے ہیں، مجھے بہت اچھا بھی لگتا ہے۔۔۔ لیکن زیادہ خوشی اس وقت ہوتی ہے جب وہ میرے پروگرام کی اور میرے لیے ہوئے انٹرویوز کی تعریف کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم کوئی فنکار تو ہیں نہیں کہ ہماری اداکاری کی تعریف ہوگئی تو ہم خوش ہوجائیں گے۔ پروگرام کی تعریف سن کر اس لیے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ ہم بہت ریسرچ کے بعد بہت محنت کے بعد پروگرام کرتے ہیں۔ تو لوگوں کی تعریف ہماری طاقت ہوتی ہے۔۔۔ اور سیلفی کا دور ہے اور ایسا کبھی ہوتا نہیں کہ لوگ آپ کو پہچان کر سیلفی نہ لیں۔۔۔ اور اب تو سیاست دان بھی سیلبرٹی بن گئے ہیں اور وہ بھی سیلفی بنوا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔۔۔ اور سب ٹاک شو کی وجہ ہے کہ یہ بھی پہچانے جانے لگے ہیں تو الیکٹرونک میڈیا کا شکریہ کہ اس نے سب کو سیلبرٹی بنادیا ہے۔“

”آپ ہوں، دیگر اینکرز ہوں۔ بہت محنت کرتے ہیں۔۔۔ بہت اچھے پروگرام کرتے ہیں۔۔۔ کیا ان کا کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔“

”جی آپ کی طرح دیگر لوگ بھی ہم سے یہی سوال پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ انہیں یہ بتاتا ہوں کہ ان پروگراموں سے فائدہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہی پروگراموں سے ایک عام آدمی بھی اس بات سے واقف ہوا ہے کہ ”پاناما“ کا ایشو کیا ہے۔۔۔ تو ہم اپنے پروگراموں کے ذریعے سے ایوانوں تک اور عوام تک اپنی آواز پہنچاسکتے ہیں۔ ان کو Aware (باخبر) کرسکتے ہیں۔۔۔ ہمارا کام مسائل کا بتانا ہے ان کا حل دینا یا ان پر عمل در آمد کرانا ہمارا کام نہیں ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ ہماری آواز سنی جاتی ہے اور مسائل کا تدارک کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ چیزیں بہتر ہوتی جائیں گی۔ جمہوریت مضبوط ہوتی جائے گی۔ اور ساتھ ساتھ میڈیا بھی مضبوط ہوتا جائے گا۔۔۔ میڈیا سے لوگوں کو جو توقعات ہیں میڈیا اس پہ پورا اترے گا۔“

”میں کچھ سیاست دانوں کے نام آپ کے سامنے رکھوں گی، آپ بتائیے کہ ان کو سیاست دان نہیں کسی اور پیشے میں ہونا چاہیے تھا۔ یا آپ نے ان کو کیسا پایا۔۔۔“

”یہ تو آپ نے بہت مشکل سوال کردیا۔۔۔ میری تو لڑائی ہوجائے گی یا تعلقات خراب ہوجائیں گے۔۔۔ خیر یہ مذاق کی بات ہے میں آپ کو جواب دیتا ہوں۔“

شیخ رشید۔ شیخ رشید کو اس جنم میں تو کیا ہر جنم میں سیاست دان ہونا چاہیے۔۔۔ مجھے نہیں پتا کہ انہیں کوئی کام آتا ہے یا نہیں۔۔۔ لیکن اس سے بہتر کام وہ اور کوئی نہیں کرسکتے۔ اور وہ اکثر پروگرام میں انگریزی کے بڑے خوب صورت جملے بھی بول جاتے ہیں جو سننے والے کو محظوظ کرتے ہیں۔۔۔ آج بھی وہ بڑے اسمارٹ سیاست دان ہیں۔۔۔ پھر وہ جانتے ہیں کہ سیاست میں کس وقت کون سا پتا کھیلنا ہے۔۔۔ اب جیسا ”پی ایس ایل“ کا فائنل تھا تو عمران خان نے اس پر تنقید کی۔۔۔ مگر شیخ رشید صاحب فوراً ”گراؤنڈ“ پہنچ گئے۔۔۔ اور لوگوں نے تو کیا ان کے مخالفین نے بھی ان کی اس جرأت پر واہ واہ کی۔۔۔

اس طرح جب عمران خان نے ”دھرنا“ کی کال دی تو ایک کال شیخ رشید نے بھی دے دی۔ جس کی وجہ سے راولپنڈی اور لال حویلی کو کنٹینر لگا کر بلاک کردیا گیا

تھا تاکہ لوگ آ نہ سکیں اور شیخ صاحب لوگوں کو اکٹھا نہ کر سکیں۔۔ مگر شیخ صاحب موٹر بائیک پہ آئے اور میڈیا کی "وین" پر بیٹھ کر "سگار" جلایا اور سگار ختم کرکے واپس موٹر بائیک پہ بیٹھ کر چلے گئے۔۔ تو شیخ صاحب کو اس فیلڈ میں ہونا چاہیے اور کسی اور فیلڈ میں جانے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔

آصف علی زرداری۔ ان کے بارے میں بہت سارے لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے بہت اسمارٹ پالیٹکس کی ہے۔ 2008 سے 2013 تک کا وقت انہوں نے بڑے زبردست طریقے سے گزارہ ہے..... مگر میں اس بات سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ چاروں صوبوں کی پارٹی اب ایک صوبے کی بھی نہیں رہی تو انہوں نے تو اپنی پارٹی کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے..... تو میرا خیال ہے کہ سیاست کے بجائے انہیں کوئی اور کام دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ ابھی اگر بلاول کو فری ہینڈ نہیں دیتے تو پارٹی کو مزید نقصان پہنچے گا۔

عمران خان۔ عمران خان ایک بہترین کرکٹر ہیں۔ انہوں نے ورلڈ کپ جتوایا اور بہترین آل راؤنڈر تھے اور پوری دنیا انہیں مانتی ہے..... فلاحی کام اور تعلیمی کام بھی زبردست کیے ہیں..... تو میرا خیال ہے کہ انہیں سیاست میں ہی رہنا چاہیے..... مجھے نہیں معلوم کہ ان کا سیاسی مستقبل کیا ہو گا مگر اس وقت وہ ایک بھرپور اپوزیشن کا کام کر رہے ہیں..... اور آپ کی جمہوریت نہیں چل سکتی، آپ کی گورنمنٹ بہتر نہیں ہو سکتی جب تک آپ کے ملک میں مضبوط اپوزیشن نہیں ہو گی۔۔ اس وقت عمران خان ایک زبردست اپوزیشن کا کام کر رہے ہیں۔۔ حکومت پر پریشر ڈال کر رکھتے ہیں..... حکومت کو پش کرتے ہیں کہ وہ کام کرے..... اور میرا خیال ہے کہ عمران خان کو سیاست میں ہی رہنا چاہیے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔

بلاول بھٹو۔ بلاول بھٹو ماشاءاللہ نوجوان ہیں..... ان کی پارٹی ان کو دو سے تین بار لانچ کر چکی ہے بہ حیثیت لیڈر کے..... مگر پھر ایسا لگتا ہے کہ وہ پیچھے کی طرف چلے گئے ہیں۔ اور زرداری صاحب آگے آ گئے ہیں..... میرا خیال ہے کہ اب بلاول بھٹو کو پیچھے والی سیٹ سے اٹھ کر آگے والی سیٹ پر آ جانا چاہیے اور اپنی پارٹی کو سنبھالنا چاہیے۔ پارٹی کو لیڈ کرنا چاہیے۔ انہیں اب پارٹی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ جانا چاہیے۔

مصطفیٰ کمال۔ مصطفیٰ کمال صاحب ایک نئے مشن کے ساتھ آئے ہیں۔ اور پورے پاکستان میں سیاست کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اگر آپ انہیں مستقل کراچی کا "میئر" بنا دیں تو کراچی سدھر جائے گا۔ کیونکہ جب وہ میئر تھے تو انہوں نے کراچی کے لیے اچھا کام کیا تھا۔

ڈاکٹر فاروق ستار۔ ڈاکٹر فاروق ستار ایم کیو ایم پاکستان کے لیے بہت محنت کر رہے ہیں۔۔ اور کوشش کر رہے ہیں کہ پارٹی کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیں اور جب الیکشن ہو گا تو پتا چلے گا کہ ان کا ووٹ بینک کتنا ہے۔ اور میں چاہوں گا کہ وہ سیاست میں ہی رہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں..... مگر اس وقت تو ان کو سیاست ہی کرنی چاہیے۔

تھوڑی باتیں پرسنل لائف پہ ہو جائیں۔۔ اپنی بیگم اور بچوں کے بارے میں بتائیے۔

"میری بیگم کا نام ہے "ربیعہ" اور یہ بھی بزنس میں اینکر تھیں اور بزنس شوز کرتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی تین سال انہوں نے جاب کی اور شوز کرتی رہیں۔ مختلف موضوعات پر..... اس کے بعد کچھ عرصہ ایک "این جی او" کے ساتھ منسلک رہیں۔ تعلیمی قابلیت ان کی "ایم بی اے" ہے..... میرے دو بچے ہیں۔ ماشاءاللہ بیٹی ہے چھ سال کی اور اس کا نام ہے آئرہ جس کا مطلب ہے قابل عزت اور بیٹا ہے ایک سال کا جس کا نام ہے "زیڈان" اس کا مطلب ہوتا ہے پروگریسو اور زیڈان فرانس کا معروف فٹ بالر ہے اور یہ مسلم نیم ہے۔

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"میں x باکس کھیلتا ہوں۔ بیٹی بھی کچھ گیم کھیلنا سیکھ گئی ہے تو اس کے ساتھ بھی کھیلتا ہوں..... ہفتے میں ایک دو دن ایسے ہوتے ہیں جو دوستوں کے ساتھ

گزرتے ہیں۔ کام کے ساتھ ساتھ تفریح بھی ضروری ہے اور اپنے آپ کو ریلیکس رکھنا بھی ضروری ہے۔ پھر کوشش ہوتی ہے کہ سالانہ چھٹیاں مل جائیں تو کہیں باہر گھوم پھر آئیں۔ تاکہ دماغ فریش ہوجائے کیونکہ یہ بہت ضروری ہے۔ چھٹیوں پہ ہونے کے باوجود دھیان اپنے کام پر ہی ہوتا ہے اور کوئی خاص خبر بریک ہوجائے تو خیال آتا ہے کہ کاش میں بھی وہاں ہوتا۔ مگر کچھ بھی ہو، کام سے بریک لینا بہت ضروری ہے۔ اور ہاں روٹین کام سے وقت نکال کر میں ہفتے میں پانچ دن جم ضرور جاتا ہوں تاکہ میرا جسم فٹ رہے یہ میرا شوق بھی ہے اور مجھے اچھا بھی لگتا ہے۔ جم پہ کوئی کمپرومائز نہیں کرتا۔"

"کھانے پینے کا شوق ہے؟"

"کبھی کبھی کھانے میں "چوزی" ہوجاتا ہوں۔ ورنہ تو سب کچھ ہی کھالیتا ہوں۔ گھر پہ پکا ہو تو گھر پہ کھا لیتا ہوں۔ ورنہ باہر سے آرڈر کردیتا ہوں۔ اس معاملے میں میرے کوئی نخرے نہیں ہیں۔ مچھلی بہت پسند ہے۔ چکن کی ساری چیزیں بھی پسند ہیں۔ وائٹ میٹ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اور ہاں نوجوانوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی فٹنس پہ ضرور توجہ دیں۔ جسمانی طور پر فٹ ہوں گے تو ذہنی اور دماغی طور پر بھی فٹ ہوں گے آپ۔ اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنی فٹنس کا خیال نہیں رکھتے جب کہ یہ بہت ضروری ہے۔"

"مزاج کے کیسے رہے اور ہیں؟"

"مزاج کا اچھا ہوں' فرینڈلی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ تو بالکل بھی غصہ نہیں آتا۔ البتہ تھوڑا چڑچڑا ہوگیا ہوں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ کام کا بہت پریشر ہوتا ہے اسٹریس ہوتا ہے۔ میری بیگم سے پوچھیں تو وہ ضرور کہیں گی میرے بارے میں کہ چھوٹی چھوٹی بات پر چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔"

"اپنے فیصلے خود کرتے ہیں یا مشورہ لیتے ہیں؟"

"والدین سے مشورہ ضرور کرتا ہوں۔ کیونکہ والدین کی دعاؤں اور ان کی گائیڈنس کے بغیر کامیاب

ہونا بہت مشکل ہے۔ اور میری ترقی دیکھ کر میری خوشحالی دیکھ کر والدین بہت خوش ہوتے ہیں۔"

"یہ فیلڈ صحافیوں کے لیے محفوظ نہیں ہے' والدین ڈرتے تو ہوں گے؟"

"جی۔ والدہ بہت پریشان رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ زیادہ سوال نہ کیا کرو۔ غصے میں نہ آیا کرو۔ وہ ہمیشہ میرے لیے فکرمند رہتی ہیں اور وہ کہتی ہیں کہ زیادہ نہ بولا کرو تو میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ اس فیلڈ میں ہوں تو بولنا تو پڑے گا۔ بہادر بن کے جینا ہے تو والدہ کو حوصلہ دیتا رہتا ہوں کہ یہی میرا کام ہے۔ آواز تو اٹھانی ہے تو تسلی میں آجاتی ہیں۔"

"کوئی پچھتاوا۔ زندگی میں؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر فلاں فیصلہ کرلیا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتا بلکہ بڑے برے حالات ہوتے۔ اللہ نے جو فیصلے کروائے میرے حق میں کروائے۔ اس لیے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ جو مقام جو عزت دی ہے اسے قائم رکھنا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے شہزاد اقبال صاحب سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ہمیں ٹائم دیا۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

آرام

عائشہ عمر کا پچھلے سال بد ترین روڈ ایکسیڈنٹ ہوا تھا، جس میں ان کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ عائشہ عمر اس وقت احسن خان کے ساتھ فلم "رہبرا" کر رہی ہیں۔ جس میں وہ اپنے اب تک کے کرداروں سے مختلف نظر آئیں گی۔ (یہ ہم نہیں عائشہ کہہ رہی ہیں۔)

عائشہ عمر کا کہنا ہے کہ "وہ اسی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ (کیوں۔۔۔؟)" کیونکہ ڈاکٹر آپریشن سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ ہڈی خود بخود جڑ جائے تو زیادہ بہتر ہو گا (یہ تو بڑھتی عمر کے بچوں کے لیے کہا جاتا ہے جبکہ عائشہ۔۔۔) مگر اب کافی وقت گزر گیا ہے۔ (جی یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ کافی۔۔۔ وقت گزر گیا ہے۔) اور ہڈی نہیں جڑ سکی۔ (دیکھا کہا تھا نا کہ۔۔۔) اس لیے عائشہ کو آپریشن کروانا پڑے گا۔ عائشہ عمر کا مزید کہنا ہے کہ "آپریشن کروانے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ وہ اس ہاتھ سے ڈیڑھ لیٹر کی بوتل بھی نہیں اٹھا سکتیں۔" عائشہ عمر اسی لیے جلدی جلدی اپنا کام مکمل کروا رہی ہیں کہ آپریشن کے بعد انہیں کافی عرصہ آرام کرنا پڑے گا۔

صلاحیت

نعمان اعجاز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عتیقہ اوڈھو کے ساتھ دشت میں ہیرو آنے والے نعمان آج تک ہیرو آ رہے ہیں اور عتیقہ۔۔۔ (بھئی آپ بھی تو ڈراما دیکھتے ہیں نا!) نعمان اعجاز سے جب بھارتی فلموں سے آج کل بننے والی پاکستانی فلموں کا موازنہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کہا۔ "بھارتی فلموں میں دلچسپی بڑھانے کے لیے ڈرامائی عنصر ڈالا جاتا ہے جبکہ پاکستانی ڈراموں میں فلمی عنصر ڈالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔" فلموں میں کام کرنے کے متعلق نعمان اعجاز کا کہنا ہے کہ "جب تک کوئی بہت مضبوط کردار نہیں مل جاتا، اس وقت تک فلموں میں کام نہیں

کروں گا۔'' (سلطان راہی جتنا۔۔۔ بھئی مضبوط) میں چھوٹی اسکرین پر ہی بہت خوش ہوں۔ (بالکل صحیح کہا آپ نے نعمان' آج کی فلمیں بھی تو ڈراما ہی لگتی ہیں نا۔)

نعمان اعجاز نے مزید کہا کہ ''میں ایسے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کرتا ہوں جن کو مجھ سے کام لینا آتا ہو۔'' (یعنی نئے ڈائریکٹرز کو موقع نہیں دیتے۔۔۔ بھئی کام لینے کا۔) اور وہ باصلاحیت بھی ہیں۔ جبکہ فلمیں بنانے والے جن ڈائریکٹرز کو میں جانتا ہوں۔ ان میں ایسی کوئی صلاحیت مجھے نظر نہیں آتی۔ (بھئی یہ تو ڈائریکٹ ہٹ ہے سمجھنے والوں کے لیے۔)

فیصلہ

حدیقہ کیانی کے متعلق پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر کسی نے خبر لگا دی کہ انہیں لندن ایئرپورٹ پر منشیات برآمد ہونے پر گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس خبر سے جہاں حدیقہ کیانی اور ان کے گھر والے پریشان ہوئے وہیں ان کے دوست احباب اور پرستار بھی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ جس وقت یہ خبر چلی۔ اس وقت حدیقہ کیانی لاہور میں اپنی بھتیجی کی سالگرہ منا رہی تھیں۔ حدیقہ نے فوراً ہی اس تقریب کے کلپ بھی سوشل میڈیا پر ڈال کر اپنے چاہنے والوں کو تسلی دی تھی کہ وہ پاکستان میں ہیں اور یہ من گھڑت خبر ہے۔

خیر۔۔۔ حدیقہ نے کہا ہے کہ اس خبر سے صرف ان کی نہیں ان کے ملک کی بھی بدنامی ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے اس ویب سائٹ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا ہے۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ کہا جاتا ہے کہ جج نہیں بولتے' ان کے فیصلے بولتے ہیں مگر ہمارے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ فیصلے سے زیادہ جج بولتے رہتے ہیں اور جو فیصلے بولتے ہیں' ان کے تحت پرویز مشرف' حسین حقانی اور بہت سے دوسرے جو قانون کو مطلوب ہیں' قانون کی دسترس سے دور بھیج دیے جاتے ہیں۔

(سعود ساحر۔۔۔ دو ٹوک)

☆ ماہرین صحت شدید گرمی میں پانی کا زیادہ استعمال' گوشت سے پرہیز' پھل' سبزیاں اور ہلکی غذا کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پانی کی کمی سے خون گاڑھا ہو جاتا ہے اور لو لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہلکی پھلکی غذا' دہی اور سبزیوں کو روز کا معمول بنائیں۔

(فرائیڈے اسپیشل)

☆ امریکی ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ جو لوگ وقفے وقفے سے اعتکاف' مراقبہ اور تنہائی میں عبادت کرتے رہتے ہیں' ان کی دماغی صحت اچھی رہتی ہے اور وہ ڈپریشن سمیت بے چینی اور ذہنی تھکن کا شکار بھی نہیں ہوتے۔

(جسارت فرائیڈے اسپیشل)

☆ پرویز مشرف ہر وقت ''سب سے پہلے پاکستان'' کرتے رہتے تھے لیکن سب سے پہلے پاکستان کا مطلب ''سب سے پہلے جنرل مشرف'' کے سوا کچھ نہیں تھا۔

(گفتگو۔۔۔ شاہ نواز فاروقی)

آپ کا باورچی خانہ

حدیقہ انصاری..... لاہور

مجھے اپنے گھر کا باورچی خانہ سنبھالے ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ خود کو سگھڑ خاتون تو ہرگز نہیں کہوں گی مگر کوشش پوری کرتی ہوں کہ کچن کو اچھے سے سنبھالوں۔ میں کچن کس طرح سنبھالتی ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں!

س : کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج : کھانا پکاتے وقت کھانے والوں کی صحت کے ساتھ ساتھ ذائقے کا بھی خیال رکھتی ہوں۔ کھانا لذیذ ہو گا تو کوئی کھائے گا۔ ورنہ بدمزہ کھانا کوئی بھی نہیں کھاتا اور سزا کے طور پر پکانے والے کو ہی کھانا پڑتا ہے۔ (ہاہاہا)

س : کھانے کا وقت ہے۔ اچانک مہمان آجائیں تو کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوری تیار کر کے پیش کر سکیں؟

ج : اگر کبھی ایسا ہو جائے تو گھبرائیں نہیں۔ جو بھی چیزیں گھر پر موجود ہوں ان سے کچھ نہ کچھ جھٹ پٹ سے بنالیں۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا حل چکن ہے جو تقریباً" ہر گھر میں دستیاب ہوتا ہے۔ میں اکثر لیمن چکن بنالیتی ہوں۔ ایسی صورت حال میں آپ بھی ضرور آزما کر دیکھیں۔

اجزا :

چکن	آدھا کلو
لیموں کا رس	چار سے پانچ چمچے
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو چائے کے چمچے
پسا دھنیا	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
چکن تکہ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

تمام مسالا جات کو چکن پر لگا کر 20 سے 30 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔

پھر چکن کو گرم تیل میں ڈالیں اور گرم ہونے تک درمیانی آنچ پر چکن کو پکائیں پھر ڈھکن بند کر کے پکنے دیں۔ جب گل جائے تو آنچ دم والی کر دیں پھر 15 سے 20 منٹ کے بعد ڈھکن کھول دیں۔ جاذب کاغذ پر چکن رکھیں اور چپاتی رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

س : کچن عورت کے سلیقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج : میرا بھی یہی خیال ہے کہ اگر کسی عورت کا سلیقہ دیکھنا ہو تو اس کو کچن میں کام کرتے ہوئے دیکھو! میں کھانا بناتے وقت' سبزیوں کے چھلکے وغیرہ ڈسٹ بن میں پھینکنا' برتنوں کو ساتھ ساتھ دھو کر رکھنا اور مسالا جات کے ڈبوں کو ان کی جگہ پر رکھنا ضروری خیال کرتی ہوں۔ تفصیلی صفائی تہواروں پر اور کسی خاص مہمان کی آمد پر تو ہوتی ہی ہے مگر کبھی کبھی اس وقت بھی ہو جاتی ہے جب لگے کہ کچن گندہ ہو رہا ہے۔ صاف ستھرے کچن میں کام کرنا اچھا احساس دیتا ہے۔

س : صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں؟ کسی ایسی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں؟

ج : ناشتے میں ہماری فیملی یکسانیت پسند نہیں کرتی' مختلف کھانے بنتے یا منگوائے جاتے ہیں۔ جیسے حلوہ پوری' پراٹھا آملیٹ' رسک چائے' نان چنے اور فرنچ ٹوسٹ وغیرہ۔ بادامی فرنچ ٹوسٹ مجھے پسند ہیں اس کی ترکیب حاضر

خدمت ہے۔

بادامی فرنچ ٹوسٹ

اجزا :

ڈبل روٹی	پانچ سے چھ سلائس
انڈے	دو عدد
دودھ	ایک کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
مایونیز	دو کھانے کے چمچے
بادام (چھلکے اتار لیں)	حسب ضرورت
نمک	1 چٹکی
چینی	حسب ذائقہ
تیل یا گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

بریڈ سلائس تکونی شیپ میں کاٹ لیں۔ دودھ میں چینی حل کریں پھر اس میں نمک 'میدہ' مایونیز اور انڈے ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ باداموں کو ایک علیحدہ پلیٹ میں پھیلا لیں۔ پہلے بریڈ سلائس کو دودھ والے آمیزے میں ڈبوئیں پھر سلائس کو باداموں پر رکھ کر ہلکا ہلکا دبائیں اور گرم تیل میں شیلو فرائی کر کے گولڈن کر لیں اور ایک پلیٹ میں ٹشو پر ٹوسٹ کو نکال کر گرم گرم سرو کریں۔

س : آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟

ج : برگر اور شوارما وغیرہ تو گھر پر آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن جب جی چاہے 'کچھ اسپیشل ہو + آؤٹنگ کے لیے تو پھر ہم گول باغ کی فوڈ اسٹریٹ میں منشاء تکہ شاپ پر چلے جاتے ہیں ان کا چکن تکہ اور ملائی بوٹی بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ (لاہوریو! سن لو)

جب جیب اجازت دے تو مہینے میں دو سے تین بار بھی باہر سے کھانا کھا لیا جاتا ہے اور اگر اجازت نہ دے تو پھر صبر کر کے گھر کی ہی دال سبزی پر گزارا کر لیتے ہیں!

س : ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج : اگر کوئی گرمی میں مالٹے اور سردی کے موسم میں آم کھائے گا تو کچھ عجیب سا لگے گا۔ اسی طرح کھانا بناتے وقت بھی اس بات کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے کہ موسم کے حساب سے کھانا بنایا جائے۔ برسات کے موسم میں عام لوگوں کی طرح ہمارا بھی دل چاہئے 'پکوڑے 'سموسے اور چپس کھانے کو چاہتا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈا کسٹرڈ یا کھیر کھائی جاتی ہے اور سردیوں میں گرم گرم گاجر کا حلوہ بناتی ہوں۔

س : کھانا پکانے میں کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج : جی بالکل میں اس بات کی قائل ہوں اور اگر کبھی قائل نہ رہوں تو میری فیملی قائل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ کیسے؟ وہ ایسے جی کہ میری فیملی میں بدمزہ کھانا کوئی بھی کھانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ جو بھی بدمزہ کھانا پکائے گا تو کھائے گا بھی۔ خود اسی لیے محنت و توجہ لازمی ہے۔

کچن کی ٹپ :

اروی چھیلنے سے ہاتھوں پر خارش ہوتی ہے۔ اروی چھیلنے کے بعد ہاتھوں کو دھولیں اور پھر ان پر لیموں کاٹ کر رگڑ لیں۔ خارش ختم ہو جائے گی۔ آزما کر ضرور دیکھیں۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

نرگسی کوفتے

ضروری اشیاء :

قیمہ (روکھا)	آدھا کلو
خشخاش (پسی ہوئی)	دو کھانے کے چمچے
کالے بھنے ہوئے چنے (پسے ہوئے)	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
تیل	تلنے کے لیے
انڈے (ابلے ہوئے)	آٹھ عدد

شوربے کے لیے :

پیاز (گھی میں سنہری کریں اور پیس لیں)	ایک کپ
دہی	پون کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
چھوٹی الائچی	چار عدد
جائفل، جاوتری پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

قیمہ کو چوپر میں ڈال کر پیس لیں۔ دوبارہ خشخاش، چنے، نمک، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر اور انڈا ڈال کر ایک دفعہ پھر پیس کر پیالے میں نکال کر دس منٹ کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔

قیمے کا آمیزہ ابلے ہوئے انڈوں پر لپیٹ کر کڑاہی میں تیل گرم کر کے فرائی کر لیں۔ سنہرا ہو جائے تو نکال کر الگ رکھیں۔ شوربہ بنانے کے لیے برتن میں تیل گرم کریں اور الائچی کڑکڑائیں۔ لہسن، ادرک پیسٹ، براؤن پیاز، پسی ہوئی نمک، لال مرچ پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، جائفل، جاوتری پاؤڈر ڈال کر بھونیں۔ دہی پھینٹ کر ڈالیں اور مسالا بھون لیں اور ایک کپ پانی ڈال کر دو منٹ پکائیں ڈش میں نرگسی کوفتے رکھیں اس پر شوربہ ڈالیں اور چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

بیف زنگر برگر

ضروری اشیاء :

گائے کا گوشت	ایک پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
بن	حسب ضرورت
ٹماٹر (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
کھیرا (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
کارن فلور	آدھا کپ
سلاد کے پتے	حسب ضرورت
مایونیز	حسب ضرورت
چیز سلائس	حسب ضرورت
ڈبل روٹی کا چورا	آدھا کپ
کارن فلیکس	آدھا کپ
انڈے	دو عدد
سادے خشک چپس	آدھا کپ
سویا ساس	1 چائے کا چمچ
چلی ساس	آدھا چائے کا چمچہ
ووسٹر شائر ساس	آدھا چائے کا چمچہ
سفید مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :
گوشت کے پارچوں کو لہسن ادرک پیسٹ اور نمک ڈال کر ابال لیں۔ ایک پیالے میں ابلے ہوئے گوشت سویا ساس، چلی ساس، ووسٹر شائر ساس، سیاہ مرچ پاؤڈر اور سفید مرچ پاؤڈر لگا کر ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ ایک پیالے میں انڈے پھینٹ کر کارن فلور اور سفید مرچ پاؤڈر شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔
کارن فلیکس، ڈبل روٹی کا چورا اور چپس چورا کر کے ایک پلیٹ میں نکال لیں۔
فرائی پین میں تیل گرم کر کے مسالا لگے ہوئے پسندے پہلے انڈے کے آمیزے میں ڈبو کر بریڈ کرمز، کارن فلیکس اور چپس کے چورے سے لپیٹ کر تل لیں۔ سنہرے ہونے پر ٹشو پیپر پر نکال لیں۔ بن میں پہلے مایونیز لگا کر سلاد کا پتا اور چیز سلائس رکھیں۔ اس کے بعد فرائی زنگر ٹماٹر اور کھیرے کا سلائس رکھ کر کیچپ ڈال بن کو سرونگ ڈش میں فنگر چپس اور من پسند ساس یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

استیم چکن چرغا

ضروری اشیاء :

سالم مرغ	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
تیل	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا (کوٹ لیں)	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :
مرغی کو دھو کر خشک کر لیں۔ ایک پیالے میں دہی، نمک، لال مرچ پاؤڈر، تیل، کٹی ہوئی سیاہ مرچیں، کٹا ہوا زیرہ، دھنیا، سرکہ، گرم مسالا پاؤڈر اور لہسن، ادرک پیسٹ اچھی طرح مکس کر لیں اور مرغ کو گود کر مسالا لگا کر فریج میں چار سے پانچ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک بڑی دیگچی میں تھوڑا پانی ڈالیں۔ اس کے اوپر چھلنی رکھیں۔ چھلنی میں مسالا لگا مرغ رکھ کر اوپر سے ڈھکن لگا دیں۔ چولہے کی آنچ کم کر دیں۔ آدھا گھنٹہ بھاپ میں پکنے دیں۔ مرغ گل جائے تو چولہا بند کر دیں اور گرم گرم سرو کریں۔

اسٹفڈ اوپن برگر

ضروری اشیاء :

مرغی کا قیمہ	آدھا کلو
برگر بن	چھ عدد
گاجر (گول کاٹ لیں)	تین عدد
مٹر (ابلے ہوئے)	آدھا کپ
ہری پیاز	آدھا کپ (چوپ کی ہوئی)
سیاہ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
کیچپ	ایک کپ
چیز سلائس	چھ عدد
مایونیز	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :
ساس پین میں تین کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے قیمہ فرائی کریں۔ اس میں گاجر، مٹر، ہری پیاز، سیاہ مرچ پاؤڈر اور نمک شامل کر کے تین سے چار منٹ تک بھون لیں اور نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔
برگر بن کو تیز چھری کی مدد سے بیچ میں سے خالی کر دیں اس کے چوڑائی میں دو حصے کر لیں۔ ایک حصے میں کیچپ اور مایونیز لگا کر چیز کا ایک سلائس رکھ دیں اوپر سے بن کا دوسرا حصہ رکھ کر قیمہ کا آمیزہ بھر دیں۔ مزیدار اسٹفڈ اوپن برگر پلیٹ میں نکال کر کیچپ اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ا۔ ب۔ ج

میں بہت اذیت اور ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ میری شادی تین سال پہلے ہوئی تھی غیروں میں۔ وہ لڑکا پنجاب کا اور میں سندھ سکھر کی رہائشی ہوں۔ میری گورنمنٹ جاب ہے۔ جس کی وجہ سے میں شادی کے بعد بھی اپنی امی کے گھر میں ہی رہتی ہوں۔ شوہر اپنے گھر میں رہتا ہے۔ شادی کے چند دن بعد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے سے نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ تین بچوں کا باپ بھی ہے میرے بار بار پوچھنے پر وہ جھوٹی قسمیں کھاتا رہا لیکن بعد میں یہ ثابت ہوگیا کہ واقعی وہ شادی شدہ ہے۔ اس نے اتنا بڑا گناہ کرنے کے بعد بھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی پہلی بیوی بچوں کے ساتھ اسلام آباد میں رہ رہا ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ لیکن میں نے اس انسان سے بالکل رابطہ ختم کردیا ہے اور وہ خود بھی مجھ سے بات یا رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس نے آج تک میری اور میرے بیٹے کی کوئی ذمے داری نہیں اٹھائی ہے۔ میں خود اپنا اور بچے کا گزارا کرتی ہوں۔ اس نے کبھی غلطی سے بھی مجھے 100 روپے بھی نہیں دیے ہیں۔ وہ ان تین سالوں میں یہ مشکل سات یا آٹھ مہینے میں ایک دن کے لیے آیا ہے۔ سب پوچھتے ہیں کہ تمہارا شوہر اتنے اتنے مہینے بیوی بچے کے بنا کیسے رہتا ہے، آتا کیوں نہیں ہے۔ سوچتی ہوں کہ خودکشی ہی کرلوں۔

مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں خلع کے کیس کروں یا نہیں۔ یا اسے اللہ پر چھوڑ کر جیسے تین سال سے بیٹھی ہوں ویسے ہی بیٹھی رہوں۔

یہاں ایک اور بات بتاتی چلوں کہ میرے ابو وفات پاچکے ہیں۔ بھائی چھوٹا ہے کوئی سرپرست نہیں ہے۔ بس ایک ماں ہے جو خود بیمار ہے۔ والد نہ ہونے کی وجہ سے بچپن سے دکھ اٹھائے ہیں اور اب یہ دکھ تو روح کو چھلنی کررہا ہے۔ بچہ بڑا ہو رہا ہے کیا کروں۔

ج : عزیز بہن! خودکشی کے متعلق تو سوچیے گا بھی نہیں.... زندگی میں تو چین نہیں پایا، مرنے کے بعد بھی عذاب۔ آپ جس تکلیف سے گزر رہی ہیں۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اس شخص سے آپ کی شادی کس طرح ہوئی۔ اس کے گھر والے کوئی دوست عزیز شادی میں شریک تھے یا نہیں.... یا آپ کا کوئی سسرالی عزیز ہے؟ اگر کوئی عزیز رشتہ دار ہے تو اس کے ذریعے اس پر دباؤ ڈلوائیں کہ وہ آپ کے حقوق ادا کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شادی کے بعد اس شخص نے آپ کو کوئی خرچا نہیں دیا۔ نہ ہی اپنے بیٹے کے لیے کچھ دیا۔ اب تو رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسی صورت میں آپ خود سوچیں کہ یہ شادی آپ کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔

دوسری شادی کا علم ہونے کے بعد آپ کو اس سے رابطہ نہیں توڑنا تھا۔ دوسری شادی میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دونوں بیویوں سے مساوی سلوک کیا جائے۔ اب آپ اس سے بات کریں اگر وہ آپ کو اپنی پہلی بیوی کے برابر حقوق دے سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ بہتر یہی ہے کہ اس کو چھوڑ دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی مرد کے بغیر تنہا رہنا مشکل ہے لیکن اب بھی آپ تنہا ہی رہ رہی ہیں۔ اس شخص کا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ممکن ہے اس شخص سے علیحدگی کے بعد آپ کے لیے بھی کوئی بہتر راہ نکل آئے اور آپ زندگی میں آگے بڑھ سکیں۔

ایک دکھی ماں۔۔۔ سیالکوٹ

میری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹی کالج میں پڑھتی تھی۔ بری لڑکیوں سے دوستی ہوگئی۔ فون پر کسی لڑکے سے سہیلی نے دوستی کروادی۔ میں نے حالانکہ بہت دھیان رکھا مگر مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں اس کی غیر موجودگی میں موبائل بھی چیک کرتی تھی اور اس کی کتابیں بیگ وغیرہ بھی مگر کبھی کوئی قابل اعتراض چیز نہ پائی۔ لڑکے کے کہنے پر کالج کے بجائے اس سے ملنے چلی گئی۔ وہ اسے ہوٹل میں لے گیا اور کہیں کا نہ چھوڑا۔ یہ خاموشی سے گھر آگئی۔ اب اس کے رویے سے مجھے

غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ دس بارہ دن گزر چکے تھے جب مجھ کو اس نے بتایا کہ کیا قیامت گزر گئی ہے۔ میں سر پیٹ کر رہ گئی۔ اسے بھی مارتی۔ خود بھی روتی۔ کسی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بدنامی اور گھر کی بربادی کے ڈر سے شوہر سے بھی ذکر نہ کیا۔ ایک سال گزر گیا ہے۔ ذہنی مریض ہو گئی ہوں۔ اب اس کے والد رشتے دیکھتے پھرتے ہیں کہ بیٹی جوان ہے شادی ہو جانی چاہیے۔ میری سانس بند ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد بات کھل گئی اور اس کے شوہر کو پتا چل گیا کہ یہ کنواری نہیں تو کیا ہوگا۔ ہمارا خاندان بڑا مذہبی ہے۔ میں نے سیدھی سادی زندگی گزاری ہے مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ کسی طریقے سے یہ بات چھپی رہ سکتی ہے یا نہیں؟ کیا ایسی باتیں چھپ جاتی ہیں؟ بیٹی کی شادی کروں یا نہیں؟ کیا کسی بہانے سارے رشتے مسترد کرتی جاؤں اور یہ بغیر شادی کے بوڑھی ہو جائے تو عزت بنی رہے۔ خدا کے واسطے مشورہ دیں کہ کیا کروں؟

ج : بہن! آپ کے دکھ اور پریشانی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ مشورہ تو کسی صورت نہیں دیا جا سکتا کہ بیٹی کو گھر بٹھا کر بوڑھا کر لیا جائے۔ اور کسی کو بتانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کسی کو بتانے کا مطلب ہے جگ ہنسائی رسوائی اور طرح طرح کی باتیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ابھی شادی میں جلدی نہ کریں جتنا ممکن ہو اسے ٹالتی رہیں۔ بیٹی کی تعلیم مکمل ہونے دیں۔ وہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائے تب اس کی شادی کریں۔ ایک پُر اعتماد لڑکی حالات کا زیادہ خوش اسلوبی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کر سکے۔

آپ کی بیٹی سے غلطی ہوئی اور وہ اپنی غلطی پر نادم و شرمندہ ہے۔ جو ہونا تھا۔ ہو چکا اگر آپ نے اس کے ساتھ اپنا یہی رویہ برقرار رکھا تو فائدہ تو کوئی نہیں ہوگا۔ بیٹی ذہنی مریض بھی بن جائے گی۔

اللہ پر بھروسا رکھیں۔ وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی بیٹی کے ساتھ اچھا ہی ہوگا۔ بندہ جب اپنے گناہوں پر نادم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ اور اپنے بندوں پر خوشیوں کے در کھول دیتا ہے۔

نگہت افروز۔۔۔۔ کراچی

ہمارے بڑے بھائی کی شادی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ شادی کے وقت بھابھی کے والدین میں ناراضی تھی اور ان کے والد شادی میں بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ بھابھی بہت اچھی طرح رہیں اور ان کا ڈیڑھ سال کا ایک بیٹا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ایک روز بھابھی کے والد ان سے ملنے آئے تو بھابھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ اب دو ماہ ہو گئے۔ بھابھی ہمارے گھر آنے کو تیار نہیں۔ بچہ ان کی جدائی میں بیمار ہو گیا ہے۔ بھائی بھی بہت پریشان ہیں مگر بھابھی نے ہم میں سے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیا اور خلع کا دعوا دائر کر دیا ہے۔ پتا چلا ہے کہ وہ اپنے چچا زاد کو پسند کرتی تھیں اور وہ اب بھی ان سے شادی کے لیے تیار ہے۔ والدین میں ناراضی کی وجہ بھی یہی تھی۔ اب ان لوگوں کی آپس میں دوستی ہو گئی ہے اور وہ پرانے رشتے استوار کرنا چاہتے ہیں۔

بھابھی کے والد کا کہنا ہے کہ ہم چاہیں تو ان کی چھوٹی بیٹی سے اپنے بھائی کی شادی کر دیں۔ ورنہ بچہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں تباہ ہو جائے گا۔ بھائی کسی صورت تیار نہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ بھابھی کو کیسے سمجھائیں۔

ج : آپ کی بھابھی کے والد کو شادی کے وقت اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کرنا چاہیے تھی لیکن انہوں نے وہی کیا جو ان معاشرے کا عام دستور ہے۔ دوسری طرف بھابھی کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ جب شادی ہو رہی تھی تو انہوں نے خاموشی سے شادی کر لی۔ اب شادی کے بعد جب وہ ایک بچے کی ماں بن چکی ہیں تو انہوں نے اتنی ہمت کر لی کہ شوہر سے خلع کا مطالبہ کر دیا اور بچے کو بھی چھوڑ دیا۔

جہاں تک ان کی چھوٹی بہن سے شادی کا سوال ہے تو ہماری نظر میں یہ کوئی مناسب بات نہیں ہوگی۔ اس طرح آپ کے بھائی کے زخم بھی مندمل نہیں ہوں گے اور وہ ایک نارمل زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اب اس خاندان سے مزید کوئی رشتہ نہ جوڑا جائے۔

بیوٹی بکس

امت الصبور

ا-ج دریا خان

س : میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر رُواں ہے۔ میں نہ ویکس کرتی ہوں نہ تھریڈنگ۔ سو اس کے لیے کوئی حل بتائیں ' لہسن ' دہی ' دودھ وغیرہ جیسے نسخے استعمال کرنے سے رُواں بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا۔

ج : اگر آپ تھریڈنگ یا ویکس نہیں کرنا چاہتیں تو ایسا کریں کہ ایک انڈے کی سفیدی کو پھینٹ لیں اور اس میں چینی اور کارن فلور ملا کر بلینڈ کرلیں۔ اب اس پیسٹ کو چہرے پر لگا کر خشک ہونے دیں۔ خشک ہو جائے تو رگڑ کر اتار لیں۔ چہرہ دھوئیں مت۔ اس نسخے کو ہفتے میں دو سے تین بار دہرائیں۔

مسز خان..... شکار پور

س : میری ڈبل چن ہے۔ جس سے میرا چہرہ جو پہلے ہی بڑا اور موٹا ہے اور زیادہ موٹا لگتا ہے۔ پلیز ڈبل ٹھوڑی کم کرنے کے آسان طریقے بتادیں۔

ج : بعض دفعہ موٹاپے کی وجہ سے ٹھوڑی ڈبل لگتی ہے۔ وزن کم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ ہمیشہ سیدھی کھڑی ہوا کریں۔ پڑھتے ہوئے یا ٹی وی دیکھتے ہوئے ٹھوڑی کو سینے سے ٹکا کر نہ رکھیں۔ رات کو سوتے ہوئے چت لیٹنے کے بجائے کروٹ سے لیٹیں۔ اس کے علاوہ اپنی ٹھوڑی پر ہلکے ہلکے اپنے ہاتھوں کی پشت سے تھپڑ مارنا شروع کریں اور رفتہ رفتہ رفتار بڑھا دیں۔ تقریباً" پانچ منٹ یہ عمل دن میں دو سے تین مرتبہ کریں۔ ان شاءاللہ اس ورزش سے آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نام نہیں لکھا..... رائے ونڈ

س : میرے ہاتھ اور پاؤں بہت سخت ہیں۔ خاص طور پر پاؤں کے تلوے اور ایڑیاں۔ اس کے علاوہ جوتا پہننے سے بھی پاؤں پر نشان پڑ جاتے ہیں۔ ناخنوں پر بھی سفید دھاریاں ہیں۔

ج : پیروں کی خوب صورتی کے لیے آپ ہر رات اپنے پیروں کو نیم گرم پانی اور شیمپو یا صابن سے دھوئیں اور رات کو سونے سے پہلے کریم یا موئسچرائزر لگا کر سوئیں۔ اس کے علاوہ ایک ٹب نیم گرم پانی میں نمک ' ڈیٹول اور شیمپو ملا لیں اور اس پانی میں پندرہ منٹ تک پاؤں ڈبو کر رکھیں۔ بعد ازاں پیر صاف کرلیں۔

پیروں پر دودھ کی بالائی اور انڈے کی سفیدی کا ماسک لگائیں۔ آخر میں پیروں پر عرق گلاب لگا کر اچھا سا موئسچرائزر لگائیں۔ یہ عمل ہر ہفتے باقاعدگی سے کریں۔

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

س : میری بیٹی کے بال میٹرک تک تو بہت تیزی سے بڑھے مگر کندھے سے ایک بالشت نیچے جا کر رک گئے۔ کچھ نسخے بھی آزمائے مگر بال بڑھ کر نہیں دیے۔ بال سلکی ہیں پر بڑھتے نہیں ـــــ کوئی حل بتائیں۔

ج : بالوں کی خوب صورتی آپ کی صحت کے ساتھ مشروط ہے۔ ایسی غذاؤں کا استعمال کریں جس میں وٹامن بی ہو۔ وٹامن بی بالوں کی افزائش میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ آپ مٹھی بھر امرود کے تازہ پتے لے کر اچھی طرح دھولیں۔ پھر ایک بڑے برتن میں تقریباً" ایک لیٹر پانی میں ان پتوں کو ڈال کر دھیمی آنچ پر آدھا گھنٹے تک پکائیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو اس پانی کو چھان کر ٹھنڈا کرکے اس سے سر دھوئیں۔ آدھے گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے سر دھو کر خشک کرلیں۔ یہ عمل ہفتے میں ایک دفعہ ضرور کریں۔